35689

مضامین

افسانے

ایک افسانہ نگار

غزلیں

آہنگ/۵۵

کلیمؔ الدین احمد

کی

خودنوشت

اپنی تلاش میں

شائع ہو گئی

ڈیلکس ایڈیشن
ایک سو پچیس روپیے

عام ایڈیشن
تیس روپیے

ہر کتب فروش سے طلب کریں یا براہ راست ہمیں لکھیے

کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگ جیون روڈ، گیا

آہنگ / ۵۵

وزیر آغا

○

بے زباں کلیوں کا دل میلا کیا — اے ہوائے صبح تو نے کیا کیا

کی عطا ہر گل کو اک رنگیں قبا — بوئے گل کو شہر میں رسوا کیا

بے خیالی میں ستارے چن لئے — جگمگاتی رات کو اندھا کیا

جاتے جاتے شام یک دم ہنس پڑی — اک ستارہ دیر تک رویا کیا

کیا تجھے وہ صبحِ کاذب یاد ہے؟ — روشنی سے تو نے جب پردہ کیا

ایک خوابِ بیکراں تھا اور میں — تو نے لفظِ بے صدا یہ کیا کیا

اپنی عریانی چھپانے کے لئے — تو نے سارے شہر کو ننگا کیا

میں نے جو کچھ بھی کیا اچھا نہ تھا
تو نے جو کچھ بھی کیا اچھا کیا

ماجد الباقری

○

ابر گھر گھر کے آج برسا ہے
گھر مرا روشنی کو ترسا ہے
کس خرابے میں آ کے ٹھہرا ہوں
رات دن سامنے سفر سا ہے
شہر میں بس رہی ہے خاموشی
رنگ اس کا بھی میرے گھر سا ہے
برگ آہنگ ہے نہ شاخِ صدا
پیڑ ہرا ایک بے ثمر سا ہے
بے حفاظت ہوئے ہیں لفظ و بیاں
سر میں الجھن ہے دل میں ڈر سا ہے
جو بھی اخبار پڑھ کے جیتا ہے
اپنی حالت سے بے خبر سا ہے
ایک اک پل کبھی قیامت تھا
اب وہ قصہ بھی مختصر سا ہے
ٹھہرتا ہی نہیں کوئی ماجد
حال بستی کا رہگزر سا ہے

○

چوٹی پہ برف و باد فضا میں سحاب ہیں
دریا پہاڑ کھیت سبھی زیر آب ہیں
خوشبو گئے دنوں کی ہے تنہائیوں میں ساتھ
صحرائے بے گیاہ میں چتے گلاب ہیں
آنسو کئی فسانوں کا آئینہ دار ہے
الماریوں میں چہروں کی آنکھیں کتاب ہیں
ہیں چیونٹیوں کی قبر پہ مٹی کی چادریں
ساحل پہ تیرتے ہوئے ننگے حباب ہیں
چیلوں کے غول دیکھ کے بدلو نہ راستہ
پانی نہیں ہے ریگِ رواں میں سراب ہیں
بے لفظ آگہی کی دلوں کی خوشیاں
صوت و صدا کے قحط میں چنگ و رباب ہیں
ماجد بساطِ خوف پہ بکھرے ہیں بحر و بر
منظر تمام دن کے نگاہوں میں خواب ہیں

انور سدید

اُردو نظم میں صنفِ نازک کے جنسی رجحانات

اُردو شاعری میں جنسی جذبات کی پیش کش ایک طویل عرصے تک بالعموم مرد شعرا کی عملداری میں شامل رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مشرق میں عورت کے ہفت رنگ پیکر کے گرد تقدیس و تکریم کے سینکڑوں دبیز پردے ہی نہیں لپیٹے گئے بلکہ اس کے اظہار و گفتار پر بھی گوناگوں پابندیاں عائد کی گئیں۔ چنانچہ جنس کا فطری جذبہ جو تخلیق نسل کا ذمہ دار اور تکمیل انسانیت میں معاون ہے۔ عملی زندگی میں تو اخلاقیات کی سرپرستی میں فروغ پاتا رہا لیکن اس کے اظہار پر خاصا کڑا احتساب عائد رہا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عورت کے بغیر مرد ایک بے معنی حقیقت ہے۔ بلکہ اکثر اوقات تو اسے ایک اہم تر حقیقت قرار دیا جاتا ہے۔ اور کائنات کی تمام رنگینوں کو عورت کے وجود سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے[1]۔ اس اہمیت کے باوجود یہ تضاد بے حد دلچسپ ہے کہ ایک طویل عرصے تک صنف لطیف کو حقیر ترین مخلوق تعبیر کیا جاتا رہا اور رستخیز حیات کی ایک معروف تثلیث میں زر اور زمین کے ساتھ اسے بھی ایک قابلِ نفرت زاویہ شمار کیا گیا۔
اہم بات یہ ہے کہ مرد نے ہر قسم کے احتساب کے باوجود عورت کی جسمانی رعنائیوں کو تو جنسی جذبات کے والہانہ اظہار کے لئے بے محابا استعمال کیا لیکن خود اسے اظہار کی آزادی نہ دی۔ دوسری طرف عورت کو جنسِ مخالف کا ہم مرتبہ قرار دینے اور کارزارِ حیات میں برابر کا شریک سمجھنے کے باوجود مرد نے اسے ہر زمانے میں کمزور مخلوق ہونے کا احساس دلایا اور اسے مرد کے اندرونِ خانہ جنسی امور سرانجام دینے پر مامور رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کا کامیاب ترین ہتھیار جنس ہے۔ اور اس ہتھیار کے دانش مندانہ استعمال سے وہ اپنی تمام کمزوریوں پر قابو پا لیتی ہے۔ اور جابر سے جابر مرد کو مطیع فرمان بنا کر اپنی خود مختاری تسلیم کروا لیتی ہے۔ تاہم یہ بات قابلِ غور ہے کہ جنس کے گرد اتنے الجھے ہوئے تانے بانے کئے گئے ہیں کہ عورت کا یہ کامیاب ترین ہتھیار بھی کند ہو کر رہ گیا۔ اور اپنا معاشرتی وقار قائم رکھنے اور اپنی پہچان کو تسلیم کروانے کے لئے وہ مرد کے آغوش میں قلعہ بند ہو کر بالآخر اس کی مستقل اجارہ داری کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئی۔
بیسویں صدی کے ربع سوم میں جب سائنس کی نت نئی ایجادات نے کائنات کی وسعتیں محدود کر دیں۔ تعلیم کے بین الاقوامی فروغ سے خیالات کا تصادم عمل میں آیا اور اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بدولت مختلف تہذیبوں اور معاشرتوں کا ادغام قلیل ترین عرصے میں عمل میں آنے لگا تو مغربی ممالک کے تہذیبی اثرات بھی براہ راست مشرقی ممالک کو متاثر کرنے لگے۔ چنانچہ وہ قلعہ بند مشرقی تصور بھی

---

[1] "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں"

[1] "وجودِ زن سے ہے تخلیقِ کائنات میں رنگ
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون" — اقبال

...ں عورت عرصے سے آسودگی کا سانس ... کی کاری ضرب کی زد میں آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورت اپنے اس تہذیبی منصب سے صدیوں سے برضا و رغبت ... تھا اب عدم اطمینانی کا اظہار کرنے لگی۔ درآنحالیکہ مرد اور عورت حیات میں جنسی اعضا اور ان کا عمل نصف نصف ادا کرتا ہے اور انسانی معاشرے کا تخلیقی فروغ ان دونوں کے حاصل ممکن ہی نہیں تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ جنسی سوال سے قطع نظر عورت نے ہر اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کی جو پہلے مرد کی عمل داری میں شامل تھا اور اس میں ادب کا میدان بھی شامل ہے۔

ادب جو زندگی کا آئینہ دار اور نمائندہ ہے ایک طویل عرصے تک مرد ہی کے تسلط میں رہا ہے۔ یہ اسی تسلط کا ہی نتیجہ ...اردو شاعری میں عورت بطور موضوع بہت کم اور بطور "شے" بہت زیادہ نظر آتی ہے، چنانچہ بیشتر شعرائے محبت کے ...بہار موضوع پر شعر کہنے کا وظیفہ ادا کیا تو عورت کے جذبات تک رسائی حاصل کرنے کے بجائے اس کے جسم اور ملبوس کی رعنائی ...خال کی آرائش ... رنگ، روغن اور جوبن کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہو گئے۔ ہر چند ان اشعار میں مرد ایک ہوس پرست اور ...ت پسند کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے اور سنجیدہ قاری پر اچھا اثر مرتب نہیں کرتا لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا سکتا کہ جنسی ہیجان کے مظہر ان اشعار میں قاری کو جنسی لذت اور خیالی مدت کا بہت سا سامان مل جاتا ہے اور وہ مرد جو عورت کے تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا وہ ایسے اشعار کے وسیلے سے استمنا بالخیال کے عمل سے گزرتا اور اعصابی گھٹن سے نجات حاصل ...یتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں جذبات کی جنسی انگیخت کے تمام ضروری عناصر موجود ہیں۔

ہاتھ میں انگیا کے چڑیا آ گئی
... طائر کو لائے دام میں — ناسخ

دوست کو لے کر بغل میں رات بھر سوتا ہوں میں
رشک ہے دشمن کو میرے طالعِ بیدار پر — آتش

بال ہیں بکھرے، بند ہیں ٹوٹے، کان میں ٹیڑھا بالا ہے
جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے — جرأت

اٹھ گئے ساقین جاناں سے جو شب کو پائینچے
اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا — امانت

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار
اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا — داغ

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا — حسرت

اور اب نئی شاعری کی طرف آئیے۔

جدید اردو نظم میں راشد کی آواز کو بغاوت کی ایک مثال قرار دیا جاتا ہے۔ راشد کی ابتدائی نظموں میں جو فرد بار بار اپنی صورت دکھاتا ہے اس میں بے پناہ عزم و حوصلہ اور کچھ کر گزرنے کی کسمساہٹ موجود ہے۔

آہنگ/۵۵

میں نالۂ شب گیر کی مانند اٹھوں گا　　فریاد اثر گیر کی مانند اٹھوں گا

میرا عزم آخری ہے یہ کہ میں　　کود جاؤں ساتویں منزل سے میں

قومی اداریے کا یہ "انسان" بھی عورت کو صرف اپنا معمول ہی سمجھتا ہے۔ یہ جواں حوصلہ انسان بھی جسم و روح کے آہنگ سے محرومی
کا اندازہ میں ماتم کناں ہے۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ اس کا ذوقِ تقدس محض فریبِ نظر ہے۔ اور وہ اپنی روح کی سرشاری
کے لیے کسی نئے جسم کی تلاش میں ہے۔

آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک　　آ۔ اسی خاک کو ہم جلوہ گہہ راز کریں
روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں　　آ۔ اسی لذتِ جاوید کا آغاز کریں

شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیمان ہو جائے　　———— "اتفاقات"
ہے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا　　حلاوتوں سے جوانی کو اپنے بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے　　———— "مکافات"

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے　　———— "انتقام"

اردو نظم کے ایک اور اہم شاعر میراجی کے ہاں عورت کا جنسی پہلو اس کی شاعری میں عظیم آدرش کی حیثیت رکھتا ہے۔
چنانچہ وہ اس بات کا برملا اظہار کرتا ہے کہ:

"ایک ہی بار مشرقی ہندوستان کی ایک عشرت انگیز عورت یعنی (میرا سین) کی طرف توجہ کی اور ہزیمت کا
منہ دیکھا یا۔"

اس ہزیمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نسوانی جسم کی محرومی نے میراجی کے فکر و خیال کی کایا کلپ کر دی۔ اور وہ ردعمل کے طور پر دنیا کی ہر بات کو

۵۔ جس کو تم جسم سمجھتے ہو، فقط جسم نہ تھا　　روح کی آگ دبی تھی، اسی پیکر میں کہیں　　پروین فنا سید

ے آئینے میں ہی دیکھنے لگا۔ میرا جی لکھتا ہے:

جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت و برکت سمجھتا ہوں۔ اور جنس کے گرد تہذیب و تمدن نے جو آلودگی جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے۔

جہ ہے کہ میرا جی کے ہاں ناجائز محبت اور ناجائز جنسی روابط سے زیادہ تعلق خاطر نظر آتا ہے۔ عورت اسے گوشت پوست کا ت نظر آتی ہے جو اسے جنسی لذت سے فیضیاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ میرا جی نے اپنی اس خواہش کے اظہار پر فنی ابہام کا کوئی ڈالا:—

آج رات
میرا دل چاہتا ہے
تو بھی میرے پاس آ
اور میں ساتھ تیرے…

میں تھکا ماندہ مسافر ہوں چلا جاؤں گا
اک گھڑی راہ میں تم مجھ کو بسر کرنے دو

یہاں ان ستونوں پہ ہاتھ رکھ دوں
یہ لہریں ہیں، بہی جاتی ہیں، اور مجھ کو بہاتی ہیں
یہ موج بادہ ہیں، ساغر کی خوابیدہ فضاؤں میں
اچانک جاگ اٹھتی ہے
حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے
تو اس کے ہونٹ متبسم ہوں۔ شاید قہقہہ اٹھ کر، جکڑ لے، اپنے ہاتھوں سے

یہ منظر ہر انسان کا دیا اور میٹھا جادو عورت کا

ے جادو کی یہ چند مثالیں میں نے اس لئے پیش کی ہیں تاکہ عورت کے بارے میں مرد شعرا کا جنسی رویہ کھل کر سامنے آ سکے۔

اردو نظم میں صنف نازک کا ورود لطیف اس لحاظ سے بے حد خوش آئند ہے کہ وہ جنسی جذبے جو پہلے صرف جسم مخالف لم سے ادا ہوتے تھے اب صنف نازک کے کومل لبوں سے بھی ادا ہونے لگے ہیں۔ یوں مشرق کی چھوئی موئی عورت نے پہلی دفعہ اظہار یات کی آزادی کا مظاہرہ کیا تو صاف نظر آنے لگا کہ جوار بھاٹا تو پوری شدت سے زیر سطح متلاطم تھا لیکن اس پر بند باندھنے جو کوشش کی جا رہی تھی وہ مصنوعی اور غیر فطری تھی۔ شاعری میں عورت کی یہ جذباتی آواز بظاہر تو نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ

شاعری کی ایک اہم صنف گیت ہیں جو بقول ڈاکٹر وزیر آغا مزاج کے اعتبار سے نسوانیت کے غنائی ادب کی ایک صورت ہے عورت
سے محبت کرنے کا عورتوں کا انداز بھی ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ گیت کے قابل قدر اثاثے میں بھی زیادہ اضافہ مرد
شعرا نے ہی کیا ہے۔ چنانچہ اس "آتشِ پنہاں" کو جو شکنتلا کے دل میں لاوے کی طرح ابل رہی تھی کالی داس کے قلم نے ہی حیات
جاوید عطا کی۔ اردو گیت کی روایت میں امانت لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری، میراجی،
قمر جمیل شرر، مقبول احمد لاری، آرزو لکھنوی، قیوم نظر، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، تاج سعید، ناصر شہزاد
اور مرزا فاضل کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ ان شعرا نے عورت کے جمالیاتی نرم، جذباتی تموج اور جنسی تجربہ کو عورت کی آنکھ
سے دیکھا اور پھر نسوانیت کے اس والہانہ پن کو گیت کی صورت دے دی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گیت اگرچہ خالصتاً نسوانی مزاج
رکھتا ہے لیکن اس صنفِ شاعری میں میرا بائی کا ظہور بہت کم ہوا ہے۔ اور اس کی ترقی اور فروغ میں بھی مرد شعرا کا زیادہ حصہ
نظر آتا ہے اور اب ہمارے زمانے میں صنفِ نازک نے اپنے خالص نسائی جذبات کا اظہار اردو نظم میں شروع کر دیا ہے تو میں اسے
کچھ کم اہم واقعہ شمار نہیں کرتا خصوصاً اس صورت میں جبکہ اس اظہار میں اس نے موضوع کی کسی قدغن کو قبول نہیں کیا اور محبت کے
نرم و نازک احساسات سے لے کر جنسی وصال کی بے پایاں خواہش، تشنگی اور سیرابی تک ہر موضوع پر یکساں آزادی، بے باکی اور
جرأت سے نظمیں تخلیق کی ہیں اور ان تمام رجحانات کو آشکار کر دیا ہے جو کبھی ان کے زیرِ بدن پرورش پاتے اور اظہار کی راہ نہ پا کر
اعصابی انتشار پیدا کرتے تھے۔ [1]

"دوسری جنس" کی مصنفہ سائمن ڈی بوائر کا قول ہے کہ:

"موجودہ معاشرے میں عورت کا مقام اس کا حیاتیاتی، نفسیاتی یا معاشرتی مفہوم متعین نہیں کرتا بلکہ ہمارے
تہذیبی رویے ہی اس کا مقام متعین کرتے ہیں۔"

یہ بات اس لحاظ سے درست نظر آتی ہے کہ مرد نے عورت کو ابتدائے آفرینش سے ہی "وفا کی دیوی" اور "حیا کی مورت" [2] کہہ کر جو
مقام بلند عطا کیا تھا وہ اگرچہ پہلے درجے کی خود غرضی اور نفس پرستی کا مظہر تھا لیکن عورت نے اس مقام افتخار کو برضا و رغبت قبول کیا
تو آج تک وہ اس سے نیچے اترنے پر آمادہ نہیں ہو سکی۔ چنانچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مرد پر غالب آ جانے کی شدید ترین
خواہش کے باوجود عورت نہ صرف اپنی ثانوی حیثیت پر مطمئن ہے بلکہ اس کی زندگی کا عظیم ترین مقصد پتی پریم کی تلاش ہی ہے۔ چنانچہ
مرد نے عورت کو بالعموم اپنا معمول بنانا چاہا تو صنفِ لطیف نے بھی اس سے کسی نمایاں بغاوت کا اظہار وسیع پیمانے نہیں کیا۔ بلکہ اپنی
زندگی کا معراج اسی بات کو تصور کیا کہ وہ اپنے حسن و جمال اور ناز و ادا سے مرد کو گھائل کر دے۔ چنانچہ اردو نظم میں بھی عورت
اپنی اولین صورت میں ایک ایسا دل ربا پیکر نظر آتی ہے جو اپنے رنگ، روپ اور رعنائی سے مرد کو اپنی طرف ملتفت کر رہی ہے۔

ہم نے دیکھی عجب اک ناری ... سانولا رنگ، جامنی ساری
اودی بندیا بھووں کے بیچ جڑی ... اور بھویں رات کی طرح کاری

---

[1] مدتوں یہ زباں میری اپنی زباں ... میرے اپنے دہن میں پرائی رہی
آج میری زباں مجھ کو واپس ملی ... میرے ہونٹوں پہ نغمے سلگنے لگے ... پروین فنا سید

[2] اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے

دیکھو لوگو یہ نار ہے کہ گھٹ رنگ اور روپ سے بھری ساری
چھلکے ہے کاش جس سے ملنے کو اسی نرمل دھنک کی اک دھاری

" مرقع " ——— فہمیدہ ریاض

ہماری آنکھوں میں دیکھ اپنے حسین فردا کا اک ہیولا
کہ جانِ دنیا ہے ، ستارا ٹھوڑی ہے ، جھیل آنکھیں ہیں ، پھول لب ہیں
حسین ہم ہیں ، حسین تو ہے ، حسین سب ہیں

——— عکس در عکس ———

من میں خوشبو
کان میں بالا
اور گلے میں
ایک اچھوتی زرد بسنتی مالا
نین میں اک جوت انوکھی
میں ہوں سجنی اپنے پیا کی

——— " ایک نظم " ——— صائم خیری

غور سے دیکھیے تو رنگ اور روپ سے بھری یہ ناری آرائشِ جمال سے مرد کے باصرہ کو برانگیختہ کرنے اور اس کے جبلہ جو اس پر چھا جانے کی کوشش لطیف میں مصروف نظر آتی ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ عورت اب صرف ایک مرد پر قانع نظر نہیں آتی بلکہ اس کا ایقان ہے کہ وہ کھلے پانیوں کی مخلوق ہے اور کھلے بازوؤں سے اسے محبت ہے ۔

وسعتوں سے سدا اس کا ناتا رہا
کھلے آسمانوں
کھلے پانیوں
اور کھلے بازوؤں سے ہمیشہ محبت رہی
ہوا ، آگ ، پانی ، کرن اور خوشبو
وہ سارے عناصر جو پھیلیں تو ہر دو جہاں اپنی بانہوں میں لے لیں
سدا اس کے ساتھی رہے تھے

——— " سمندر کی بیٹی " ——— پروین شاکر

دوسری طرف اس عورت نے اپنے لئے جو مرد منتخب کیا ہے وہ بھی وفا شعار یا عشق میں مر مٹنے والی شخصیت نہیں رکھتا بلکہ ہرجائی قسم کا بھنورہ صفت مرد ہے اور اس کے سراپا میں ایک رنگین مزاج عاشق کے نقوش زیادہ نمایاں ہیں ۔ اس مرد کی چند ایک نمائندہ

صویریں ہمیں فہمیدہ ریاض نے فراہم کی ہیں:

شبنمی گھاس سے بھیگا ہوا ملبوس اس کا
کہنہ شب خیزی سے آنکھوں میں گلابی ڈورے
ہاتھ میں پھول بنفشے کے لئے
بے نیازانہ چلا آتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ "وہ جو تم سا نہیں"

عشق آوارہ مزاج
وہ مسافر تو گیا
نہ کوئی اس کی مہک ہے کہ تو دے اس کا پتہ
۔۔۔۔۔۔ "عشق آوارہ مزاج"

وہ کشیدہ بدن، سبز خط، خوش قطع، نابرد نوجوان
۔۔۔۔۔۔ شہر والو سنو

آج کی عورت جنس کے تقاضوں کو ممنوع تصور نہیں کرتی بلکہ وہ جسم کے کورے برتن کی آواز پہچانتی ہے، اور برکھا کی آمد میں ذرا سی تاخیر بھی ہو جائے تو یہ کورا برتن خود بخود آواز دینے لگتا ہے۔ اردو نظم میں جذبات کی یہ فراوانی بیدار جسم کی پہلی صدا ان کر ظاہر ہوئی ہے

کیسی سوچ نے میرے دل میں چٹکی لی
کیسے دھیان سے میری آنکھیں بھر آئیں
سینے میں کیوں سناٹا سا چھایا ہے
یہ میرے سجدے میں تذبذب کیسا ہے
لب پہ دعائیں آکے بنیں کیوں بے معنی
جیسے میرے اندر ہو سنسان اجاڑ
کوئی تو آئے، کوئی تو آکے دستک دے
کیسے کھولوں اپنے دل کے بند کواڑ
۔۔۔۔۔۔ لے والی رت کون دمکاں ۔ فہمیدہ ریاض

بس ایک سنگین آرزوؤں کی پھول شاخوں کو کاٹتی ہے
بدن میں ان کی جڑیں جہاں بھی ہیں
ان زمینوں کو چیرتی ہے

آہنگ/۵۵

وہ روح جو شبنمی ہے، جلتی ہے
دل کے دوزخ کے شعلے اوڑھے ہوئے
کچھ اس طرح ناچتی ہے
کہ میری آہیں سلگتی پیاس کی بن کے آتی ہیں
اور سانسیں جلے ہوئے اور جیسے جھلسے ہوئے غنچے

"لے عدل جہاں گیر" ـــــ

برگشتہ جسم یاد کرتے ہیں
ساونوں کی پھوار کو شاید
آگ برسا رہا ہے پھر سورج

"سنہرا" ـــــ سیما خاں درگزنی ـ

متذکرہ بالا اقتباسات میں شعورِ جنس کی شوخ کرن ہی بیدار نظر نہیں آتی بلکہ ان میں عورت کے جسم کی وہ نادر پکار بھی موجود ہے جس نے اُردو نظم میں ہندی گیت کی نزاکت اور رعنائی پیدا کر دی ہے۔ اول الذکر دو نظموں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی فطرت کی تکمیل کے لئے "عدلِ جہاں" اور "والیِ کون و مکاں" کو آواز دی گئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم عشقیہ شاعری میں عورت کو تخریب کے سمندر میں اندھا دھند کود پڑنے کے باوجود موضوع نوی محترز رہنے کا جو شعور دیا گیا تھا اس کا کچھ شائبہ آج کی عورت کے مزاج میں بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں جذبات کی فراوانی تو قاری کو متاثر کرتی ہے، لیکن کسی فحش عریانی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آج کی عورت نے شرم و حیا کے روایتی پردوں کو اپنی ڈھال بنا رکھا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ عورت جنسی وصال کی شدت سے آرزو ہے۔ جنسی جذبہ اس کے باطن میں لاوے کی طرح ابل رہا ہے اور صنفِ نازک نے اس جذباتی گرمی کو فنی اشاروں اور مبہم کنایوں میں خوب صورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فنی اخفا کے باوجود یہ صاف نظر آتا ہے کہ سلگتا بدن جنسی حدت سے پگھل رہا ہے۔

یہ ماکہ نیتِ ہجر ہوں
مجھ میں ایسی آگ ہے
بن کے میرے ہوا سطے
وصل بھی فراق ہے
میری ایسی پیاس ہے

"میگھ دوت" ـــــ فہمیدہ ریاض ـ

بوڑھے برگد کے نیچے
تپتے جسم کی آنچ لئے

آنکھوں میں برسات لئے
مستقبل کی سوچ میں گم
تنہا لڑکی بیٹھی

_____ "خون کی دیواریں" _____ شفیق بانو۔

مرے اطراف تنہائی کی
یخ بستہ فضائیں سانس لیتی ہیں
مرے سینے میں وہ آتش فروزاں ہے
جو ہر زندہ حقیقت کا مقدر ہے

_____ "آتشِ سیال" _____ ساجدہ زیدی۔

اب کوئی ابر پارہ آئے، کہیں سایہ ہو
اے خداوندِ عظیم
بادِ تسکیں کہ نفس آگ بنا جاتا ہے
قطرۂ آب کہ جاں لب پہ چلی آئی ہے

_____ "پاکرہ" _____ فہمیدہ ریاض۔

اور وہ بھی ہوا کی طرح بھاگتی ہی گئی
اور پھر چند لمحوں میں دنیا نے دیکھا
سمندر کی بیٹی سمندر کی باہنوں میں تھی

_____ "سمندر کی بیٹی" _____ پروین شاکر۔

جنسی لحاظ سے اس برانگیختہ عورت نے اپنے اندر کی آنچ کا موازنہ خارج کی حرارت سے بھی کیا ہے اور اس کے لئے پیمانے کے طور پر تھرمامیٹر کی درجہ بندی کو بھی استعمال کیا ہے:

اتنی گرمی
میرا تن اندر سے بھٹی
باہر ۱۱۷ ـ ۱۲۰ کی گرمی

_____ "تم سے" _____ کشور ناہید۔

جنسی حدت کے موازنے کا ذکر آیا ہے تو یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ آج کی عورت نے زندگی کے ہر میدان میں مرد کو نیچا دکھانے کی ٹھان رکھی ہے۔ چنانچہ حسن کے مقابلوں میں عورت کے اعضا کی پیمائش پر بھی اس کے ہاں احتجاج کا شدید ترین

[illegible] ہوا کیا ہے۔ اور اس کے خلاف عورت سے موقع آواز بھی جنسی زبان میں [illegible]
[illegible] یہ کیفیت مندرجہ ذیل نظم میں پوری طرح موجود ہے۔

کو ٹھوں میں بھنور جو ہیں تو کیا ہے
سرشاں گی ہے جستجو کا جوہر
تھا پارۂ دل بھی زیر پستاں
لیکن میرا مول ہے جو اس [illegible]
گھبرا کر نہ یوں گریز پا ہو
پیمائش مری ختم ہو یا رب
اپنا بھی کوئی عضو ناپ

——— مقابلۂ حسن ——— [illegible]

ان نظموں میں عورت کے خون کی گرمی اعصاب سے متلاطم ہی نہیں بلکہ وہ جنسی عمل سے لذت کشید کرنے اور اس [illegible]
کی آرزومند بھی ہے۔ چنانچہ گیت میں عورت کا جو کومل جذبہ لطیف کوک بن کر ابھرا تھا وہ نظم میں جس کا ایک [illegible]
ظاہر ہوا ہے۔ اور اس میں بھوک کی کیفیت بھی خاصی نمایاں ہے۔ اردو نظم میں جنسی لذت پسندی کا اظہار [illegible]
فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید نے کیا ہے وہ کسی اور شاعرہ کے ہاں ابھی تک نظر نہیں آیا۔ فہمیدہ ریاض نے [illegible]
کو بالخصوص جنسی لذت کشید کرنے کے لئے ہی استعمال کیا ہے۔

مرے ذہن کے ریزے ریزے میں ایک آنکھ سی کھل گئی ہے
تم اپنی زباں میرے منہ میں رکھے جیسے پاتال سے میری جاں کھینچتے ہو

——— زبانوں کا رس ——— فہمیدہ ریاض

یہ کیسی لذت سے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیسا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیف کیا ہے کہ سانس رک رک کے آرہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسے شہوت بھرے اندھیرے اتر رہے ہیں
لہو کے گنبد میں کوئی در ہے کہ وا ہوا ہے
یہ چھوٹتی نبض، رکتی دھڑکن، یہ ہچکیاں سی

——— ابد ——— فہمیدہ ریاض

لاؤ اپنا ہاتھ لاؤ ذرا
چھو کے میرا بدن

جیسے صدیوں کی بے خواب [illegible] شبیہ
دھواں دھار جلتی چتاؤں [illegible] سفر کرتے خیمے اچھلتی ہوں

"بکشائے لب" ـــــ شفیق فاطمہ شعریٰ

جب ہم گہری نیند میں تھے
[illegible] آوازیں
[illegible] جیسے بادل برس پڑیں

"کھلی چھت پر سونے والے" سیما خان رکزئی

زرد لمحات کے ملبے میں دبے
جذبہ واحساس کے کچلے ہوئے جسم
اور تا حد نظر
کاوشِ پیہم کے کھنڈر

"ویرانہ" ـــــ زاہدہ زیدی

میں سراپا تشنگی ہوں
اور دور دور تک
بارشوں کی آہٹیں سُنیں

"ویسٹ لینڈ" ـــــ پروین شاکر

کل رات کہ چاند ڈھل رہا تھا
کوئی مرا دل مسل رہا تھا
سینے کے اُدھڑ رہے تھے ٹانکے
جیسے کوئی دل کو مل رہا تھا

"واہمے" ـــــ لیلیٰ نیازی

دیکھئے رہگزر میں
سراب بھی فرات بھی
فرات کے سبو میں تشنگی بھی ہے

"ناپشیماں" ـــــ ادا جعفری

نوحہ بلب ہے مرا ریشہ ریشہ بستر کی رگ رگ
ہر شکن جس کی رم خوردہ ہے آلودۂ غم
واقفِ شورشِ غم ——— "تریت" ——— عزیز ندیم پراچہ

———

خدائے برتر
مجھے عطا کر
محبتوں کی نئی عمارت کی مہرباں چھت
وہ نرم جذبے، وہ گرم باہیں
کہ جن کے سائے تلے میں بیٹھوں
تو کہہ سکوں ان سے چپکے چپکے
میں منتشر ہوں
مجھے سنبھالو ——— "دعا" ——— شائستہ حبیب

———

ہر موڑ پہ اب میرا
احساس سلگتا ہے
آنکھوں سے ٹپکتا ہے جب درد پگھلتا ہے
جل جاتی ہیں آنکھوں میں
پھر درد کی قندیلیں
ٹکراتی ہیں پیڑوں سے بے چین ابابیلیں ——— "لوٹ کے گھر آنا" ——— ارشاد وارثی

———

چپ بہت گنجان ہے
نیلی خلائیں سانس لیتی ہیں
مرے آنسو پڑھے جاتے ہیں جذبے ناپے جاتے ہیں
مرے دکھ کو مگر تولا نہیں جاتا ——— "پشیماں" ——— نسرین انجم بھٹی

معاشرتی پابندیوں، سماجی حرمتوں اور تہذیب کی روایتی جکڑبندیوں کی وجہ سے جلتی آنکھوں اور نیلی خلاؤں میں سانس لیتی عورت کو جنسی آسودگی حاصل کرنے کے فطری وسائل شاید میسر نہیں۔ چنانچہ نرم جذبوں اور گرم باہوں کے بے سود انتظار سے اکتا کر یہ عورت خود آسودگی پر بھی قائل ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر "ایک نظم" ملاحظہ ہو جس میں یہ کیفیت نمایاں ہے۔

میں نے جب سے اپنے اوپر

ایک اور میں کو اوڑھ لیا ہے
آہنگ/۵۵

تب سے میں نے
ایسے سپنے نہیں دیکھے
خوشبو کی آواز سُنی، نہ سرد ہوا کا ذائقہ چکھا
نہ کوئی دکھ دھندا پھسلتے پھسلتے
کئی جگہ سے ہاتھ کٹے
اور کئی طرح سے جی اُلجھا ہے ——— ایک نظم ——— نسرین انجم بھٹی۔

[illegible] نے جذبے کو غیر فطری [illegible] کر کے پر قدرے پشیمانی کا احساس جھلکتا ہے۔ اس کے برعکس فہمیدہ [illegible] تجربے سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور وہ اس حربے کو اس وقت اختیار کرتی ہے جب [illegible] مایوس ہو جاتی ہے؛

اب طمع کسی [illegible] ہوں ہو راغب
انسانوں کو برت چکی ہوں
اک طفلک جنجو ہوں شاید
میں اپنے بدن سے کھیلتی ہوں

تشنگی کو سیراب کرنے کا ایک رجحان نظم "میرزا صاحباں" میں ظاہر ہوا ہے۔ اس نظم کے باطن میں وہ بیدار عورت موجود ہے فطرت کی آواز پر سماج کے بندھنوں کو توڑنے اور اپنے سیکھ دیوتا کے ساتھ چل پڑنے کی جرأت رکھتی ہے اس عورت کے پاؤں معاشرتی بیڑیوں میں بندھے ہوئے ہیں اور وہ تاسف بھرے انداز میں پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھ رہی ہے لیکن وہ فطرت کی ہر آواز پر کان بھی دھرتی ہے۔ اس کی ہر سرگوشی کو پہچانتی ہے۔ لہٰذا اس کے قدم معاشرے کی دہلیز بھی پار کر چکے ہیں۔ اردو نظم میں اس رجحان کی مثالیں نایاب میں تو کمیاب ضرور ہیں۔

اب تک کی بحث سے میں نے یہ حقیقت اجمالی طور پر پیش طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو شاعری میں جنسی جذبات کے اظہار لئے صنف نازک نے والہانہ سرگرمی کا اظہار کیا ہے اور اس سے فطرت ایک بوقلموں زاویہ اپنے اصلی اور خوبصورت رنگوں میں ظاہر ہونے لگا ہے۔ شبہ صنف نازک کے قلم نے اس نامعلوم جزیرے کی دریافت کو حقیقت نگاری کا نیا زاویہ عطا کیا ہے۔ تاہم یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اردو کی بہت سی شاعرات نے جنس کو جسمانی ضرورت کے طور پر تو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے لیکن وہ اس جذبے کی داخلی گہرائی اور روحانی رفعت رسائی حاصل نہیں کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر خواتین اور بالخصوص فہمیدہ ریاض کے ہاں جنس کا اظہار نسبتاً خام اور ناپختہ اظہار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اور یہ روحانی بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے حیوانی جذبے کو زیادہ اُبھارتا ہے۔ اگر مقصد حیوانی جذبے کو برانگیختہ کرنا ہی ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ صنف نازک کی یہ کاوش بھی مرد کو اپنی طرف راغب کرنے کی ہی کاوش ہے اور اس میں عورت کی کمند افگنی کا پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

———— ————

آزاد گلاٹی

○

[illegible] بوں میں بھٹکتے رہیے
[illegible] کی لکیروں سے اُلجھتے رہیے
[illegible] سے بھی لے جائے گا
[illegible] کی طرح اپنے سے نکلتے رہیے
[illegible] جائیں تو عکس اپنے ملیں گے ان میں
[illegible] نکلے ہیں تو اب شیشوں پہ چلتے رہیے
[illegible] فاش لبوں پر ہو تو بہتر ہے یہی
[illegible] اس کی بھٹی میں پگھلتے رہیے
خود کو ہی داؤ پہ رکھئے شبِ تنہائی میں
اور لمحات کے پتّوں سے بہلتے رہیے
ابر کے سائے تو مٹتے ہیں ہوا کے ہاتھوں
دھوپ ہی اپنا مقدر ہے سو جلتے رہیے
کس کو فرصت ہے کہ آزاد سُنے بات کوئی
خود کلامی ہی کے جوہر سے نکھرتے رہیے

○

ایک ہنگامہ بپا ہے مجھ [میں]
کوئی تو مجھ سے بڑا ہے مجھ میں
ہائے وہ شخص جو اب بھول گیا
دل کی مانند رہا ہے مجھ میں
انکساری مرا شیوہ ہے، مگر
اک ذرا زعمِ انا ہے مجھ میں
وحشتِ ظلمات میں ہمراہ مرے
کوئی تو ہے جو جلا ہے مجھ میں
مجھ سے وہ کیسے بڑا ہے کہئے
جب خدا میرا چھپا ہے مجھ میں
وہی لمحے تو غزل چھیڑتے ہیں
جن کی گم گشتہ صدا ہے مجھ میں
میں نہیں ہوں تو مرا کون ہے یہ
اتنے جنوں جو رہا ہے مجھ میں

قمر اعظم ہاشمی

فنکار اور اسٹیبلشمنٹ

فن کار کے لئے اپنے ضمیر کی آزادی ہی سب سے اہم فنی معیار ہے۔ اسی لئے آرٹ انسانیت کے ضمیر سے عبارت ہے۔ تخلیقی مرحلوں میں فن کار مبہم اور مردہ تعمیمات کو مسترد کرتا ہے اور اپنی ذات کے مخصوص ردعمل کو شعری تجربے کی بنیاد بناتا ہے۔ جب بھی تخلیقی عمل کے دوران فن کار کو چونکہ اظہار کی مکمل آزادی حاصل رہی ہے اس لئے ہر دور میں اہم فن کاروں کے اسالیب مختلف اور منفرد رہے ہیں۔ "مخصوص ردعمل" کی نوعیت، کیفیت اور قوت ہی دراصل اس کی انفرادیت کی پہچان مقرر کرتی ہے اور اسلوب کی شناخت کے مختص نشانات اجاگر کرتی ہے۔ فن کار کی ذات تخلیقی مرحلوں سے اپنا رشتہ توڑ لے تو اس کی دردمندانہ بصیرت اور جمالیاتی حس کا دو طرفہ امتزاج گم ہو جائے گا۔ جہاں سے آرٹ کی تخلیق کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ انقطاعِ شخصیت حقیقتاً تخلیقی الجھنوں سے علیحدگی کا اعلان ہے۔ اور ایسی صورت میں اعلیٰ ادب اور ادبی پائیدار قدروں کے فروغ کی توقع فضول ہوگی۔ مگر ہمیں یہ سچائی بھی یاد رکھنی ہے کہ فرد، ماورائے فرد بھی موجود ہے۔ فرد کے امتیازات اپنی جداگانہ اہمیت ضرور رکھتے ہیں لیکن اجتماعی قدروں سے بھی اس کا واسطہ رہتا ہے بلکہ فرد کی جداگانہ قدروں کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اپنے اجتماع کا جزو لاینفک ہے اور اجتماع سے فرد کے رشتے ہی تخلیق ادب کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ کوئی واحد فرد ماورائے انفرادیت موضوعات سے بالکل بے تعلق ہو جائے اور صرف اپنی فردیت میں محصور رہے تو اس فرد واحد کی زندگی غیر معاشرتی تصور کی جائے گی۔ اور معاشرتی زندگی کا تعلق قومی زندگی اور قومی زندگی کا تعلق بین الاقوامی زندگی سے ہے اس لئے آخرکار اجتماعی زندگی کے تمام رشتوں سے یکسٹ کر رہ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی غیر معاشرتی ذات میں کائنات کی جستجو بے معنیٰ ہوگی۔ ادب میں فرد کی مکمل معاشرتی زندگی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں ذات اور کائنات سے جداگانہ برتاؤ کو زندگی کے بنیادی عمل سے انحراف سمجھا جاتا ہے۔ فن کار مکمل زندگی کے خفیہ روزن وا کرنے میں اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب کائنات اس کی ذات میں اتر چکی ہو اور وہ اپنی ذات کے مرکز سے ہر لمحہ کائنات میں بکھر رہا ہو۔

چنانچہ فن کار اور اسٹیبلشمنٹ کو ایک دوسرے سے بالکل غیر متعلق نہیں تصور کیا جا سکتا۔ ایسی لاتعلقی خود اس کی اعلیٰ فن کاری کے حق میں مفید نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ فن کاروں کے دو حلقے بن جائیں۔ ایک حلقہ وہ جو اسٹیبلشمنٹ کا ہمنوا اور معاون ہو اور دوسرا وہ جو اس کے نظریات اور اصولوں کی مخالفت کرے۔ ایک کا مثبت تعلق ہوگا، دوسرے کا تعلق منفی۔

اسٹیبلشمنٹ سے مراد ہے موجود معاشرتی ڈھانچہ۔
درست ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کا مرکز حکومت ہے مگر ارباب
اقتدار میں غیر سرکاری افراد اور ادارے بھی شامل ہیں۔ مخالف
سیاسی جماعتیں بھی اجزائے نظام جاریہ ہیں۔ ریاستی مجالس
قانون ساز، پارلیامنٹ، یونیورسٹیاں، اعلیٰ عدالتی ایوان
سب موجودہ معاشرتی ڈھانچے میں شامل ہیں۔ بین الاقوامی
تناظر میں ادارہ اقوام متحدہ، دولت مشترکہ، افریقی اتحاد
کا کونسل۔ لیگ آف عرب اسٹیٹس۔ اسلامی ملکوں کا بلاک
غیر جانب دار ملکوں کا محاذ اور طرح طرح کے متضاد مقاصد
و نظریات کے حامل ادارے ہیں جن پر موجودہ عالمی نظام
قائم ہے۔ ایک سنجیدہ اور مخلص فن کار کے لئے کسی ایک نقطۂ
نظر، کسی ایک طرز عمل، کسی ایک سیاسی اصول اور کسی ایک
مکتبۂ فکر کا تا عمر وفادار رہنا اس لئے مشکل ہے کہ وہ اپنے
ضمیر کی آواز کو نہیں کچل سکتا۔ یہ اسٹیبلشمنٹ جو تضادات اور
اختلافات کا مجموعہ ہے اپنی پالیسیوں پر عمل درآمد اور اپنے
مفادات کے تحفظ کے لئے ایسے راستے بھی اختیار کر سکتا ہے اور
کرتا ہے جو فن کار کی نگاہ میں غیر انسانی یا انسانیت کے منافی
ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فن کار کا اخلاص، اسٹیبلشمنٹ
کی بخشی ہوئی نعمتوں کے عوض اپنے ضمیر کی فروخت پر کبھی آمادہ
نہ ہوگا۔ انسانی ضمیر کے آگے جواب دہی کا احساس فن کار کی
خارجی وابستگیوں کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ جنھیں اپنی منزل انسانیت
عزیز ہے وہ چھوٹی بڑی تمام مصلحتوں کو تج کر اپنی آواز کی آبرو
کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ فن کار اسٹیبلشمنٹ کا وفادار
پرزہ بن کر اپنی تخلیقی ندرت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اسٹیبلشمنٹ
کے بنائے ہوئے پیمانوں میں سوچنا اور اظہار کے لئے اس کے
منتخب الفاظ کی فہرست کے استعمال ہی پر قناعت کر لینا
دوسرے درجہ کے چھوٹے قد فن کاروں کا کام ہے۔ خارجی سطح پر
اسٹیبلشمنٹ کے مرکز یعنی حکومت یا کسی سیاسی پارٹی سے

فن کار کی وابستگی ممکن ہے مگر ہر حال میں ایک مخلص اور سچے
فن کار کا بنیادی کمٹمنٹ انسانیت کے مسائل ہی سے ہوتا ہے
کسی مخصوص سیاسی، معاشرتی یا انتظامی کیمپ سے وابستگی
نے اگر فن کار کی تخلیقی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں رخنے ڈالنے
کی کوشش کی تو بس نہیں پر اس کی آرزوئے کشف ذات احتجاج
آمیز بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ احتجاج کی اس زبان میں انقلاب
پسندی کی آہٹیں شامل ہونے لگتی ہیں۔

اسٹیبلشمنٹ کے مرکز یعنی حکومت کے وفادار فن کار
اپنے ضمیر کے مطالبوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ انسانی مفادات
سے زیادہ ذاتی مفادات انہیں عزیز ہوتے ہیں۔ مصلحت کوشی
اور ملمع پوشی سے وہ الگ نہیں ہو پاتے۔ سچی بات کہنے کی ہمت
اس کے اندر نہیں ہوتی۔ اخلاص و ایثار کے جذبے اقتدار کی
چکی میں پیس کر رہ جاتے ہیں۔ اعزاز پسندی اور رجاہ پسندی کا میلان
غالب ہو جاتا ہے اور ایسے فن کار ایک طرح کی ابن الوقتی کے
شکار ہو جاتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ سے وابستہ وہ فن کار جو
صورت حال سے مطمئن ہیں شکست احساس کی ایک کیفیت سے
دوچار ہوتے ہیں اور یہی احساس انھیں حالات سے مفاہمت
کی ترغیب دیتا ہے۔ چونکہ معاشرہ ہر لمحہ تغیر پذیر ہے اور اس کی
حیاتی لہریں نشیب و فراز سے گزرتی رہتی ہیں اس لئے فطری طور
پر معاشرتی نظام کو انسانیت کے نقطۂ نظر سے ہر لمحہ بہتر سے بہتر
بنانے کی کاوشیں ضروری ہیں۔ سیاسی لیڈروں سے ایسی کاوشوں
کی توقع فضول ہے۔ کیونکہ سماجی تبدیلیوں کے سلسلہ میں غور و
فکر کی نہ انھیں مہلت ہے اور نہ سہولت۔ فن کار عصری
زندگی کے مسائل سے چونکہ براہ راست متعلق بھی ہوتا ہے اور
موجودہ سماجی نقائص اور اوصاف پر غور و فکر بھی کرتا ہے
اس لئے انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر مناسب اور بہتر
تبدیلیوں کی خواہش اس کے اندر موجزن ہوتی ہے۔ تبدیلیوں
کی یہ خواہش ایسے ہی فن کاروں کی تخلیقات میں بھرپور تاثر

قوت کے ساتھ ابھرتی ہے جو اسٹیبلشمنٹ سے وابستہ
تے ہوئے بھی صورت حال سے غیر مطمئن ہیں اور عوامی احول
میں پیدا ہونے والی بے چینیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ سماجی حقائق
ن کار کی نظر ہو اور عصری زندگی کے اضطراب و تنہاب
، اس کی ذات گزر رہی ہو تو اس کا دیکھا ہوا شعور ہر ایک
ں اُسے نئے امکانات کے لئے متجسس رکھتا ہے اور یہی تخلیقی
تجو اس کے انفرادی امتیاز کا سبب بن جاتی ہے۔ فن کار
ر اسٹیبلشمنٹ کا آلۂ کار بن جائے تو یہ تخلیقی جستجو دم توڑ دیتی
ہے۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کے اصولوں، نظریوں اور پالیسیوں
کی تبلیغ میں منہمک ہو کر سماجی حقائق اور عصری تقاضوں سے
منہ موڑ لیتا ہے اور پھر اپنے ضمیر پر بھی اس کا قابو باقی نہیں رہتا۔
اس کی وہ آزادی ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے فنی
کاریوں کے اندر بھی تخلیقی رو جگانے اور ساز احساس کو چھیڑنے
کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ سے فن کار کا وفادارانہ
تعلق قائم ہوتے ہی انسانی تعلقات اور سماجی رشتوں کی کڑیاں
ٹوٹنے لگتی ہیں۔ حالانکہ دراصل یہی انسانی تعلقات اور سماجی
رشتے فن کار کو زندگی کی اصل تہ میں پوشیدہ المناکی کی آگہی
بخشتے ہیں اور انہیں کی وجہ سے افکار و اقدار کے انتشار کے
دور میں بھی فن کار کی تخلیقی بصیرت سرگرم عمل رہتی ہے۔ فن کار
اسٹیبلشمنٹ سے منسلک بھی ہو اور سماجی تعلقات بھی قائم
رکھے تو ایسی صورت میں اس کی نگاہ تخلیق آزادانہ اور بیباکانہ افق
تا افق دیکھتی ہے۔ وہ تنہا اسٹیبلشمنٹ کی خامیوں کو دور تو
نہیں کر سکتا مگر اصلاح کے لئے ایک فضا تیار کر دیتا ہے، اس کی
تخلیقیں عصری اور معاشرتی حقائق کی روشنی میں رنگ، نسل،
نظریہ اور جماعت کے پیدا کردہ تضادات اور ان کی لعنتوں کو
مسترد کرتی ہیں اور دکھ کھلے انسانوں کے مقابلے میں بھرپور اور
مکمل انسانوں کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتی ہیں۔
مختصر یہ کہ فن کار انفرادی صداقتوں سے بھی متعلق ہے اور
سماجی حقائق سے بھی اس کا رابطہ ہے۔ اس کے انفرادی اور
اجتماعی شعور کو کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا اسی لئے اس کی
فنی دیانتداری اور اجتماعی ذمہ داری میں کہیں پر ٹکراؤ نہیں ہو
زندگی صرف سیاست، صرف معیشت، صرف ظلم و جبر کا نام نہیں۔
زندگی ان سب سے جامع اور مکمل حقیقت ہے جو متواتر زندہ
ہے اور ہر لمحہ اپنے دامِ تغیرات اور حلقۂ اثرات کو وسیع کرتی
چلی رہی ہے۔ فن کار اگر اپنی مکمل شخصیت سے کنارہ کش ہو جائے
خانوں اور پیمانوں میں بٹ کر اس مسلسل اور رواں قوت کو
پکڑنا اور اس کو ظاہر کرنا چاہے تو ناکامیوں کی گرفت سے اس
کی نجات مشکل ہو جائے۔ ——

○

شاھد جمیل

سوچتا ہوں کہ اسے کون سا منظر کہتا
ریت کا جسم تھا، کیا ہاتھ لگا کر کہتا
یوں تو قطرہ ہی سمجھتا رہا تا عمر، مگر
جان لیتا تو بہرحال سمندر کہتا
پھر بچا لیتا یوں الزام دفا سے مجھکو
پھر ترے شہر میں کوئی مجھے پتھر کہتا
یہ بھی اچھا ہی ہوا، مٹھی کھلی ہے میری
ورنہ ہر شخص مجھے اپنا مقدر کہتا
حکم کی بات تھی بیٹھا ہوں بغل میں ورنہ
مر رہا ہوتا، جو آوارہ قلندر کہتا
حالانکہ دونوں ہی اُکتائے ہوئے تھے لیکن
وہ روادار نہ تھا میں اسے کیونکر کہتا
قرب کی دھوپ سے بیزار سبھی تھے شاہد
کون کس کو نزدیک بُلا کر کہتا

فخر رضوی

○

تیری آنکھوں میں جھلکتا ہے مجھے پیار بہت
دیکھ ہو جاؤں کہیں میں نہ گنہگار بہت

صبح ہوتے ہی اسی گاؤں میں جانا ہے مجھے
میرے بچپن کے جہاں رہتے ہیں دلدار بہت

بھول جائے جو تمہیں کوئی تو شکوہ نہ کرو
یاد اپنے کو بھی اب رکھنا ہے دشوار بہت

ٹوٹنا جس کا مقدر ہے وہ تو ٹوٹے گا
ہلکا جھونکا ہی سہی اس کے لئے وار بہت

ساتھ دے گا نہ کوئی خود پہ اکڑنے والو
سست اتنا نہ چلو وقت کی رفتار بہت

حسین الحق

○

دل بہلتا ہے ذرا پھر سے تماشا کیجئے
پھر اسی طرح بھری بزم میں رسوا کیجئے

جاگتی آنکھوں کا یہ کرب کہاں لے جاؤں
اپنی دزدیدہ نگاہی کو نہ رسوا کیجئے

روندتے جاتے ہیں کیوں آپ لکیر شب گوں
حرج ہی کیا ہے اگر خواب دکھایا کیجئے

پھیل کر ٹوٹ گیا خواب تمنا کا سکوت
بے صدا لفظ ہیں آنکھوں میں تو گونجا کیجئے

اپنے خیمے کو سنبھالیں کہ قنائیں تو ٹیں!
دیکھئے آپ نہ اب اور تماشا کیجئے

منظر ہاشمی

○

جذبۂ شوق کو اعجاز بیانی دے دو
بند پانی کے ذخیرے کو روانی دے دو

سالہا سال کی لکھی ہوئی تحریروں میں
اس سے پہلے کہ مٹے کچھ تو معانی دے دو

بھول جائیں نہ کہیں لوگ وفا کے قصے!
آؤ اس دور کو اک تازہ کہانی دے دو

ریگِ ساحل پہ ہر اک موج نے یہ لکھا ہے
ہم بھی پیاسے ہیں کوئی ہم کو بھی پانی دے دو

سُرخ پھولوں کی قطاریں ہوں قدم تا بقدم
کچھ تو اس راہ کو تم اپنی نشانی دے دو

جلتے سورج کے تلے بیت گیا سارا دن
اب مسافر کو کوئی شام سہانی دے دو

...عسکری

○

...بُز زادر ستم رسیدہ لوگ
...اوڑھے کے ملبوس صد دریدہ لوگ
...ہیں رواں بحرِ ننگِ داماں
...وقت میں ڈوبے ہیں آبدیدہ لوگ
...غم دوراں کا مرثیہ کبھی نصیبِ
...اپنے ہی اوصاف کا قصیدہ لوگ
...موسمِ جور و جفا میں تیغ بکف
...بادِ مخالف سے سرکشیدہ لوگ
...گنبدِ بے گوش کو ہر ایک لمحہ
...ہے ہیں عبث حرف ناشنیدہ لوگ
...رسیدہ تمناؤں کے جزیروں پر
...کرتے ہیں گل ہائے نو دمیدہ لوگ
...راہ گزارِ جنوں سے ہم جعفر
...کی طرح بدلتے رہے عقیدہ لوگ

سرور عثمانی

○

نت نئے پیکر بدل کر وضع داری کیجئے
دوستوں سے دشمنی دشمن سے یاری کیجئے
خواب سارے سو گئے لوہے کی چادر تان کر
اپنے بستر پر پڑے اختر شماری کیجئے
کس لئے ہو وحشتِ دل میں خواہشوں کا ازدہام
آنسوؤں سے کشتِ غم کی آبیاری کیجئے
پتھروں کے بھیس میں ابھرے گی صبحِ ناتواں
شب کی تاریکی سے پیہم غمگساری کیجئے
جگنوؤں کی روشنی ہے جھاڑیوں میں خیمہ زن
ذہن و دل کے جنگلوں میں شعلہ باری کیجئے
مچھلیوں کے جسم میں ہے موتیوں کا اک ہجوم
اک نئے انداز سے پھر وضع داری کیجئے
اپنی ہی آواز کے سائے میں پلتے ہیں سبھی
ہیپیوں کے شہر کی مردم شماری کیجئے
ہو کسی بوڑھے مصور کی پریشانی تمام
خطوطِ رنگیں کی سرور دستکاری کیجئے

م۔ اخلاق

○

مرے نصیب پہ کب اختیار ہے یارو
اک آنکھ میرے لئے اشکبار ہے یارو
گئے وہ دن کہ میسر تھا جلوۂ رخسار
فضا میں تلخیٔ غم کا غبار ہے یارو
نہیں کہ شامتِ اعمال کی سزا نہ ملے
جلو میں گردشِ لیل و نہار ہے یارو
وہ جس کی گود میں کل ماہتاب اترا تھا
وہ رات آج بہت سوگوار ہے یارو
خدا نہ کردہ کہیں شہر یارِ وقت سُنے
مسرتوں سے کوئی ہمکنار ہے یارو
نہ شوق عرضِ تمنا نہ شرحِ غم کا جنوں
بُجھا ہے دل تو ہر اک شے سے عار ہے یارو
وہ شخص جس کے لئے یوں چمن اداس رہا ہے
امیرِ قافلۂ نوبہار ہے یارو
وہی غزل جسے اخلاق کی غزل کہئے
مزاجِ دہر کی آئینہ دار ہے یارو

مجید جمال

تنقید میں آزاد تلازمۂ خیال کی ایک مثال نئے کلاسیک پر تبصرہ ”

تبصرہ نگاری جب اپنی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے تو تنقید کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ مبصر پر بھی وہ تمام ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں جنھیں پورا کرنا نقاد کے لئے ناگزیر ہے۔

آہنگ میں نئے کلاسیک پر شائع شدہ تبصرہ اس بات کا تو احساس دلاتا ہے کہ مبصر عبدالمغنی صاحب نے اپنے کام پر بڑی محنت صرف کی ہے۔ لیکن متن اس بات کی غمازی کرتا نظر آتا ہے کہ مبصر تنقید کی پہلی شرط بے تعصبی، پوری نہیں کر پایا زیر بحث تبصرہ پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ ان کے ذہن میں کچھ بنے بنائے فارمولے اور طے شدہ نتائج پہلے ہی سے موجود تھے جنھیں کتاب میں نہ پا کر وہ جھلا اٹھے اسی طرح شاید انھوں نے نئی شاعری، نئے افسانے اور تنقید سے متعلق پہلے ہی سے کچھ Label بنا رکھے ہیں جنھیں ہر قیمت پر موقع محل دیکھے بغیر کہیں نہ کہیں چسپاں کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ رویہ نا بالغ ضد تو کہلا سکتا ہے تنقید نہیں۔ موصوف آخری فیصلوں اور قطعیت کے اتنے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں کہ کسی فن پارے میں پوشیدہ امکانات پر غور کرنے اور تنقید میں اپنی رائے اور نقطۂ نظر کے علاوہ کچھ دیکھنے اور سننے کو کفر گردانتے ہیں اُن کا پورا تبصرہ پڑھ جائیے۔ پہلا تاثر یہی قائم ہو گا کہ وہ ادب بلکہ موجودہ سیاست و سماجی صورت حال پر بھی آخری اٹل اور دو ٹوک فیصلے صادر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان کی پسند یا ناپسند ادبی رجحانات و معیارات کی بجائے قطعی نجی اور ذاتی ہے۔ ویسے کسی بھی قاری کو کوئی فن پارہ پسند یا ناپسند کرنے کی مکمل آزادی ہے اور وہ اپنی پسند کی اساس محض اپنی ذات و جذبات کو بھی بنا سکتا ہے لیکن جب وہی قاری نقاد کی حیثیت سے سامنے آتا ہے تو اُسے اپنے ذاتی تعصبات و تاثرات سے بلند ہو کر ادبی معیار اور ادب کی بدلتی ہوئی فضا کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اگر مغنی صاحب کو ایک عام قاری کی حیثیت سے جوگندر پال کے افسانے پسند نہیں ہیں یا وہ شمس مظفر پوری کو کرشن چندر کے پائے کا افسانہ نگار سمجھتے ہیں تو اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ آج بھی کئی ایسے لوگ مل جائیں گے جو جاسوسی ناولوں کو فن ناول نویسی کی معراج سمجھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آخر الذکر حضرات اپنی ذاتی پسند کو ادبی معیار منوانے پر اصرار نہیں کرتے جبکہ مغنی صاحب مذکورہ بالا قسم کے خیالات کو تنقیدی نقطۂ نظر ماننے اور منوانے پر مصر ہیں جب تنقید کی بات آ ہی گئی ہے تو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ تنقید میں محض ذاتی پسند کچھ نہیں ہوتی۔ مغنی صاحب کو یہ اطلاع فراہم کرنے کی ذمہ داری میں نے یا کسی اور نے قبول نہیں کی ہے کہ آج کا افسانہ A Boy met a girl کی حدود سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ شاید انھیں یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ انسان

یا دو دنیاؤں میں بیک وقت جیتا ہے ۔ ایک خارجی
اور دوسری وہ دنیا جو اس کے ذہن [illegible] میں آباد ہے
طرح خارجی دنیا کی عکاسی بن سکتی ہے [illegible] طرح اندرونی
باطن کو گرفت میں لینے کا نام بھی فن ہے اور شاید زیادہ
ل فن ہے ۔ اسی لئے جو فن کار [illegible] کے ذہن پر اور کہ واقعے
زرا متناز وغیرہ ([illegible]) بن جاتے
اور سیدھی سادھی باتیں [illegible] کر خوش ہونے [illegible]
ثابت ہوتے ہیں ۔ جوگندر پال اور [illegible] صاحب کا [illegible]
کچھ اسی قسم کا ہے ۔ [illegible] جوگندر پال
افسانہ نگاروں کی صف سے خارج نہیں کر سکتے تھے ۔

مغنی صاحب نے کتاب کی کچھ فروگذاشتوں کی طرف
اشارہ کیا ہے ۔ افسانے کے ضمن میں لکھتے ہیں :

" دوسری قابل ذکر فروگذاشتیں یہ ہیں ذکی
انور ، الیاس احمد گدی "

اب تبصرہ نگار کی فروگذاشت پر غور کیجئے ۔ صرف ذکی انور اور
الیاس احمد گدی ہی کیوں ؟ مغنی صاحب کے ذہن میں شفیع [illegible]
عوض سعید ، ہرچرن چاولہ وغیرہ کے نام کیوں نہیں آئے ۔ کہیں
ان لوگوں کو قابل مبصر نے دور رس [illegible] کا DISADVENTAGE
تو نہیں ؟

مغنی صاحب ہر انتخاب میں اس قسم کی " فروگذاشتیں "
ہونی ضروری ہیں کیونکہ کسی ایک انتخاب پر آج تک تمام پڑھنے
والے متفق نہیں ہو پائے ہیں ۔ مبصر یا نقاد کیا ہونا چاہئے
کہ حکم سے نکل کر جو ہے وہ کیسا ہے پر اظہار خیال کرے تو میرے
رائے میں تنقید کا حق زیادہ اچھی طرح ادا کر سکتا ہے ۔
لیکن اس رویئے کو اپنانے کے لئے بہت سارے ذہنی
حصار توڑنے پڑتے ہیں اور یہی کام کم از کم زیر بحث مبصر کے بس
کا نظر نہیں آتا ہے ۔ ورنہ وہ اس قسم کی عمومی آراء سے
دامن بچاتے جو ان کے تبصرے میں جگہ جگہ موجود ہیں ۔ ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ مغنی صاحب نے پہلے ہی سے طے کر لیا تھا کہ
کتاب پر ایک مخصوص قسم کی رائے ظاہر کریں گے اور شاید یہ بھی
طے تھا کہ کتاب کے مختلف ذیلی عنوانات کو فن کاروں کی اہمیت
و فن کاری سے تعبیر کریں گے ۔ شاید انھیں یہ غلط فہمی ہوئی
کہ عنوانات کی ترتیب میں بھی اسی بات کا خیال رکھا گیا ہے
حالانکہ کھلے ذہن سے یہ کتاب پڑھنے والا ہر شخص اس نتیجے پر
پہنچ سکتا ہے کہ یہ عنوانات لکھنے والوں کی برتری یا کمتری کے
پیش نظر قائم نہیں کئے گئے بلکہ اُن کے مزاج اور فنی رویہ کو
ملحوظ رکھتے ہوئے یہ اقدام کیا گیا ہے ۔ اب اگر وہ " پس منظر " کو
" عروج " اور " اعتبار " کو زوال کے خانوں میں تقسیم کریں تو اس کا
کوئی علاج نہیں ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ مغنی صاحب نے پوری کتاب پڑھنے
کی زحمت اُٹھائی البتہ اُن کا تبصرہ اس شک میں مبتلا کرتا ہے
کہ پڑھنے کے بعد کے عمل میں (یعنی پڑھے ہوئے کو سمجھنا اور اُس
سے کچھ نتائج اخذ کرنا) وہ خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں
کر سکے ۔ اگر وہ ایسا کر پاتے تو مجھے یقین ہے اُن کی بہت ساری
شکایتیں خود بخود رفع ہو جاتیں ۔ مثلاً انھیں راشد کی نظم
" دل میرے صحرا نورد پیر دل " پر یہ اعتراض نہ ہوتا کہ اُس کا
" پیمانہ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ وہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا ہے اور
ان کا ذہن تنظیم کے ضروری عناصر حیات فن میں پورے طور سے
اُبھر نہیں پائے ہیں .... ممکن ہے کہ سارا قصور شاعر کے ذہنی
تصور کا ہو ۔ " مبصر کو قصور کے قوافی کی داد دینے کے
بعد عرض کروں گا کہ سارا قصور مبصر کے ذہنی تصور کا بھی تو ہو سکتا
ہے ۔ اسی طرح مغنی صاحب میراجی کے بارے میں فرماتے ہیں ،
" میراجی کی تخلیقات کی تاریخی حیثیت جو بھی ہو مگر تنقیدی نقطۂ
نظر سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں معلوم ہوتی ۔ " ایک
تو میراجی کا ذہن بے حد اُلجھا ہوا ہے اور ان کو اپنے تجربات پر
قدرت حاصل نہیں ۔ دوسرے یہ کہ یہ تجربات بجائے خود بہت ہی

معمولی اور پیتذل قسم کے ہیں۔ اور شاید کے احساس میں اپنی بےچارگی کے سبب ان کے اندر کوئی فنی قدر و قیمت بھی پیدا نہیں کرتے (اگر گستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ بےچارگی کے سبب ان کے اندر کی بجائے بیچارگی کے سبب اُن میں کہہ دیا جاتا کہ عصب بھی پیدا ہو جاتا اور زبان بھی فصیح ہو جاتی) محض حواس و اعصاب فن کاری کے لئے کافی نہیں۔ "

مغنی صاحب محض حواس و اعصاب فنکاری کے لئے کافی ہوں یا نہ ہوں تنقید نگاری کے لئے بے حد ضروری ہیں کیونکہ جب تک ان پر قابو نہ ہو اسی قسم کی مولویانہ تنقید وجود میں آتی ہے۔ لیکن شاید یہ قصور آپ سے زیادہ آپ کے اس نقطے کا ہے کہ ادب میں قطعیت اور دو ٹوک انداز کے فیصلے کئے جانے چاہئیں۔ آپ کو بستر نواز سے شکایت بھی تو یہی ہے کہ اُن کے پیش آہنگ میں تحسین اور تنقیص کا فقدان ہے۔ یہ بات تو آپ بھی جانتے ہی ہوں گے کہ ادب تو ادب آج سائنس میں بھی کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کیونکہ علمی معاملات میں حرف آخر کوئی نہیں ہوتا اور خصوصی طور پر آج کے دور میں جب کہ علم اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اُس نے آج کے انسان کو علم کے مزید امکانات سے روشناس کروا دیا ہے کوئی بھی نظریہ یا اُس نظریے کا حامی خود اپنے آپ کو یا اپنے نظریے کو علم کی آخری منزل قرار دے کر مطمئن نہیں ہو سکتا کہ اطمینان اور سب کچھ جان لینے کا گمراہ کُن احساس کم علمی کا تحفہ ہے، اور بدقسمتی سے آپ کا تبصرہ اسی "قطعیت" کے مسلسل اظہار و استعمال کا نتیجہ ہے ورنہ کم از کم تبصرہ میں اس قسم کے فیصلے نظر نہ آتے ہے۔

۱۔ "کرشن چندر کا افسانہ تو بس ایک دلچسپ واقعہ کا بیان ہے۔ "

۲۔ "اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کی فوقیت بہت واضح ہے۔ بیدی کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ "

۳۔ "مین را کا آخری کمپوزیشن تو محض ہذیان ہے۔ "

۴۔ "جوگندر پال کے دونوں افسانے یکسر لغو ہیں۔ "

۵۔ "انور عظیم میں اجتہاد کی صلاحیت سرے سے مفقود ہے۔ "

وغیرہ وغیرہ۔ نہ یہ رویہ تنقیدی رویہ کہلا سکتا ہے اور نہ اس زبان کو تنقیدی زبان کہا جا سکتا ہے۔ تنقید میں بحث سے سخت اعتراض کی گنجائش موجود ہے لیکن اس اعتراض کو دلیلوں سے ثابت کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مغنی صاحب نے اعتراضات تو بہت بھاری بھر کم کئے لیکن ان اعتراضات کی وجہ و جواز پیش کرنے سے یکسر دامن بچا گئے اور اگر وہ چاہتے بھی تو شاید وہ ان اعتراضات کی کوئی معقول وجہ پیش نہ کر سکتے کیونکہ تنقید میں کٹر پن غور و فکر کی تمام راہیں مسدود کر دیتا ہے۔ آخر میں چلتے چلاتے مغنی صاحب نے کچھ معلمین ادب پر بھی کیا عمومی انداز میں تنقید جھاڑ دی ہے۔ جو مولویانہ تنقید کا طرہ امتیاز ہے اور یہ بات بہت غور و فکر کے باوجود اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ آخر اس اطلاع کا کہ "آج خود اُردو کے اساتذہ کا ذوق و کردار اتنا پست ہو گیا ہے کہ وہ کالج کی درسیات میں سراسر غیر معیاری چیزوں کا انتخاب کر کے اُردو زبان و ادب کے ساتھ غداری اور نمک حرامی کر رہے ہیں" تنقیدی کلاسیک سے کیا تعلق ہے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مغنی صاحب افسانے میں نہ سہی تنقید میں آزاد تلازمہ خیال

FREE ASSOCIATION OF THOUGHT

کے قائل ہیں۔ اب اسے اتفاق ہی سمجھ لیجئے کہ "تنقیدی کلاسیک" پر تنقید کرتے وقت اُن کے ذہن میں کتاب سے متعلق باتیں کم اور غیر متعلق باتیں زیادہ آ گئیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس اتفاق نے سنجیدہ تنقید کا بُری طرح بلکہ پوری طرح گلا گھونٹ دیا ہے

— —

شاھد احمد شعیب

گلی مڑتی ہے ؟

تعفن :
کہ احساس کو جیسے مرنے پہ مجبور ہونا پڑے
شور :
جیسے سبھی کچھ کے موجود میں کوئی کچھ بھی نہیں ہو
ہوا :
اس طرف سے گذرنے میں خود کو گنہگار سمجھے

○○○

المیہ لیکن عجب ہے
یہاں سے گلی اک کشادہ سڑک سے بھی ملتی ہے
اور ہم
یہاں سے نکل بھاگنے کی سبھی صورتوں سے بھی واقف ہیں
لیکن
یہاں لوگ کس "شے" کے "زیراثر" ہیں
قدم روک کر
موت کے منتظر ہیں
عجب "بے خبر" ہیں ○!!!

ظفر غوری

بازیافت

ابھی میں منجمد ہوں
برف کی مانند چوٹی پر
چٹانیں ٹوٹ کر جب راستہ دیں گی
تو دریا کی طرح لہرا کے اتروں گا
سمندر میں چھپی اس گہری نیلی پیاس کے دل میں
ہوا کا عکس بن کر
ریت کے شیشے میں ابھروں گا
چمکتی دھوپ کے پنکھوں پہ اڑتا
بادلوں کے آسمانی جنگلوں کو پار کر لوں گا
گلابی موسموں کی آنکھ سے شبنم سا برسوں گا
ہر اک پہچان کی خوشبو بھری تتلی سا اُڑ اُڑ کر
کبھی کہرا بھرے لمحوں میں
ٹھٹھرا ٹھٹھرا، بکھرا بکھرا، پھر میں
اپنے بے رنگ خال و خط پانے کو
ننھے ننھے ہاتھوں کے مقدس لمس کی گرمی کو
ترسوں گا ــــــ!!!

ــــ ــــ

قطرہ قطرہ حساب

جرعہ جرعہ جام میں ڈھلتا لہو
قطرہ قطرہ مانگتا اپنا حساب
دھوپ کے دریا میں سب ہی پیاس سے سیراب ہیں
آسماں
دھرتی
ہوا
سب خواب ہیں
اُٹھ رہی ہے ہر طرف موجِ سوال
چار سو ہے سُرخ بحرِ بے کنار
لمحہ لمحہ جس میں گھلتا آفتاب
کس سے مانگیں اب حساب؟
کس کو دیں اپنا جواب؟
احتساب و احتساب و احتساب!!!

ــــ ــــ

شکیلہ اختر

ٹوٹی ہوئی گڑیا

نیاز [illegible] دلہن کی خوب صورتی پہلے تو کانوں [illegible] چلی گئی، لمبی لمبی پلکوں والی سیاہ [illegible] ملاجایا کرتا تھا، اب تک وہ اپنے آپ کو سنبھال [illegible] اس کی نگاہوں میں زندگی کا تصور ہی دوسرا تھا۔ اس کو [illegible] چہرے پسند تھے، اترے ہوئے اداس چہروں سے اس کو پیار تھا، سمٹی اور سہمی ہوئی نگاہوں کے محسوس ہوتے ہوئے درد کو وہ اپنا لیا کرتا تھا، مگر یہ کھلا ہوا روشن چہرہ، یہ مسکراتے ہوئے خوبصورت لبوں کی جنبش اس کی زندگی میں کہاں سے آگئی تھیں، اپنی شادی کے بعد وہ گھٹا گھٹا سا رہتا، اس نے اپنی شخصیت پر پردہ ڈالنے کی کوششیں بھی کی تھیں مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا تھا، اس کے اپنے گھر کے در و دیوار تک بدلے بدلے سے نظر آتے تھے، ہر طرف ایک نیا ماحول چھاتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی وہ بڑی حسرتوں سے بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتا جب وہ اکیلا تھا، مگر وہ اکیلا کبھی نہ رہا تھا زمانے کے کچلے ہوئے لوگوں کو خلوص کو سہارا دیتے ہوئے نیاز نے ہمیشہ اپنے اندر برتری محسوس کی تھی، اس کو اپنی ذات سے بڑی محبت تھی، اپنے فرسودہ محلے کی گندی گلیوں میں لوٹیں لگانے والوں بچوں کو تانبے کا ایک ایک پیسہ دیتے ہوئے صرف اس لئے مسرور ہوا کرتا تھا کہ وہ ان گندے بچوں کو چند لمحوں کی مسرتوں کی بھیک دے سکتا ہے، اس کی انا کو اس سے بڑی تسکین مل جاتی تھی اور وہ اپنے تانبے کے پیسے بچوں کو دے کر پھر بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگاتا اور دھوؤں کے چھلے بنا بنا کر خوش ہوتا۔ اس کو اجالوں سے نفرت تھی، جس میں زخمی روح کے سارے ٹانکے نظر آنے لگتے تھے نیاز کو اونچی عمارتوں سے الجھن ہوتی تھی۔ اس کے پیڑوں کے نیچے جب سوکھے ہوئے پتے چرمرانے لگتے تو اس کی آواز اسے بڑی اچھی لگتی تھی، فنا کا ہلکا دھیما سا نغمہ اور پھر خاموشی۔ نیاز کو اپنے گندے محلے سے بڑا پیار تھا۔ اس لئے اسی محلے میں آکر پناہ لی تھی، وطن کی محبت اور ماں کے پیار سے بچھڑ کر نیاز نے اپنے آپ کو اسی جگہ بھلایا تھا، اسی جگہ کھویا تھا۔ اور جب وہ ڈوب کر ابھرا تو اپنے مکان کے سامنے مکھیاں بھنکتے ٹین کے پتر اور ٹاٹ کے ٹکڑوں سے چھائے ہوئے ہوٹل کو ممتا کی محبت بھری آغوش سمجھنے لگا۔ گندے ٹوٹی میلی چائے کی پیالیوں سے بھی وہ پیار کرتا تھا۔ اپنے گھر سے روٹھ کر وہ جب سے یہاں آیا تھا۔ سارے ٹوٹے ہوئے رشتے اسی جگہ اس کو جڑتے ہوئے نظر آتے تھے، اس گندے ہوٹل کی ٹوٹی پھوٹی بنچ پر بیٹھنے والا بس ایک نیاز ہی سفید پوش بھلا آدمی تھا۔ جس کے آتے ہی ہوٹل کے مالک سے لے کر سارے ملازم اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جاتے تھے اور یہی سلامی، یہی اندھیرے اور یہی کثافت اس کو

...رہے تھے۔

چونکہ وہ تعلیم یافتہ تھا، اس لئے اس کو جلد ہی ایک اچھی سی ملازمت مل گئی تھی ایک افیسر ہونے ہوئے بھی اس نے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ آفس سے گھر آ کر اندھیرے میں سارا وقت وہ سوچتے ہوئے گزار دیا کرتا تھا۔

اس کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی، اپنے گھر کے ایک کونے سے اس کی گہری وابستگی تھی۔ مگر اس کی انا کبھی اس سے بڑی قربانیوں کا مطالبہ بھی کر لیتی تھی، وہ اپنی ...یت میں اتنا مبتلا تھا کہ اس کو اپنے سوا اور کسی سے محبت نہیں تھی اور جہاں کوئی اس کے وجود کے راستے میں حائل ہوتا وہ بکھر جاتا۔ ٹوٹ جاتا، اور پھر اُسے اپنے ذرّے ذرّے کو مشکلوں سے چننا پڑتا اور تب آہستہ آہستہ نیاز کا ایک تازہ بت پھر سے بن جاتا اور وہ اسی گہری عقیدت کے ساتھ اپنے وجود کے اسی بت کی پرستش کرنے لگتا تھا۔ اس کی زندگی کا لمحہ لمحہ اپنی ہستی کے گرد رقص کرتا رہتا تھا۔ اور وہ گردش خانۂ کعبہ کے گرد مقدس چکر لگانے سے کسی طرح کم نہ تھی۔

نیاز کو اپنے گھر کی تنہائی سے وحشت بھی ہوا کرتی تھی۔ گھر کے اندھیرے کبھی کبھی اُس سے روشنی مانگتے ہوئے نظر آتے تھے اس کو بھی کبھی احساس ہوا کرتا تھا کہ اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ضرور ہے۔ مگر وہ کیا چیز تھی جس کو اس کی روح تلاش کرنا چاہتی تھی۔ اُس کے پاس عمدہ مکان اور اچھی ملازمت تھی، ملنے والے کچھ دوست بھی تھے، پھر اس کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ پورے طور پہ اس بات کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتا۔ مگر ہر بار اس کو یہی محسوس ہوتا کہ اس کے دل میں زمانے کا درد بھرا ہوا ہے۔ اگر اس کے دل کے گوشے اتنے نرم نہ ہوتے تو سامنے کے گندے ہوٹل پر وہ اتنا مہربان ہی کیسے ہوتا؟۔ اور اُداس چہروں اور بھیگی ہوئی آنکھوں کی نمی اس کے اندر تھرتھراہٹ کیوں پیدا کر دیا کرتیں۔؟

وقت گزرتا چلا گیا۔ اور نیاز ساری دنیا سے بے پروا اپنی ڈگر پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے دوستوں اور رشتہ داروں نے اس کو شادی پر مجبور کر دیا۔ ابھی تک جن سے نیاز نے اپنے آپ کو اب تک شخصوں سے بچائے رکھا تھا آخر فرار کے سارے راستے بند ہو گئے تھے۔

اور جب اس نے اپنی بیوی کی پہلی جھلک دیکھی تو چونک کر رہ گیا۔ اب تک جو تصویریں کبھی کبھار اس کے ذہن اور نگاہوں میں جھلک پڑتی تھیں اُس سے یہ صورت کتنی مختلف تھی۔ گلاب کے معطر پھولوں اور کلیوں سے وہ ہمیشہ اپنا دامن بچاتا رہا تھا۔ حسن کی نزاکتوں کو سمجھنے کی اس میں صلاحیت ہی نہیں تھی، پھر جس نے پھول کی ایک ننھی سی کلی بھی کبھی اپنے بٹن ہول میں نہیں لگائی ہو، وہ حسن و نزاکت سے بھرے اس حسین گلدستے کو کیسے سنبھال سکے گا۔ اس کو اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اس کے ساتھ یہ اچھا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے آئینہ میں تو بس ایک ہی صورت جلوہ گر اور وہ خود اسی کی اپنی صورت تھی، پھر اب وہ اس حسِین ... صورت کو کن نگاہوں کے چوکھٹے میں جڑے ...؟

شاہینہ کو دیکھ کر ایک اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا، اس کو تھوڑی بھر کی مسرت بھی نہ مل سکی تھی، جو اپنے ... روایتوں سے بغاوت کر کے فرار ہو کر ایک آزاد فضا میں سانس لیتا رہا تھا۔ اب اس کے پیروں میں اچانک بیڑیاں جھنجھناتی محسوس ہونے لگی تھیں۔

شاہینہ نے رفتہ رفتہ نیاز کی زندگی پر چھا جانا چاہا اس کی راتوں کے اندھیروں کو صبح کے اُجالے میں تبدیل کرنے لگی تھی۔ نیاز کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔ وہ

اپنے پسندیدہ ہوٹل میں اب پہلی سی آزادی کے ساتھ جاتے ہوئے جھجھکنے لگا تھا۔ گندے بچوں کا شور مچاتا ہوا ہجوم جب نیاز سے پیسہ مانگنے آتا، تو شاہینہ کی آنکھوں میں بیزاری کی جھلکیاں دیکھتے ہی نیاز تلملا جاتا تھا۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے اس کے پر کاٹ دئے گئے ہیں۔ اور وہ ہر طرح سے بے بس بنایا جا رہا ہے۔ کچھ دنوں تک تو وہ شکووں سے ان چیزوں کو برداشت کرتا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ جب نیاز نے محسوس کیا کہ شاہینہ کا حسن اس کی نرگسیت سے ٹکرا کر اس کے بت کو پاش پاش کرنا چاہتا ہے، تب وہ یکبارگی بپھر اٹھا۔ اس نے اخلاق و شرافت سے ہٹ کر اپنی انا کی حفاظت کرنی چاہی اس کے گھر کا سکون مٹ گیا۔ نیاز شاہینہ سے کٹتا چلا گیا۔ اور شاہینہ جو ہتھیلیوں پر پلی تھی، نزاکتوں اور پیار کے جھولوں میں اب تک زندگی گذارتی آئی تھی، اپنے خوابوں اور تصورات کے شیش محل کو اس طرح سے چکنا چور ہوتے دیکھ کر اس پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کا ماحول نیاز کی دنیا سے بالکل جداگانہ تھا۔ پہلی بار نیاز کو دیکھ کر اس کے دل پہ چوٹ تو ضرور لگی تھی، مگر اس کو محبت کے سہارے، نیاز کو جیت لینے کا یقین تھا، وہ اداس گھر کو اپنی مسکراہٹوں سے سجانے کی آرزومند تھی، مگر اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نیاز نے روک دیا تھا۔ اس کی نازک انگلیوں کے پور پور میں، زندگی کے شرارے تڑپ رہے تھے مگر اب شاہینہ میں نیاز کی بداخلاقیوں، جھڑکیوں اور نفرتوں کے مسلسل اظہار کو سہتے چلے جانے کی برداشت نہ تھی۔ آخر صبر کی بھی تو ایک انتہا ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس کو لگتا جیسے ضبط کرتے کرتے اس کا دل پھٹ پڑے گا۔ اسی طرح آنسوؤں آہوں اور کراہوں کے درمیان شاہینہ کی گود میں ایک پیاری سی بچی آ گئی تھی۔ نیاز کو بچوں سے پیار تھا، گلیوں کے ٹھکرائے ہوئے بچے تک اس کو بے حد عزیز تھے۔ اس نے اپنی بچی کو اپنا پیار دینا چاہا، اس کو اپنے کلیجے سے لگانے کو تڑپ اٹھا مگر بچی کی طرف اس کی بڑھتی ہوئی باہیں سمٹ کر رہ جاتیں، وہ ٹھٹھک جاتا۔ یہ بچی شاہینہ کی طرح اس کے رحم و کرم کی محتاج نہیں تھی۔ یہ ہنستی مسکراتی بچی پھولوں کی طرح شگفتہ تھی اور چاندنی کی طرح پاکیزہ۔ جس بچی کے پالنے کے گرد قسم قسم کے کھلونے پڑتے رہتے وہ نیاز کی بچی نہ تھی۔ اور شاہینہ کی بچی تانبے کا ایک پیسہ پا کر خوشیوں سے جھوم اٹھنے والی نہیں تھی۔ نیاز باپ بن کر بھی بیگانہ ہی رہا۔ شاہینہ بڑی خاموشی اور صبر کے ساتھ یہ ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ نیاز کی اپنی بچی کے ساتھ یہ بے پروائی شاہینہ برداشت نہ کر سکی۔ اب تک وہ نیاز کے سارے کچوکے اور سختیاں سہتی رہی تھی۔ زندگی کا بڑا صبر آزما وقت اس نے خاموشی سے گذار دیا تھا، مگر اب اس میں ذلتوں اور نفرتوں کے اظہار کو اور زیادہ سہتے رہنے کی طاقت نہیں تھی۔ نیاز کی سختیوں اور بدزبانیوں نے اس کے اپنے گھر کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔

نیاز چاہتا تھا کہ شاہینہ کی بے پروا نگاہیں اس سے اپنے لئے رحم کی بھیک مانگیں۔ مگر شاہینہ کو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، وہ جانتی تھی کہ نیاز کے ساتھ زندگی گذار دینا ہی ایک بڑی قربانی ہے اور وہ ایک عرصے سے یہ قربانی پیش کرتی چلی آ رہی تھی۔ آخر ایک روز جھگڑے نے بڑی نازک صورت اختیار کر لی۔ نیاز نے شاہینہ کو اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔ شاہینہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس حکم کو سنا اور پہلی بار اس نے اپنے گھر والوں کو ٹرنک کال کے ذریعہ اپنی دردناک داستان سنائی۔

دوسرے دن شاہینہ کے گھر والے اس کے پاس پہونچ گئے اور شاہینہ کی غمناک صورت دیکھتے ہی وہ بپھر اٹھے۔ اسی وقت شاہینہ کو ہمیشہ کے لئے ان گذرتی ہوئی قیامتوں سے چھڑا لینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

نیاز دوسرے کمرے میں بیٹھا غصے اور نفرت سے تلملا رہا تھا۔ بڑا اچھا ہوا جو اس کے سر سے نحوستوں کا بوجھ خود بخود اتر

رہا تھا۔ شاہینہ بچی کو گود میں لئے اُٹھی تو اچانک اس کی نگاہیں سامنے کی دیوار پر اٹک کر رہ گئیں۔ نیاز کے ساتھ اس کی شادی کی تصویر اتنے غموں اور درد مندیوں کے باوجود ابھی تک مسکرا رہی تھی۔ اس نے تصویر اُتارنی چاہی مگر تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے تصویر دیوار سے الگ ہوتے ہی زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئی شیشے کی کرچیاں اُلجھے ہوئے بے ترتیب کمرے کی زمین پر ہر طرف پھیل گئیں۔ شاہینہ نے بڑی گہری نظر سے ان کرچیوں کو دیکھا اور سوچا اگر ان پر ننگے پاؤں دھر دے جائیں تو خون کی سرخیوں سے شیشے کی یہ کرچیاں کیسی رنگین ہو جائیں گی؟ اور شاہینہ اپنے دل کے خون آلود ٹکڑوں کو کب سے چھپائے ہوئے تھی۔

نیاز نے گھر کے اندر ہنگاموں کو سنتے ہوئے محسوس کیا قدموں کی آہٹیں دور ہوتی چلی گئیں۔ اور جب کار اسٹارٹ ہو کر چلی گئی۔ تب وہ اپنے کمرے سے نکلا، اتنی سی دیر میں اس کا گھر ایک ویرانہ بن چکا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ شاہینہ کے کمرے میں پہونچ کر شیشے کی کرچیوں پر اس کے جوتے چیخ پڑے۔ سامنے شادی کی تصویر زمین پر پڑی اب بھی مسکرا رہی تھی۔ نیاز اس تصویر کا حشر اور اس کی مسکراہٹوں کو دیکھ کر لپک اُٹھا۔ مگر جب اس کی سلگتی ہوئی نگاہیں خالی پالنے پر گئیں تو سنہرے بالوں والی گڑیا اس میں ٹوٹی ہوئی اکیلی پڑی تھی۔ یکبارگی نیاز کے دل کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے، وہ تڑپ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کے جھرنے اُبل پڑے اور وہ اس ٹوٹی ہوئی گڑیا کو اپنی آنکھوں سے لگائے بیتابی سے چیختا ہوا پھوٹ پڑا "میری بچی۔ میری گڑیا" اور گھر کے اندر ہر طرف اس کے اپنے وجود کا ذرہ ذرہ بکھرا پڑا محسوس ہو رہا تھا۔

— —

عبدالرؤف

سب سرِ راہ ملے

سحر کاریِ بیاں، صنعتِ لفظی کا طلسم
روزمرے کی پھبن، زورِ فصاحت کا فسوں
نکتہ دانیٔ زباں، فنِ بلاغت کی نمود
سب سرِ راہ ملے
ہم سفر کوئی نہیں

نطق کا سیلِ رواں، گرمیٔ گفتار کا جوش
کاوشِ طرزِ ادا، زورِ خطابت کا خروش
نغمگی صوت کی یوں لگتی ہو جیسے کہ سروش
سب سرِ راہ ملے
ہم سفر کوئی نہیں

فکرِ پروازِ سخن، تازہ مضامیں کی ہوس
حسنِ ترسیل اور تشبیہ و کنایات کا لطف
مسئلے شعر کے، ابہام و ابلاغ کی بحث
سب سرِ راہ ملے
ہم سفر کوئی نہیں

تمتماتے ہوئے چہروں پہ لکیریں اُبھریں
خون کا غازہ ملے صبح کا سورج نکلا
شعلگی درد کی آواز کے پیکر میں ڈھلی
ایک کڑکا تھی وہ بجلی کا یا صوتِ ہادی
ظلمتیں کانپ گئیں، نور کا طوفاں اُٹھا
کعبۂ شوق بنا ذرۂ صحرائے عرب
درد چمکا تو پیمبر کی صدائے برحق
وادیٔ نیل میں گونجی
اور غلاموں کی صفیں
رقص کرنے لگیں، زنجیر کے حلقے ٹوٹے

کشش درد سے اجرام فلک کرۂ ارض
نورِ مستور کی ان دیکھی شعاعوں سے بندھے
رقص کرتے ہوئے ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں

درد کی ہم سفری سارے زمانے سے پرے
جانے کن راہوں سے کس سمت مجھے لے کے چلی

[illegible]مکمل

[illegible]م رومانی احساس کی کوکھ سے!

[illegible] سے کترانا چاہا
[illegible] اور تھا
[illegible] نہیں تھا:
[illegible] نہیں ...
[illegible] وعدہ لیا تھا
[illegible] کسی نو پردہ نظر آئے
[illegible]
[illegible] سے کترا کے دامن بچا کر، گذر جاؤں:
[illegible] نہیں!
[illegible] میں، نہیں تھا
[illegible] وہ کون تھے
[illegible] خود سے کترا کے انجان بنتے گئے
بھولی بسری سی پہچان بنتے گئے

—— ——

مرگِ آرزو

کسی دستِ حنائی کی لکیریں
لکیروں میں اُلجھتے زاویوں میں
کسی کا خواب،
—— بے تعبیر ٹوٹا۔
کسی سے دامنِ احساس چھوٹا
ابھی تک دشتِ محرومی میں کوئی
دریدہ پیرہن، اور آبلہ پا
کہانی اک سُناتا پھر رہا ہے —— ——

فاروق مصطفیٰ

تعاقب

شب و روز
جانے مجھے کیوں یہ احساس ہے
کوئی میرے تعاقب میں بڑھتا چلا آ رہا ہے
میں خود ہی کر ان بھاری قدموں کی آواز کے بوجھ
—— سے دب رہا ہوں
کہ میں اپنے ہی دست و بازو میں اب لمحہ لمحہ سمٹنے لگا ہوں!
میں اب خود ہی میں ذرّہ ذرّہ بکھرنے لگا ہوں!!
میں اب اپنی ہمسائیگی سے بھی ڈرنے لگا ہوں!!!
میں شاید۔ خود اپنی صدا کے تعاقب میں چلنے لگا ہوں!!!
—— —— —— کہ
تشکیک۔ اور۔ لایقینی
کے دھندلے مناظر لئے آنکھ میں
آپ اپنے لہو کے دہکتے جہنم میں
جلنے لگا ہوں!
مرے حافظے میں تعاقب کی کوئی بھیانک کہانی ہے
محفوظ شاید

—— ——

ھد کلیم

ظلم

تاب!
ے سُلگتے ہوئے آفتاب!!

ام ہونے ہی پتا
بڑ دیتا ہوں دروازہ کمرے کا اپنے
اِک رات دروازے پہ میرے
بتا ہے دستک کوئی
ں نے دروازہ کمرے کا کھولا نہیں ہے
ھی تک مگر ــــــــ

وچتا ہوں کہ
کون ہے ـــ؟
رکیا ہے ـ؟

رپھر
پنے بستر پہ چادر میں مُنہ کو چھپائے ہوئے
ز اُٹھتا ہوں میں ـــ
روے رات کا یہ طلسم حسیں

تاب!
ے سلگتے ہوئے آفتاب!

ــــ ــ

خاطر حافظی

نظم

جل بجھی ـ ذہن کے ـــ
آسماں پر چمکتی ہوئی سی وہ قوسِ قزح
وہ سنہری فضا،
راستہ کھو گیا!
اب اندھیرا ہے ساتھی ترا!
دیکھنا چھوڑ دے،
سوچنا چھوڑ دے۔
اب ملیں گے کہاں؟
لہلہاتے ہوئے گنگناتے بدن
اُجلی پریوں سے دلکش وہ گورے قدم
خواب زاروں سے اُٹھتی ہوئی، گندھ سی!
بے خودی، تازگی، زندگی،
اب کہاں؟
خواب کا دیکھنا چھوڑ دے
سوچنا چھوڑ دے

ــ ــ

سراج
جونپوری

سگار

سیاہ رات ہے
کمرے کا بلب روشن ہے
مری نگاہ
مری ڈائری میں گم ہوکر
تصورات کا پیکر تلاش کرتی ہے
ہوا کا بھوت
سلاخوں سے رونما ہوکر
میرے وجود کے شانے جھنجھوڑ دیتا ہے
تصورات کی زنجیر ٹوٹ جاتی ہے
وفورِ غم سے بلکتی ہے
میری تنہائی
مرا سگار
نئے دائرے بناتا ہے

ــ ــ

رشید امجد

یاہو کی نئی تعبیر

اندھیرا آنکھیں ملتا ہوا رات کے بستر سے کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھا ہے، اور اُجلا یا ہریالی سی شرمائی دلہن کی طرح ململی گھونگھٹ نکالے دبے پاؤں سیڑھیاں اتر رہا ہے۔

پچھلی رات،

پچھلی ساری رات، میں آنکھوں کی جھولی میں انتظار کے پھول لئے نیند کی نیلی چڑیا کی راہ تکتا رہا ہوں، لیکن نیند کا جہاز خوابوں کی بندرگاہ میں لنگر انداز نہیں ہوا۔

ساری رات،

پچھلی ساری رات ـــــ میں اپنی خواہشوں کے پنجرے سے اُڑتے ہوئے پرندوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، لیکن سارے پرندے دھند میں لپٹی ہوئی زمین پر دُور دور نکل گئے ہیں۔

کئی دنوں سے زمین کے چہرے میں پھپکلی اُگ آئی ہے، اور اس کی چھاتیوں کے سرہانے دودھ میں میری خواہشوں کے گندے انڈوں کی لیس دار جھاگ گھل گئی ہے۔ ایک زنگ آلود کالی روشنی میرے جسم کی کڑاہی میں وہ تبرک تل رہی ہے جس کا بیشتر صدیوں پہلے میرے جسم نے مجھے دیا تھا۔

میں کھڑکی کھول دیتا ہوں،

صبح نے اپنا ململی گھونگھٹ اُتار دیا ہے، اور اب دیواروں سے اُتر کر گلیوں اور بازاروں میں دوڑ رہی ہے۔ میں اپنے بدن کی ریلنگ سے لٹکے سارے پردے ہٹا دیتا ہوں اور کلینڈر کے چکنے صفحوں پر چڑھ کر دنوں، مہینوں اور سالوں کے صفحے اُلٹنے لگتا ہوں۔ دھند دغبار میرے چاروں طرف پھیل جاتا ہے، اور کلینڈر کے خوشبودار صفحوں سے تاریخیں اُڑ اُڑ کر دور نیلاہٹوں کی جانب جانے لگتی ہیں۔ میں ان کے سنہری پَروں سے لٹک جاتا ہوں اور ان کے ساتھ ساتھ دِنوں اور سالوں کی گھنیری وادیوں میں سے گزرتا دور ـــــ بہت دور نکل جاتا ہوں۔

یادیں اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھتی ہیں، اور میرے وجود کے اجڑے کھنڈر میں چھن چھنا چھن ناچنے لگتی ہیں

"یاہو" ـــــ اس نے نعرہ مار کر سامنے پڑے ہوئے شخص پر جست لگائی اور اسے پنجوں میں دبوچ کر اس کے نرخرے میں دانت گاڑ دیئے۔ تڑپنے والے نے خرخر کرتے ہوئے نرم زمین کو میخوں کی ڈھلوانوں پر روکنے کی کوشش کی، لیکن زندگی نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور گرم نمکین خون کا ذائقہ اس کے دشمن کے لبوں پر دستک دینے لگا۔

وہ کچھ دیر اس کے نرخرے کے پیالے سے اپنے پیاسے ہونٹوں کے خشک کھیت سیراب کرتا رہا، پھر اس نے اس کے جسم کو نوچنا شروع کر دیا، اور نرم نرم تازہ گرم گوشت اُتار کر کھانے لگا۔

ہو" ۔۔۔۔۔ سب سہمے رہتے تھے اور آنکھوں
کی خمیس جلائے گوشت سے اٹھتی بو کو اپنے نتھنوں
سے تھے۔ اس کا اشارہ پاتے ہی وہ سب
ہوئے جسم پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا
ں کی کنڈیوں میں لٹکنے لگا۔

س نے منہ سے لگے ہوئے خون کو کہنی سے صاف کیا،
کو ایک طرف کرتا اس بڑی چٹان کی طرف بڑھا،
ساتھ لگی وہ ہانپ رہی تھی۔

ارا جھگڑا اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ بات اتنی سی
س کے جسم کے گداز ابھاروں نے اسے آنکھ ماری
نانچہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چٹان کی دوسری طرف
لگا تھا کہ اسی شخص نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر
ہ شخص کہاں تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ زمین پر تو
ند دھبے ہی تھے۔ وہ شخص تو بوٹی بوٹی ہو کر مختلف
ں میں پہنچ چکا تھا۔

"یاہو" ۔۔۔ اُس نے نعرہ مارا اور سہمی ہوئی عورت
ہ پکڑ کر چٹان کی طرف چلا گیا۔

"یاہو ۔۔۔ یاہو۔"

میں اپنے جسم کے لمبے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں،
پنے منہ سے نکلنے والی یاہو کے پیچھے دوڑنے لگتا ہوں۔
لوں کی گود میں بیٹھے ہوئے دیوتا مجھے پکارتے ہیں۔ میں
کے قریب چلا جاتا ہوں۔ سالوں کی تیز درانتیاں میرے
پر اُگے ہوئے لمبے بالوں کی کالی فصلیں کاٹ رہی ہیں۔
مجھے نیند آ رہی ہے ۔۔۔ میں اونگھ رہا ہوں۔
سالوں کے جسموں سے رستی دھند مجھے گود میں لے کر
یاں دینے لگتی ہے۔

پونتوخوس تلوار میان میں ڈال کر باہر جانے لگا، تو
سے غلاموں نے اسے دعاؤں کے ہاروں سے لاد دیا۔ ارینا
قریب ہی تھا۔ وہ ہوا میں دشمن کی بو سونگھتا پیدل ہی وہاں تک
آیا۔ ارتیوس پہلے ہی آچکا تھا۔ اور اب ارینا کی پیاسی مٹی پہ
کھڑا اس کی راہ تک رہا تھا۔ وہ بڑے وقار سے اس کے سامنے
آیا۔ دونوں نے اپنی اپنی تلواروں کو دن کی سفید روشنی کی سلامی
دی، اور چند قدم ہٹ کر ایک دوسرے کی طرف دوڑ پڑے۔

پونتوخوس نے وار کرنے سے پہلے اپنے منہ میں دیوتاؤں
کے مقدس نام کا شہد گھولا، اور کہنے لگا:

"اے اپالو، اگر تو میری مدد کرے تو میں تیرے
مندر میں ایک موٹی تازہ جوان گائے کی قربانی
دوں، اور ایک دوسری گائے کی چربی سے تیرے
مندر کی آگ کو تیز کروں۔"

اپالو اس کی تلوار کی نوک پر آ بیٹھا، ارتیوس اب صرف اپنا
دفاع کر رہا تھا، اور پونتوخوس کی تلوار کی نوک پر بیٹھا ہوا
اپالو ارتیوس کے نرخرے کو بوسہ دینے کے لئے بے تاب ہوا جا رہا
تھا۔ ایک لمحے کے لئے جب ارتیوس کے پاؤں لڑکھڑائے، تو
تلوار کی نوک پر بیٹھا ہوا اپالو اس کے نرخرے میں اتر گیا،
گرم نمکین خون ارینا کے پیاسے ہونٹوں کو گلابی بناتا چاروں
طرف پھیل گیا۔

سب نے تالیاں بجا کر پونتوخوس کی بہادری کا گیت
گایا۔ اُس نے لمحہ بھر کے لئے زمین پر پڑے ہوئے ارتیوس کو
دیکھا اور بازار کی طرف چل پڑا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے، لیکن
پچھلے چند دنوں سے ارتیوس کی نیک نامی اور شہرت کے پرندے
سارے شہر پر منڈلانے لگے تھے، اور یہ بات اسے کسی قیمت
پر قبول نہ تھی۔ اس نے بہت دنوں سے یہ سوچ رکھا تھا کہ
اس بار ارینا میں وہ ارتیوس کی زندگی کا قالین لپیٹ دے گا،
اور اب وہ تلوار پر چمکتے ہوئے لہو کے قطروں کو
اچھالتا ڈیانا کے معبد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

پورکلیا ڈیانا کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔
دونوں نے مسکراہٹوں کی ٹرے میں اپنی خواہشوں کے دیئے
جلا کر ایک دوسرے کو پیش کئے۔ پونٹو خوش نے جیب سے سکّہ
نکال کر مندر کی صندوقچی میں ڈالا اور پور کلیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے
پچھلے حصہ میں لے گیا۔

میں اپنے جسم پر نظر ڈالتا ہوں۔ میرے جسم کے کھیت میں
اُگی ہوئی بالوں کی فصل کٹ چکی ہے۔ دور سے آتی روشنیاں
میرے جسم پر ناچ رہی ہیں اور میرے بدن پر پڑی ہوئی سلوٹیں
ایک ایک کر کے نکل رہی ہیں۔
میری آنکھوں کے کٹوروں میں غنودگی گھول رہی
ہے میں لڑکھڑا کر سانسوں کے ہنڈولے میں گر پڑتا ہوں۔

بشن داس بھورے رنگ کی چٹان سے ٹیک لگائے
دیا جلا رہا تھا کہ امبا دبے پاؤں اس کے قریب آئی اور اپنی
سریلی آواز کو دیا پر پٹختے ہوئے بولی ——— "ہے رام تم ابھی تک
یہیں ہو ——— "

بشن نے دیا ایک طرف رکھ دی اور بولا ———
"کہاں جا رہی ہو؟" کیسری رنگ کی ساڑھی اور جوڑے
میں گیندے کا پھول سجائے وہ اسے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔
امبا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "شاکیہ منی کو دیکھنے نہیں
جاؤ گے ——— ؟"

بشن نے سر ہلایا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔
برگد کے درخت سے پھوٹتا سورج آسمان کی وسعتوں
میں چمک رہا تھا۔
وہ آلتی پالتی مارے برگد کے نیچے بیٹھا تھا اور اپنی آواز
کی مٹھاس میں سکون کے ذائقے سجا کر سب کے کانوں میں ابدیت
کا شہد ٹپکا رہا تھا۔
"دھرم کرو ——— دھرم کرو۔"

اس کی آواز بشن کے کانوں میں بیٹھے پرکھوں کی روحوں
کے جالے توڑنے لگی۔ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔
ہاں اس نے اپنے شریر کو ریاضت کی آگ میں جلا کر
اپنی آتما کو کندن بنا لیا تھا۔ اور اب وہ ایک مسکراہٹ بنا بیٹھا
تھا۔ اس کی آواز اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ "کسی کو
دکھ نہ دو۔ سب انسان ایک ہی ہیں۔"
ذات پات کے سارے رشتے ٹوٹ رہے تھے۔ ریزہ
ریزہ ہو رہے تھے۔
وہ امبا کو وہیں چھوڑ کر چپ چاپ باہر نکل آیا۔
شام کو جب وہ امبا سے ملنے ندی کنارے جا رہا تھا
تو دفعتہً کسی کا پاؤں اس کی گیروی دھوتی پر پانی کا نشان ڈال
گیا۔ اس نے مڑ کر غصے سے دیکھا ——— ارونی سہما ہوا ہاتھ
باندھے کھڑا تھا۔
"تم ——— " اس کے اندر کا برہمن جست لگا کر باہر آ گیا
"تم ——— مجھے بھرشٹ کر دیا ——— "
ارونی نے اپنی آنکھوں میں بے یقینی کے تھان کو لپیٹتے
ہوئے اس کی طرف دیکھا، اور برگد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا
"لیکن مہاراج وہ تو کہتا ہے کہ اب کوئی شودر نہیں، کوئی
برہمن نہیں ——— اور تم نے بھی تو اس کے سامنے اس کا اقرار کیا تھا"
بشن پرے ہٹتے ہوئے بڑبڑایا۔ "دفع ہو جاؤ ——— کتے۔"
کچھ دیر بعد جب وہ ندی کنارے پہنچا تو امبا گھاس پر
لیٹی لہریں گن رہی تھی۔ اس نے پھول توڑا اور اس کے جوڑے
میں سجانے لگا۔ امبا کے ہونٹوں پر مٹھاس کی بانسری بجنے لگی۔
بشن نے اسے اسی مسکراہٹ کی چادر میں لپیٹ لیا۔ اور چپکے چپکے
اس کے جسم کے مندر میں خواہشوں کا سیندور گوندھنے لگا۔
برگد کے نیچے آواز کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔
"دھرم کرو ——— دھرم کرو ——— ———
سنکھ بجاؤ، سنکھ بجاؤ۔"

جسم پر پھیلے ہوئے سیاہ دھبے پونہ مقبروں کے
پ رہے ہیں۔ میں۔ نگھتے او نگھتے مسکراتا ہوں
اکر ساتوں اور صدیوں کی گرد میں جا گرتا ہوں۔
ے کے ہنگوڑے میں لیٹے لیٹے ساتوں اور صدیوں
نے جو سے نئی خواب بیرن پلکوں کی چلمن پر دستک۔

ریا کی چنچل بانہوں کو دیکھ کر قافلہ رک گیا۔
معون نے راحیل کے کان میں سرگوشی کی۔ "اب کیا ہوگا؟"
راحیل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا
اور دریا کی طرف دیکھنے لگی۔
دریا درمیان میں سے پھٹ چکا تھا۔ اور سارے دوڑتے
پار کر رہے تھے۔ راحیل نے شمعون کا ہاتھ پکڑا اور دریا
اتر پڑی۔ شمعون نے دوسرے کنارے کی طرف جاتے
عقیدت سے اسے دیکھا، جو سب سے آگے عصا ہاتھ
چلا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "اب سارے ایک
کی بانہیں ہیں۔"
دوسرے کنارے پر پہنچ کر سب نئی وادیوں میں اتر گئے
رہ گیا تھا۔ اس نے اسے آواز دی۔ جب یوحنا رک
بڑے سکون سے اس کے قریب آیا اور پھر اچانک
نیچے گرا لیا۔ یوحنا کے ساتھ اس کا خاندانی جھگڑا
سے آج کے دن کا انتظار کرتا چلا آ رہا تھا۔ اور آج
یوحنا کے گرم ابلتے نمکین سرخی کو دن کی روشنی دکھا کر
فیصلہ کر دیا۔ اور عصا ہاتھ میں لئے وہ کہہ رہا تھا۔ "اب
ایک دوسرے کی بانہیں ہیں۔"
میں لڑکھڑا کر اگلے خواب کی اطلسی وادی میں جا گرتا ہوں
لمبے چوغے والے نے کتاب بند کر دی اور بولا۔ "تو
ہے کہ جو دوسروں کی غلطی معاف کر دے۔ وہ مقدس
نظروں میں آ گیا، اس پر صلیب کا سایا ہو گیا اور یوں
سمجھو کہ اسے کچھ مل گیا۔"

اس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ملائم سکون محسوس کیا
اور بڑی عقیدت سے الٹے پاؤں باہر آ گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو
رُکھ سو چکی تھی اور اس کا غلام پرونیس حسب معمول جاگ رہا تھا
جونہی وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ پرونیس نے اس کے کان میں
سرگوشی کی۔ "مالک! امی جیرس آج پھر مالکن کے پیچھے پیچھے
باغ میں گیا تھا۔"
یہ بات سنتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور دوڑتا ہوا
اسلحہ خانے میں آیا۔ تلوار نکال کر اس نے اس کی دھار کو
جانچا اور اسی رفتار سے خواب گاہ میں آیا۔ رُکھ مسکراہٹوں
کی نگری میں بیٹھی رنگین خوابوں کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔
"کتیا" — وہ لفظوں کو دانتوں کے آرے میں کترتا ہوا
بڑبڑایا اور تلوار لہراتا امی جیرس کے گھر کی طرف دوڑا۔
میں چونک کر اسے دوڑتے ہوئے دیکھتا ہوں، لیکن وہ
فاصلوں کی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔ دن صدیاں ایک دوسرے
کی بانہیں پکڑے میرے ساتھ لکن میٹی کھیل رہے ہیں۔
عائشہ دوسرے کمرے سے تلوار لے آئی اور ادیس کو دیتے
ہوئے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
ادیس نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے کٹورے میں سمیٹ لیا
اور بولا۔ "پگلی ہم صبح ہونے سے پہلے لوٹ آئیں گے اور پھر"۔
اس نے عائشہ کے ہونٹوں کی گلابی قبر پر مخملی خواہشوں کے پھول
چڑھائے۔
عائشہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "نہ جاؤ۔"
ادیس نے جھٹک کر اسے پرے کیا اور بولا "تم چاہتی ہو
سارا قبیلہ مجھے بزدل کہے۔"
عائشہ نے پھر اس کا بازو تھام لیا۔ "لیکن شب خون
مارنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔"
ادیس نے غصے سے اسے گھورا۔ "یہ کیا کم وجہ ہے کہ

جانداروں کے پانیوں میں حصہ مانگتے ہیں۔"

عائشہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ اذان کی آواز ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر فضا میں دوڑنے لگی۔

اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر

اللہ عظیم ہے اور سب سے بڑا۔ اور جو مومن دوسرے مومن پر تلوار نکالے گا وہ میری رحمت کے دائرے سے نکل جائے گا۔

اللہ اکبر۔

ادریس نے نرمی سے ہاتھ چھڑا لیا اور عائشہ کو ایک طرف کرتے ہوئے بولا ۔۔۔ "خدا حافظ" ہم فجر کی نماز واپس آکر پڑھیں گے انشاءاللہ ۔"

تلواروں سے ٹپکتا گرم گرم لہو میری پلکوں پر گرتا ہے۔ میں جلدی سے آنکھیں کھولتا ہوا۔ سبز مخملی روشنی دھندلائی ہوئی ہے، اور نئی خواہشوں کا اندھا رتھ ساری زمین کو روندتے چلا جا رہا ہے۔

لی یونگ چی نے سرخ کتاب بند کر کے گھٹنوں پر رکھ لی، اور دور پھیلے فاصلوں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا، اس کتاب کے لفظوں کی کوکھ سے پھوٹنے والی روشنی نے تو اسے مانجھ دیا ہے اس کا انگ انگ لشکنے لگا ہے۔

اس نے فاصلوں کی دھند میں سے چانگ پُو کے قدموں کی آہٹ کو سننا چاہا، جو صبح سے شہر گئی ہوئی تھی، اور اپنے ساتھ خبروں کی تازہ فصل لانے کا وعدہ کر گئی تھی۔ آج ان کی چھٹی کا دن تھا، اور چانگ پُو کمیون کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ صبح سویرے ہی شہر چلی گئی تھی۔

اس نے پھر کتاب کھول لی۔

اس کتاب نے تو اس کی زندگی کے سارے رُخ ہی بدل دئے تھے، وہ ساتھیوں کے ساتھ کورس گاتا ہوا، قدم بہ قدم شانہ بہ شانہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

ایک سکون ۔۔۔۔ ایک اطمینان '

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔

شام کو چانگ پو اور دوسرے ساتھی واپس آئے تو ان کے کندھوں سے ثقافتی بخار کے زرد کیڑے چمٹے ہوئے تھے۔

کچھ لوگ نظریاتی قینچی کو ٹڈیوں کی طرح کاٹ رہے ہیں، ہمیں ان کا محاسبہ کرنا ہے ۔۔۔ آواز کی برچھیاں اس کے سینے میں اتر گئیں، اس کے ہاتھوں کی گرفت بندوق پر مضبوط ہو گئی۔

زرد ثقافتی بخار کے جراثیم چاروں طرف پھیل گئے، سب ایک دوسرے کو شبے کے کلہاڑوں اور رشک کی درانتیوں سے کاٹ رہے تھے۔

خون ۔۔۔ گرم، ابلتا نمکین خون،

میں اپنے ہونٹ چوستا ہوں۔

حیرت کے احرام میں لپٹی ہوئی میری آنکھیں سارے جسم کا طواف کرتی ہیں۔

میرے جسم پر ملائم شفاف چکناہٹ گنگنا رہی ہے، میں اپنی آنکھوں کو منہ کے راستے اندر اُتار دیتا ہوں۔ اندر بڑی بڑی خوف ناک چہروں والی سیاہ نوکیلی چٹانیں سر اُٹھائے کھڑی ہیں۔

میری آنکھیں زخمی ہو جاتی ہیں،
ان پر سیاہی کی کائی جمنے لگتی ہے،
باہر سے میں کتنا ملائم اور شفاف ہوں،
لیکن اندر سے ۔۔۔۔ !

"یاہو" ۔۔۔ میرے منہ سے نکلے ہوئے خوب صورت، ملائم اور لذیذ لفظ سامنے والے کے نرخرے میں گڑ جاتے ہیں۔ میں ہونٹوں کی طشتری میں گرم، اُبلتے، نمکین لہو کا ذائقہ چکھتا ہوں۔

"یاہو ۔۔۔ یاہو" ۔۔۔۔ میرے اندر اُگے ہوئے لمبے سیاہ بالوں کے گھنے جنگلوں میں کوئی سرسراتا ہے، اور چپکے چپکے ہنستا ہے۔

— —

خصوصی پیش کش

ایک افسانہ نگار

شمیم افزا قمر

آہنگ / ۵۵

شمیم افزا قمر

میں کا تعارف

میں کا تعارف لکھنا میرے لئے ایک مشکل مرحلہ ہے۔ لیکن مجھے لکھنا ہے۔ اس لئے اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہوں۔ میں اس بے تحاشہ تیز رفتار دنیا کی ایک نہایت سست پست اور معمولی سی شے ہوں۔ لیکن ہوں اور زندہ ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ میری شخصیت جیسی بھی ہے وہ میری۔ والد مرحوم نظام الدین خاں بیرسٹر (سہسرام) نانا عبدالصمد خاں (سنولی) میرے شوہر قمر توحید صاحب (بھاگلپور) اور میری والدہ کی دین ہے والد مرحوم انگریزی حکومت کے باغی، گاندھی جی کے پیرو اور سیاسی کارکن تھے۔ نانا پرانے آئی سی ایس افیسر حکومت کے نہایت فرماں بردار، زندگی کی رفتار کو گھڑی کی سوئی اور سائنس کے فارمولے پر ناپنے تولنے کے عادی، ایک ایک لمحہ ایک ایک پل کا حساب لینے والے، ادھر والد مرحوم کی شفقت میں ماسوا جھوٹ کے سو خون معاف ہو جاتا۔ ایسے متضاد ماحول میں میں بالکل گھن چکر بن گئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں اسکول کے نیچے درجوں میں تھی تو سبھی مسلمان لڑکیوں کی طرح میں بھی مسلم ہی لڑکیوں کے آگے پیچھے منڈلاتی رہتی مگر وہ مجھے کانگریسی کہہ کر نفرت سے دیکھا کرتی تھیں۔ میرے اونچے کٹے بال اور بغیر دوپٹہ کے فراک پہنے رہنے پر میرا اچھا خاصا بائیکاٹ ہوتا۔ اپنا حوصلہ بھی بلند کہ اگر سلائی سیکھتے ہوئے سوئی کی نوک چبھ کر انگلی سے خون نکل آتا تو سارا دن میں انگلی ہی تکے جاتی۔ یا اسکول میں اجریہ کے کنارے کوئی مردہ آ لگتا تو رات کا کھانا ہی گول کر جاتی۔ ایسا چھوٹا سا دل لے کر اپنے کٹے چھٹے بال اور کانگریسی ابا جان کی وجہ سے میں طرح طرح کی احساس کمتری و برتری میں مبتلا ہوتی رہتی لیکن والد ہی کی نصیحت نصیحت سے کچھ خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی گئی۔ اسکول کے اونچے درجوں میں پہنچتے پہنچتے ابا نے پٹنہ چھوڑ اپنے آبائی مکان سہسرام میں سکونت اختیار کر لی مجھے اور میری چھوٹی بہن کو نانا حضور کے حکم کے مطابق پٹنہ ہی میں ان کے گھر منتقل کر دیا گیا۔ یہاں زندگی کا ایک طے شدہ اصول تھا۔ ڈسپلن بہت سخت تھی۔ تبدیلی کی گنجائش صرف کھانے کے متفرقات میں تھی۔ ہر دن اور ہر رات میں انتہائی یکسانیت تھی۔ حکم عدولی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ تھوڑی سی بغاوت میری فطرت کو وراثتاً نصیب ہوئی تھی۔ کچھ والد کی شہ مل جاتی۔ سو اس پرسکون خاموش ماحول میں گاہے گاہے دھماکہ ہوتا۔ جب میں نانا حضور کے روبرو پیش کی جاتی تو سب دعائیں الٹی پلٹی پڑھے جاتی۔ نانا بہت مختصر سوال پوچھتے۔ "آمنہ کس کی اجازت سے جوائن کیا؟" (کیونکہ پٹنہ کالج میں کلاس ہوا کرتے تھے۔) یونیورسٹی اسپورٹس میں کیوں گئی؟ N.C.C. میں نظام سے پوچھ کر داخلہ لیا تھا؟" میں ہر سوال کا جواب مختصر سے "جی" میں دیتی۔ "نظام کا خط موجود ہے؟" —

اضافہ کردیتی اور مانا بڑے حوصلہ اور فراخ دلی سے معاف
مجھے اور میری لڑکی تمام بہنوں کو ناول پڑھانے
تک کی اجازت تھی۔ میری رشتہ دار بہنیں
میری چھوٹی بہن بھی پڑا چھپا کر ہر طرح کے ناول پڑھ ڈالتیں
کی چوٹ پڑھنا اپنا حق ہونے کی ہمت نہ پڑتی
اس میں پہونچی تو رات دن کی یکسانیت میری تفریح کا
ہوگیا۔ بیٹھے بیٹھے ایک گھٹیا سا رومانی ناول لکھ
وہ ناول گھر پر تفریحاً سبھوں نے پڑھ لیا۔ میری امی کی
منتظر رہی لیکن سی نے کچھ نہ کہا۔ بلکہ آپس میں ہی کچھ کہہ
رہ گئیں۔ ۔۔۔ اب ناول پڑھنا شروع کردیا تو کوئی
بھی نہیں ۔۔۔ ذرا بلند ہوا۔ جوش میں آکر ایک ڈیڑھ
ایک ناول اور لکھ ڈالا جس میں اپنی دانست کے
ادبی بحثیں چھیڑیں، اقبال کے اشعار سے سجایا اور بہت
دلی۔ ہاں یہ لکھنا تو بھول ہی گئی کہ سب سے پہلی کہانی میں نے
کی عمر میں لکھی تھی۔ ہوا یوں کہ اپنی خدبرامی سے
اور پٹائی بھی ہوئی۔ پھر کیا تھا۔ رو رو کر ۔۔۔
اٹھا ڈالا اور ۔۔۔ جلی بھنی سی کہانی " ایک بدقسمت
کہ اپنی دانست میں امی سے بدلہ وصول کیا۔ اس
اردو لکھنا سیکھ ہی رہی تھی۔ اس کہانی کو میری خالہ
تک محفوظ رکھا تھا۔

کالج میں اکنومکس کے ساتھ اردو ادب بھی پڑھنا
کیا۔ تقریباً ہر ادبی انعامی مقابلوں میں اول آئی۔
س وقت تک ادب کے الف بے سے بھی واقف نہ تھی
خود کو نہایت عقلمند اور بہترین افسانہ نگار سمجھنے لگی۔
ایک گجراتی دوست کی ضد پر اکنومکس چھوڑ اردو آنرز
کرلیا۔ بی۔ اے ختم بھی نہ کر پائی تھی کہ انگلش کے
قمر التوحید صاحب سے شادی ہوگئی۔ شادی سے قبل
کے پروفیسر کی ہیبت طاری تھی لیکن انہیں بھی اردو ادب کا
دلدادہ پایا تو جان میں جان آئی۔

قمر کے افسانے اور ادبی ذوق کو دیکھ کر ایک دفعہ
پھر احساس کمتری کا دورہ پڑا۔ لکھنا پڑھنا چھوڑ چھاڑ، کھانے
اور گپ کرنے کو معراج زندگی سمجھا۔ لیکن قمر کی ضد اور زبردستی
نے پھر اس راہ پر لا ڈالا ہے کہ کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔

۷۰ ۔ ۱۹۶۷ میں میں قمر کے ساتھ حیدرآباد میں تھی۔ اُن
دنوں ہم دونوں اپنے اپنے PH. D. کا مقالہ لکھنے میں
مصروف تھے۔ وہاں مخدوم محی الدین مرحوم، زینت ساجدہ
مغنی تبسم، حسن عسکری، عالم خوندمیری، احمد ہمیش، مصطفےٰ
کمال پاشا وغیرہ وغیرہ نے ہم دونوں کو نہایت "ادبی انسان"
بنا ڈالا۔ مجھے اب تک اپنی نااہلی کا کافی احساس ہو چکا تھا۔
سو وقت بے وقت نروسنیس کا دورہ پڑتا۔ مگر سب سے مشکل اس
وقت پیش آئی جب زینت آپا نے باضابطہ طور پر عورتوں کا ایک
جلسہ منعقد کیا۔ نہایت اہتمام سے دعوت کا انتظام ہوا اور میں
بیچاری خاص الخاص افسانہ نگار پیش کی گئی۔ وہاں نجمہ نکہت
اور جیلانی بانو سے ملاقات ہوئی۔ میں نے بدک کر افسانہ کے
بدلہ ایک مقالہ ہی پڑھ ڈالا۔ لیکن مقالہ سن کر پھر وہی افسانہ
کی فرمائش ....

اب سوچتی ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ وکیل، ڈاکٹر، انجینئر
یا کسی اور قسم کے نوکری پیشہ شوہر سے میرا واسطہ نہ پڑا ورنہ اپنی افسانہ نویسی
کی دھاک جما کر اور اردو ادب کا الف۔ بے کا رعب گانٹھ کر اُسے تو
یقیناً احساس کمتری میں مبتلا کردیتی اور خود بھی کچھ نہ سیکھ پاتی۔
اب یہ حال ہے کہ خود کو ایک نہایت مجہول سی شئے محسوس کرتی
ہوں۔ اس عظیم دنیا کی ایک نہایت چھوٹی سی شئے جیسے زمین پر
رینگتی چیونٹی یا کوئی برساتی پتنگا۔ چونکہ زندہ ہوں اس لئے اسی
دنیا کی شئے ہوں۔ مگر اب کوئی ان سے کہے کہ "میں کا تعارف"
لکھو تو بھلا کیا ہو ؟

——— ———

شمیم انجم

منزل کہاں ہے تیری

[illegible] کے آئی۔ اے۔ ایس میں کامیاب ہوتے ہی
[illegible] روں میں اچانک کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ہر جوان لڑکی کے
[illegible] کو نہایت شوق سے سُنا اور سُن کر بھی انجان بن
[illegible] بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی لیکن مختلف
[illegible] وقت فوقتاً رفعت معظم کا نام سنا جانے لگا۔ رفعت
[illegible] میں بھی کچھ ایسی ہی متبلہ خصوصیات جو وہ والدین کی توجہ
[illegible] تھے۔ ماں باپ بچپن ہی میں سدھار گئے تھے۔
[illegible] اور ان کی مختصر سی جائیداد جس کے سہارے آج
[illegible] تھے اور اس بھاگتی سرکتی دنیا میں انہوں نے
[illegible] سے جمائے تھے۔ گورا گورا رنگ، بھرا بھرا
[illegible] بھرا جسم اوسط درجہ کی آنکھیں، ذرا موٹی سی
[illegible] اگر وہ اعلیٰ درجہ کے ہیرو نہیں تو اچھے بھلے نوجوان
[illegible] در اصل رفعت معظم میں کوئی ایسی کمی نہ تھی جو انہیں
[illegible] خوش پوش ہیرو بننے میں مانع ہوتی۔ لیکن اس کو
[illegible] کہ یہ صرف ان کا تصوراتی بت تھا جو اب تک انہیں
[illegible] سے زیادہ آدمی بنائے ہوئے تھا۔ نہ انھیں بے حد تنگ
[illegible] سے دلچسپی تھی اور نہ پیشانی پر جھولتے ہوئے بالوں سے،
[illegible] کے دنوں میں چاک گریباں میں رنگین اسکارف کی
[illegible] نظر آتی۔ شوخ مردانہ رنگ کے پینٹ، سفید کھلے آستین
[illegible] عجلت میں بنائے ہوئے بال، چہرے پر اُبھرتی ہوئی
سنجیدگی کا ملکا سا [illegible] اور [illegible] کے قریب جو کبھی رفعت
معظم خود ہی [illegible] لگتے۔ اس پر [illegible] انہوں نے موجودہ
روش کے مطابق شادی [illegible] کا اعلان کیا اور نہ
ہی [illegible] اور [illegible] کی فہرست اپنی سروس [illegible] بورڈ کے ساتھ
لگائی بہرحال رفعت معظم آج کل کے نوجوانوں کے ہجوم میں خود کو
ملانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کا ایک سہانا خواب
دیکھ رہے تھے جہاں سکون زیادہ تھا اور انتشار کم۔ سادگی اور
سپردگی زیادہ تھی بناوٹ اور [illegible] کم۔

جوان لڑکیوں کے والدین کے لئے رفعت معظم ایک سہانا
خواب بن گئے۔

"بھلا اس سے اچھا اور سلجھا ہوا لڑکا کہاں مل سکتا ہے۔ پھر
ساس و نند کا بھی جھگڑا نہیں۔ گھر کا اکیلا ہے۔" امین منزل
کی صحن میں تخت پر بیٹھے ہوئے ابراہیم صاحب نے سفید بچھی ہوئی
چاندنی پر نظر جمائے ہوئے اپنے منجھلے داماد سے کہا۔ "میرا خیال ہے
کہ رفعت تو شاید تم لوگ کے دوستوں ہی میں ہوں گے۔"
آس اور نراش کی کشمکش نے اُن کی آواز میں ہلکا سا
ارتعاش پیدا کر دیا اور دل میں متمنی ہوئے کہ ان کے داماد کا
جواب اقرار ہی میں ہو۔ اگر رفعت دوست ہوئے تو منہ بھی
کرنا بہرحال آسان ہی ہوگا۔ لیکن اسد نے کہا،
"رفعت سے میری ملاقات تو نہیں پھر بھی میں اُن سے

بات کروں گا۔ ویسے تو انھیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے،
کیونکہ سیدہ اُن کے خیال کے مطابق خوبصورت ہے۔ اور تعلیم یافتہ بھی۔
وہ ایک اچھی بیوی بن سکتی ہے۔"

ابراہیم صاحب ایک ٹھنڈی سی ہونہہ کہہ کر خاموش ہوگئے
اسد دن ہی دل میں ملاقات کی تدبیریں سوچتے اٹھ کھڑے ہوئے
انھیں کوئی وقت طلب بات بھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اس لئے
کہ رفعت نے جن خوب صورت خیالوں سے اپنے کردار کو سجایا
تھا۔ سیدہ اُس خواب کی تعبیر بن سکتی تھی ——— لیکن
بات بگڑ گئی۔ ابھی اسد میاں رفعت سے ملنے کا پروگرام ہی
بنا رہے تھے کہ دوسری شام دور سے انہوں نے عرفان بھائی
کو آتے دیکھا۔ ان کے ساتھ رفعت معظم بھی تھے اور دونوں "بلو
برڈ" ریستوران سے نکل رہے تھے۔ عرفان لپک کر اسد کے
پاس پہونچے۔ بڑی پرتپاک ملاقات کی اور چلتے چلاتے رفعت
سے بھی تعارف کرا دیا۔ لیکن اُن کے جاتے ہی اسد نے رفعت
معظم والے معاملہ کو تو تہہ کر کے رکھ دیا اور اپنے سسر سے عرض کر
آئے، کہ وہ رفعت کا خیال دل سے نکال دیں۔ سیدہ کے لئے
کوئی اور رشتہ تلاش کیا جائے گا۔ اب عرفان بھائی سے ٹکر
لینے کی ہمت تو اسد میں نہ تھی۔ عرفان بھائی تو اتنے داؤں پیچ
جانتے تھے کہ کوئی کم بخت ان کے دام میں ایک بار پھنس کر پھر
نہیں نکل سکتا۔ انہوں نے اپنے خاندان کی اکثر لڑکیوں کو پار
لگایا تھا۔ اور اس کے مختلف حربے انھیں اچھی طرح معلوم
تھے۔ کبھی تعریفوں کے دفتر کھول کر، کبھی مختلف بڑے رسوخ
والوں کا نام لے کر کبھی مارل سپورٹ کا واسطہ دے کر اور کبھی
اپنی مختصر سی کار پر بے تحاشہ دلفریبی کے ذریعہ وہ شے
مطلوبہ کو اس طرح مسحور کرتے کہ وہ طرح طرح کی بولیاں بولنے
لگتا۔ بہرحال اب تو معاملہ طے ہی تھا کہ رفعت معظم شاہین کے
لئے چن لئے گئے تھے۔ پھر شاہین تھی بھی تو ایسی ہی خوبصورت

فریچ کٹ بال، چست پائجامہ، ڈھیلا کرتا پہنے، پردہ والے
ماحول میں چلمن کے پیچھے سے اپنے ہیرو کٹ بھیا کے دوستوں کو
ناشتہ اور چائے اس طرح بھجواتی کہ ہر انداز میں اس کی نفاست
جھلکتی ہوئی۔ شاہین کی ہلکی ہلکی سی جھلک باہر بیٹھنے والوں
کو نظر آتی تو دل ہی دل میں شعر گنگنا کے رہ جاتے۔

شاہین عرفان بھائی کی سب سے چھوٹی سالی تھی اور
سب سے چہیتی بھی عرفان بھائی ہمیشہ ہی اُسے چڑھایا کرتے تھے کہ اس کے
لئے تو میں کوئی نہایت شاندار بندر را باندھ لاؤں گا۔ لیکن مجھے
شک ہے کہ یہ لڑکی اُسے دیوانہ نہ کر دے۔ بہرحال عرفان بھائی
کامیاب ہوئے اور شہر میں شاہین اور رفعت کی منسوب طے پانے
کی خبر گشت کرنے لگی۔ بیگم نعیم نے جو اچانک ہی رفعت معظم اور شاہین
کا قصہ سُنا تو سنتی ہی رہ گئیں۔ اُنہیں یہ بات کچھ جچی نہیں۔
ہئے ہئے کتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے نکل گیا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی
انہوں نے بڑے تاسف سے سوچا۔ یہ نعیم صاحب بھی عجیب نامعقول
آدمی ہیں۔ آج تک انہوں نے کوئی کام بھی ڈھنگ کے نہ کئے۔
خدا بھلا مردوں کو ایسی اُلٹی عقل ہی کیوں دیتا ہے۔ اگر کچھ بھی
قبل انہوں نے رفعت معظم کا نام سُنا ہوتا تو آج اُن کی روشنی
ہی سے رفعت معظم کی منسوب طے ہوتی۔ لیکن اُنہیں تو اب
بھی رفعت معظم کا صحیح پتہ معلوم نہ تھا۔ وہ گھنٹوں دل ہی دل
میں سوچتی اور افسوس کرتی رہیں اور جب بے حد اُکتا گئیں
اُٹھ کر سنگار میز کے پاس پہونچیں۔ قدِ آدم آئینہ میں دیکھ کر
بالوں کو درست کیا۔ ہونٹوں پر بڑی بددلی سے لپ اسٹک
لگا کر
ململ کی ساری کے آنچل کو درست کیا۔ قریب ہی رکھی گئی
الماری سے ایک ڈبیہ نکال کر پرس میں ڈالی اور پورچ میں
کھڑی کار میں جا بیٹھیں۔ اچانک ہی انھیں کچھ خیال آیا
اُتر کر روشنی کو بلانے چلی گئیں۔ روشنی اپنے کسی دوست
کے یہاں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بیگم نعیم کا فرمان سن

"ممی! مجھے تو بخشئے! مجھے کل کے سیمینار کی تیاری
ہے۔ اب میرا آخری سال ہے۔ اب بھی وقت ضائع کرتی
تو رزلٹ خراب ہو جائے گا۔" روشنی نے اکتا کر کہا۔
"لیکن بیٹی بات بہت بڑی ہے۔ کسی آئی۔ اے۔ ایس
سے تیری شادی ہوگی تو زندگی بھر آرام کرے گی اور میں بھی
سکھ کی سانس لوں گی۔ امتحان وغیرہ کی تیاری تو پھر کر لینا۔"
"توبہ! ممی آپ پر تو خواہ مخواہ ہی شادی کا دورہ
پڑ رہا ہے۔ صوفی آپ کے پیچھے لگی تھی آخر ان کو جھنجھٹ میں
پھنسا دیا اور اب میں اس چکر میں پڑ گئی۔ آخر آپ لوگ چین
سے کیوں نہیں دیتے ہیں۔"
روشنی نے اور بھی منہ پھلا لیا اور بڑبڑاتی ہوئی ممی
کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کار مختلف راستوں پر دوڑتی۔ چکر
لگاتی آخر رفعت معظم کے مکان پر پہونچ گئی۔
معمولی سے مکان کے برآمدے میں کرتا پائجامہ پہنے
رفعت معظم بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بیگم نعیم اور روشنی کو کار
سے اترتے دیکھ کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ بڑے ادب سے انہیں
ڈرائنگ روم میں لا کر بیٹھایا۔
"مجھے رفعت معظم آئی۔ اے۔ ایس سے ملنا ہے۔ انہیں
اطلاع کر دیجئے۔" بیگم نعیم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
"جی فرمایئے میں ہی تو رفعت ہوں۔" انہوں نے ایک
اچٹتی سی نظر روشنی پر ڈالتے ہوئے کہا۔
"ایں تم ہی رفعت معظم ہو۔ اچھا اچھا۔ بہت خوب۔" بیگم
نے اپنے جاتے ہوئے ہوش کو سمیٹا۔
"بیٹا میں مسز نعیم ہوں۔ نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ ابھی
ریٹائر ہوئے ہیں۔ ڈی۔ ایم کے پوسٹ سے۔ مجھے تم سے کچھ
ضروری کام تھا۔ میں نے سوچا، چلو تم سے خود ہی مل لوں۔ اب تو
بڑے آدمی ہو۔ ماشاء اللہ ہونہار بچے ہو۔"
"جی فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
رفعت ہمہ تن گوش ہو گئے۔
"ارے نہیں بیٹا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہارے والدین
کہاں ہیں؟"
"ان کا انتقال تو میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔" وہ ایک
ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔
"اوہو ہو ہو۔ ۔۔ بیچارہ .... بیچارہ ۔۔۔
اور بہنیں؟"
"جی بس میں تنہا ہی ہوں۔"
"اوہو ہو ... بیچارہ ... لیکن نہیں نہیں ....
ایسی کوئی بات نہیں تم ہم لوگ کو ہی اپنا سمجھو۔ یہ میری بیٹی ہے
روشنی۔ ایم۔ اے کے آخری سال میں ہے۔"
"جی بہت خوب!" رفعت دھیرے سے بولے۔
"ڈولٹ" روشنی دل ہی دل میں بڑبڑائی۔ اُسے
اپنی ماں اور رفعت دونوں ہی پر بیک وقت غصہ آ رہا تھا۔
کیا بے تکی ملاقات ہے۔ کیسی احمقانہ باتیں ہو رہی ہیں۔ اُس کا
شعور یافتہ ذہن جھنجھلایا جا رہا تھا۔ وہ اس طرح انجان بن کر
بیٹھ رہی۔ جیسے وہ بھی کمرے میں سجے ہوئے ٹیبل کرسی اور
صوفہ سیٹ وغیرہ کا کوئی حصہ ہو یا دیوار پر آویزاں کوئی تصویر
ہو۔ رفعت کی نظریں اُسے غیر حاضر پا کر آہستہ آہستہ اٹھیں اور
روشنی کے چہرے سے پھسلتی، سرکتی پیروں پر آ کر جم گئیں۔ خوبصورت
سے پیروں میں نازک سی اونچی ایڑی کی سفید سینڈل، سیاہ چست
پائجامہ، سیاہ اور سرخ چھوٹے چھوٹے پھولوں کا پھنسا پھنسا جمپر
سیاہ ہی دوپٹہ، کھلے بازو، اُلجھے اُلجھے بال۔ آنکھوں کے
کونے میں موٹے موٹے کاجل، ہونٹوں کے خم کو اُبھارتے ہوئے
پھیکے رنگ کی لپ اسٹک اور یہ روٹھا روٹھا انداز، اچانک
ہی رفعت کا دل چاہا کہ وہ اِن رس بھرے ہونٹوں کو بس کچلکچ
چبا ہی جائے۔ اُسے چیری، انگور، امرود، سیب اور نہ جانے کون
کون سے الّم غلّم پھل یاد آنے لگے۔ دھیرے سے اُس نے اپنا ہی

ہونٹ کاٹ لیا۔

"آپ کس سبجیکٹ میں ایم۔اے۔ کر رہی ہیں؟" رفعت نے اپنے ہوش مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ لمبی لمبی پلکوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ آنکھوں کے گدشیے میں دیدوں کے گھومنے کا احساس ہوا۔ نظریں کہیں اور بھٹکنے لگیں۔ جسم اور کاندھے میں ایک لچک پیدا ہوئی اور ایک بے حد مترنم آواز پیدا ہوتے ہی ڈوب گئی۔

"جی! معاف فرمائیے گا میں نے سنا نہیں۔" رفعت پوری توجہ سے سامنے جھک آئے۔

"میں سائیکلوجی میں ایم۔اے کر رہی ہوں۔" نہایت دھیمی آواز میں دوبارہ جواب ملا۔ رفعت کو چائے کی پیالی میں قند کی ڈلیاں تلخ سی معلوم ہوئیں۔

"اوہو سبجیکٹ تو آپ نے نہایت دل چسپ چنا ہے۔" انہوں نے خوش اخلاق بننے کی کوشش کی۔ خمیدہ پلکوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ لہرائی۔ رفعت معظم کے ہوش دوبارہ جانے لگے۔ نوکر چائے کی ٹرے اور پلیٹ میں بسکٹ اور سیب کی قاشیں لے آیا۔ رفعت آگے بڑھے

"ارے رہنے دیجئے ...... تم بیٹھو رفعت۔ روشنی بیٹا تم چائے بناؤ نا۔" بیگم نعیم نے نہایت خلوص اور بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ ایک فتنہ خیز انداز میں روشنی اٹھی اور ٹیبل کے قریب آ گئی۔ رفعت کی آنکھیں ایک بار پھر روشنی کے جسم پر گڑ گئیں۔ دراز قد۔ بے حد سڈول جسم، پتلی لچکتی کمر، بغیر آستین کے جمپر میں چکنے بازو۔ کھلے گریبان سے جھانکتی ہوئی خوبصورت گردن اور پوشیدہ ابھار نے اس کی توبہ پھر توڑ ڈالی۔ اسے اچانک ہی وہ مچھلی جیسی کوئی مخلوق معلوم ہونے لگی۔ جو کہیں سے پھسل کر اس کے ڈرائنگ روم میں آ گری ہو۔ رفعت نے اپنے چکنی پھسلتی ہوئی چیز کو وہ اپنے بازوؤں میں اس طرح جکڑ لے کہ اس کے پھسل کر گرنے کا خدشہ ہی نہ رہے۔

روشنی نے بڑی نزاکت سے چائے بنائی اور پیالی میں شکر ڈال کر ملانے لگی۔ ایک لطیف سی آواز کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔ اور رفعت پھر بکھرنے لگے۔ اسے اپنا خالہ زاد بہن سکینہ کا چائے بنانا یاد آیا۔ کتنا تضاد تھا دونوں میں۔ لسڑ پھسڑ کپڑے پہنے چائے کی ٹرے میں چائے دانی سے چھلکتی چائے لئے۔ بکھرے بالوں کو بار بار لپیٹے ہوئے چائے پیالی میں انڈیل کر دھواں دھار پٹاخے کی سی آواز میں شکر ملانے لگتی۔

"ہاں بیٹا! میں نے کہا تھا نا کہ تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔" بیگم نعیم کی آواز نے رفعت کو جیسے جاگتے خواب سے بیدار کیا۔

"جی ہاں! فرمائیے۔ میں حاضر ہوں۔"

"بیٹا بات دراصل یہ ہے کہ میں بیسویں صدی میں بھی زیادہ دقیانوسیت کی قائل نہیں۔ اور پچھلے رسم و رواج کو جائز نہیں سمجھتی۔ خاص کر لڑکے لڑکیوں کی شادی کا معاملہ تو ایسا کہ جب تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی پسند کا اظہار نہ کریں غیر دانستگی کی شادی تو میں ظلم ہی سمجھتی ہوں۔ اور اب شادی بھی کچھ اتنی کم سنی میں نہیں ہوتی جیسی گزشتہ دنوں ہوا کرتی تھی۔ لڑکے لڑکیاں خود ہی سمجھ دار ہو جاتے ہیں۔"

"جی ہاں! درست فرمایا آپ نے۔"

"تو بیٹا میں نے بھی سوچا کہ تمہاری اور روشنی کی ملاقات کرا دوں۔ تمہاری تعریفیں تو میں نے بہت سنی ہیں۔ اگر تم دونوں کو میرا مشورہ پسند آ جائے تو ماشاء اللہ جوڑا بہت اچھا ہوگا۔ میری روشنی بھی اللہ کے فضل سے بڑی ہونہار اور سمارٹ بچی ہے۔"

"جی جی جی جی ہاں! بجا فرمایا آپ نے۔ روشنی صاحبہ بہت اچھی ہیں۔" رفعت کو اپنے کان کی لوئیں جلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ روشنی کی سانولی رنگت پر کسی قسم کا رنگ نہیں آیا وہ بڑی بے تعلقی سے بیٹھی اپنے گلابی رنگے ناخنوں کو کھرچتی رہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے بیٹا؟ کیا یہ رشتہ تمہیں پسند ہے؟ ویسے تو یہ بڑی ہنسوڑ لڑکی ہے۔ لیکن ابھی خواہ مخواہ ہی شرمائی جا رہی ہے۔"

"لیکن صرف میری ہی پسند اور ناپسند پر کیا منحصر ہے۔ اب جو تو بھی تو اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔" رفعت نے ... کی کوشش کی۔

"... تو میں اپنی بٹیا سے پوچھ ہی چکی ہوں۔ لیکن آخر ... تیار ہو، تم بھی تو کچھ کہو۔"

"جی ... وہ ...... وہ ایسا ہے نا کہ ..."

"ارے ... پوچھو ......"

"بیٹے! اب تم بھی کمال کرتے ہو۔ اس عمر میں ... کیا پوچھنا اچھی ضرورت ہے۔ پھر شادی تمہیں کرنی ہے یا تمہاری بچی کو۔ ... صاف دل سے تمہیں روشنی پسند ہی ہے ... اظہار کرتے جھجک رہے ہو۔"

"جی نہیں! بات دراصل یہ ہے کہ ......"

"نہیں بیٹا! کوئی جھجک نہ رکھو۔ دیکھو میں تمہارے ایک چیز لائی ہوں اور امید ہے کہ یہ تمہیں ضرور پسند آئے گی۔"

نعیم نے پرس کھول کر بڑی احتیاط سے ایک ڈبیہ نکالی۔ ڈبیہ کھول کر ایک یاقوتی نگ کی جگ مگ کرتی انگوٹھی اپنی انگلیوں میں پکڑ کر رفعت کے سامنے کر دی۔ رفعت بالکل ہی جھلا گئے۔ گھبرا کر انہوں نے روشنی کی طرف دیکھا لیکن وہ سار ... سے بے نیاز بیٹھی ٹیبل کرسی اور کمرے کی مختلف چیزوں کو بے تحاشا گھورے جا رہی تھی۔

"کیوں کیا یہ تمہیں پسند نہیں ہے۔؟"

رفعت خاموش رہے۔ وہ سوال کی نوعیت بھی نہ سمجھے۔ بیگم نعیم کیا پوچھ رہی تھیں۔ اُسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ انگوٹھی پسند ہے یا مچھلیوں جیسی چکنی ہر موضوع سے بے تعلق بیٹھی روشنی؟

رفعت معظم جھنجھلا گئے۔ نہ جانے بیگم نعیم کی چابک دستی پر یا روشنی کی بے تعلقی پر یا اپنی بے بسی پر۔ اپنی اہمیت کے احساس نے رفعت معظم کو روشنی پر غالب آنے کی خواہش اچانک ہی کئی گنا زیادہ شدید کر دی۔

وہ روشنی کی بے تعلقی پر مسکرائے اور بڑے اطمینان سے بولے۔

"مجھے دونوں ہی پسند ہے۔ آپ کی لائی ہوئی انگوٹھی بھی اور روشنی بھی۔"

بیگم نعیم کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن روشنی ابھی تک ہینڈلوم کاریگری کا بہترین نمونہ بنی ویسی ہی بے تعلق بیٹھی رہی۔ انگوٹھی رفعت کی انگلیوں میں ... رہ گئی۔ اور اس کے آئینہ میں بکھرے بالوں کی ایک لمبی چوٹی لیے سادہ چہرہ، مسکراتی آنکھیں، ساری کے آنچل کو کمر میں کھونسے، چائے کی کشتی سینے سے لگی ہوئی لڑکی کی تصویر جھلک ... کر رفعت کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ — —

نسیم فراقی

ہم بھی کیا یاد کریں گے ......

جنت کی بلندی سے جھانک کر دیکھا کرتی ی
آہستہ سے رحم کر بہٹ گئی۔ شاید اُسے یہ
ں کا کوئی بھائی بھتیجا یا آپا اس کی اس حرکت
ر نصیحتوں کا طومار شروع ہو جائے۔ اس لئے کرمی
ی اس پلنگ کی پٹیوں میں چھوٹے چھوٹے لتے
ی طرف پرواز کر گیا تھا اور اب جنت کے ہنڈولے
۔ جب حضرت دشمنِ جاں سے میری ملاقات
، خواب میں مجھے موت کی سرحدوں سے ہم آغوش
تھی۔ خواب کی ہیبت سے جاگ کر وہ اُٹھی تو
ح بے بس پڑا دیکھ کر پھر سو رہی۔ اس لئے کہ میری
ے درمیان فرق ہی کیا تھا۔ ویسے بھی زندگی اور
رف حرکات و جمود ہی کا فرق ہے سو میرے
نہیں آئے۔

ستوں کے سایہ میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے
پاگل تھا۔ میں اس کے پاگل خمیر سے ہی ماں کے
ں چڑھا۔ سنتا ہوں کہ میری ماں کی معصومیت پر
ر اباپ پاگل ہو گیا تھا۔ اُسے ایک نامعلوم سے
ا۔ کسی ناکردہ گناہ کا ڈر جس کا احساس اُسے
تا۔ لیکن میرا باپ نہایت کمزور دل کا انسان تھا
لہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی حوصلہ مند

ہوں گے جو ہر گناہ کو امرت کی طرح پی کر سرشار رہا کرتے
تھے ...... لیکن ...... لیکن میرا باپ تو اپنے
وجود ہی کو گناہِ عظیم سمجھتا تھا۔ سو وہ کسی ناکردہ گناہ کی حسرت
لئے ہی نیم مجنوں ہو گیا۔ اور جب اُسے میری ماں کی معصومیت کا احساس
ہوا تو پاگل ہو گیا۔ میری نو بیاہتا ماں نے اس کے پاگل پن کو گلے
سے لگا کر سنبھالنا چاہا تو وہ میری ماں کی زندگی کا دشمن ہو گیا۔
مجبوراً ڈر کر وہ اپنے میکے بھاگ آئی اور میری پرورش میں مصروف
ہو گئی۔ اس پرورش کے زمانہ میں وہ مجھے طرح طرح کے ناموں
سے پکارا کرتی۔ کبھی راجیش کھنہ کہتی، کبھی سنجیو کمار۔ طرح طرح
کے کپڑے سی کر پہناتی۔ میرا منہ دھلاتی، غسل کراتی، پیاخانہ
صاف کرتی، گود میں بٹھاتی، کھانا کھلاتی اور راتوں کو اُٹھ کر
میرے پاس بیٹھی رہتی۔ میں بڑھتا گیا۔ لمبا ہوتا گیا۔ میری ماں میرا
بوجھ اب مشکل ہی سے اُٹھا سکتی تھی۔ کیونکہ اتنی عمر میں بچے
ماں کی گود میں نہیں رہتے۔ بلکہ کبڈی کھیلا کرتے ہیں۔ لیکن
میں اپنے پیروں پر کبھی کھڑا نہ ہو سکا۔ اپنی کمر کے سہارے بیٹھ نہ
سکا۔ اپنے ہاتھوں سے کچھ اُٹھا نہ سکا۔ وہ تو میری ماں تھی
جو دن رات میری خدمت کیا کرتی تھی۔ پھر بھی میں اپنی ماں کو
دیکھ نہ سکا۔ کبھی اُس کی آواز سُن نہ سکا۔ ارے میں تو کچھ عجیب
سی مخلوق تھا۔ گونگا، بہرا، اندھا، ناسمجھ اور اپاہج، گوشت
و پوست کے لوتھڑے کے درمیان صرف اوپر نیچے چلتی ہوئی سانس۔

اور ان سانسوں کا ایک طویل سلسلہ جو خدا کی رحمتوں کی طرح جاری و ساری تھا۔ میرے حصے میں زندگی کی کچھ عجیب تکلیفیں آئی تھیں۔ لیکن جو اس قسم نہ تھا کہ ان کو سمجھ سکتا۔ دل کھول کر رو پڑ سکتا یا قدرت کے اس تماشا پر ہنس ہی سکتا۔۔۔ وہ تو کچھ عجیب تکلیفیں تھیں جن کی شدت سے میں ایک بھیانک چیخ نکال کر اٹھ جاتا۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔ جیسے شاید میرا جسم بجلی کے ننگے تاروں سے چمٹ گیا ہو۔۔۔۔۔ یا شاید میری تکلیفیں اور بھی شدید ہوئیں۔ میری ماں مجھے لے کر ڈاکٹروں کے دروازوں پر دستک دیتی رہی۔ اسپتالوں کے چکر کاٹتی رہی لیکن تو یہ ہے اسپتال میں تو مجھے تحقیق کا ایک نیا موضوع بنا کر طلباء کے درمیان چھال دیا گیا۔ اور میری ماں کے دکھ کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے معنی خیز شوروں کو چھپا لیا گیا۔ میری ماں آس و نراش کی کیفیت میں ڈوبی ڈاکٹروں کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ ان کی تشخیص جاننے کے لئے بے چین پھرتی رہی اور آخر کار اس نے صبر کا ایک بہت بڑی سل اپنے سینے پر رکھ لیا تاکہ اس کی ایک چھوٹی سی آہ بھی باہر نکلنے نہ پائے اور اس کے تپش کی شدت اس کے سینے کو اندر ہی اندر جھلساتی رہے۔ وہ سینما کی بڑی شوقین تھی لیکن اس نے پکچر دیکھنا چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ میں تنہا جو پڑا رہتا تھا۔ پھر اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ کسی سے نہ ملتی پھر بھی لوگ اس سے ملنے ضرور آتے۔ اور مجھے بھی ضرور دیکھتے میں تھا بھی قابل دید نظارہ ایک زمانہ مجھے دیکھنے آتا تھا۔ اور میں سارے جہاں سے بے پروا پلنگ پر لیٹا اپنا سر دائیں بائیں نفی کے انداز میں تیزی سے ہلاتا رہتا۔ شاید یہ منکرانہ انداز ہی میری زندگی کا بہترین سرمایہ تھا۔ اس کائنات کا ایک واضح سمبول دیکھنے والوں کے سر دکھ جاتے لیکن میں اسپرنگ کی گڑیا کی طرح سر تب دیکھاتے دیکھلتے نہ تھکتا۔ میرے والدین نے میرا نام انوار رکھا تھا۔ نور کی جمع انوار۔ لیکن میں تو مکمل ظلمات تھا۔ پانچ سال کی عمر سے ہی میرے رشتہ دار میرے مرنے کا انتظار کرنے لگے۔ اس لئے کہ میں گلتے گلتے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا نہ جانے کتنی طرح کے جراثیم تھے جو میرے جسم کو چھلنی کر چکے تھے۔ میری ماں ڈاکٹروں پر جب ڈاکٹر مجھے دیکھنے آتے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سی دوائیں میرے لئے تجویز کریں۔ پھر بھی میری ماں مجھے ہر وقت دوائیں کھلایا کرتی تھی۔ میں درد کی شدت سے تڑپتا تو میری ماں میرے مرنے کی دعائیں کرنے لگتی میرے نانا ہی یا نہوں میں اپنا منہ چھپا لیتے اور آیاتِ آسمانی کی گونج میری ان کے کانوں کو جھنجھنا دیا کرتی کہ۔

"میں والدین کے گناہوں کا بدلہ ان کی اولاد سے لیتا ہوں۔" (زبور)

ایک دبی دبی سی صدائے احتجاج میری ماں کی آہوں میں ہی گھٹ کر رہ جاتی۔ اور اس کا ذہن سوچتے سوچتے مفلوج ہو جاتا کہ آخر یہ اس کے کن گناہوں کی سزا ہے؟ خیر تو میں اپنی زندگی کے تیرہ سال بہت تباہ حال رہا۔ گلتے گلتے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ ڈائریا کی شدت سے میری بے نور آنکھیں جن میں صرف ہلکی سی دھند تھی سرخ ہو کر سیلی ہو چکی تھیں اور اب میرے سامنے گھپ اندھیرا تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا۔ پھر بھی میرا جسم جیسے بجلی کے تاروں سے ہمیشہ چمٹا رہتا میں دن رات روتا اور کراہتا رہتا۔ گھر بھر کی نیند میں نے اچاٹ کر رکھی تھی۔ میرے ماموں ڈاکٹر کے یہاں جاتے اور طرح طرح کی نیند کی گولیاں لا کر دیتے تاکہ میں سوتا رہوں اور سبھوں کی نیند میں خلل انداز نہ ہوں۔ ادھر میں تھا کہ روتے چیختے محلے والوں کی بھی نیند خراب کرتا تھا۔ بستر پر پڑے پڑے میرے جسم کے چمڑے ہر جگہ پھٹ گئے تھے۔ ان سے خون اور پانی رستا رہتا میرے جسم پر زخم ہی زخم تھے۔ گھاؤ ہی گھاؤ۔ میری شریانوں میں خون پانی بن کر دوڑ رہا تھا اور جسم کا ہر حصہ سوج گیا تھا پھر بھی میری سانسوں کا سلسلہ ٹوٹتا نہ تھا۔ اس کا زیر و بم تھمتا نہ تھا۔۔۔۔ اسی تباہ حالی میں میں تین دنوں تک بے ہوش

پڑا جاگتا سو رہا۔ اس رات میری ماں نے مجھے نیند کی گولی میں شاید امرت گھول کر پلایا تھا۔ مجھے ایسی گہری نیند آئی کہ میرے تمام دکھوں کا خاتمہ ہو گیا۔

گھر پر ایک ہجوم تھا۔ لوبان، اگر، صندل اور کافور کی ملی جلی سوگوار مہک پھیل رہی تھی۔ عورتوں کی چہ میگوئیاں اپنے عروج پر تھیں۔ طرح طرح کی قابلیت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ مذہبی معتقدات کے اٹل فیصلے صادر ہو رہے تھے۔ جنازے میں انہی ہنگاموں کے ساتھ سپرد خاک ہوا۔

میری ماں نے بہت ضبط کی انتہا کر دی۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں درد کی لہریں اٹھا کرتیں۔ گھنٹوں وہ بیٹھی اس جگہ کو خاموشی سے تکا کرتی جہاں کبھی یہ پلنگ رہا تھا۔ کبھی چپکے سے میرے کپڑوں کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیتی یا سینہ سے اس طرح چپکائے کھڑی رہتی گویا اس نے مجھے ہی سینہ سے لگا رکھا ہو۔ تب ہی میں نے اپنی ماں کے لئے ایک عجیب سی کسک، ایک انوکھا درد محسوس کیا۔ تب ہی میں نے اپنی ماں کو دیکھا، پہچانا اور سمجھا۔ ارے یہ تو ایک کمسن سی دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ جس کے چہرے پر مصور کائنات نے غم کی بے پناہ گہری گہری لکیریں بکھیر دی تھیں۔ گندمی رنگت پر کھوئی کھوئی آنکھیں، سیدھی مانگ میں بکھرے بکھرے بال لئے مکان کے گوشہ گوشہ میں نہ جانے کیا ڈھونڈھتی رہتی۔ اب میرا احساس میرا شعور مجھے مجبور کرتا کہ میں ہمک کر اپنی ماں کی گود میں چلا جاؤں۔ اس کے سینہ سے لگ جاؤں اور اپنے آنسوؤں سے اس کے چہرے کے تمام غم دھو ڈالوں۔ لیکن میں تو جنت کی بلندیوں میں اٹکا رہا۔ اور اپنی تمام کوششوں کے باوجود نیچے چھلانگ نہیں لگا سکا۔ ہائے میں تو اس دنیا کی پستی ہی میں اچھا تھا کہ نہ شعور تھا نہ احساس۔ گوشت و پوست کا ایک نا تمام لوتھڑا اور بس۔ جسے نہ اس کی ماں کے درد کی خبر تھی نہ اپنے وجود کا احساس

لیکن اب ——— اب تو میرے دل و دماغ پر زخم ہی زخم تھے۔ گھاؤ ہی گھاؤ میری کراہتی نظریں ہر وقت اپنی ماں کے چہرے پر جمی رہتیں۔ میرا دل ماں کی گود میں جانے کو ہمکتا رہتا اس کے سینہ سے لگ جانے کو مچلتا رہتا۔ ہائے یہ زندگی اور موت کی کیسی دوری تھی کہ اس میں زمین و آسمان کی وسعت حائل تھی۔

— —

اپنی تخلیق کے اختتام پر اپنا پتہ جلی حروف میں ضرور تحریر کریں۔ (ادارہ)

شمیم افزا قمر

زندگی زندگی

"ہو ماڈرن سوسائٹی! آج کی تازہ خبر۔"

"یوسفی صاحب نے سوسائیڈ (Suicide) کر لیا"

"ٹھیک ہی کیا۔ جی کر بھی کیا کرتے۔"

"زندہ رہتے۔"

"کس کے لئے۔؟"

"سوسائٹی کے لئے۔"

"کیا دیا تھا سوسائٹی نے انہیں؟"

"کیا نہیں دیا تھا انہیں؟"

"کون تھے وہ؟"

وہ حیدرآباد میں رہتے تھے۔ اُن دنوں حیدرآباد جل رہا تھا۔ چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ تقسیم کی آگ، نفرت کی آگ، اندار و مرثیہ کی آگ، گولیوں کی بوچھاڑ کی آگ۔ آندھرا اور تلنگانہ والے ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھے۔ شہر لُٹ رہا تھا۔ دکانیں جل رہی تھیں۔ راستے بلاک تھے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر اور پول سڑکوں پر پڑے تھے۔ اسکول، کالج اور دفتر بند تھے۔ آرمڈ فورس (ARMED FORCE) جلوس، کرفیو آرڈر، ایمبولنس کی گھڑگھڑاہٹ، زخمیوں کی چیخ و پکار، خوف و دہشت شہر کی زندگی تھی۔ خوبصورت شہر حیدرآباد جل رہا تھا اُن دنوں۔ لیکن شہر سے سات آٹھ میل دور

عثمانیہ یونیورسٹی کیمپس اب بھی ویسا ہی خاموش، پُروقار اور پُرسکون تھا۔ اونچے نیچے ٹیلوں پر ہوائیں بڑی سبک رفتاری سے بہتی تھیں۔ پیچ و خم کھاتی ہوئی چکنی سڑکوں کے دونوں طرف درخت جھومتے تھے اور کوارٹرس کے بچے بڑی بے فکری سے اپنی چھوٹی چھوٹی سائکلیں دوڑاتے پھرتے تھے۔ شام کے جھٹپٹے اکثر و بیشتر یونیورسٹی کے کوارٹرس سے ریڈیو کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دیتی۔ کیمپس کے رہنے والے شام کی پرادیشک سماچار بڑے جوش و خروش سے سنتے تھے۔ اسی کیمپس کے آخری سرے اور [illegible] پر دس بجے دن کے قریب ایک خوبصورت سفید مکان سے بڑے دل خوش کن قہقہے بلند ہوتے۔ یہ بڑے مہذب اور سوشل لوگ ہوتے تھے۔ شہر کے چند معززوں میں اُن کا شمار تھا۔ دس بجتے بجتے حسین صاحب کے بے تکلف دوست اُن کے گھر پر جمع ہوتے۔ ان کی بیویاں بھی اُن کے ہمراہ ہوتیں۔ ڈرائنگ روم کے ٹیبل اور سائیڈ ٹیبل ایک طرف کر دیے جاتے۔ چاروں طرف قرینہ سے رکھے ہوئے صوفے سرکا کر درمیان میں جگہ بنائی جاتی۔ اور خوبصورت قالین پر حسین صاحب کے دوست اور ان کی بیویاں بیٹھی کارڈس کے دو تین پیکٹ لئے کھیل میں مصروف ہوتیں۔ رمی کا دور چلتا رہتا۔ ہار پہ ہار ہوتی۔ جیت پہ جیت ہوتی۔ قہقہے بلند ہوتے۔ چائے کا دور چلتا اور جلتے ہوئے حیدرآباد کی تپش یہاں ذرا

سی محسوس ہوئی۔ حسین صاحب کو ان پتوں کے کھیل سے زیادہ
مان نوازی کا شوق تھا اور بیگم حسین کو مہمان نوازی سے زیادہ
تیں کا شوق تھا۔ حسین صاحب اپنی نگرانی میں نوکروں سے
ہوئے ہوتے۔ چائے منواتے اور ٹرے ہاتھوں سے نکلے
تو وہی اپنے دستوں کو گرم گرم ٹیوٹرے اور چائے پیش کرتے
ت کی سانولی سونی بیگم جو ذرا موٹاپے کی طرف مائل تھیں،
یل میں مصروف ہوتیں۔ اُن کے بہت چھوٹے کٹے ہوئے بال
اندھوں سے اوپر کان پر جھولتے رہتے۔ سفید موتی کی مالا اُن کی
سی قدر موٹی گردن میں پھنسی ہوتی۔ موتی کے سفید ٹاپس
ن کے کانوں میں چمکتے رہتے اور آنکھیں کچھ کھوئی کھوئی
رہتیں۔ ۔۔۔ سوچ میں ڈوبی۔ چائے سے انھیں ذرا کم ہی
رغبت تھی۔ اس لئے حسین صاحب جب اپنے مہمانوں کو چائے
پیش کرتے تو وہ ایک گلاس بیئر پی لیتیں۔ حسین صاحب
عثمانیہ یونیورسٹی میں ایڈوانس میتھمیٹکس کے پروفیسر تھے اور
ن کی بیگم وہاں کی مصروف ترین سیاسی کارکن تھیں۔ اکثر
کثر وہ کھیل کے دوران ہی پتے پھینک کر اٹھ کھڑی ہوتیں اور
میٹنگ اٹینڈ کرنے چل دیتیں۔ اُن کی غیر حاضری میں محفل ویسی
ہی جمی رہتی۔ حسین صاحب کے دوست کی بیویاں اسی طرح کھیل
میں مصروف ہوتیں۔ لیکن اس دن کھیل کچھ جمتا معلوم نہیں ہوتا تھا
بیگم حسین اپنی میٹنگ اٹینڈ کرنے جا چکی تھیں۔ اور یوسفی صاحب
کے آنے میں آج خلاف توقع دیر ہو رہی تھی۔ وہ اس محفل کے
خاص الخاص ممبر تھے۔ ان کی شخصیت کا جادو ہر محفل میں سر
چڑھ کے بولتا تھا۔ اگر وہ راجاؤں اور بادشاہوں کے زمانہ میں
ہوتے تو ایک کامیاب داستان گو ہوتے۔ ویسے بھی عثمانیہ
یونیورسٹی کے چند مشہور اساتذہ میں اُن کا شمار تھا۔ لیکن آج
ان کے بغیر محفل سونی سونی تھی۔ کلیم صاحب پہلو بدل رہے تھے
ان کا پتوں میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مسکرا کر اُنہوں نے کہا
" نہ جانے کیوں اب تک یوسفی نہیں آئے؟ خواہ مخواہ
ہی بور کر رہے ہیں۔ "

بیگم کلیم نے بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملائی "بھلا یوسفی صاحب
کے بنا ان پتوں کے کھیل کیا۔ کتنے گُر جانتے ہیں وہ۔ "

" مزہ تو یہ ہے کہ بیگم یوسفی بھی خوب ہیں۔ کیا ہی اچھی باتیں
کرتی ہیں۔ بس ذرا بچوں کو بدتمیز کر رکھا ہے۔ "

" جی ہاں! آپس میں دونوں کے جھگڑے بھی خوب ہوتے ہیں۔ "

" مشکل تو یہ ہے کہ دونوں کی طبیعت بالکل نہیں ملتی۔ "

" یوسفی میں Talent ہے اور ان کی بیگم بس واجبی
واجبی سی چیز ہیں۔ "

" لیکن کبھی جھگڑے کی بنا کچھ INTELECTUAL
REASONS تو ہوتے نہیں۔ "

" معاملہ تو ان کی فضول خرچی کا ہے۔ "

" ہاں! یوسفی کو رئیسانہ روش کی بُری عادت ہے۔ "

" افسوس، رئیس کے شوق نے انھیں برباد کر دیا۔ "

" اور کیا شراب نے نہیں۔ "

" بھئی خوب پلاتا ہے۔ دل کھول کر۔ اُس کی دعوت
میں تو مزہ ہی آجائے۔ "

" ہاں! شکوہ کسی ایک کا کہاں، یہاں تو ہر رنگ
دو آتشہ ہے۔ "

" اُن کی باتیں کتنی اچھی ہوتی ہیں۔ "

" اُن کا دل کتنا عجیب ہے۔ "

" اُن کے چہرے پر ملال کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ "

" وہ گھٹنوں گھٹنوں قرض میں ڈوبے ہیں۔ "

" لیکن یوسفی اب تک آئے کیوں نہیں؟ "

" اب آ ہی جائیں گے۔ "

" یوسفی کے بنا کھیل کیا جمے گا۔ "

" یوں کہو کہ محفل کا رنگ بجھا ہوگا۔ "

" یوسفی کیوں نہیں آئے؟ " [بقیہ صفحہ ۵۹ پر]

شمیم افزا قمر

انٹرویو

پبلک سروس کمیشن کے کمپاؤنڈ میں قدم رکھتے ہی اُسے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ ایک سرور کا احساس، جیسے اُس نے کوئی خمار آلود مشروب پی لیا ہو۔ فتح و کامرانی کی مشروب جس کی انوکھی مسرت اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ شانوں تک بکھرے بال پیچھے کی طرف دو چھوٹی چھوٹی کلپ سے بندھے تھے۔ اونچے لمبے قد اور جسم کے خوب صورت نشیب و فراز پر شیفون کی پھولدار ساڑی بہت سج رہی تھی۔ اُس کا مجموعی تاثر بڑا دل خوش کن تھا۔ جیسے بہار کا تازہ پھول۔ اُس نے اپنے ساتھ شامل ہونے والے امیدواروں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور غرور سے سربلند ایک بدحواس سے لڑکے سے خواہ مخواہ ہی اُلجھتی سُلجھتی رہی۔ کوئی اس کی بکواس سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ سب اپنی ہی بدحواسیوں میں مگن تھے۔ انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔ مقابلہ سخت تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں کی ایک لمبی تعداد آس و نراش کے درمیان ہچکولے کھاتے یکے بعد دیگرے اپنی قسمت آزمانے چلے جا رہے تھے۔ ایک وہ تھی کہ اطمینان و سکون کے سب سے اونچے زینہ پر قدم جمائے اپنے ساتھی امیدواروں کو زہرخند سے تکتی اپنے سر کو بڑے دلربانہ انداز میں جھٹک جھٹک دیتی تھی۔ اس کی ہر ادا شان بے نیازی کی اترائہٹ تھی۔ اس دفعہ اس نے اپنے

تھی کیونکہ [illegible] درست کر رکھے تھے۔ [illegible] سلسلہ ختم کر دیا تھا۔

یہ آج کی بات نہیں تھی بلکہ دس سال قبل سے ہی وہ اپنی حماقتوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ آنرز، ایم۔ اے، ریسرچ، سپیریئر جیسے انٹلیکچوئل گورکھ دھندوں کے آئیڈیل کو ایک زمانہ تک سینہ سے لگائے وہ بہت سی خوش فہمیوں میں مبتلا رہی۔ لیکن مشکل یہ ہو جاتی کہ ہر آئیڈیل اس کے ہاتھوں سے پھسل کر چکنا چور ہو جاتا۔ اس فراخ دلی کے زمانہ میں جب ہر کوئی کسی کو کچھ دے دینے کی سعی مسلسل میں مصروف ہوتا تو وہ اپنے دونوں ہاتھ سمیٹ کر اس طرح پیچھے کھسکتی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو یا کسی بھیانک خواب سے جاگ کر لرز رہی ہو۔ اُسے وہ مشہور زمانہ جملے بھی یاد تھے جن کی گستاخ نگاہوں سے بے چین اس کی ساتھی نزہ تو بولائی بولائی پھرتی تھی۔ اونچے کلاسیز میں پروفیسرس کی نظروں کی گستاخیاں تو خیر معاف ہی تھیں لیکن مشکل تو اس وقت پیش آتی جب گستاخیاں سہنے والی میرٹ (MERIT) پر امتحانات کے نمبر بٹنے لگتے۔ یا پھر روز جن مشکلات سے دوچار ہوئی تھی ویسی کتنی ہی مشکلیں پیدا ہو جاتیں۔ بیچاری نزہ تو ابھی بھاجی کی نظروں ہی کی تاب نہ لا پائی تھی کہ ایک نیا شگوفہ پھوٹا۔ انہوں نے اپنے بیٹا کی شادی کے لئے پیغام بھیجا تھا۔ اس کے پاپا کو اس رشتہ میں جب کوئی

ائی نظر نہ آئی تو انہوں نے پوری سنجیدگی سے اس کا منشا دریافت کیا۔ وہ جی جان سے سلگ اٹھی۔ جوابی گستاخیوں ذکروہ اپنے پاپا سے تو نہیں کر سکتی تھی۔ سکا رد لازمی تھا اور نتیجہ معلوم۔ ہیڈ ڈیپارٹمنٹ سے ہیڈ ماسٹرنی تک نے کہا سنا مگر رنگ تنگ آکر اس نے اپنی بات ہی بدل دی۔ وہ بھی ایسی کتنی ہی گستاخیوں کی مرتکب ہوئی تھی۔ کالج کی ٹاپ موسٹ (TOP MOST) لڑکیوں میں اس کا شمار تھا۔ کالج پہ چھاپا سے کے ساتھ ساتھ وہ نہ جانے کتنوں کے دلوں پر بھی چھا گئی تھی۔ لیکن اس بدد ماغی کا کیا جواب کہ وہ کسی کی نظر میں تھی نہ ادا۔ ہر سوال کا جواب اُس نے مسترد کر کے عارفانہ سے۔ یا اور اب اسی مستم عارفانہ کا خمیازہ وہ ہر ہر قدم پر بھگت رہی تھی۔ اس کی خود اعتمادی کا بے پناہ سکون اور مستحکم ارادے متزلزل ہوئے تھے۔ ہر انٹرویو میں کچھ عجیب سا حادثہ پیش آتا رہا۔ جگہ V.I.P جگہ کے چمچے بڑی کثرت سے بکھرے پڑے تھے۔ اور کوئی اپائنٹمنٹ ان چمچوں کی ناز برداری کے بنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا بے حد مشکل۔ کہاں وہ اور اس کی وہ شان استغنائی اور کہاں یہ ڈیپارٹمنٹ اور V.I.P کی چمچہ گیری۔ اُس کے دل و دماغ کو اتنے جھٹکے لگے کہ وہ بدحواس ہوگئی۔ بلندی سے گرنے کا احساس بھی کیسا جان لیوا ہوتا ہے۔ اور یہ ظالم احساس اس کی رگ و پے میں سرایت کئے جا رہا تھا۔ اُس کا وہ خود سر انداز اچانک ہی ٹوٹنے پھوٹنے لگا تھا۔ اپنی ہی نظروں میں اُس کا اپنا وجود اتنا حقیر سا ہوگیا تھا جیسے۔ جیسے وہ ایک دم سے چھوٹی ہوگئی ہو۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی پھوٹتی رہی۔ شاید وہ کوئی تیر نیم کش تھا، جو دل میں کھب کے رہ گیا۔ ناکامی کے جان لیوا احساس اور خود داری کے زعم تلے وہ چکنا چور ہوتی رہی۔ لیکن اس کی ضدی طبیعت اتنی آسانی سے شکست قبول کرنے کو تیار نہ تھی اُس نے بہت سی باتیں سوچیں۔ اور بازی جیت لینے کی قسم کھائی

اب کے اس نے ایک سال قبل سے ہی دانہ ڈالنا شروع کیا۔ اپنے لئے دیئے رہنے والے انداز کو جھٹک کر اچانک وہ بڑی دلبر نظر آنے لگی۔ اُس کے ہونٹوں کے خم گہرے ہوگئے۔ آنکھوں کی چمک طلسم سازی کے جال بننے لگی۔ اس کے چمکیلے بھورے بال اس کے چہرہ کے گرد ہار ڈالے رہتے اور جسم کی لچک گلاب کی ڈالی کی یاد دلا دیتی۔ اُس کے ملنے والوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اور اُس نے اپنے سبھی کیل کانٹے درست کر لئے۔ راستے ایک نہیں کئی ایک تھے۔

انٹرویو سے ایک ماہ قبل ہی اس کی اہمیت مسلّم ہوگئی تھی۔ اس کی قابلیت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا اُس نے ساحری سیکھ لی تھی۔ اس لئے انٹرویو سے ایک دن قبل ہی اُسے نتیجہ معلوم تھا۔ انٹرویو میں پوچھے جانے والے سوالات بھی معلوم تھے۔ فتح و کامرانی کے سرور میں وہ ڈوبی جا رہی تھی بڑی مشکلوں سے وہ بت مشکل پسند ہاتھ آیا تھا۔

اندر انٹرویو کا سلسلہ جاری تھا۔ باہر امیدوار بے چین بے چین پھر رہے تھے۔ وہ امیدواروں پر تمسخرانہ نظر ڈالے اپنے سر کو بار بار جھٹک رہی تھی۔ جیسے کسی تکلیف دہ خیال سے چھٹکارہ پانا چاہتی ہو۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی تمام کھڑکیوں اور کواڑوں کو مقفل کر لیا تھا تاکہ کوئی خیال کوئی تکلیف دہ خیال اس بیش قیمت لمحہ کو ضائع نہ کرے لیکن دل جیسے بغاوت پر آمادہ تھا۔ لگاتار کوئی دل کے چور دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ یا دماغ پر ہتھوڑے مار رہا تھا؟ بہرحال کچھ تو ضرور تھا۔ وہ بڑی بے چین سی تھی۔ انجان سی خلش اُس کے دل کو چکنا چور کئے جا رہی تھی۔ اپنی ہی نظروں میں اُس کا اپنا وجود اتنا چھوٹا سا ہوگیا تھا۔ اتنا حقیر سا۔ ایک دفعہ پھر وہ اپنی تمام خود اعتمادیوں کے ساتھ کمیشن کے سامنے تھی۔ لیکن اندر ہی اندر جیسے وہ ٹوٹ رہی ہو شکستہ شکستہ چور چور۔ جانے بوجھے سوالات دہرائے گئے۔ رٹے رٹائے

چلے اُس نے سُنا دیے۔ اُس کا انٹرویو بہت اچھا ہوا۔ اُس
جمہوری حکومت کے ایچ ایچ ڈی۔ یاروں نے اُسے بہت سراہا۔
وہ باہر آئی تو ایک شکست خوردہ مسکراہٹ اُس کی لبوں سے
چپک کر رہ گئی۔

زیادہ دن نہیں گزرے جلد ہی وہ جس پروانہ
اس کے ہاتھ آیا جس کے پیچھے وہ جان دیتے جاتی تھی۔ وہ دن
بھی آ ہی گیا جب اُسے جوائن کرنا تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ اُس
بیش قیمت مشکل پسند کو چوم کر سنبھال کر اپنے پرس میں رکھا اور رپورٹ
جوائن کرنے کے لئے تیار ہونے لگی۔ آج کچھ دہی انداز دلربائی
تھی۔ اس کی زلفیں شانوں پر دو چھوٹی چھوٹی کلپ سے
بندھی ہوئی تھیں۔ ساری میں لپٹا لپٹایا جسم بڑا خوبصورت
معلوم ہو رہا تھا۔ قدآدم آئینہ کے سامنے کھڑی وہ دیر سے اپنے
سراپا کو تک رہی تھی۔ خوب صورت چہرہ، اُس کا اپنا چہرہ
بڑا اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی اُداس ہوئی
جا رہی تھی۔ خوب صورت جسم کے اندر تڑپتا پھڑکتا دل
نہ جانے کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ جیسے اُس نے کوئی گناہ کیا ہو
یا کسی کو قتل ہی کر ڈالا ہو۔ اُس کے ساتھ انٹرویو میں شامل
ہونے والے سبھی لڑکے لڑکیوں کا چہرہ اُس کی آنکھوں تلے
گھوم رہا تھا۔ حیران پریشان اور بدحواس سا ہجوم ان میں
سے کون سب سے زیادہ حق دار تھا جس کا حق اُس نے
پریشان سے مارا تھا۔ اُسے اپنے پچھلے تمام انٹرویو یاد آ رہے
تھے۔ خوب صورت سے جسم میں خوب صورت سی روح کو نہ
جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں گری جا رہی تھی۔
گھبرا کر اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسک
سسک کر رونے لگی۔ خوب رو دھو کر جب کسی قدر دل کو
ڈھارس بندھی تو اپنے محبوب پروانہ کو پرس سے نکال کر
ایک بار پھر چوما۔ پھر اس کے ٹکڑے کرنے لگی۔ دو۔ چار۔ آٹھ
سولہ اور انگنت ٹکڑے۔ کمرے میں چاروں طرف
دھجیاں ہی دھجیاں بکھر گئیں۔ ایک عجیب سی تھکاوٹ
کے احساس کے ساتھ اُس نے اپنے کپڑے بدلے اور پلنگ پر
گر کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ — —

بقیہ: زندگی زندگی

"یہ معلوم کیسے ہو گیا؟"
"یوسفی صاحب نے سوسائیڈ کر لیا ہے۔" حسین صاحب
نے [illegible] اپنی ٹک پیچھے کر لی۔"
"کیا کہا؟ کس نے کیا؟ نہیں یہ معلوم؟" تقریباً
[illegible] ایک ساتھ پوچھا۔
"یہ دیکھئے آج کی تازہ خبر [illegible] ابھی پیپر آیا ہے۔"
"ہوں [illegible] تو یہ خبر ہے۔"
"تو آج اسی لئے یوسفی نہیں آئے۔"
خاموشی .... خاموشی ......
"چلو پتے پھینٹو۔ کس کی باری ہے؟ کون ہار رہا ہے؟
کھیل جلدی شروع کرو۔ [illegible] دیر ہو رہی ہے۔"
تارا ناکا کے نکڑ پر ایک خوب صورت سفید مکان سے
بڑے دل خوش کن قہقہے بلند ہو رہے تھے۔
"آج کی تازہ خبر بولو۔ ڈرن سوسائٹی؟"
"مسٹر اکبر علی نے سرشن کشچپ سے شادی کر لی۔"
"ٹھیک ہی ہے۔ لیکن وہ کون تھیں؟" — —

شمیم افزا قمر

محض تماشائی

آج پھر صولت کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ایک دن یہی اُمی [illegible] کو [illegible] کا اسکول کھل گیا۔ لیکن [illegible] ایک سرد سی خاموشی [illegible] خط بھی ملا تو لکھا تھا:

"[illegible] ابھی تک [illegible] کا اسکول کھل گیا ہے۔ لیکن [illegible] روپے سے فرصت کہاں [illegible] ان باتوں پر [illegible]۔ مگر کس طرح تم ایک نیچے [illegible] کر رہی ہو۔ خیر تمہیں [illegible] تھی۔"

صولت کی آنکھوں سے [illegible] بہنے لگا۔ یادوں کے سمندر اس نے کھنگال ڈالے۔ اس کی تہہ میں انگنت [illegible] تصویر کے شکستہ ٹکڑے اور امیدوں کی لاشیں دفن تھیں۔ اس کے بند بند ہونٹ پھڑپھڑائے اور بڑے ضبط سے وہ گنگنانے لگی:

اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

شعر کی رومانی فضا نے اس کے دل میں خوشی کی ایک چھوٹی سی مدھم سی لہر پیدا کی۔ لیکن اس شعر کی حقیقت نے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ سچ ہی تو تھا کہ وہ اپنے دل کے تمام لطیف و حساس جذبوں کے ساتھ ایک بت مرمر سے جا ٹکرائی تھی۔

صولت نے دل دیوانہ کو پھر سمجھایا اور نقش فریادی کی ورق گردانی شروع کر دی۔ خوشی جو اتنی معدوم اتنی موہوم اتنی بیگانہ سی چیز ہے اگر کوئی اچھا سا شعر پڑھ کر حاصل ہو جائے تو کیوں نہ غم بھلایا جائے۔ اپنے خیال پر وہ آپ ہی آپ مسکرائی ویسے ہی اُسے شبو آپی کی بات یاد آ گئی۔ کل ہی تو وہ کہہ رہی تھیں۔

"کیوں بی صولت! تمہارا دل کیا اندر سے بہت خوش رہتا ہے جو تم اتنا ہنستی ہو؟"

ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی اور آنکھوں کے ستارے ٹمٹمانے لگے۔ ان جلتے بجھتے تاروں کی روشنی میں اُسے وہ ہنگامہ خیز رات یاد آئی۔ جب وہ ڈری سہمی بے خودی کے عالم میں سُرخ کپڑے پہنے پھولوں سے لدی بیٹھی تھی۔ درجنوں لڑکیاں تالی پیٹ پیٹ کر ڈھول بجا بجا کر میراثنوں کے مقابلہ میں گا گا کر جا رہی تھیں اور پروفیسر شہناز کی باتیں یاد کر کے اس کے کان کی لوئیں گرم انگارہ ہو گئی۔ کس لاپرواہی سے انہوں نے کہا تھا:

"اس ہنسوڑ کا کیا ہے یہ تو اپنی رونمائی کے وقت بھی ہنسے گی۔" پروفیسر کی بات پر لڑکیوں نے ایک طویل قہقہہ لگایا تھا۔ وہ بھی تو دل کھول کر ہنسی تھی مگر اب جلدی جلدی سورہ ناس پڑھ رہی تھی۔ خدانخواستہ اگر اسے واقعی ہنسی آ گئی تو؟ نہ جانے کب اس کا گھونگھٹ اٹھا اور گرا لیکن جب

[illegible] فیاض صاحب جل جاتے اور سولت بنتے بنتے لوٹ جاتی [illegible] کی جان ایک عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ ایک طرف [illegible] تھی اور ایک طرف اُس کے آئیڈیل ابو۔ سولت کو سمجھا [illegible] وہ ہار گئی لیکن اس کی وہی ایک ضد کہ چھوٹے بچے کی طرح [illegible] لیے کو بیٹھی تھی۔ اب جب سجاد سونے سے قبل کوئی اچھا [illegible] اس کی نذر کرنا چاہتا تو وہ بڑی بد دماغی سے اس کے [illegible] طور رو اطوار میں عیب نکالنے لگتی۔ سجاد کا شعر نہ ہو [illegible] میں [illegible] جاتا۔ اور وہ چڑھ کر کہتیں یہ گھر پسند نہیں تو [illegible] کیوں نہیں چلی جاتیں۔

اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ کاشانہ اب چھا کر سولت [illegible] وقت سے اٹھی، سولت کبس میں کچھ کپڑے ڈالے اور اپنی امی [illegible] جانے کو تیار ہو گئی۔ سجاد اُسے اسٹیشن تک چھوڑنے [illegible] دونوں بجھے بجھے خاموش خاموش تھے۔ سولت کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ ٹرین چلی تو اُس نے ہلکی سی سسکی لی اور آنسو [illegible] آ گئی۔ اس رم تپ رم ٹپ بوندوں میں سجاد کا چہرہ دھندھلا گیا۔ تین گھنٹے کے بعد وہ گھر پہونچی تو اس کی امی اسے [illegible] کر کھل گئیں لیکن سولت کا دل اندر ہی اندر سلگ اٹھا۔

.... اور اب ایک طویل خاموشی کے بعد سجاد کا خط ملا بھی تو جلا کٹا۔ نقش فریادی کی ورق گردانی کرتے کرتے بڑی بیزاری سے کتاب اپنے چہرے پر ڈال کر وہ دیر تک سوتی جاگتی رہی۔

ہفتوں گزر گئے۔ اُس نے سجاد کے خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر ایک دن اُکتا کر خود ہی اُسے خط لکھنے بیٹھ گئی مختصر سا خط۔ آخر اس کی خیریت دریافت کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ اُس نے دل کو تشفی دی۔ جلدی ہی جواب آ گیا۔ لکھا تھا:

" ..... میں کسی طرح زندہ ہوں۔ کام بہت
ہے۔ امتحانات کے پرچوں کا انبار لگا ہے
میں نے سمجھا تھا کہ شاید تمی کے ساتھ تم بھی
آ گئی لیکن تمی تنہا ہی آیا۔ آج کل تو میں اور
بے خوابی میں بڑی دوستی ہے۔"

سولت کا دل چاہا وہ بھاگی بھاگی جائے اور سجاد کے کانوں میں مدد دے۔ آخر سجاد کی آنکھوں کی نیند کون لے گیا؟ کیا سجاد اُسے یاد کرتا ہوگا؟ بڑی بے یقینی سے اُس نے سوچا کڑوی کڑوی مسکراہٹ نے آنکھوں میں تارے جھلملا دیے اور وہ خط کا جواب [illegible] بیٹھ گئی۔ موسم تپ رہا تھا۔ دس بجے دن سے ہی ہوا گرم تھی۔ سولت نے دکان سے خریدے ہوئے پیکٹ سنبھالے اور [illegible] لے کر چلی۔ ویسے ہی اسے شوخ شوخ نظروں سے تکتے ہوئے فیاض صاحب نظر آئے۔

" ارے چچا جان۔ سلام علیکم۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی کہئے خیریت مزاج؟

" جب آپ سامنے ہوں تو خیریت کہاں۔" وہ ہنس کر بولے پھر کچھ دھیمی آواز میں نہ جانے کیا کہا کہ سولت نے اپنا سر پیٹ لیا۔ سن سناتی گرم لو کا جھونکا اس کے دماغ کے ہر گوشے میں سنسنانے لگا۔

" اونہہ مجھے اتنا وقت نہیں کہ آپ کی واہیات خرافات سنتی رہوں۔"

وہ بد دماغی سے لال بھبھوکا چہرہ گھما کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ مگر وہ کچھ بدحواسی کے عالم میں پہونچی۔ اور بستر میں منہ چھپا کر دھواں دھار رونے لگی۔ " بھئی اللہ، آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے ان رشتوں ناتوں کی یہ کیا کہ بڑے موڈرن بنے پھرتے ہیں۔ اور جس کے جو دل میں آئے کئے جاتے ہیں۔"

سامنے ہی ٹیبل پر سجاد کا خط رکھا تھا۔ اُس نے لپک کر خط اٹھا لیا۔ لکھا تھا:

" .... رات کو نیند نہیں آتی۔ سونے میں
نہ جانے کیوں چونک چونک اٹھتا ہوں۔ شاید
زندگی اور موت کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ

باقی ہے۔ اب تو اِن کاموں سے بہت جلد
تھک جاتا ہوں ...."

صولت کا بیٹ گیا۔ تھکن کے نام سے نفرت کرنے والا سجاد اب بہت جلد تھک جاتا ہے۔ دیر تک وہ بستر پر آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت پڑی رہی۔ لیکن اس کا ذہن جاگ رہا تھا وہ سوچ رہی تھی۔ تصورات پوری تیز رفتاری کے ساتھ۔ اُسے فیاض صاحب سے ڈر لگنے لگا تھا۔ کیسے دلیر بنے تھے وہ سجاد کی غیر حاضری پر۔ اور پھر اُسے تنہا پا کر نہ جانے اور بھی کتنے فیاض صاحب پیدا ہو جائیں۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل چلی جائیگی سجاد کے پاس۔ جہاں بھی ہے۔ ٹھیک ہے آج ہی ٹیلیگرام دے دوں اور امی سے بھی کہہ دوں۔

اس کی امی اس کے اچانک جانے کا پروگرام سن کر حیران ہوگئیں۔ وہ بگڑ کر بولیں "جانا ہی ہے تو دو چار دن بعد چلی جاتا۔ یہ کل ہی کی ضد کیوں؟" لیکن صولت سوچ رہی تھی جو کسی طرح آج ہی امی جانے دیتیں۔

اسٹیشن پر سجاد موجود تھا۔ بالکل تنہا۔ ہمیشہ وہ اپنی پوری بٹالین کے ساتھ رہتا تھا۔ صولت نے شک بھری نظروں اُسے دیکھا۔ لیکن سجاد کے آنکھوں کی چمک نے اُسے اس تنہائی کا مطلب سمجھا دیا۔

"اچھا ہوا جو تم آگئیں ورنہ ...."

"ورنہ کیا؟"

"کچھ نہیں ڈرتا ہوں کہ جو تم پھر ناراض ہو کر چلی گئیں تو مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔"

صولت نے ادھ کھلی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ وہاں پیار ہی پیار تھا۔ زندگی مزے میں گزرنے لگی۔

صولت نے "اپنے گھر" کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا۔ کم از کم سجاد کی موجودگی میں وہ خیال اُسے کبھی نہیں ستاتا، لیکن باتیں کرتے کرتے اکثر وہ چپ ہو جاتی اور چونک کر پوچھتی،

"اوہ کیا کہا؟ میں نے سنا ہی نہیں۔" اُس کی آنکھیں کم میں نہ جانے کیا جھانکتی رہتیں۔ اس کی بے ساختہ ہنسی میں ایک تھکاوٹ کا احساس ہوتا۔ وہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر بڑ اہتمام سے ہنستی تو اس کی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگتی جسے وہ لاپرواہی سے ٹال جاتی۔ ایک عجیب سی کمزوری اور تھکن کا اح تھا جو اس کے صحت مند جسم کو جکڑے جا رہا تھا۔ کبھی تیز تیز دھڑکن کے ساتھ اس کے سینہ میں درد ہوتا۔ وہ بے چین بے چین رہتی۔ ڈاکٹر کو بلانا چاہتا تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی اور بگڑ کر کہتی "بھئی ا میں نے ہزار دفعہ کہہ دیا نا کہ مجھے پیٹ کا عارضہ ہے۔ پھر بھی سمجھتے۔ بس ابھی اِنو (ENO) پی لیتی ہوں اور دیٹا تا منگا لوں گی۔ ڈاکٹر کی مطلق ضرورت نہیں۔

آج بھی وہ دل کی دھڑکن تیز محسوس کر رہی تھی۔ تمام دن اُس نے خود کو طرح طرح کے کاموں میں اُلجھا رکھا۔ رات آئی تو خلاف تو زیادہ ہی تاریک تھی۔ صولت کے دل کی دھڑکن بڑھتی ہی گئی اور د سے سینہ کٹنے لگا۔ جسم پسینہ سے تر ابور اور ہونٹ نیلا ہو گیا۔ سجاد صو کے روکنے کے بعد بھی ڈاکٹر کو بلانے چل دیا۔ ڈاکٹر آیا تو مریضہ درد میں بھی کمی آئی۔ لیکن اس طرح کہ آہستہ آہستہ اس کی نبضیں آ چھوٹ گئیں۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اُس نے سجاد کی طرف دیکھا ا آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے تاسف سے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حرکت قلب کے بند ہونے کی پہلی علامت موت ہی ہوتی ہے۔" سجاد نے وحشیانہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھ اور تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس کی ماں سینہ پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی،

"ہائے میرے گھر کی رونق چلی گئی
میری ستی ساوتری جیسی بہو چلی گئی۔" ---

جواب طلب امور کے لئے ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ فرمائیں۔ (ادارہ)

R.N.RegdN.4255/64
P.T.Regd.N.7
Phone No. 662 432

The AAHANG Urdu Month[ly]

Bairagi, Gaya. Phone : 443

کلچرل اکیڈمی، ریڈ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

فروری، مارچ ۱۹۷۵ء

شمارہ ۵۶، ۵۷

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے
فی شمارہ	ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ن : ۵۳
۴۳۲

تابت : قمر نظامی

باعت : ہند لیتھو پریس ٹیکلوڈ گنج گیا

مدیر

کلام حیدری

محتویات

مزاحیہ

مضامین

افسانے

نظمیں

غزلیں

سواد و صوت

مزامیر

سچ تو یہ ہے کہ اُردو پر بُرا وقت پڑا ہے۔ ہندوستان میں سرکاری اکیڈمیاں، بورڈ، کمیشن بنا کر اس نے کوشش کی اور اب بھی کوشش جاری ہے مگر اس مظلوم زبان کے زوال کی رفتار رکتی تو کیا کم بھی نہیں ہو رہی ہے۔ ادیبوں کے تخلیقی جذبے کو بڑھانے، اُکسانے اور ترقی دینے کی خاطر انعامات، امداد اور مزید امداد و بخشش کے اعلانات سب بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔ اُردو لائبریریاں بند ہوتی جا رہی ہیں یا مختصر سے مختصر ہوتی جا رہی ہیں۔ اردو کے اخبارات کی اشاعت کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ جن علاقوں کو اُردو کا آباد سمجھا جاتا ہے وہ اُردو کے قدر دانوں کی بات چھوڑئیے اردو دانوں سے بھی خالی ہوتے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں ترقی پسند ادب پیدا کیجئے، جدید شاعری تخلیق کیجئے، ادیبوں کو امتیازات بخشئے وظیفے عطا فرمائیے ——— سب بے کار، سب برباد۔

نہ ترقی پسند ادب پڑھنے والے پیدا ہو رہے ہیں نہ جدید شاعری۔

مدرسے خالی، استاد غائب۔

اور ترقی اردو بورڈ اصطلاحات کی ڈکشنری تصنیف کر رہی ہے

اور ترقی اردو بورڈ اردو انسائیکلوپیڈیا تصنیف کر رہی ہے۔

اور ترقی اردو بورڈ سائنس کے موضوعات پر درسی کتابیں لکھوا رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ سب کن کے لئے ہو رہا ہے۔ رسم الخط جاننے والے مفقود ہو رہے ہیں تو یہ تمام تصانیف، یہ تمام کتابیں کیا میوزیم میں رکھی جائیں گی؟

سرکار —— سرکار —— سرکار!

سب سرکار کرے گی؟ کبھی ایسا ہوا ہے؟

حالات جڑ سے ہی بگڑے ہوئے ہیں، مدرسے غائب اور یونیورسٹی میں ایم۔اے کے پروفیسر اور ریڈر موجود! اور طالب علم؟ کیا سیدھے آسمان سے ٹپکے گا؟

'کتاب' برسوں نکل کر کدھر کھو گیا؟

'شب خون' جدید ادب بکھیر کر کہاں گم ہے؟

'آہنگ' کب تک؟

کلام حیدری

رسالہ فن اور شخصیت کی اولین پیش کش
ساجدہ ت اور سی۔ ایل۔ کاوش کی ادارت میں

مہندر ناتھ یادگار نمبر

زیر سرپرستی ــــــــــــ کرشن چندر

۲۰ مارچ کو مہندر ناتھ کی برسی کے موقع پر منظر عام پر آرہا ہے

• مہندر ناتھ کے شاہکار افسانے • طنزیہ و مزاحیہ مثالی مضامین • نایاب اور یادگار تصاویر اور کرشن چندر کی لکھی مہندر ناتھ کی سوانح حیات

ــــــ (چند اور قلمکار) ــــــ

ــ آل احمد سرور ــ ڈاکٹر قمر رئیس ــ خواجہ احمد عباس ــ قرۃ العین حیدر ــ ڈاکٹر ظ۔ انصاری ــ راجندر سنگھ بیدی ــ سردار جعفری ــ عصمت چغتائی ــ جاں نثار اختر ــ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ــ مالک رام ــ محمد طفیل ــ مرزا ادیب ــ خدیجہ مستور ــ مجروح سلطانپوری ــ کنہیا لال کپور ــ فکر تونسوی ــ راما نند ساگر ــ ریوتی سرن شرما ــ کیفی اعظمی ــ راہی معصوم رضا ــ واجدہ تبسم ــ زہرہ جمال ــ پرکاش پنڈت ــ کملیشور ــ اپندر ناتھ اشک ــ نیاز حیدر ــ آغا شورش کاشمیری ــ خواجہ عبدالغفور ــ رام لعل ــ شمیم احمد شمیم ــ غلام رسول ریفیزو ــ دشوامتر عادل ــ مظہر امام ــ مدھوسودن ــ خوشتر گرامی ــ صہبا لکھنوی ــ یوسف ناظم ــ ندا فاضلی ــ عزیز قیسی ــ وید راہی ــ پریم وار برٹنی ــ احتشام حسین ــ ممتاز حسین ــ کشمیری لال ذاکر ــ سرلا دیوی ــ سلمیٰ صدیقی ــ خدیجہ جاں نثار ــ اعجاز صدیقی ــ اور ــ ساحر لدھیانوی

قیمت ــــــــــ ۱۵ روپے

ملنے کا پتہ: تین مورتی پبلی کیشنز، ۱۵ چھپرہ بلڈنگ ــ مادھوداس پاستہ روڈ۔ دادر۔ بمبئی ۱۴۰۰۰۱۴

بیان ملکیت و دیگر تفصیلات

ماہنامہ آہنگ، بیراگی، گیا

فارم IV رول نمبر ۸

مقام اشاعت	محلہ بیراگی، گیا
مدت اشاعت	ماہنامہ
پرنٹر، پبلیشر اور ایڈیٹر کا نام	کلام حیدری
ملکیت	کلام حیدری
زبان	اردو

میں کلام حیدری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفاصیل میری دانست میں صحیح و درست ہیں

دستخط: کلام حیدری

غزل

مظہر شہاب

لبوں پہ اس نے تبسم کا پردہ ڈال دیا
بڑھایا ہاتھ تو آداب کہہ کے ٹال دیا

کہیں پڑوس کا کوئی لہو پکار نہ سکے
توقعات نے کیا کیا نہ اشتعال دیا

نہ صرف تیری وفا نے روایتیں توڑیں
مری انا کو بھی تادیبِ انفعال دیا

اُسی خلیق سے یادیں رچی بسی سی ہیں
سمجھ کے غیر جسے آپ سے نکال دیا

اندھیری کوٹھری سے جب بھی بھاگنا چاہا
سُلگتے خواب نے دیوار و در اُچھال دیا

ہوئی جو صبح تو بے رنگ و نور تھا گلشن
شعاعِ مہر نے ہر برگِ گل کھنگال دیا

یہ مفلسی کے ہرے کھیت، بھوک کی فصلیں
تمہارے راج نے کیا سبز سبز اکال دیا

بیانِ شوق زبانِ غزل سے ہم کرتے
بہ موقع کارِ زمانہ نے خال خال دیا

نمازِ شکر ادا کر، خدا نے تجھ کو شہاب
شریکِ زیست طرح دار و خوش خصال دیا

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

اقبال اور جیمس وارڈ

اپنی تصنیف IQBAL'S CONCEPTION OF GOD (اقبال کا نظریۂ الٰہ) میں پروفیسر شریف نے
برملا ظاہر کی ہے کہ "اقبال کو پورے انصاف کے ساتھ وارڈ (WARD) کا شاگرد قرار دیا جاسکتا ہے۔" تصنیف ہذا
سے ماخوذ مندرجہ ذیل اقتباسات پر توجہ مبذول فرمائیے۔

"اقبال پر وارڈ کے اثر کو دریافت کرنے کے لئے دونوں کے نکتہ ہائے نظر کی مماثلت پر نظر ڈالنا چاہئے۔
کانٹ کی طرح ان دونوں فلسفیوں یعنی اقبال اور وارڈ نے خدا کے وجود کے متعلق استدلال کو مسترد کر ڈالا
افلاطونیت کو ترک کر دیا۔ خدا کو کائنات میں دیکھنا (PANTHEISM) ہمہ اوستیا اور مطلقیت
(ABSOLUTISM) سے روگردانی کی اور قریب قریب ایک ہی وجہ پر دونوں نے اس
بات پر اعتراض کیا کہ دانائی کل (OMNISIENCE) ایک پہلے سے معلوم (PRE —
ORDAINED) حقیقت کا علم پیشین (FORE- KNOWLDGE) ہے اور دونوں نے
خدا اور محدود خودی (FINITE EGO) کے لئے SERIAL TIME یعنی تدریجی
زمان سے وابستہ کرنا بند کر دیا۔ دونوں کو PLURALIST THEIST یعنی تعدد پسند خدا پرست اور
روحانی موحد (SPIRITUAL MONPIST) ہیں۔ دونوں برکلے کے OCCASIONALISM
(اتفاقیت) کے برخلاف PANPSYCHISM (نفسیات کل) کو اپناتے ہیں اور دونوں لیبنز
(LEIBNITZ) کے بے روزن خوردیت (WINDOWLESS MONADISM) کے برخلاف
باروزن خوردیت (WINDOWED MONADISM) کے حامی ہیں۔ تخلیقی آزادی
(CREATIVE FREEDOM) اور لافانیت فرد (IMMORTALITY OF THE INDIVIDUAL)
پر دونوں ایمان لاتے نظر آتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک ایغو کے درمیان ہم کاری (INTERACTION)
سے حیاتی دنیا (SENSUOUS WORLD) معرض وجود میں آتی ہے اور دونوں یہ اعتقاد رکھتے ہیں
کہ جسم (BODY) کی تخلیق ذہن (MIND) اپنے مقاصد کے لئے کرتا ہے اور [illegible]
TIME (تدریجی زمان) بھی ذہن ہی کا فعل (ACT) ہے ایک سے زیادہ اور [illegible]

[illegible] اقبال اور وارڈ دونوں لامحدود، باشعور، قادرِ مطلق، دانائے کل (OMNISCIENT)
روح کو [illegible] محدود ایغو میں جاری و ساری ہونے کے باوجود ان سے اسی طرح ماورا ہے جس طرح
جاندار (ORGANISM) اپنے حصے میں جاری و ساری ہونے کے باوجود اپنے حصوں سے ماورا بھی
ہے (اقبال اور جیمس وارڈ) دونوں کے نزدیک خدا اپنی اس تخلیقی روح (CREATIVE —
SPIRIT) سے جو محدود انا (FINITE EGO) کو تخلیق کرکے اپنی آزادی کو محدود کر لیتی ہے
بالکل اوپر رہتا ہے۔ اور دونوں کے نزدیک یہ اندرونی محدودیت (INTERNAL LIMITATION)
خدا کی کامل آزادی سے کوئی تضاد نہیں رکھتی۔ دونوں ہی یہ مانتے ہیں کہ خدا اپنی تمام تر تخلیقی پیش رفت
(CREATIVE PROGRESS) میں کامل ہے کیونکہ یہ پیش رفت کاملیت (PERFECTION)
میں ہوتی ہے نہ کہ کاملیت کی جانب۔ دونوں کی یہ بھی رائے ہے کہ مشیت الٰہی محدود ایغو کے ذریعہ ہی عمل پیرا ہوتی
ہے۔ دونوں ہی کا یہ اعتقاد ہے ...... کہ دلائل ایمان کی ضرورت کو ثابت تو کر سکتے ہیں لیکن یہ ضرورت ایمان
کو علم و آگہی (KNOWLEDGE) میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ خدا میں یقین رکھنا
دراصل ایمان و اعتقاد کا معاملہ ہے حالانکہ یہ یقین معقول (RATIONAL) ہے مگر خدا کے متعلق
اعتقاد یا پورا ایقان (CERTITUDE) دلیلوں سے حاصل نہ ہو کر زندگی بسر کرنے ہی سے ملتا ہے
اور خدا سے براہ راست مکاشفت (COMMUNION) صرف عشق (LOVE) یا استزاقی
ہم آہنگی (RAPPORT) کے توسط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی صرف عشق خداوندی کے ذریعہ
ہی سے محدود خودی (FINITE SELF) کو لافانیت (IMMORTALITY) نصیب
ہو سکتی ہے[۱۲]

غالباً شریف کے اسی مقالے کی بنا پر ڈاکٹر سنہا اس نتیجہ پر پہنچے کہ :

"...... شروع شروع میں اقبال افلاطونی (PLATONIST) تھے...... بعد میں میکٹگرٹ
رومی، نطشے، برگساں اور وارڈ کے زیر اثر آگئے اور نتیجتاً ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آنے پر انھوں نے
ان ہی فلاسفہ کے اثرات کے تحت اپنے خیالات کو تشکیل دے کر نہایت آزادی سے ان تین مجموعہ ہائے کلام میں
پیش کیا جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۰ء تک زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے۔ اس کے اور بعد وہ وارڈ کے اثر میں
آنے لگے اور یہاں تک زیر اثر آئے کہ ان کو وارڈ کا مرید (DISCIPLE) کہنا غلط نہ ہوگا۔ اور اقبال کے
ان طور پر واضح ہوئے خیالات ان آٹھ مجموعوں میں ملتے ہیں جو ۱۸ سال میں یعنی ۱۹۲۰ء سے لے کر
۱۹۳۸ء تک شائع ہوئے۔"[۱۳]

یہاں ایک غلط فہمی کی گنجائش نکلتی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ محولہ بالا کی بنا پر یہ بھی خیال کیا جا سکتا
ہے کہ اقبال پر صرف وارڈ ہی کا اثر قائم رہا۔ یہ ایک غلط نتیجہ ہوگا۔ خود شریف ہی نے لکھا ہے کہ :

"قابلیت و استعداد کی تربیت اور ایک خصوصی طور پر تشکیل میں روئس، میکٹگرٹ، جیمز وارڈ، بریڈلے
وغیرہ کے نظام فکر کا خاصا حصہ ہے۔ دوسری جانب میں دوسرے فلسفیوں کا اقبال پر جو کچھ اثر پڑا ہے وہ
اقبال کے ...... تصورات پر کی تشکیل خاص طور سے وارڈ سے اثر پذیر ہوئی۔"

خلیفہ عبدالحکیم نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ اقبال جب 'اسرار خودی' کی تخلیق میں مصروف تھے "تو مجھے اس کا ذاتی
علم ہے[5]" کہ اقبال پر نطشے کے خیالات کا بھی غلبہ تھا۔ خود اقبال کی ڈائری ہی میں یہ اعتراف ملتا ہے کہ،
"انسانی ذہن کے مطالعہ کے لئے آپ کو ونڈ، وارڈ جیمس یا اسٹاؤٹ (WUNDT, WARD
JAMES, STOUT) سے استفادہ حاصل کرنا چاہیئے[6]"
لہذا پیش کردہ ارشادات واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ اقبال پر صرف وارڈ ہی کا نہیں بلکہ دوسرے فلاسفہ کا بھی اثر
ڈاکٹر سنہا کا یہ ارشاد کہ اقبال پر وارڈ کا اثر ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک رہا، درست معلوم نہیں
اقبال کی تیسری تخلیق 'پیام مشرق' میں جو ۱۹۲۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ایک حصہ بہ عنوان "نقش فرنگ"
اس حصے میں متعدد فلاسفہ پر نظمیں شامل ہیں۔ شوپنہاور، نطشے، ہیگل، کارل مارکس، آئنسٹین
وغیرہ پر نظمیں ہیں مگر نہیں ہے تو کوئی نظم وارڈ پر نہیں ہے۔ علاوہ بریں 'جاوید نامہ' میں جو ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ شائع
ہوا، وارڈ کا کہیں کوئی ذکر نہیں آتا۔ میری رائے یہ ہے کہ وارڈ کے اثر کی نشاندہی صرف آخری چار تخلیقات
میں کی جاسکتی ہے یعنی بال جبرئیل، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق، ضرب کلیم، ارمغان حجاز جو علی الترتیب ۱۹۳۶
۱۹۳۶ء، ۱۹۳۸ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ (موخر الذکر تخلیق یعنی ارمغان حجاز اقبال کی وفات
بعد شائع ہوئی تھی) بال جبرئیل کے زمانے سے اقبال کے فکر و شعر پر نطشے اور برگساں کا اثر کم ہونے لگا اور خیالات
ٹھہراؤ پیدا ہوگیا اور وارڈ کے نظام فکر سے ملتا جلتا نظام فکر اقبال کے رشحات قلم سے ابھرنے لگا۔ یہاں یہ بتانا ضرور
ہے کہ وارڈ کے یہاں کانٹ، ہیگل، نطشے، برگساں وغیرہ کے خیالات کی ترکیب (SYNTHESIS) ملتی ہے اور
اقبال شعوری یا لاشعوری طور پر اس ترکیب کی طرف مائل ہوگئے اور اسی فلسفیانہ آمیزہ کو شعری ملبوس دینے لگے۔ اب
شعر اقبال میں وارڈ کے خیالات کی عکاسی دیکھنے کے لئے شریف کا یہ ارشاد کہ وارڈ اور اقبال دونوں تعدد پسند' خدا
پرست اور روحانی موحد ہیں' پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی قدرے وضاحت کا باعث ہی ہوگا کہ '
PLURALISM (تعدد پسندی) سے مراد وہ عقیدہ ہے جس کے مطابق آئین و ساخت میں دنیا ایک اکائی
(UNIT) نہیں ہے بلکہ متنافر و مخالف قوتوں (FORCES) کا ایک منظرہ (SCENE) ہے۔[7]
اقبال اور وارڈ دونوں شخصی خدا (PERSONAL GOD) میں اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ ماننے کے باوجود
کہ دنیا متنافر و مخالف قوتوں کا منظرہ ہے دونوں ہی اس نکتے پر متحد الخیال ہیں روح کے علاوہ اور کچھ حقیقی (REAL
نہیں ہے۔ وارڈ کہتا ہے کہ شعوری یعنی فکر و احساس و ارادہ کنندہ وجود (THINKING, FEELING AND
WILLING BEINGS) ہی حقیقی ہیں اور مادہ (MATTER) یا اور عام طور پر عام کائنات (NATURE)

[illegible] ہو یا اس کا مظہر (MANIFESTATION) تصور کرنا چاہیئے۔ ملاحظہ فرمائے اقبال کے اشعار جن میں عالم کائنات کو ایسی روح کا مظہر بتایا گیا ہے۔

عالم آب و خاک و باد سرِّ عیاں ہے تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں
وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں اس کی اذاں ہے تو کہ میں
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرم سیر
شانۂ روزگار پہ بار گراں ہے تو کہ میں
تو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لئے آب رواں ہے تو کہ میں (بالِ جبریل)

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا، من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا، تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن (بالِ جبریل)

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست
طواف او طواف بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبرئیل امین را ہم خبر نیست (ارمغانِ حجاز)

در چمن زی مثلِ بو مستور و فاش
در میانِ رنگ پاک از رنگ باش
عصر تو از رمز جاں آگاہ نیست
دینِ او جز حبِّ غیر اللہ نیست
فلسفی این رمز کم فہمیدہ است
فکر او بر آب و گل پیچیدہ است

دیدہ از قندیلِ دل روشن نکرد
پس ز دیدِ الّا نبود و سر خود زند
اے خوشا آں مردے کہ دل با کس نداد
بند غیر اللہ را از پا کشاد

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق)

یہ سب اقتباسات اقبال کی بعد کی تصنیفات سے لئے گئے ہیں۔ جو خیالات و جذبات منظوم کئے گئے ہیں وہ صوفیانہ عقیدہ ہمہ اوست سے عبارت بھی بتائے جا سکتے ہیں۔ تمام تر اردو، فارسی شاعری میں ہمہ اوست کی واضح ملتی ہے اقبال کی شروع کی شاعری میں بھی اس دھن کی الاپ سامعہ نواز ہوتی ہے۔ باقیاتِ اقبال، سرودِ رفتہ اور بانگِ درا وغیرہ میں بہت کچھ اسی ہمہ اوست کی سنگت نظر آتی ہے۔[9]

اسرارِ خودی کے "ستم گرشو" کی گونج میں ہمہ اوست کا نغمہ ڈوب ہی گیا تھا اور نطشے کی دھن پر حال و قال ہے سوائے ستم گر شو اور کچھ مشکل ہی سے سنائی دیتا تھا۔ چوں کہ وارڈ کے خیالات صوفی عقائد کے آس پاس ہی کے نظر آتے ہیں اغلب یہ ہے کہ اقبال نے وارڈ کی طرف رجوعِ قلب محسوس کی ہوگی بالخصوص وارڈ کے ایسے خیالات کی طرف "گزشتہ نصف صدی میں مادیت (MATERIALISM) کی شکست و ریخت، غائیت (TELEOLOGICAL) کی طرف اور میکانکی پہلو سے دور رہ کر بے علاقہ توحید (NEUTRAL MONISM) کا موجودہ رجحان...... یہ سب دنیا کی ایک ایسی روحانیت سے بھرپور تعبیر (SPIRITUALISTIC INTERPRETATION) کے آغاز کی نشان دہی ہے جو تصورِ خیر (NATION OF THE GOOD) اختتام پذیر ہوتی ہے۔"[10]

اقبال بھی اپنے پیشِ نظر یہی تصور رکھتا ہے کہ دنیا کو استقلال و عزم سے بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے اور عالمِ ممکنات کو ترقیاتی سمجھتے ہوئے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ بالآخر انسان شر پر فتح حاصل کر سکے گا۔[11]

علم کی تنقیص کئے بغیر وارڈ عقیدہ (FAITH) کو خصوصی جگہ دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ عقیدہ سے تا ممکنات کی تسخیر کی جا سکتی ہے۔[12]

علاوہ بریں وارڈ کو ایک ایسی غیر مرئی ذات (UNSEEN BEING) پر یقین و اعتماد ہے، جس کو تمام مذہب ہر زمانے میں ایسی قوت سمجھتے آئے ہیں جو تسخیرِ کائنات میں ان کی ممد و معاون ہوتی ہے۔[13]

اقبال کے یہاں بھی بصیرت پر ور رہ عقیدہ و ایمان کو خصوصی اور اہم جگہ حاصل ہے ؎

دین مجو اندر کتب اے بے خبر — علم و حکمت از کتب، دین از نظر
چیست فقر اے بندگانِ آب و گل — یک نگاہ راہ بیں، یک زندہ دل

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق)

خرد دیکھے اگر دل کی نظر سے — جہاں روشن ہے نورِ لا الٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے — اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے

[illegible] وایمان ایک فعال مظہر ہے۔ "یہ عشق تخلیقی جوشش، ارفع جذبہ، ربانی شعلہ (DIVINE [illegible]
[illegible] کے لیے جوش وخروش، شدت آگیں خودسپردگی (ARDENT SELF - DEDICATION)
[illegible] کے اس ادراک سے مشابہت رکھتا ہے جیسے وہ ایک روحانی دنیا کا ادراک' ایک ایسی دنیا
[illegible] کے احساتی سطح سے بالاتر ہوتا ہے۔ وارڈ لکھتا ہے کہ:

"[illegible] کہ بطور حیاتی سطح پر اس دنیا کا اشارہ وکنایہ نہیں ملتا اور چھوٹے جانور کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی .... تب، کیا ایسی دنیا، روحانی دنیا نہیں ہو سکتی جس کا ادراک فقط فہم و ذکاوت سے بالاتر ہو؟ تاہم' اپنے وجود کے دوسرے جوانب سے ہمیں اشارے فراہم ہوتے ہیں کیونکہ ہماری عقل (INTELLECT) نہ تو ہماری واحد توانائی واستعداد ہے نہ ہی ہماری دیگر توانائیوں اور استعدادوں [illegible] ہے۔ اور بلاشبہ ہمیں اس صداقت (TRUTH) کے اشارے دستیاب ہوتے ہیں' جو ایک دفعہ بیدار ہو کر کبھی ناپید نہیں ہوتی۔"

کسی بالاتر (SOME THING BEYOND) کے احساس کو مجبور انحصار (HELPLESS DEPENDENCE) نہیں گردانا چاہئے کیونکہ عیسائی مذہب کے عقیدے کے مطابق یہ اس اندرونی حضور پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو امن و توانائی کی ایک نئی زندگی کا سرچشمہ ہوتا ہے ...... یہ بالاتر .... ربانی شخصیت ہے ...... یہ عقیدہ صداقت اعلیٰ ..... عشق پر یقین پیدا کرتا ہے اور ایک نئی زندگی کی تخلیق کرتا ہے۔"[16]

اب اقبال کی مشہور نظم مسجد قرطبہ (بال جبریل) کے یہ اشعار دیکھئے ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام — جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل، عشق دم مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام' عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود — عشق ہے ابن السبیل' اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات — عشق سے نور حیات' عشق سے نار حیات
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل' اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب' اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو — رزم ہو بزم ہو پاک دل و پاک باز

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

(بالِ جبریل)

بالفاظِ دیگر، مومن ایک نئی زندگی اور نئی توانائی کا سرچشمہ ہے اور وارڈ اپنے تصور کے مطابق ایسے ہی شخص کو وہ MAN OF FAITH یعنی ایمان و عقیدہ کا آدمی کہتا ہے۔

ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ وارڈ کہیں لبنز (LEIBNIZ) سے اتفاق کرتا ہے اور کہیں اتفاق نہیں کرتا۔ وارڈ لبنز کے MONAD (خوردہ خودی) کے تصور کو صحیح مانتا ہے مگر وہ اس کو WINDOWLESS نہیں سمجھتا۔ وارڈ نے لکھا ہے کہ:

"لبنز کی اس بات سے کوئی اتفاق نہیں کرتا کہ PERCIPIENTS (دراک کنندگان یعنی MONADS) دریچوں سے ایسے بیگانہ ہیں کہ مشترک دنیا کو نہ دیکھ سکیں لیکن لبنز کی یہ بات البتہ درست ہے کہ دراک کنندگان ایسے دریچے نہیں رکھتے جن سے دوسرے ان کے اندر کی طرف دیکھ سکیں۔" ص ۱۴

لبنز کی مونیڈولوجی (MONADOLOGY) پر حرف گیری کرتے ہوئے وارڈ لکھتا ہے کہ،

"...... لبنز کی مونیڈولوجی کی طرح جیسے تصورات صرف جاندار اور فعال وجود کے علاوہ کسی بھی وجود کی نفی کرتے ہیں۔ یہ تصورات کسی از پیش وضع کردہ ہم آہنگی (PRE-ESTABLISHED HARMONY) کی تردید کرتے ہیں اور ان کے مابین کسی تعلق کی غیر موجودگی کا بھی بطلان کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان کے مطابق دنیا کے تمام وضعی وجود (جن کو مونیڈ یا روح بھی کہہ سکتے ہیں) آپس میں ایک دوسرے پر انحصار کرنے اور باہمی ارتباط رکھنے کی وجہ سے منسلک ہیں اور ان کی ہم آہنگی آخری ہم آہنگی ہوتی ہے جو تاریخ کا نقطۂ آغاز نہ ہو کر منزلِ مقصود ہوتی ہے۔" ص ۱۶

اس کے بعد وارڈ اس خاصیت پر زور دیتا ہے جو تمائلی وجود (CONATIVE BEINGS) کو بے حرکت وجود (INERT BEINGS) سے ممیز کرتی ہے۔

"تمائلی وجود سے پیشتر کسی قسم کے قوانین ہو ہی نہیں سکتے...... وہ وجود چاہیں جس طرح کے کیوں نہ ہوں، اپنے عمل اور ایک دوسرے کے مابین عمل کے ذریعہ یکسانیت اور نظم و ضبط پیدا کر ہی لیں گے۔ عادت، مہارت اور محرمیت (FAMILIARITY) وغیرہ تجربہ سے پہلے معرضِ وجود میں نہیں آتیں بلکہ تجربہ کے دوران ہی میں پیدا ہوتی ہیں۔ زبان، رسم و رواج، سماجی حیثیت اور فرائض معاشرے کی ترقی کے ساتھ پیدا بھی ہوتے ہیں اور مستحکم بھی ہوتے ہیں۔ معاشرے کی ترقی کے بغیر ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... لہٰذا روحانی نظریے کے مطابق، عمل کرنے والے پہلے اور قانون وار تقابعد میں...... قوانین اپنے میں کوئی توانائی رکھتے بلکہ ان کی حیثیت صرف تجریدی فارمولے (ABSTRACT FORMULAE) ہی کی ہوتی ہے بلاشبہ اجسام کشش کے حامل ہوتے ہیں لیکن کشش کا حامل ہونا کسی بیرونی قانون سے مجبوری پر دال نہیں ہے۔ قانون تو

... بیان کرنے کے لئے ایک نعیم ہے۔ لہٰذا قانون سے مزید واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہمیں ... بنایا ہے ۱۹

... پر ایک نظر ڈالئے جو اقبال ریویو (IQBAL REVIEW) کے ایک شمارہ میں عطاء الرحیم ...

خود شعوری (SELF CONSCIOUSNESS) یا خودی (SELF) اقبال کے نزدیک ... وجود کی صداقت ہے۔ خود شعوری آخری صداقت (ULTIMATE REALITY) ہے ... کائنات کی واحد تخلیقی اور رہنما قوت (DIRECTIVE FORCE) ہے۔ ایک مذہبی آدمی ... لئے یہی خودشعوری خدا ہے ...... کائناتی خود شعوری (UNIVERSAL SELF-CONCIOUSNESS) ... محبت کرنے کی ترغیب ہی انسانی خود شعوری (HUMAN SELF-CONCIOUSNESS) ... ہے ...... خدا سے محبت کرنے کی ترغیب کا اظہار کرنے کے لئے اور اس سے تسکین حاصل کرنے کے لئے انسانی خود شعوری طور پر اور عمداً سرگرم کار رہتی ہے۔ اسی انسانی عمل کے ساتھ کائنات اپنی مرفع ترین سطح پر یعنی انسانی سطح پر عظیم ترین تکمیل کی منزل کی طرف دھیرے دھیرے بدلتی اور ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ لیکن جب خودی (SELF) اپنے حقیقی نصب العین سے بے خبر ہوتی ہے یا جب وہ اس کی زیبائی (BEAUTY) کا احساس یا تجربہ نہیں کر سکتی تو یہ ان بدلے کے آدرشوں کے پھیر میں پڑ جاتی ہے جن میں زیبائی اور تکمیل کی خصوصیت کا بالکل فقدان ہوتا ہے اور اس سے نتیجۃً بعد میں خود مایوسی ہی لغیب ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر وہ آدرش جو ایک فرد کے سرگرم عمل ہونے کا قطعی منتہا (FINAL END) ہوتا ہے بہت سے سلسلہ در سلسلہ چھوٹے چھوٹے تابع مقاصد یا منازل جو محولہ نصب العین سے معرض وجود میں آتے ہیں یا اس کی طرف رہنمائی کرتے ہیں حصول پذیر ہوتا ہے۔ چاہے ایک فرد کے چھوٹے مقاصد اور منازل صحیح ہوں یا غلط، سچے ہوں یا جھوٹے، اچھے ہوں یا برے ...... آدرش اور ان سے پیدا ہونے والے مقاصد یا منازل سچے جھوٹے صحیح غلط اچھے برے چاہے جیسے بھی ہوں، اقبال کے نزدیک انسانی خودی کا جو ہر و روح ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آدرشوں کو سمجھے بغیر نہ تو انسان کی کارکردگیوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی سماجی خدمات کا تنظیم کے ساتھ اظہار ہو سکتا ہے۔" ۲۰

... وارڈ کے ان الفاظ سے ابھرتا ہے کہ:

"قوانین اپنے میں کوئی توانائی نہیں رکھتے بلکہ ان کی حیثیت صرف تجریدی فارمولے ہی کی ہوتی ہے ...... قانون تو فقط طور و طریقہ کو بیان کرنے کے لئے ایک نعیم ہے۔" ۲۱

"یہی نہیں بلکہ وارڈ کی طرح اقبال کے یہاں بھی ایغو یا خودی محو عمل رہتی ہے اور با ہمدگر محو عمل رہتی ہے۔ ایک طرف تو خودی محیط الذات ہوتی ہے اور دوسری طرف اس میں یہ استعداد و ظرفیت بھی ہوتی کہ دوسری خودی کے لئے ردعمل کی حامل ہو۔ مزید برآں خدا بھی ایک ایغو یا خودی ہے۔" ۲۲

خلاصہ یہ کہ اقبال کے تصورِ خودی میں لبنز، فشطے اور نطشے وغیرہ کے تصورات کا آمیزہ نظر آتا ہے اور یہ بات ... کہ خود وارڈ بھی لبنز اور فشطے کا بہت حد تک مرہون منت ہے۔ اقبال کی آخری زمانے کی شاعری میں ... ہے اس میں نطشے کے اثر سے پیدا شدہ بلند آہنگ جارحیت کافی دبا ہوا معلوم ہوتا ہے اور وارڈ کے تصور ... پذیر ہوتی ہوئی طالب توجہ ہوتی ہے ؎

برون از سینہ کش تکبیر خود را	بخاک خویش زن اکسیر خود را
خودی را گیر و محکم گیر و خوش زی	مدہ در دست کس تقدیر خود را

(حضورِ ملّت، از ارمغانِ حجاز)

خودی روشن ز نورِ کبریائی است	رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از مقاماتِ وصالش	وصالش از مقاماتِ جدائی است

(ارمغانِ حجاز)

خودی را از وجودِ حق وجودے	خودی را از نمودِ حق نمودے
نمی دانم کہ این تابندہ گوہر	کجا بودے اگر دریا نبودے

(ارمغانِ حجاز)

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات	خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند	سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک	من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

(ساقی نامہ، بالِ جبریل)

اب رہا لافانیت کا سوال۔ میکٹگرٹ کے فلسفہ پر اپنے مقالے میں لافانیت پر اپنے تصور کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ "...... لافانیت کو ایک ابدی حقیقت نہ سمجھ کر ایک امید، ایک اشتقاق، ایک فرض ... کیا جا سکتا ہے"
لیکن شریف کی رائے یہ ہے کہ اقبال کو وارڈ سے اس پر اتفاق ہے کہ "صرف عشقِ خداوندی کے ذریعہ ہی محدود خودی کو لافانیت نصیب ہو سکتی ہے۔" غالباً حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا درست ہے اور اقبال کے شخصی لافانیت کے اعتقاد پر ہمیشہ استفہامیہ لگا ہی رہے گا۔ ہاں، اقبال کے آخری دور کی شاعری میں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں ؎

تو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

لیکن یہ آہنگ گاہ گاہ ہی ہے۔ بہرکیف یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کی دورِ آخر کی شاعری سے وارڈ کے تصورات ... ہیں۔ یہ بات بالکل الگ ہے کہ اقبال کو وارڈ کا مرید (DISCIPLE OF WARD) کہا جائے یا نہ کہا جائے۔

حوالے

۱. M.M. SHARIF : IQBAL'S CONCEPTION OF GOD (LAHORE) P. 127
۲. ایضاً PP. 125 - 27
۳. DR. S. SINHA : IQBAL THE POET & HIS MASSAGE (ALLAHABAD) P. 76
۴. M.M. SHARIF : ABOUT IQBAL & HIS THOUGHT (LAHORE) PP. 26-27
۵. IQBAL AS A THINKER (LAHORE) PP. 149 - 150
۶. STRAY REFLECTIONS (LAHORE) ED. JAWED IQBAL P. 139
۷. WILL DURANT : THE STORY OF PHILOSOPHY (NEW YORK) — GLOSSARY P. 533
۸. JAMES WARD : ESSAYS IN PHILOSOPHY (CAMBRIDGE) P. 167
۹. باقیات اقبال : (نیو تاج، دہلی) مولفہ : سید عبدالوحید معانی
سرود رفتہ : (غلام رسول، لاہور) مولفہ : غلام رسول مہر، و صادق علی دلاوری
ان دونوں مجموعوں میں اقبال کا غیر مطبوعہ کلام اکٹھا کیا گیا ہے۔
۱۰. JAMES WARD : ESSAYS IN PHILOSPHY (C.U.P.) P- 252
۱۱. دیکھئے MD. IQBAL : THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGT IN ISLAM (LAHORE) P. 81
۱۲. دیکھئے: "FAITH CAN REMOVE THE MOUNTAINS." JAMES WARD: ESSAYS IN PHILOSOPHY (C.U.P.) P. 101
۱۳. ایضاً P. 101
۱۴. JOHN KIERNAN : POEMS FROM IQBAL P. 106 (NOTES)
۱۵. JAMES WARD : ESSAYS IN PHILOSOPHY (C.U.P.) P. 353
۱۶. ایضاً P- 355
۱۷. ایضاً P- 238
۱۸. ایضاً P- 242
۱۹. ایضاً P- 247
۲۰. IQBAL REVIEW (THE IQBAL ACADEMY) OCTOBER 1969 ISSUE, ATAUR RAHIM : THE CONCEPT OF VERSTEHEN & THE PHILOSOPHY OF SELF
۲۱. JAMES WARD : ESSAYS IN PHILOSOPHY (CAMBRIDGE) P. 241
۲۲. MD. IQBAL : THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGT IN ISLAM (LAHORE) PP- 71-72
۲۳. THOUGHTS & REFLECTIONS OF IQBAL (LAHORE) P. 127
۲۴. M.M. SHARIF : IQBAL'S CONCEPTION OF GOD (LAHORE) P. 127

غزل

مظفر حنفی

شجر جلا تو دھوئیں کا شجر بلند ہوا
انا پسند بہرحال سر بلند ہوا

ابھی وہ ٹھیک سے لنگر نہ کھول پائے تھے
کہ بادبان کمر باندھ کر بلند ہوا

اُبل رہا ہے بدن سے لہو کا فوارہ
اسے ہزار دبایا مگر بلند ہوا

ہراول میں کئی اور بھی دلاور تھے
ہر ایک نیزہ مری ذات پر بلند ہوا

شکستہ چھت سے نظر آسمان تک پہنچی
تو سوچتا ہوں چلو اور گھر بلند ہوا

لگام چھوٹ گئی آرزو کے ہاتھوں سے
غبارِ دشتِ طلب اس قدر بلند ہوا

پھر ایک رات کئی کروٹیں بدلنے میں
پھر ایک غلغلۂ شور و شر بلند ہوا

وہ برگِ زرد ہر اک شاخ پر مچلنے لگے
وہ گرد باد برائے سفر بلند ہوا

قصور وار لبوں کو تو سی دیا تم نے
وہی سوال نظر در نظر بلند ہوا

غزل

کیلاش ماہر

خواب کی تعبیر کتنی احتمالی ہو گئی
زخم روشن ہو گئے دل میں دوالی ہو گئی

یہ شگفتگی روح کا تحفہ ہے کم ظرفی نہیں
جو دعا میرے لئے نکلی وہ گالی ہو گئی

میں کوئی گوتم نہ تھا جو زندگی سے بھاگتا
میری ہر تصویر تصویرِ خیالی ہو گئی

تو نے وہ سوغات بھیجی ہے وفا کے نام پر
میرا دامن دیکھ کر دنیا سوالی ہو گئی

وقت کی بے چہرگی دیکھی نہیں جاتی کہ اب
رات روشن ہو گئی ہر صبح کالی ہو گئی

اہلِ غم دیوار کے سائے میں چھپ کر سو گئے
اب کی فصلِ گل میں ہر زنجیر خالی ہو گئی

کتنے ماہر خونِ دل سے پھر کھلائیں گے گلاب
ہم نہیں تو کیا زمیں کی گود خالی ہو گئی

فضا ابن فیضی

○

کمزور بلبلہ نہ تھا، اُبھرا، سمٹ گیا
جس رُخ مڑا میں، وقت کا دھارا سمٹ گیا

میں گرمیوں کی دھوپ ہوں، جاڑوں کی چاندنی
بادل نہیں کہ اک ذرا پھیلا، سمٹ گیا

ملتی کہاں اب اتنی کشادہ فضا اُسے
آ کر مرے وجود میں صحرا، سمٹ گیا

یوں بحثِ ہست و بود تو پیچیدہ تھی بہت
دو سانس میں معاملہ سارا سمٹ گیا

پھیلے ہوئے ہیں لوگ دُکھوں کی بساط پر
وہ حلقۂ طرب تو کبھی کا سمٹ گیا

اب تو خود ایک نقطۂ موہوم ہے وہ شخص
جس نے مجھے بکھیرنا چاہا سمٹ گیا

آتے ہی اس کا دھیان، گئی فکرِ روزگار
آنگن میں دھوپ اُتری تو سایا سمٹ گیا

بچھڑا وہ کیا کہ ولولے سب دل کے بجھ گئے
لَو تھا جو شمع کی وہی شعلہ سمٹ گیا

ہے کائنات، عکس ہماری ہی ذات کا
جس نے بھی اس کے خول کو توڑا سمٹ گیا

ہے اس کو وجہِ کاہشِ جاں خوشبوؤں کا درد
کیا نسیمِ صبح کا جھونکا سمٹ گیا

ہاتھوں میں وقت کے ہوں میں اسفنج کی طرح
لوگوں نے مجھ کو جتنا سمیٹا سمٹ گیا

ویسے تو میں بھی کوئی پیمبر نہ تھا، مگر
رکھا جو بڑھ کے پاؤں تو دریا سمٹ گیا

اتنا بھی اب نہ اپنے فضاؔ کو حقیر جان
ٹھہرا صدی کا روپ، جو لمحہ سمٹ گیا

غزل

موج (علیگ)

ایسے بچھڑو کہ کوئی مونس و غم خوار نہ ہو
عہد و پیمان وفا ٹوٹیں اور آواز نہ ہو

مجھ کو صحرا پہ بھی دھوکا ہے ترے گلشن کا
میری آغوش تری انجمنِ ناز نہ ہو

آپ کے اذنِ تبسم پہ یقین کون کرے
آپ کے اذنِ تبسم میں کوئی راز نہ ہو

رنگِ محفل نہ جمے، جام میں صہبا نہ ڈھلے
گیت کے سُر نہ ملیں، رقص کا آغاز نہ ہو

اب عنایت نہ ہو بیمارِ محبت کے لئے
وہ نظر جس میں مسیحائی کا اعجاز نہ ہو

کیا اعلانِ رہائی ہے اسیروں کے لئے
بابِ زنداں نہ کھلے، صورتِ پرواز نہ ہو

مجھ سے جوڑے نہ کوئی لفظ و بیاں کا رشتہ
میری آواز سے ملتی ہوئی آواز نہ ہو

وقت آیا ہے کہ اک بار لبِ گیتی پر
حرفِ دل ایسے بکھر جائے کہ آواز نہ ہو

علی حیدر ملک

پسپائی کا آخری موڑ

...دوسرے بھائی تانگیں پسارے آرام سے سو رہے ... درحقیقت میں جاگ رہا تھا کہ وہ آ پہنچے۔ میں نے انھیں اپنے قریب دیکھ کر حیرت سے پوچھا

"——— تم لوگ کون ہو؟"

"ہم پاس والے جزیرے کے رہنے والے ہیں۔" ان میں سے ایک نے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن اس وقت یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

"ہم تمہارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ تم ہمارے لئے سونے کا ایک محل بنا دو۔"

مجھے اس بات پر ہنسی آ گئی لیکن اپنی ہنسی ضبط کر کے میں نے کہا ———

"مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اتنی دور جا کر تمہارے لئے سونے کا محل تعمیر کر دوں؟"

"بات یہ ہے کہ پانی ہمارے کچے مکانوں کو روز بروز نگلتا جاتا ہے جس سے ہم بہت پریشان ہیں۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سونے کا ایک محل بنوا لیں تاکہ ہماری زندگیاں اور ہمارے اثاثے سب محفوظ ہو جائیں۔" ایک نے اپنی بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ دوسرے نے کہنا شروع کیا۔

"تم ہمارے پڑوسی ہو اور اس کام میں مہارت رکھتے ہو، اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم ہماری مدد کرو۔"

جب ان میں سے ہر ایک نے پہلے فرداً فرداً اور پھر ایک ساتھ مل کر میری بڑی خوشامد کی اور اپنے بیوی بچوں کا واسطہ دیا تو میں راضی ہو گیا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔

وہاں پہنچ کر میں نے سونے کے محل کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر شروع کر دی۔ جیسے جیسے محل کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں اور اس کے نقش و نگار واضح ہوتے گئے وہ میری کاریگری اور مہارت کے قائل ہوتے گئے۔ برسوں کی لگاتار محنت کے بعد آخر کار وہ محل مکمل ہو گیا۔ وہ سب بہت خوش ہوئے اور خوشی سے ناچنے گانے لگے۔ جشن کی محفل ختم ہوئی تو میں تھکن سے چور ہو کر وہیں محل کے ایک سائبان میں سو گیا ——— نہ جانے کب تک یوں ہی سوتا رہتا کہ کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھا دیا۔

"ارے یہ یہاں کیوں سویا ہوا ہے۔ ہمارے محل پہ قبضہ کرے گا کیا؟" ——— سانولے رنگ کے ایک دبلے پتلے آدمی نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

"نکالو نکالو ——— اسے یہاں سے نکالو۔" بہت سی آوازیں کھلے خنجر کی طرح فضا میں لہرانے لگیں۔

"بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا آرام کر لوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"نہیں ——— نہیں ———" ہوا میں تیر سنسنانے لگے۔

میں نے بہت منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے، پاؤں

ے ۔ لیکن انہوں نے میری ایک بھی نہ سنی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر
ر گھسیٹنے لگے ۔ انہوں نے اتنا گھسیٹا ۔ اتنا گھسیٹا کہ میرا سارا
دلہو میں تر ہو گیا اور انگ انگ سے کراہ بلند ہونے لگی ۔ اس
بعد مجھے ہوش نہیں رہا ——— اور جب کچھ ہوش آیا تو
نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں لیکن کچھ نظر
ہیں آ رہا ہے ۔ میں بہت حیران ہوا اور دونوں ہتھیلیوں سے
ل کر آنکھوں کے جالے صاف کرنے لگا ۔ پھر بھی بہت
یر تک مجھے کچھ دکھائی نہ دیا اور نہ کوئی آواز ہی سنائی دی ۔
ہیں میرے حواس مجھ سے جدا تو نہیں ہو گئے ۔ ؟
——— خوف کا ایک جھکڑ چلا اور میں
رز گیا ۔ پھر ذرا ٹھہر کر میں نے اپنے تمام حواس کا جائزہ لیا ۔
آنکھیں ، ناک ، کان ——— ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی ۔ تو یہ
جو میں کچھ دیکھ اور سن نہیں پا رہا ہوں اس میں میرے حواس کا
کوئی قصور نہیں ۔ اندر سے سب ٹھیک ٹھاک ہے ۔ باہر سے
رابطہ ختم ہو جانے کی وجہ شاید یہ ہو کہ باہر کی دنیا میں تبدیلی
آ گئی ہے یا اس کی ترسیلی قوت ختم ہو گئی ہے اور ——— اور یہ بھی
ممکن ہے کہ باہر کی دنیا سرے سے ہو ہی نہیں ۔

میں پھر زور زور سے اپنی آنکھیں ملنے لگا یہاں تک کہ
یہ پانی سے جل تھل ہو گئیں ۔ رفتہ رفتہ آنکھوں کے سامنے دھند سی
چھانے لگی ——— مجھے خوشی ہوئی کہ میں دھند کو دیکھ سکتا ہوں
دھند کا پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف تاریکی کی دلدل پھیلی
ہوئی ہے اور مختلف سمتوں سے آتی ہوئی سائیں سائیں کرتی جنگلی
ہوائیں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے برسرِ پیکار ہیں ۔

"یہ ہوائیں کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں ؟"
کسی نے بے آواز لہجے میں سوال کیا اور پھر یہ سوال پھانسی کے
پھندے کی مانند میرے پورے وجود سے لپٹ گیا ۔

"ہوائیں بے وطن ہیں اور گردش ان کا مقدر ہے ۔"
میرے من نے مجھے پھندے کی اذیت سے نجات دلانے کی کوشش کی

ہوائیں اسی طرح سنسناتی ہوئی گردش کرتی رہیں ۔

پھر ہوا کے ایک جھونکے نے آ کر مجھ سے پوچھا ۔ "اے
معصوم خوابوں کے محافظ تم ہم سے جدا کیوں ہو گئے ؟"

دوسرے جھونکے نے دریافت کیا ۔ "میرے محبوب
ہونے کے ہم سفر میں اب کس کے سہارے اپنا سفر طے کروں ؟"

تیسرے جھونکے نے سوال کیا ۔ "میری آنکھوں کی بینائی
تم کب واپس آؤ گے ؟" دور دیس سے آتی ہوئی ان جاڑ
کے مانوس لہجے نے مجھے ریزہ ریزہ کر دیا ۔

پھر میں نے اپنے بکھرے ہوئے ریزوں کو یکجا کیا اور
جسم و جان کی پوری قوت سے چلایا ۔ "میں یہاں ہوں ۔ میں
یہاں ہوں ۔" لیکن میری یہ چیخ کہیں پہنچ نہیں سکی ۔ کیونکہ فوراً
ہی بعد یہ میرے اپنے ہی کانوں سے آ کر ٹکرا گئی ۔ "میں یہاں ہوں
میں یہاں ہوں ۔"

میرے سارے وجود سے انگارے نکلنے لگے ۔ میں ان
انگاروں کو اپنی زبان سے چاٹتا رہا لیکن انگارے تھے کہ ختم
ہونے ہی کو نہ آتے تھے ——— ہوتے ہوتے یہ انگارے میری زبان
کا سارا لعاب چاٹ گئے اور میرا وجود ایک بار پھر ریزہ ریزہ ہو کر
بکھرنے لگا ۔ اب مجھ میں اپنے بکھرتے ہوئے وجود کو سمیٹنے کی
صلاحیت بھی معدوم ہو چکی تھی ۔

باہر ابھی تک دلدل اسی طرح قائم تھی
جنگلی ہوائیں سائیں سائیں کرتی پھر رہی تھیں
اور میں لمحہ لمحہ بکھر رہا تھا ۔

پھر جب انتہائی نڈھال ہو کر میں زمین سے چپک گیا
اور اپنی بے نور آنکھوں سے سورج کے ابھرنے کا انتظار
کرنے لگا ——— تو کہیں سے ندا آئی
زمین طلوع ہو رہی ہے ۔

[illegible] بچھڑتے ہوئے غم یاد آئیں گے
[illegible] قسم یاد آئیں گے
[illegible] کہ اس طرح ترے وجود میں
[illegible] کیا یاد تو ہم یاد آئیں گے
[illegible] کے تو زخم ہیں سینے سے لگا لو
[illegible] بچھڑتے ہوئے غم یاد آئیں گے
[illegible] جائیں گے صد ہواؤں کی زد میں
[illegible] گھٹاؤں کے ستم یاد آئیں گے
[illegible] سی لگتی ہوئی ناساز شبوں میں
[illegible] خیالوں کے صنم یاد آئیں گے
[illegible] آنکھوں کے یہ گل رنگ [illegible]
[illegible] خواہشوں کے ادھم یاد آئیں گے
دن رات کے ہونٹوں پہ بھی سرخیاں ہوں گی
[illegible] حادثے حیات کم یاد آئیں گے!!
[illegible] جاؤ گے [illegible] لمحوں کے سفر میں
اس دشت میں ہم سبز قدم یاد آئیں گے
[illegible] شہر ستم ساز کی سفاک سڑک پر
[illegible] کے شفقت بھرے غم یاد آئیں گے
[illegible] جذبات کی جب [illegible]
[illegible] وقت شکستہ قلم یاد آئیں گے
[illegible] جاں ستاں میں ظفر کون بچا ہے
[illegible] زندگی تجھ کو بہت ہم یاد آئیں گے

غزلیں

ظفر غوری

لوٹنے تجھ کو پر سمت ید پار کرنے آئے تھے
ہم بھی کل اس زندگی سے پیار کرنے آئے تھے

ڈر کے جنگل کی فضا سے پیچھے پیچھے ہو لیے
لوگ چھپ کر قافلے پر وار کرنے آئے تھے

کیسی اپنی کم نصیبی دیکھ کر شرما گئے
چور مجھ بے مایہ کو نادار کرنے آئے تھے

اس گنہ پر مل رہی ہے سنگساری کی سزا
پتھروں کو نیند سے بیدار کرنے آئے تھے

اب اسی لا حاصلی کا خوف دل ڈسنے لگا
ہم اسے جس کرب سے دوچار کرنے آئے تھے

لوگ سمجھے اپنی سچائی کی خاطر جان دی
ورنہ ہم تو جرم کا اقرار کرنے آئے تھے

وہ بھی کربِ خود بیانی میں ظفر غلطاں ملا
جس سے اپنی ذات کا اظہار کرنے آئے تھے

شروع سے اس کا ہر انداز آشنا کا تھا
اس اجنبی کا ہر اک وار کس بلا کا تھا
میں اس کو قتل نہ کرتا تو قتل ہو جاتا
سوال سامنے دونوں کے خود بقا کا تھا
جہاں میں درد کے رشتوں کا مول کیا لگتا
زیاں کچھ اس میں کسی جنسِ بے بہا کا تھا
کوئی بھی فرد کسی کا نہ حال جان سکا
عجیب رنگ ترے شہر کی فضا کا تھا
گرا دیا نئے موسم کی شوخ دستی نے
ہوس کی شاخ پہ جو آشیاں وفا کا تھا
میں برگِ خشک سا اُڑتا رہا تعاقب میں
قیام دشت میں جانے کہاں ہوا کا تھا
لہولہان جسے [illegible] بن میں چھوڑ گئے
جو دیکھا لختِ جگر میرِ قافلہ کا تھا
لرز رہا تھا اُجالا سا کوہِ شب کے ادھر
ظفر وہ تازہ لہو حرفِ خوش نوا کا تھا

آہنگ /

شاہد حسین

صحرا نے گرد باد میں گھوما کرے کوئی
نہ مجھ سی ہی تپش کا مداوا کرے کوئی

ساحل پہ بھی بچا نہ سکے آپ کو تو پھر
کیسے سمندروں سے کنارا کرے کوئی

آئینۂ شکستہ میں چہرہ ہے منقسم!
اپنی شناخت کے لئے اب کیا کرے کوئی

یہ دشتِ بے اماں ہی بہت ہے مرے لئے
کوہِ ندا سے اب نہ بلایا کرے کوئی

پہچان حرف حرف کی مٹنے گی ایک موج
ساحل پہ بیٹھ، ریت پہ لکھا کرے کوئی

تنکے تو ہیں مگر یہ مرے آشیاں کے ہیں
ٹکڑے ہیں بجلیوں کے نہ کھیلا کرے کوئی

مشہد میں شاہ کرب و بلا کے شہید ہو
ہے نام جب حسین تو اتنا کرے کوئی

معصوم سا وہ شخص تھا شاید خبر تراش
کل کہہ رہا تھا مجھ کو حقیقت کی ہے تلاش

مرنے سے پہلے مر گیا پھر حال یہ ہوا
سڑکوں پہ گھومتا تھا اٹھائے وہ اپنی لاش

ویران سی ان آنکھوں میں اترا ہی تھا کہ پھر
پھر ہو گیا ہے قلب جو پاش پاش، کاش کاش

پھر ہے وہی سکوت، خموشی کا راج ہے
کوئی نہ اضطراب نہ لرزش نہ ارتعاش

مجھ کو گھنی صداؤں کے جنگل بلائیں پھر
کر دوں نہ ترک شہر کی اپنی میں بود و باش

ہاں ہاں! ستاؤ رات کٹے تو کسی طرح
ہوگا یہی نا، داستاں ہوگی وہ دلخراش

پتھر کسی نے پھینکا ہی ہوگا جناب شاہد
شیشہ ہے دل کا آج جو اس طرح پاش پاش

احتشام اختر

○

کیسا ظالم ہوں سزا دیتا ہوں
رو کے خود اس کو رلا دیتا ہوں

مشغلہ اب تو یہی ہے میرا
نام لکھتا ہوں مٹا دیتا ہوں
خود جلاتا ہوں میں یادوں کے دیے
اور پھر خود ہی بجھا دیتا ہوں
جب ندی شب کی جواں ہوتی ہے
ناؤ خوابوں کی چلا دیتا ہوں
جب بھی روتا ہے دلِ زار تو میں
پھر نہ کچھ کہہ کے ہنسا دیتا ہوں
کوئی دیکھے کہیں آنکھوں کے گہر
خاک میں کیسے ملا دیتا ہوں
میری پہچان یہی ہے اختر
آئینہ سب کو دکھا دیتا ہوں

○

چپ رہوں ایسا ہی کر دے کوئی
خالی برتن ہوں میں بھر دے کوئی
خواب آنکھوں میں کھٹکتے ہیں بہت
میری شب کو بھی سحر دے کوئی
سنگ باری کی تمنا ہے مجھے
نخلِ دل کو بھی ثمر دے کوئی
کب سے روشن ہوں میں ویرانے میں
مجھ کو خاموش ہی کر دے کوئی
دیکھ کر اس کو جہاں کو دیکھوں
ایسی مجھ کو بھی نظر دے کوئی
ہاتھ کٹ جائیں امر ہو جاؤں
ایک ایسا بھی ہنر دے کوئی
کھو گیا ہوں میں جہاں میں اختر
میرے ہونے کی خبر دے کوئی

علی امام

رپورٹ

(ازموں کو کہانیوں پر ترجیح دینے والوں کے نام ایک نوحہ)

وہ تقریباً ۴۵ کیلوگرام، ۷۰ یا ۸۰ سال اور پانچ فٹ چھ انچ کو اپنے آپ سے لپٹائے ہوئے تیز رفتار گاڑیوں سے بے نیاز سڑک کراس کر رہی ہے۔

تار تار ہوتے ہوئے میلے چکٹ کپڑے اور اس سے دکھائی دیتا ہوا خزاں آلود مربھوی، شہد سے لت پت ٹیلے اور ٹیلے سے لت پت مکھیاں۔ آنکھوں میں کیچ، بالوں میں گوبر جیسی غلاظت۔ انگلیاں کیچڑ سے نکالی ہوئی لکڑیاں چہرے پر پیدائش کے وقت کی لسلساہٹ اور جمی ہوئی گندگی۔ ہاتھ میں کھیتی اور اس میں پھپھوندی لگی روٹیاں کچی مہکتی ہوئی مچھلیاں۔ بھنبھناتی بجبجاتی ہوئی اور بہت کچھ ——

چلچلاتی دھوپ اور بپھرتی ہواؤں کے مارے [illegible] ہوئے لوگ اسے دیکھنا اور سوچنا [illegible] نہیں کرتے میونسپل ہسپتال سے جھانکتا ہوا سورج [illegible] لمحے کے لئے انھیں روک ہی لیتا وہ آنکھوں کو بھانپتی ہوئی بہت کوشش کرتی کہ اس کے تار تار ہوتے ہوئے کپڑے سجدہ گاہ کو ڈھک دیں مگر بار بار کے ڈھکنے اور چھپانے سے وہ اور بھی وا ہوتا ہوا معلوم پڑتا۔ تب وہ جھلا کر اسے جوں کا توں چھوڑ دیتی یا اپنے اندر کی مجبوریوں کو آزاد کر دیتی تاکہ بندے محرومیوں کی قبرگاہ سے خوشیاں نوچ لیں۔

اوپر دھواں، بادل اور خلاء بلا جھجک گزرتا ہوا ساتویں آسمان پر پھیل کر آقا کے وجود کو انت سے اننت کے لائق بنا رہا ہے اور نیچے ہر ہر گھر سے غلاظتوں کو اگلتے ہوئے چھوٹی چھوٹی نالیاں سڑک کے کنارے بہتی ہوئی بڑی بڑی نالیوں میں آکر گرتی ہیں، یہ بڑی بڑی نالیاں شہر سے دور ایک مردہ ندی کی گود میں آ ٹھہرتی ہیں۔

غلاظتوں کے موافق سمت پر پھیلی ہوئی اسٹیشنوں کی انجن کے فوبی سہارے کے ذریعہ پیچھے بہت پیچھے جاتے ہوئے لوگ، بڑھے ہوئے داروؤں کا سمندر اور مردہ جانوروں کے گوشت کی سڑاندھ ہے۔ کچھ دور ہٹ کر مخالف سمت کباڑ، گیرج۔ الکٹروپینٹنگ اور راڈو موبائیل ہیں میرے گھر کا راستہ ان نمونوں کے بیچ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتا ہے۔ میں کے شغل سے چور ہوتے ہوئے جسم کو گھر واپس لوٹا رہا تھا۔ مگر راستے کو بند کیا دیا ہوا دریا بہائی ہوئی تھی۔ چند گز فاصلے پر دو آدمی گرتے پڑتے چلے، دیکھتے ہی پہچان گیا پاسی خانہ کے ناتے سلامی بھیکی۔ میں وہیں پر کھڑا ہو گیا چانس ملنے پر تھوڑی سی لکڑیاں میں بھی کاٹ لوں گا۔

" بابا چھوکری کو لے کر کار کھانے کے پیچھے دبا ہے!

[illegible] جیب [illegible] الٹا کھول کر پھینکو !
[illegible] تب تو تاتا۔
وہ [illegible] ہو گیا۔ چیتھڑا، چڑا اور ناتا،
[illegible] ڈبل اور گریز کی بنڈنگ، قمیض کی جیب
[illegible] ٹنگی ہوئی چیت۔ ہیپ اور تختے پر گھس کر چور
[illegible] بیٹھ کر وہ اس کے گال پر اپنی پٹرول سے لت پت
[illegible] جاتا ہے۔ پھر انگلیوں اور ہتھیلی کو خوب
رگڑ کر اپنی [illegible] ہوئی قمیض میں پونچھتا ہے۔ منہ سے تھوک
نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھتا ہے اس کے گال پر اپنی تھوک آلود
ہتھیلی کو رگڑتا ہے۔ چند لمحے بعد دانتوں سے اس جگہ کو
چباتے ہوئے اس کے پیر میں اپنا پیر پھنسا دیتا ہے۔ وہ اکھڑے
ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے زمین پر آن پڑتی ہے۔ [illegible]
[illegible] پھیکا جاتی ہے۔ آنکھیں موندے۔ ان کے
بیچ دھاروں پر سر جھکائے اپنی ٹوٹتی بنتی سانسوں کے درمیان
وہ کسی سفر کے اہتمام سے لیس کر دی گئی ہے۔

پھر بھی کدورت یا احتجاج کا کہیں دور دور تک
نام و نشان نہیں ہے۔

ٹیلے پر اس کے بائیں ہاتھ کا گریز چھاتا جا رہا ہے
مینڈک مردہ ندی کے گندے جالے میں چھپاک چھپاک
کودتا ہے۔

میں خود کو ہوا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ کئی ہوئی لکڑیاں
گود میں چھوڑ کر انجان گیپ کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔

وہ گندے پر بیٹھی چینیوں کے اگلتے اور گھروں کی
ٹھکی بنی پر [illegible] اشیاء کو چن رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک ٹوکری
دھری پڑی ہے۔ جو اس کے ساتھ ہی ساتھ کھسکتی چلی جاتی
ہے۔ وہ جلے ہوئے کوئلے کو اٹھا کر اپنی ہتھیلیوں پر رگڑتی
ہے [illegible] سفید [illegible] کو پھانک جاتی ہے۔ اور سیاہ ڈھیلے کو
[illegible] میں پھینک دیتی ہے۔

اب کاغذ کے ڈھیر پر کھسک کر پہنچ چکی ہے۔ اسے
کوڑی سے کھود کر بکھیر رہی ہے۔ تہ در تہ جمے ہوئے اوراق
میں منہمک ہے۔ جب اس کا انہماک ٹوٹتا ہے تو وہ کاغذ کے
پلندے کو اپنی ٹوکری میں جمع کرنے لگتی ہے۔ ایک دیمک لگے
ورق کو اٹھا کر چوستی ہے۔ اور دانت میں دبا کر گھونٹ جاتی
ہے۔ پھر وہی الٹ پلٹ، ایک کاغذ کو پیٹ کر ادھر ادھر
دیکھے بغیر اپنے بلوز میں دفن کئے دیتی ہے۔ ایک گڑی کا [illegible]
مل جاتا ہے۔ جسے کان پر یوں ہی جھوتا ہوا چھوڑ دیتی
ہے۔ ایک مڑا تڑا کلینڈر جس پر بڑی بڑی تصویریں بوڑھے
بزرگوں کی دکھائی پڑ رہی ہیں۔ اسے اٹھا کر ڈیٹ کو غور سے
دیکھتی ہے۔ پھر اسے مروڑ کر ایک کنارے اپنی غلاظتوں کا
اخراج کرتی ہے اور مروڑے ہوئے کاغذ سے خود کو صاف کر لیتی
ہے۔ تب ٹوکری اٹھا کر سڑک پر اندھی لنگڑی بے رخی
سے اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر
میں چونک پڑا۔ (آخر زہر نے زہر اگا ہی دیا) میں شدت
احساس میں میڈیکل ہال کی طرف بھاگا۔ کئی استقاطی ٹیبلیٹ
لئے لوٹا۔ جب تک وہ غائب ہو چکی تھی۔ میں بے تحاشہ
سڑک پر بھاگنے لگا۔ مگر مخالف سمت سے آتے ہوئے اکھل
بھارتیہ جلوس میں پھنس جاتا ہوں۔ بس، ٹرک، ٹم ٹم، رکشا
اور بیل گاڑی سے بچتے بچاتے ہوئے نکلا تو اونٹ، ہاتھی
گھوڑا، گارا اور گدھوں کے ریلے میں پھنس گیا۔ دیواروں
سے چپکے چپکائے گھروں کی سیڑھیوں۔ دالان پلیتھے سے
گزرتا ہوا آگے جا کر آدمیوں کے ہجوم میں گھر جاتا ہوں
جو مجھے آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ باری باری سے ریلا
آتا ہے اور مجھے دھکا مار کر پیچھے کر دیتا ہے (مخالف
سمت میں چلنے کا حشر یہی ہوتا ہے) پھر بھی میں گھستا گھسا
آگے کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں۔ چوٹ کھا کھا کر جب
بری طرح زخمی ہو گیا تو چیخ پڑا !

تم لوگ لینے والے ہو، میں دینے والا ہوں

مجھے راستہ دو!

تم لوگ لینے والے ہو، میں دینے والا ہوں

مجھے راستہ دو!

مگر جلوس کے نعروں سے ٹکرا کر میری آواز شکستہ پا لوٹ کر میرے ہی اندر چلی آتی ہے۔ اس تگ و دو میں میرا کافی وقت ضائع ہو رہا تھا چنانچہ راستہ کاٹ کر جلوس سے آگے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

گلیوں گلیوں۔ سڑکوں سڑکوں بھاگا ہر کہیں ڈیرے، گیرٹ۔ نمبری اور بالے کو جھانکا مگر وہ تو ٹن۔ (قید کر لی گئی تھیں جو ہوائیں اسے آزاد کرنے کے لیے انانیت کے دروازوں پہ دستک دیتے ہوں گے کہ آزادی اور غلامی کے بدرو جذبوں کے معنی بند دروازوں کے اندر واضح ہو چکے ہیں)

ایک دن مجھے خبر ملی کہ میرے بھائی نے جو بھانگ اور چرس کا عادی ہو گیا تھا نوکری یا ڈگری یا چھوکری کے چکر میں خودکشی کر لی ہے۔ اور قانون کے شیطانی ہاتھوں نے میرے باپ کو حراست میں لے لیا ہے۔ میں گھر قہقہہ لگانے جا رہا تھا کہ اچانک وہ ایک گلی سے حسب معمول شکل و شباہت میں نمودار ہوئی۔ میں نے جیب ٹٹولی۔ اسقاطی ٹبلیٹ انتظار کر رہی تھی برفیاں خریدیں۔ اسے اشارہ کیا۔ قریب آئی تو ٹبلیٹ اور برفیاں اس کی کھیٹی میں ڈال دیا۔ اب میں نے اطمینان کی سانس لی اور گھر کے سوگ میں منہ لٹکائے شامل ہوا۔

آج جب جنگی چورستے پر پہنچا تو سیپ اور ہاتھ کے بل کھسکتی ہوئی وہ دکھائی پڑی، چانگھوں سے دبائے ہوئے کاغذ اور اس پر سنبھالے ہوئے سڑی گلی چیزوں سے بھی خالی کھیٹی ٹیلے بے نام موسموں کے جھکڑ دار بارش کی زد میں آ کر بہ گئے ہیں۔ آنکھیں کیچ کے اندر گم، ہونٹ تے جیسی رطوبت سے بھیگی پڑی ہے۔ کپڑے بچھڑتے ہوئے جسم سے [illegible] کر چکے ہیں۔ گھاؤ سے بہتے ہوئے پیپ جگہ جگہ [illegible] خون اور بدن کو نوچتی ہوئی مکھیاں۔

اس کی پشت پر سنبھلا ہوا ایک وجود جس کو [illegible] ٹبلیٹ چبا نہ سکی۔

چورستے پر آسمان سے باتیں کرتی ہوئی زمین خود کو نیچے کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کر رہی ہے۔ گو نیچے صاف شفاف حسین و جمیل شاہراہ بل کھاتی ہے۔ مگر وہاں زمین اچاٹ اچاٹ اور بے سنگر رہا کرتی تھی۔ مگر خود کو کسی نہ کسی طرح پر کر ہی لیتی تھی۔

بچہ ایک ہاتھ سے ماں کے کاندھے کو تھامے دوسرے ہاتھ سے جھک کر زمین پر گری ہوئی چیزوں کو چنتا جا رہا ہے وہ کھسکتی جا رہی ہے۔ بازاروں میں چھوٹے چھوٹے بچے منہ سے اگلی ہوئی ٹافیاں اس کی طرف پھینکتے ہیں۔

بے نام کیفیتوں کی بے نام اولاد اپنے نرم جولیوں کے تھوکے ہوئے ٹافی کو اٹھا کر چوستی ہے اور خوب خوب چلتی ہے۔

— — —

غزلیں

انجم ترازی

خون کی نہر لگے، درد کا چناب لگے
مجھے تو زیست کا ہر پل اک عذاب لگے

ہے شور خول کے اندر سکوت ہے باہر
مجھے تو ذات کی چپ حشر کا جواب لگے

جلا رہی ہے انہیں کب سے انتظار کی آگ
سلگ رہے ہیں دریچوں سے ماہتاب لگے

لہو ہو دل تو پھر آنکھوں میں پھیل جائے شفق
[illegible] اور بھی گہنا کے آفتاب لگے

کسی کے کام تو آئے مرے لہو کا درخت
مرے بھی ہاتھ سے اب شاخِ انقلاب لگے

عجیب رنگ دکھاتا ہے یاد کا منظر
کہ جیسے شام کو پانی میں آفتاب لگے

کسی کے عیب پہ پردہ اٹھاؤں کیوں انجم
مجھے تو اپنا بھی چہرہ پسِ نقاب لگے

جو ایک شکل دکھاتے ہیں روز سائے مجھے
وہ آدمی ہے تو بڑھ کر گلے لگائے مجھے

میں ہر سفر میں نئی رہگزر تلاش کروں
پسند آئیں نہ رستے بنے بنائے مجھے

میں سنگِ سبز کا ترشا ہوا کھلونا ہوں
وہ اپنی آنکھ کے شوکیس میں سجائے مجھے

مرے وجود میں میرا عدو بھی رہتا ہے
مری ہی ذات کا جو آئینہ دکھائے مجھے

میں اپنے رستے کا انجم خود ایک پتھر ہوں
کہیں سے آئے کوئی راہ سے ہٹائے مجھے

میں تو سایہ ہوں اندھیروں کا ملا مرقد مجھے
روشنی لا کر دکھا میرے ہی خال خد مجھے

ان فصیلوں سے نکلنا چاہتا ہوں دوستو
ہر قدم پر روکتی ہے جسم کی سرحد مجھے

گونجتا رہتا ہے اپنی ہی صداؤں کے طفیل
ہر کوئی لگتا ہے اپنی ذات کا گنبد مجھے

راحتوں کی ساعتیں کب ہیں مرے کشکول میں
لے مرے ساتھی ملی ہے درد کی مسند مجھے

مجھ کو شہرِ جاں کا اے انجم سفر درپیش ہے
اپنی پرچھائیں کا خود ہی ناپنا ہے قد مجھے

محمد حسن امام

○

وہی اہلِ خرد جو ہیں خرد سے آپ بیگا نہ
پرستارِ محبت کو کہا کرتے ہیں دیوا نہ
ذرا اے اہلِ دل، اہلِ نظر ٹھہرو سناؤں گا
حدیثِ بادہ و ساغر، گل و بلبل کا افسانہ
مآلِ زیست کے زرّیں اصولوں کے منافی ہے
بہ یادِ رفتگاں شیوہ، ز فکرِ حال بیگا نہ
ہو الاوّل، ہو الآخر، ہو الظاہر، ہو الباطن
یہ روشن ہو تو زیبا ہے تمہیں ضربِ کلیما نہ
مقامِ فکر ہے ناداں نہ رہ خوابیدہ خوابیدہ
چمن زارِ محبت آج ہے صیدِ بہیما نہ
خیالِ کہنہ کو افکارِ تازہ سے بدل ڈالو
بناؤ عزم کے مینارۂ روشن پہ کاشانہ
وہ تیری عظمتِ رفتہ، ترا کارِ نمایاں تھا
جو تیری خود فراموشی سے ہے اب جھوٹا افسانہ
خودی کی پست منزل سے جو گزرے تو خدا پایا
خود آرائی ہوئی ایسی کہ پائی شانِ یزدانہ
امامِ مبتلا دکھ درد کے ماروں کو یہ کہہ دو
بڑا جاں بخش ہے لاتقنطو کا اذنِ مستانہ

اشہر ہاشمی

○

نظر نہ آتا تھا محو حسن ہی ہوتا ہوتا
کہیں بھی ہوتا کسی روپ میں ملا ہوتا
یہ بوجھ بوجھ سی آنکھیں تو کچھ سبک ہوتیں
پڑاؤ خواب کا اے کاش! اٹھ گیا ہوتا
جو آگ تھی مرے چاروں طرف غضب کی تھی
نجات ملتی اگر میں ہی بجھ گیا ہوتا
پلٹ کے آیا تو دروازہ بند تھا اس کا
مجھے تو جانا تھا، آگے ہی بڑھ گیا ہوتا
تھا ہاتھ ہاتھ میں اتنے قریب آ کر بھی
دلوں کے بیچ تھا جو فاصلہ، مٹا ہوتا
مثالی یار تھا یا زد کا ہاشمی جب تو
مثال اس کی کوئی دشمنی میں کیا ہوتا

سلیم شہزاد

○

گھر مانگتے ہیں، راہ گزر مانگتے ہیں لوگ
جلتے نگر میں موم کے پر مانگتے ہیں لوگ
سچائیوں سے ان کو ہمیشہ ہے اختلاف
پھر کس بھرم میں شمس و قمر مانگتے ہیں لوگ
ایذا پسند ہو گئے سانپوں کے درمیان
باتوں میں زہر کا سا اثر مانگتے ہیں لوگ
بہتے ہوئے لہو سے انھیں کس قدر ہے پیار
شانوں پہ اک جنوں زدہ سر مانگتے ہیں لوگ
چاٹیں گے کب تلک یوں ہی سدِ سکندری
جینے کو کوئی شغلِ دگر مانگتے ہیں لوگ
سوتے ہیں جب سروں پہ چمکتا ہے آفتاب
اور ظلمتوں میں سمتِ سفر مانگتے ہیں لوگ
گھبرا کے آج اپنے مشینی مزاج سے
ہر لمحہ ایک تازہ خبر مانگتے ہیں لوگ
باہر کے اضطراب کی ان کو ہے گر خبر
پھر کیوں حصارِ جسم میں در مانگتے ہیں لوگ
بینائی ان کی کھو گئی سورج کے شہر میں
اندھی سیاہیوں سے نظر مانگتے ہیں لوگ

غزل

نثار خلیلی

غلط ہجّے کر یوں مجھے لکھا نہ کر
دوستی گر ترک کرنی ہے تو پھر ایسا نہ کر

سب چھپا کا خوب کیا اور زشت کیا
اصطلاحاً بھی کبھی سوچا نہ کر

جز ترے سب لوگ بے چہرہ سے ہیں
اے شعورِ انجمن تنہا نہ کر

صبح جب ہوگی تو دیکھا جائے گا
رات ہے کٹ جائے گی جاگا نہ کر

ہاتھ کچھ آتا نہیں جز تیرگی
روشنی کا اس قدر پیچھا نہ کر

راستہ جاتا کدھر ہے یہ بتا
رہبری کے نام کو رسوا نہ کر

آرزو کا ماحصل کچھ بھی نہ ہو
شعر میں اس لفظ کو کاٹا نہ کر

کہہ رہے تھے ہم سے اربابِ جنوں
شہر کو صحرا کبھی لکھا نہ کر

پہلی صف میں وہ جو بیٹھے ہیں نثار
اُن بزرگوں سے کبھی اُلجھا نہ کر

غزل

رونق گیاوی

آتی کیا جلدی ہے بابا رُکنے دے طوفان ذرا
ہم تم تیرے دیس کو جائیں نکلے تو ارمان ذرا

کاٹ چکا ہوں سر میں اپنا تھا اپنا عرفان ذرا
میں ہوں تیرے دیس کا باسی تو مجھ کو پہچان ذرا

یخ بستہ احساس کا ماتم کرتے بھی جی اوب گیا
گرم سمندر کے پانی سے آج کروں اشنان ذرا

ننگے پیڑوں کی چھایا میں گھور تپسیا کون کرے
مانگ رہا ہوں بھیک دیا کی برسو تم بھگوان ذرا

شوخ ہواؤں کے جسموں پر سورج کی کرنوں کی مار
دھوپ چھاؤں کے کھیل میں پہنچا فصلوں کو نقصان ذرا

اُڑتی دھول رہے جسے کی آنکھوں میں اٹ جائے گی
اپنی جانب اور جھکا مت خوشبو کا میزان ذرا

ایک نظر کھنی ہے مجھے بھی سوکھے آس کے پودوں پر
رونق دوب کی ہریالی سے خالی ہو جب لان ذرا

حسین الحق

شاید

یہاں میں ہوں ـــــ
وہاں کیا ہے اور کون ہے، اس کا پتہ نہیں۔
میرے چاروں طرف گہری سیاہ، پراسرار رات ہے
...... دور ...... تا حدِ نظر...... رات ....
رات جو اپنے سینے میں سب کچھ چھپا لیتی ہے ...... میرے
تمہارے دکھ سکھ ...... جانے انجانے جہانوں کے سارے بھید
رات! جو شبنم میں نہائی اور دھند میں بھیگی ہوئی
ہے، میرے دل کی طرح جہاں ستارے اوس اور کہر کے دھند لکے
میں کھو جاتے ہیں۔

یہاں میں ہوں، اس گہری، سیاہ، پراسرار رات
کا ایک حصہ، میرے من میں بھی وہی دکھ، وہی اندھیرا، وہی
اسرار، چاروں طرف بیتابانہ بکھر رہا ہوں...... کہیں کوئی
نشان ...... کوئی سراغ ......
کہیں کچھ نہیں ...... کچھ نہیں ...... کچھ نہیں!
میں آہستہ سے اپنا پیر ہلاتا ہوں، اطمینان کی
سانس لیتا ہوں کہ ابھی بھی احساس اپنے وجود کا ایک حصہ ہے
پیروں کی لرزش پہ لہریں شاید مضطرب ہو گئی ہیں
مجھے ایسا احساس ہو رہا ہے!
ساحل پر میں ہوں ...... اور ریت ...... اور
ہوا ...... اور رات ...... گہری سیاہ پراسرار رات

ایک تیز رفتار ندی ...... دور تا حدِ نظر ...... پانی اور رات
اور ہوا اور ریت ...... میرے قدموں کے نیچے ریت..
میرے پیچھے ریت ...... ساحلی ریت ...... اور اس کے پیچھے
ایک شہر، جو میرا ہے یا شاید میرا نہیں مگر جہاں میں رہتا
ہوں، میرے آگے ...... ندی ...... تیز رفتار ندی ...
ندی کے اس کنارے پر میں، ندی میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوا
ہیں، اور ندی کے اس کنارے ...... شاید ریت، اور ہوا
اور رات ...... گہری، سیاہ، پراسرار رات ...... اور
اس کے آگے ایک شہر جو اس کا ہے یا شاید اس کا نہیں ہو
مگر جہاں وہ رہتا ہے۔

ندی آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے ...... لہریں کنارے سے
ٹکراتی ہیں، آواز پیدا ہوتی ہے ...... چپ ...... چپ ......
چپ، پھر وہ لہر آگے بڑھ جاتی ہے ...... پھر دوسری لہر
پھر تیسری لہر ...... چپ ...... چپ ...... چپ ......
ایک تسلسل ...... مسلسل رواں دواں!
تسلسل! اندھیرے کا، اور لہروں کا، اور
اسرار کا۔

تم کہاں ہو؟ اس سارے تسلسل میں تم کہاں پہ
ٹھہرے ہو ...... کہاں پہ رواں ہو؟
میں یہاں، اس کنارے پہ، رات، اور رات کے

اسرار میں چھپا ہوا ..... اور رات آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے ،
پانیوں کے اوپر ، اور پانیوں کے اندر ..... ندی کے سینے پہ
رات ..... اور چراغ ...... ہولے ہولے بہتا ہوا چراغ !
اُس کنارے سے ہواؤں کے ریلے کے ساتھ شور و غل کی آوازیں
یہاں تک پہنچ رہی ہیں ..... کچھ بھی واضح نہیں ..... سب دُھند
اور گہرے اور اسرار میں کھویا ہوا ..... میں دور سے آتی ہوئی
آوازوں کو اپنے وجود کے ایک ایک حصے پہ محسوس کر رہا ہوں۔
..... بھاگتے ہوئے خوف زدہ قدم ..... گولیوں کی تڑ تڑ تڑ .....
بچوں کی سسکی اور بلبلاہٹ ..... تلواروں کی جھنکار .....
عورتوں کی بے سہارا ہانپتی سانسیں ......
سُنو ! جب قبر کی نرم مٹی تمہارا بستر بنے تو یاد رکھنا
کہ کہیں اور ..... کوئی اور بھی اِس سارے تماشے میں شامل
ہے۔ میں ! اِس رات ، اور اِس رات کے سارے اسرار کا
ایک جزو ..... گہری ، سیاہ ، پُراسرار رات ..... ایک تیز
رفتار ندی ...... دور تا حدِ نظر ..... پانی اور رات
اور اس رات اور پانی کے سینے پر ایک چراغ ...... تیرتا ہوا
چراغ ..... سمتوں کے تعین سے بے پروا ..... لہروں پہ
ہچکولے کھاتا ہوا چراغ .....

وہ اگر نہ آیا تو ؟

میرے چاروں طرف رات ..... یہاں میں .....
اور ندی ..... ندی میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوا میں .....
کسی کا منتظر ..... انتظار کس کا ہے ..... جواب
بھی اس رات کی طرح اسرار میں گم ..... میں بار بار اپنے آپ سے
پوچھ رہا ہوں ..... انتظار کس کا ہے ..... انتظار کس کا ہے
شاید اس کا ..... شاید اپنا ..... شاید تمہارا ..... شاید
کسی کا نہیں ......

وہ اگر نہ آیا تو ؟

ندی کے سینے پہ تیرتا ہوا چراغ ..... سمتوں کے
تعین سے بے پروا ..... لہروں پہ ہچکولے کھاتا ہوا چراغ .....
الاؤ جل رہے ہیں ..... آگ زندہ ہے .....
تو ایسا ہوا ...... تو ایسے ہوا ...... ؟
ہاں ! کیسے ہوا ؟
تو یہ ہوا ! ...... یہ ہوا ۔
ہاں ! کیا ہوا ؟
میں کنارے سے ایک کنکری اٹھا کر ندی کے سینے پہ مارتا
ہوں ، لہریں مضطرب ..... تسلسل تیز ..... اور تیز .....
اور تیز ......
کڑے کوس کی یہ مسافت اور مسافر کو نیند آ گئی۔
چراغ کا رُخ کدھر ہے ؟
میں پھر ایک کنکری ندی کے سینے پہ مارتا ہوں ......
پھر مارتا ہوں ...... پھر مارتا ہوں .....
سب مسافر رستے میں کھو جاتے ہیں۔
چراغ کا رخ کدھر ہے
ندی کے اس کنارے پر میں ..... اُس کنارے پر وہ
یا اُس کنارے پر میں ...... اِس کنارے پر وہ !
ہواؤں کے ریلے کے ساتھ تلوار کی جھنکار ......
بھاگتے ہوئے خوف زدہ قدم ..... گولیوں کی تڑ تڑ تڑ .....
بچوں کی سسکی ...... عورتوں کی بے سہارا ہانپتی سانسیں۔"
تو ایسا ہوا کہ جب رات دھند میں کھو گئی تو کچھ ہیولے
بگولے کی طرح رقصاں ، شہر شہر وارد ہوئے ، اور شہر سے باہر
اس مقام پہ جہاں اندر باہر کی ہواؤں کا آدان پردان
ہوتا تھا ، جمع ہوئے ، سازشی حروف ترتیب دیئے گئے۔
پھر دن کی کھلی چھپاتی دھوپ میں سروں پہ عذاب برسے۔
تو اے رستے میں سو جانے والے مسافر ! شبنم تیری
لحد کے پھولوں کو تازگی بخشے۔
نیل کے ساحل سے کاشغر کے کناروں تک ..... فرات

اور جیحون، اور گنگا، اور کوسی، اور جمنا، اور گنڈک،
اور سرسوتی، اور مسسیپی اور آمیزن اور والگا.....''
سارے میں رات اور اس کے اسرار..... اور......
تا حدِ نظر..... ہوا، پانی، اور رات..... اور چاروں طرف
بکھرے ہوئے ان جانے اسرار..... اور تیز رفتار ندی..... اور
ندی کے سینے پر ایک چراغ..... تیرتا ہوا چراغ..... سمتوں
کے تعین سے بے پروا، لہروں پہ ہچکولے کھاتا ہوا چراغ۔
میں اس سارے تسلسل میں کہاں ہوں..... شاید کہیں
نہیں.....شاید ہر جگہ!
تو یہ ہوا کہ اس کے بچوں کو اس کے سامنے نیزوں پر اچھالا گیا، حالانکہ وہ بے قصور تھا، ایسا صرف اس لئے ہوا کہ وہ اس محلے سے تعلق رکھتا تھا جہاں لوگ کرسیوں پر نہیں بیٹھتے تھے
سارے میں پھیلی ہوئی اس داستان کا سرا کہاں نہیں
ہے..... کہیں نہیں ہے!
''ہواؤں کے ریلے کے ساتھ..... صدیوں سے صدیوں
کی صدیوں پر حاوی آوازیں.....''
آگ، کیچڑ، ادھڑی، جلتی تپتی ریگ، نیزوں پر سر بلند، آگ کی زد پہ ہر اک گھر روشن، تلوار کی جھنکار بھاگتے ہوئے خوف زدہ قدم، گولیوں کی تڑ تڑ تڑ، بچوں کی سسکی، عورتوں کی بے سہارا ہانپتی آوازیں.....''
میں نے سب کچھ تو سہن کر لیا، اب کیا باقی ہے؟
میرے اندر ستارے اوس اور کہر کے دھندلکے میں
کھوتے جا رہے ہیں اور میرے باہر چاروں طرف سسکیاں
لیتی ہوئی رات بکھری پڑی ہے۔
وہ اگر نہیں آیا تو؟
ندی کے سینے پہ چراغ ہچکولے کھا رہا ہے۔
تم کب تک مجھے دھوکے میں رکھو گے؟ سب
آچکے..... آنے والی ہر ٹرین، اور ہر بس سے کوئی نہ کوئی ضرور

اترا ہے، کوئی چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے
حصہ رومال سے چھپائے ہوئے کوئی.....
کوئی فیلٹ ہیٹ چہرے پہ جھکائے۔ دھیر.....
چشمہ لگائے، سب اترے، سب اترتے ہیں۔ آنکھوں میں
جھنڈیاں..... ہونٹوں پہ انکار، اقرار، اعتراف.....
کی سازشی ترتیب......
تم کہاں ہو؟ اس سارے تسلسل میں تم کہاں پہ ٹھہرے ہوئے؟
کہاں پہ رواں ہو؟
تم اگر نہیں آئے ہو تو؟
وہ اگر نہیں آیا تو؟
میں صدیوں سے یہاں خاموش ٹھہرا ہوا ہوں.....
صدیوں سے بہ رہا ہوں..... صدیوں سے کہیں نہیں ہوں
صدیوں سے جہاں بھی ہوں، میرے چاروں طرف رات ہے
اور اس کے اسرار..... اور ندی کے سینے پہ ہولے ہولے تیرتا
ہوا چراغ...... صدیوں سے یہی رات..... گہری، سیاہ
پراسرار رات......
ہوا.....ریت......پانی.....اور رات..... اور
اس تسلسل میں..... میں.....ایک نقطہ..... یا شاید.....
سارے پہ حاوی..... میں..... ٹھہرا ہوا میں...... بہتا
ہوا میں.....
تالاب، ندی، دریا، سمندر!
سمندر، دریا، ندی، تالاب!
گہری، سیاہ، پراسرار رات...... ایک تیز
رفتار ندی..... ندی کے اس کنارے پہ میں..... اُس
کنارے پہ وہ..... اُس کنارے پہ میں..... اس کنارے پہ وہ!
وہ یہاں ہے؟
میں کہاں ہوں؟
شاید کہیں نہیں..... شاید ہر جگہ!

[illegible] —— کچھ صاف نہیں —— کچھ
[illegible] —— کہاں ڈھونڈوں خود کو ……
[illegible] —— کا چارہ آگیا ہو !
ہوا اُس کے ریلے کے ساتھ آتی ہوئی آوازیں ……
صدیوں کی صدیوں سے صدیوں پر حاوی آوازیں …… "
ان میں بھلا وہ کہاں ہوگا ؟
ان میں بھلا وہ کیوں ہوگا ؟
مجھ پہ کیسی طاری ہو رہی ہے —— آنے والے تو
سب ساز و سامان کے ساتھ آتے ہیں …… اُسے تو ننگے پیر
ننگے سر اور کھلی مٹھیاں لے کر یہاں وارد ہوتا ہے ……
نقابوں نے کب چارہ گری کی ہے …… تمہیں کس
بات کا ڈر ہے …… وہ کیوں خوف زدہ ہے !
اُسے تو کسی خول کی ضرورت نہیں …… وہ ان میں
بھلا کیوں ہوگا …… وہ ان میں بھلا کہاں ہوگا ؟
سُنا ! اُس طرف ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے پائے گئے ۔
مجھے وجود اور عدم کا فرق مت بتاؤ …… کیسا کیسا
تڑپا ہوگا وہ …… سمندروں سے گہری آنکھوں نے کیسا
کیا دیکھا ہوگا …… تمہیں تو یہاں تک پہنچنا تھا ……
وہاں تک جانا تھا …… چلتے چلتے اُس صحرا میں تم کہاں کھو گئے
مسافر کو رستے میں نیند آگئی …… منزل ہے کہاں تیری
اے لالۂ صحرائی ……
اے لالۂ صحرائی !
ندی پہ تیرتا ہوا چراغ ڈگمگ ڈگمگ کر رہا ہے
وہ اگر نہیں آیا تو ؟
میرے چاروں طرف رات ہے ، گہری ، سیاہ ،
پُراسرار رات ، اور رات کے اسرار ……
تم بھی کبھی اسرار میں کھو جاتے ہو ، کبھی احساس میں
ڈھل جاتے ہو ، کبھی ہونٹوں پہ بکھر جاتے ہو !

اُس سمت ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے ……
کیا ریت پرانی یاں رگڑ رگڑ کر اِدھر دیکھا ہوگا !
سمندر سے گہری آنکھیں …… کہاں کہاں رو ئی
ہوں گی ……
دیکھی دیکھی سب کچھ …… ٹکڑے ٹکڑے وہ ……
اس سمت —— ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے ……
ڈھانچے …… ڈھانچے ……
اسے تو ننگے سر ، ننگے پاؤں اور کھلی مٹھیاں لے کر
وارد ہوتا ہے !
وہ اسے کہاں کہاں قید کر سکیں گے !
تو سارے میں گہری ، سیاہ ، پُراسرار رات بکھری
پڑی ہے ۔ یہاں میں ہوں ، اس گہری سیاہ پُراسرار رات
کا حصہ ، میرے من میں بھی وہ دکھ ، وہی اسرار ……
چاروں طرف بتیا یا نہ بکھر رہا ہوں ……
کہیں کچھ نہیں —— کچھ نہیں …… کچھ نہیں ——
میرے چاروں طرف ہوا ، پانی ، رات ، میرے پیچھے
ایک شہر جو میرا ہے یا شاید میرا نہیں ہے مگر جہاں میں رہتا
ہوں ۔ میرے آگے ندی …… ندی کے اُس کنارے رات
ہوا ، پانی اور ریت …… ساحلی ریت …… اور اُس کے
آگے ایک شہر جو اُس کا ہے یا شاید اُس کا نہیں ہے مگر جہاں
وہ رہتا ہے ۔
ندی آہستہ آہستہ بہ رہی ہے …… لہریں کناروں
سے ٹکراتی ہیں ، آواز پیدا ہوتی ہے …… چپ …… چپ
…… چپ —— پھر وہ لہر آگے بڑھ جاتی ہے …… پھر دوسری
لہر —— پھر تیسری لہر —— چپ …… چپ —— چپ ……
ایک تسلسل ، مسلسل رواں دواں
تسلسل ! اندھیرے کا ، اور لہروں کا ، اور اسرار کا ——
تم کہاں ہو ؟ اِس سارے تسلسل میں تم کہاں پہ ٹھہرے ہو ؟

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

شاھد احمد شعیب

دُھند میں تصویریں

●

سفید فاختائیں
[illegible] کے باوجود
اُڑا [illegible] سامنے آجاتی ہیں
زہریلے دھوؤں کی شکست کی داستانیں
سناتی ہیں
نیلے آسمانوں میں
دُھند ——— ؟
شاداب نہیں ہے

●●

فیصلہ کی گھڑی
ابھی — اسی لمحہ — آچکی ہے
ملعون آوازوں کا شور
زمینوں اور خلاؤں کی عقربی تسخیر کے ساتھ
آسمان کی اس تحریر سے لرزاں ہے
جو — ابھی ابھی — یہیں سے اٹھ کر
ہم سب کی پیشانیوں پر
ثبت ہو چکی ہے

●●●

کیا بُرا ہے
یہ تسلیم کر لینا کہ :
سمندروں نے
ندیوں کی سادگی پر
قاتلانہ حملے کیے

اور
چاندی کی لکیریں
سرخ لہو میں
تحلیل ہونے لگیں

سنہرے دن
کالی طنابوں کے فریب کی سچائی
سمجھ نہ پائے ——— اور
بے موت مرے ——— بے موت!

●●●●

مجھے گھور کر مت دیکھو
بینائی پر بھروسہ کیے بغیر
زندہ پتھروں نے پتھرائی آنکھوں کا رمز
جان لیا ہے
تمہاری آنکھوں کا نوحہ
سننے کی فرصت — اب کسی کو نہیں

—۲—

●

اظہار کے تمام واسطے

[illegible]
[illegible] کاوش
[illegible] کا سرمایہ —— جلا نہ دے
وہ —— شہر
دشت
صحرا
کچھ بھی نہیں

بہت پہلے کے پروردہ
مقہور حروف
لفظوں کی دہلیز تک آنے سے
خائف ہیں
جان کے ملبوس
تیزابی ہوائیں
جلا جلا کر ——
جلا جلا کر خاک کر چکی ہیں

★

آبادیوں کے ویرانوں میں تبدیل ہونے کے قبل
سورج کو آسمانوں نے
قید نہیں کیا تھا۔

اب
روشنی کے جسم پر
نیلے نشان
کس کے ہیں —— کیسے ہیں ؟

●●

بے زبانی کی زبان
میں سمجھ لیتا ہوں

میں سمجھ لیتا ہوں ؟
نہیں !
یا
شاید —— !!
.........؟.....!!!

●●●

کٹی زبان والوں کی بھیڑ
مردہ آنکھوں کی سوغات لئے
مجھے ڈھونڈتی ہے

●●●●

مشوروں اور تجویزوں کی ناکارہ اور نیم بھیڑ میں
کسی کو پہچان کر
قبول کر لینے کے قبل
اپنے شل دست و بازو کو
بے جرم خودکشی کے جرم پر
زندگی کی سزا
سنا دو ——

—— ——

گمان اور یقین کے بیچ

بشر نواز

پتہ نہیں وہ کون تھا
جو میرے ہاتھ، موتئے کی ڈال اور پنکھ مور کا تھما کے چل دیا
پتہ نہیں وہ کون تھا
ہوا کے جھونکے کی طرح جو آیا اور گزر گیا
نظر کو رنگ، دل کو نکہتوں کے دکھ سے بھر گیا
میں کون ہوں؟
گزرنے والا کون تھا؟
یہ پھول اور پنکھ کیا ہیں، کیوں ملے؟
یہ سوچتے ہی سوچتے
تمام رنگ، ایک رنگ میں سما گئے
سیاہ رنگ
تمام نکہتیں ادھر ادھر بکھر گئیں
خلاؤں میں
یقین ہے...... نہیں نہیں گمان ہے
وہ، کوئی میرا دشمن قدیم تھا
دکھا کے جو سراب میری پیاس اور بڑھا گیا

میں بے پناہ آرزوؤں کا شکار
شدتِ خلوص میں فریب اس کا کھا گیا
یقین ہے..... نہیں نہیں گمان ہے
وہ کوئی میرا دوست تھا
ہوا کے جھونکے کی طرح جو آیا اور گزر گیا
دل و نظر کو دو گھڑی کے واسطے ہی کیوں نہ ہو
رنگ اور نکہتوں سے آشنا تو کر گیا
پتہ نہیں کدھر گیا
وہ اب اگر ملے تو اس سے پوچھ لوں
میں صرف اتنا پوچھ لوں
تو میرا دشمنِ قدیم ہو کر میرا دوست ہو
گمان اور یقین کی سرحدوں پہ کیوں
مجھے اکیلا چھوڑ کر نکل گیا

بازگشت

یوسف ناظم

زمیں سے قافلے انساں کے بیسیوں گزرے
سنا ہے اپنی یہ دنیا بہت پرانی ہے
قدیم کتنی ہے اس کا حساب، کیسے ہو
نہ جانے کتنے ہی برسوں کی دھوپ میں جلی
نہ جانے کتنی ہی صدیوں کے زخم اس نے سہے
یہ آج کی نہیں، قرنوں کی اک کہانی ہے

کروڑوں سال ہوئے ہوں گے جب کہ یہ انساں
نئے علوم سے ناآشنا و بیگانہ
ہر ایک گام پہ پتھر سے کام لیتا تھا
جو پتھروں کے سوا کچھ نہیں سمجھتا تھا

یہ روشنی کے جزیرے، یہ خوشبوؤں کے محل
یہ رقص و رنگ کے جلسے، یہ جلوہ گاہِ طرب
یہ علم و فن کے مظاہر، یہ آسماں کا سفر
نہیں تھے آج سے پہلے ہماری دنیا میں
ہماری دنیا تو کتنی صدی پرانی ہے
یہ پتھروں کے عہد سے بھی ہو کے گزری ہے

مگر وہ آدمی حد درجہ ہم سے بہتر تھا
وہ پتھروں کا عہد آج سے غنیمت تھا

— —

اختر واصف

اُسی قافلے کا مُسافر

ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو نیم وا کر کے ارد گرد نظر دوڑائی۔ ڈبے کے تمام مسافر اونگھ رہے تھے۔ چند ایک تو خراٹے بھی بھر رہے تھے۔ دفعتاً بتی بجھ گئی۔ اور چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جانے کیوں جب بھی میں ٹرین پر سفر کرتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس پٹری پر یہ ریل چل رہی ہے وہ جا بہ جا زمین سے اکھڑی ہوئی ہے اور ہم سب کسی لمحہ بھی ......

میں نے خوف کی شدت کو کم کرنے کے لئے ایک سگریٹ سلگایا۔ ماچس کی روشنی میں، میں نے اپنے بغل والے مسافر کے چہرے کا جائزہ بھی لیا تھا۔ لیکن وہ بڑے مطمئن انداز میں سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے خوف کی وہ پرچھائیں کہیں بھی نظر نہ آئی جو مجھے اکثر دہلاتی رہتی ہے

میں نے اس ڈراؤنے خیال کو دل سے نکالنے کے لئے ادھر اُدھر کی باتیں سوچنی شروع کر دیں اور اس سلسلے میں مجھے بڑے بھیا کے اس تار کی یاد آئی جو آج ہی مجھے ملا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ اگر بابا کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہو تو فوراً چلے آؤ۔

اس TELEGRAM سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ بابا کی حالت بہت خراب ہے۔ بابا سے ملے مجھے کوئی پانچ سال ہو گئے اور اس درمیان میں نے ان کی کوئی کھوج خبر لی ہے اور نہ خط ہی لکھا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہم سب ساتھ ہی رہتے تھے۔ بابا، بڑے بھیا، منجھلے بھیا، چھوٹے بھیا، لیکن آج سب لوگ الگ ہو گئے۔ اس زمانے کی کچھ دھندلی دھندلی سی یادیں باقی ہیں بڑے بھیا کو پڑھنے لکھنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ اسلئے وہ بابا کے ساتھ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے منجھلے بھیا کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ زیادہ تر اپنی کتابوں میں ہی کھوئے رہتے تھے۔ رہی بات چھوٹے بھیا کی تو وہ اس وقت نہ بچے ہی تھے اور نہ جوان ہی۔ اور بقول بابا یہ تو انکے کھانے کھیلنے کے دن تھے۔ اسلئے وہ صرف کھیلتے تھے اور کھاتے تھے۔ میں اس وقت بمشکل گیارہ برس کا ہوں گا اور شاید ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

اسی زمانے میں ٹھیک چوک پر ایک JEWELLARS SHOP کھولا گیا تھا۔ جسے بھیا سنبھالتے تھے کیوں کہ بابا کہا کرتے تھے کہ بڑے بھیا اب کاروبار میں پکے ہو چکے ہیں واقعی بڑے بھیا اپنے کاروبار میں بڑے پکے نکلے۔ انہیں جتنے روپیوں کی ضرورت ہوتی تجوری سے نکال لے جاتے بابا انہیں کچھ نہ کہتے شاید وہ سمجھتے ہوں کہ ان کا بیٹا انکے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے بھیا کی شادی کے ایک سال بعد تک تو سب کچھ ٹھیک

[illegible] کا حساب گڑبڑ شروع ہو گئی پھر اختلافات [illegible] سب سے الگ ہو گئے۔ ساتھ ہی بھیا وہ [illegible] بھی بابا نے انہیں بیٹا سمجھ کر دیا تھا۔ اور ابھی زخم بھرا بھی نہ تھا کہ ایک دن منجھلے بھیا ایک کاغذ ہاتھ میں لئے بابا کے پاس آ کر بولے "مجھے سرکاری نوکری مل گئی ہے۔ میں مدراس جا رہا ہوں"

بابا کچھ نہ بولے۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے رہے میں نے بابا کو اس رات چپکے چپکے روتے دیکھا تھا، جس رات منجھلے بھیا مدراس جا رہے تھے۔ پھر دو ہی سال کے بعد چھوٹے بھیا بھی الگ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے حصے کا پچیس ہزار روپیہ بابا سے لیا اور بڑے بھیا کے ساتھ بزنس میں شریک ہو گئے۔ اب گھر میں میرے علاوہ میرے دو سوتیلے بھائی اور ایک سوتیلی ماں رہ گئی۔ ان دنوں بابا کے چہرے پر ہر وقت افسردگی چھائی رہتی تھی اور جب بھی بڑے بھیا وغیرہ کی باتیں چلتیں بابا جھنجھلا کر کہتے ـــــ اچھا ہوا منحوس اس گھر سے چلے گئے۔

منحوس تو پیچھے گھر سے چلے گئے تھے لیکن اپنی نحوست چھوڑ گئے۔ کیوں کہ اسی سال بابا کو نقصان اٹھانا پڑا اور وہ تقریباً دیوالیہ ہی ہو گئے۔ تب زندگی کی گاڑی جو پہلے سبک روی سے چل رہی تھی ایسے چلنے لگی جیسے کوئی بیل گاڑی کراہتی چرمراتی چلی جا رہی ہو۔ پھر بابا کے کاروبار کی حالت دن بدن گرتی ہی چلی گئی۔

جن دنوں میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا، بھیا ایک دن آئے اور مجھے ایک کارآمد چیز سمجھ کر اٹھا لے گئے۔ تب سے میں [illegible] کے گھر کی چیز بن گیا۔ مجھے بابا کے گھر کیا تکلیف تھی یہ [illegible] لیکن بھیا اور بھابی نے مجھے بتایا کہ بابا کے گھر [illegible] دی جاتی تھی۔ سوتیلی ماں مجھے کھانا کم دیتی تھی اور بابا غیروں سا سلوک کرتے تھے، میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا تھا یا نہیں یہ کہنا بڑا مشکل ہے لیکن بھیا اور بھابی یہ ساری باتیں اتنے یقین کے ساتھ کہتے تھے جیسے میرے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہوں

شروع شروع میں تو بڑے بھیا کا برتاؤ میرے ساتھ کافی اچھا رہا۔ لیکن بعد میں وہ سخت سے سخت تر ہوتے گئے۔ میرے سامنے حالات کی دیوار انہوں نے کچھ اس طرح سے کھڑی کی کہ میرے سارے کام روٹین کی شکل میں ڈھل گئے۔ میں روزانہ صبح سویرے نہا دھلا کر بھیا کی دکان پر پہنچ جاتا۔ اسے کھولتا، جھاڑتا پونچھتا اور پھر نو بجے تک بھیا کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ جب بھیا ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر پہنچتے تو میں کسی کتے کی مانند وہاں سے دھتکار دیا جاتا۔ اور میں چپ چاپ سر جھکائے گھر کی طرف چلا جاتا۔ گھر پہنچنے پر بھابی میرے سامنے رات کی بچی ہوئی روٹیاں اور بھاجی رکھ دیتی۔ لیکن یہ سوکھی باسی روٹیاں میرے لئے گرم پراٹھے اور ٹھنڈی بھاجی، بھنی ہوئی گرم کلیجی سے کم نہ تھی۔

ناشتے کے بعد میں اپنی پرانی سائیکل، جس پر کبھی بھیا سواری کرتے تھے، اٹھا کر کالج چل دیتا تھا اور راستے میں خیالات کے ہجوم مجھے گھیر لیتے تھے۔ کالج جاتے وقت میں اکثر بھیا کے بارے میں ہی سوچا کرتا تھا۔ نہ جانے کیوں ان دنوں میری یہ عادت سی بن گئی تھی۔ بڑے بھیا کے بارے میں بہت سے خیالات میرے ذہن میں گڈمڈ ہوتے رہتے۔ لیکن میں کبھی فیصلہ نہ کر سکا کہ میں بھیا کی عزت کرتا ہوں یا ان سے نفرت۔

یوں تو بھیا دیکھنے میں قابل نفرت بالکل نہیں لگتے۔ وہ ہمیشہ کھادی کا سفید کرتا اور سفید پاجامہ پہنتے ہیں۔ سفید کرتے پر کالی سی جیکٹ، سر پہ مخملی ٹوپی، بھرا ہوا سانولا چہرہ، باریک مونچھیں، اور پتلی سی داڑھی۔ بھلا اب صرف شکل

[illegible] کسی سے کیسے نفرت کی جا سکتی ہے۔ اور سب سے بڑی
[illegible] یہ ہے کہ وہ لاکھوں کا بزنس کرتے ہیں ہزاروں میں کھیلتے
[illegible] اور یہ بات قابل رشک ہو سکتی ہے قابل نفرت نہیں
کالج سے لوٹنے کے بعد پھر وہی ٹھنڈا باسی کھانا جسے
[illegible] میں بھیا کی دوکان چل دیتا تھا۔ وہاں سیکڑوں کام
[illegible] انتظار میں رکے رہتے تھے جن سے نپٹتے نپٹتے تو ساڑھے
[illegible] بج ہی جاتے اور گھر آتے آتے دس۔ دس بجے وہی ٹھنڈا باسی
کھانا۔ کھانا کھانے کے بعد بارہ ایک بجے تک جاگ کر پڑھنا،
پھر صبح صبح وہی دوکان۔ اور نو بجے تک بھیا کا انتظار۔
رات میں جاگنے کے سبب جھپکی لگ جائے تو بھیا کی ڈانٹ پھٹکار۔
یہ سارے کام میری زیست کے اعضا بن گئے تھے جس
طرح جسم کے کسی حصے کو کاٹا نہیں جا [illegible] تا۔ اسی طرح میں بھی اپنی
زندگی کے ان اعضا کو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں
یہ خیال ضرور آیا کہ مجھے بھیا کا گھر چھوڑ دینا چاہیئے اور بابا
کے گھر جا کر رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ خیال بھی صرف خیال ہی تھا۔
عمل کی نوبت کبھی نہ آئی۔ اور آ بھی کیسے سکتی تھی۔ اس ضعیفی
میں بابا کے کاندھوں پر چار جانوں کا بوجھ تھا۔ یعنی میرے
دو سوتیلے بھائی، سوتیلی ماں اور ایک وہ خود۔ ان چار
جسموں کو زندگی سے جوڑے رکھنے کے لئے ان کے پاس صرف
ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ [illegible] بھی دروازے کب بند
ہو جائیں کچھ کہنا مشکل [illegible]

جن دنوں میں [illegible] فائنل میں پڑھ رہا تھا۔ جانے
کیوں بھیا مجھ پر بہت مہربان ہو گئے۔ مجھ سے نرمی سے باتیں کرنے
لگے اور میرے سر سے تمام 'بیگاروں' کا بوجھ اٹھا لیا گیا۔
پہلے میرا کھانا میرے روم میں پہونچا دیا جاتا تھا لیکن اب بھیا
اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھانے لگے۔ پہلے کوئی پوچھتا تک نہ
تھا لیکن اب ہمیشہ ہدایتیں دیتے رہتے "دیکھو! رات
میں زیادہ دیر تک نہ پڑھا کرو [illegible] صحت خراب ہو

ہو جاتی ہے"
کبھی پوچھتے ـــــ "ارے سلیم! تم نے اپنے کمرے میں [illegible]
پاور کا بلب لگا رکھا ہے؟ کیا کہا..... پچیس [illegible]
ارے نہیں نہیں، اسے فوراً نکال پھینکو اور [illegible]
لگاؤ۔ کم روشنی میں پڑھنے سے آنکھوں پر برا اثر پڑتا ہے"
لیکن نہ جانے کیوں مجھے بھیا کی مہربانی اور شفقت بھری [illegible]
صرف ایک رنگین دھوکا لگتی ان کی باتوں سے بناوٹ اور [illegible]
کی بو آتی ـــــ لیکن کیوں؟ اس کا میرے پاس نہ کوئی جواب تھا
نہ جواز۔

بھیا کے گھر میں ایک ایسا کمرہ بھی تھا۔ جس میں بھابھی اور
بھیا کے علاوہ اور کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ
بزنس کے راز اسی کمرے میں رکھے جاتے تھے۔ انہیں دنوں بھیا
مجھے ایک دن اسی کمرے میں لے گئے۔ مجھے سخت تعجب ہوا تھا۔
اور بھیا نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا تھا جیسے کہہ رہے ہوں
دیکھو میں نے تمہیں کتنی عزت بخشی؟
اس کمرے میں لے جا کر بھیا نے مجھے [illegible] بیٹھا دیا
اور بولے ـــــ "تم نے کبھی اپنے بارے میں [illegible] سلیم؟"
میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ بھیا کیا کہنا چاہتے [illegible] بھیا نے
ـــــ "بھئی! میرا مطلب ہے کہ [illegible] دنوں میں تم اپنی
پڑھائی ختم کر لو گے، پھر تم [illegible]
ہمیشہ تو تم میرے ساتھ [illegible]
بڑے بھیا کی بات [illegible]
تو میں نے بھی سوچا نہیں تھا لیکن [illegible]
تو تھا نہیں۔ میں نے چپ چاپ [illegible] بھیا بولے
ـــــ "ہاں!
تم بابا کے اپنا [illegible] دونوں
بھائیوں کو تو انہوں نے [illegible]
تمہیں تو وہ پڑھا بھی نہ سکے [illegible] نہ

دینگے ۔ [illegible] کوئی حق ہے۔"

[illegible] پیدل میں کانٹے کی طرح چبھ گیا۔ میں نے
کتابوں میں پڑھا تھا کہ ہر انسان کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ لیکن
والدین [illegible] کا یہ گمان تک نہ تھا۔ اسے تو میں صرف
کتابوں کا پرچہ سمجھتا تھا جو امتحان دینے کے لئے رٹ لئے جاتے
ہیں۔ اس روز بھیا نے احساس دلایا تو مجھے محسوس ہوا کہ واقعی
میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ مجھے اپنے حقوق کی خاطر لڑنا چاہیئے
اور اسی دن میں باپا سے ملنے گیا۔

میں باپا سے ملا بھی اور واپس بھی چلا آیا لیکن دل
کی بات زبان پر لانے کی ہمت نہ کر سکا۔ باپا کی حالت نے میرے
تمام خیالات کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ میری زبان تھام لی
تھی۔ میں جب باپا کے پاس پہونچا تھا تو وہ ایک میلی کچیلی
پرانی سی دھوتی اور کرتا پہنے تھے جس کا دامن جھڑ چکا تھا۔ ان
کے چہرے پہ جھریوں کا جال بری طرح پھیلا نظر آیا تھا۔
وہ بات کرتے کرتے ان کی پیلی پیلی آنکھیں سیاہ حلقوں کے
درمیان ٹھہر ٹھہر کر ایک دم اس طرح ساکت ہو جاتی تھیں
جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔

میں باپا کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر واپس
چلا آیا۔ اس روز پہلی بار میرے دل میں اپنے بھائیوں کے
خلاف نفرت کی چنگاریاں اڑی تھیں۔ بڑے بھیا اور چھوٹے
بھیا ہزاروں میں کھیل رہے ہیں۔ منجھلے بھیا اچھی سرکاری
نوکری پہ ہیں۔ اس کے باوجود باپا کی یہ حالت ؟ مجھے بڑی
حیرت ہو رہی تھی کہ میرے تینوں بڑے بھائی یہ کیسے بھول گئے کہ
آج ان کے ہاتھوں میں جو ہے وہ اسی غریب باپ کا دیا ہوا ہے
[illegible] بڑے بھیا باپا کی جانب بھوکی نگاہوں سے دیکھ رہے
ہیں لیکن جس کے پاس نہ مال ہے نہ زر ہو وہ کیا دے گا ؟

اسی روز بھیا نے مجھے بلا کر پوچھا تھا ـــــ

"تم باپا کے پاس گئے تھے؟ کیا کہا انہوں نے ؟؟"

میں نے صرف "ہاں" کہا اور میری دبی دبی بغاوت
بھری آواز نے بھیا پر سب کچھ ظاہر کر دیا۔

بھیا کچھ دیر تک کچھ سوچتے رہے پھر بولے ـــــ

سلیم! تم ان لوگوں کو نہیں جانتے !

وہ سب ناٹک ہے ناٹک۔ صرف دکھلاتے ہیں کہ بہت
غریب ہیں۔ ابھی تجوری میں ہزاروں کے زیورات پڑے ہیں۔
گاؤں پر کھیت ہے، مکان ہے۔ لیکن تم ابھی بچے ہو ان باتوں کو
نہیں سمجھ سکتے۔ دراصل اس وقت تمہاری سوتیلی ماں کا بھوت
باپا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

میں بھیا سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ بھی نہ کہہ
سکا۔ جانے کیوں بھیا کے سامنے میری آواز ہی بیٹھ جاتی ہے
اس دن کے بعد سے بھیا مجھے برابر ٹوکنے لگے۔ لیکن میں پہلے
بنا دیتا۔ اسی زمانے میں ایک ایسا حادثہ پیش ہوا جس نے مجھے
اور بھی چوکنا کر دیا۔ بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا میں کچھ کھٹ
پٹ ہو گئی۔ بڑے بھیا نے چھوٹے بھیا کو بزنس سے الگ کر دیا
اور جب حساب کتاب ہوا تو چھوٹے بھیا کو ایک نہایت قلیل سی
رقم ملی۔ دراصل حساب کتاب میں ادھر ادھر کر دینا بائیں
ہاتھ کا کھیل ہے

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بی۔ اے کرنے کے بعد۔
نوکری کی تلاش میں تھا۔ دوسری طرف بڑے بھیا مجھ پر برابر
دباؤ ڈال رہے تھے کہ باپا سے اپنا حصہ لے کر ان کے ساتھ
بزنس کروں۔ لیکن چھوٹے بھیا والا واقعہ سامنے تھا اور باپا
کے پاس روپے بھی نہ تھے ایسی صورت میں یہی بہتر تھا کہ نوکری
تلاش کی جائے۔ یہ بھی ایک اتفاق کی بات تھی کہ مجھے نوکری
مل گئی۔ ورنہ آج کل آسانی سے نوکری کہاں ملتی ہے۔

اب اس خبر کو بڑے بھیا تک پہونچانا بھی جوکھم کا کام تھا کیونکہ
یہ خبر ایسی تھی جو بھیا کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتی۔

بڑے بھیا کی سخت مخالفت کے باوجود میں نے سروس جوائن کرلی اور دوسرے شہر چلا گیا۔ شروع شروع میں پاپا کو میں نے پچاس روپے بھیجنے شروع کئے۔ میں جانتا تھا کہ پچاس روپیوں کی کچھ حقیقت نہیں۔ لیکن اتنے میں پاپا کم از کم اپنی صحت کا خیال تو رکھ ہی سکتے تھے۔

یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا لیکن جب میں ایک سے دو ہو گیا تو اخراجات ایک دم سے بہت بڑھ گئے۔ پہلے ڈھائی سو میں کام چل جاتا تھا۔ لیکن اب چار سو خرچ ہونے لگے۔ اور وہ پچاس روپے جو میں پاپا کو بھیجتا تھا بوجھ لگنے لگے۔ کبھی کبھی تو میں جھنجھلا اٹھتا ـــ "آخر پاپا کے اور بھی تو بیٹے ہیں وہ کیوں ان کی مدد نہیں کرتے؟

صرف میں ہی کیوں؟؟"

"لیکن جیسے ہی میں ان خیالات کے دائرے سے باہر آتا، چونک پڑتا ـــ کیا یہ سب میں سوچ رہا تھا..... میں!"

آخر بہت کھینچ تان کرنے کے بعد مجھے پاپا کو ہی بھیجے جانے والے روپیوں میں کٹوتی کرنی پڑی۔ کیوں کہ کوئی دوسرا فضول خرچ مجھے ایسا نظر نہ آیا جسے میں چھوڑ دیتا۔ تب سے پاپا کو صرف پچیس روپے ہی جانے لگے۔ لیکن جب بات فرحت ہی تک محدود نہ رہ کر منا تک جا پہونچی تو وہ پچیس روپے بھی بوجھ سے لگنے لگے۔ اور آخر میں وہ پچیس روپے بھی بند ہو گئے۔

آج اس بات کو پانچ سال ہو گئے۔ میں دور دراز کا سفر طے کر کے تین روز قبل پاپا کے پاس پہونچا ہوں۔ اور اس وقت میں پاپا کے تقریباً نیم مردہ جسم کو دیکھ رہا ہوں تو نہ جانے میرے دل میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

لیکن ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑ رہا ہے کر رہا ہوں۔ اچھے ڈاکٹر، دوائیوں کا انبار اور تمام ضروری چیزیں موجود ہیں۔ بڑے بھیا اور منجھلے بھیا بھی ہر قسم کی مدد کر رہے ہیں۔

لیکن ـــ؟

کیا یہ سب میں پاپا کے لئے کر رہا ہوں [illegible]

میرے دل میں جانے کیسے یہ خیال دبا [illegible]

ہوا کہ میں، بڑے بھیا، منجھلے بھیا، اور [illegible]

کے انسان ہیں۔ ہم لوگ تو یہ سب کچھ دکھانے کو کر [illegible]

کہ لوگ بعد میں یہ نہ کہیں کہ بیٹوں نے مرتے باپ کو [illegible]

بھی نہ پوچھا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ پاپا اب پہلے سے ٹھیک ہیں [illegible]

میرے دونوں سوتیلے بھائی بہت خوش ہیں۔ پاپا کی سدھرتی حالت دیکھ کر بڑے اور منجھلے بھیا بھی خوش ہیں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں خوشی نہیں بلکہ فکر کے سائے ڈول رہے ہیں۔

اور میں..... کیا خوش ہوں؟

میں اپنے دل میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ لیکن وہاں خوشی کی کرن نہیں۔ بلکہ جیسے جیسے پاپا کی طبیعت سدھرتی جا رہی ہے۔ میرے دل میں خوف سماتا جا رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ پاپا اب فوراً اٹھ بیٹھیں گے اور کہیں گے ـــ

"اسے سلیم!

میرے بیٹے.......

تم میرے بیٹے ہو کر بھی میرے لئے کچھ نہیں کر سکے۔"

مانا کہ آج کل میں آٹھ سو روپے کما رہا ہوں پھر بھی

پاپا کو دینے کے لئے ہر ماہ سو روپے کہاں سے لاؤں گا؟

لیکن ویسا کچھ نہ ہوا۔ پاپا ٹھیک ہو گئے۔ اس بارے میں انہوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔

صرف فرحت کی خیریت پوچھی، منا کے بارے میں پوچھا (?) اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ پھر بھی خدشہ تو لگا ہی رہتا (?) ہے جانے کب پاپا پیسوں کا ذکر چھیڑ دیں۔

لیکن پاپا نے ویسا کچھ بھی نہ کہا۔ یہاں تک کہ میں جانے کے

(بقیہ صفحہ ۶۲) (?)

یوسف اعظمی

دوسرا قتل

جو احساس کی قاتل ہے
چپ چاپ کھڑی ہے پتھر کی مورت کی صورت
سناٹوں کی اوٹ میں
نظروں کی تنقید سے اوجھل
دل کے صحیفے میں لفظوں کے معنیٰ مریم کی
پاکیزہ صورت ہی کا نام نہیں ہے
مصر کے چاک پیراہن نے چوراہے پر
آنکھیں کھولیں
اور احساس کی لاش پہ اندھی آنکھ کے آنسو گرتے دیکھیں
کس کو پتہ ہے
زلفوں کی خوشبو سے اٹھتے
مرغولوں نے
مجھ کو پکارا
جسم کے خوابیدہ جنگل سے

رات کی کشتی
دور سمندر میں بہ نکلی
موجوں کے سینے کی دھڑکن
رات کی کشتی
رات سمندر
طوفاں طوفاں
آج اخبار کے بکھرے کاغذ
شہر کی آنکھوں کے کالے میں
جس آواز کو بانٹ رہے ہیں
وہ احساس اس سے پہلے بھی قتل ہوا تھا
کس کو خبر ہے ؟

———— ————

عشرت ظہیر

پیچھے چھوٹا ہوا سال

لیکن اب ہو بھی کیا سکتا ہے؟ وہ تو چلا گیا۔ اور ایسا بھی نہیں ہوا کہ وہ دبے پاؤں، غیر محسوس اور اَن دیکھے گذر گیا ہو۔ میں نے اُسے جاتے ہوئے دور تک دیکھا تھا۔ اس کے پاؤں کی آخری چاپ تک سُنی تھی، لیکن ————!

اور اب اس کے پاؤں کے نشان ڈھونڈ رہا ہوں۔ جبکہ جانتا ہوں، وہ آواز دے کر آتا ہے، آواز دے کر گزر جاتا ہے، لیکن اپنے نقش قدم نہیں چھوڑتا ——

جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر بھی نہ دیکھ پایا۔ اُس کی آواز سن کر بھی نہ سُن پایا۔ اور اب —!

اور اب ہاتھ مل رہا ہوں۔

اب ہاتھ ملوں یا اپنی حسرتوں کے بکھرے شیرازے کو بیٹھا سمیٹتا رہوں، زندگی کی آخری حدوں تک سمیٹتا رہوں۔ مگر انجام؟ معلوم ہے۔ نہ وہ آئے گا، نہ ان بکھرے شیرازوں کو ہی میں سمیٹ پاؤں گا۔ پھر ————!

پھر نہ کوئی لذت ہے، کاغذ کے اس ٹکڑے کو دیکھنے میں نہ کوئی لطف یہ سننے میں۔

"مبارک ہو — مبارک ———!"

جی چاہتا ہے، مونہہ نوچ لوں — اب کیوں۔ کیوں؟ یہ سب ایک سال پہلے ہوتا تو کیا تھا۔ صرف ایک سال ——! لیکن اس میں دوسروں کا کیا دوش؟ اُسے جانے ہی کیوں دیا؟

مجھے کیا معلوم تھا، اس قلیل مدت میں ساری لذت سارا لطف اس قدر تلخی میں بدل جائے گا، مسموم ہو جائے گا — میں نے تو وہ چہرے دیکھے تھے جن کی افسردگی بھلائی نہیں جا سکتی۔ جن کی سلوٹیں اور لکیریں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ کیا میں اُن کے لئے اُن لمحوں کو قربان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لمحے —! لیکن کسے پتہ تھا، اس قربانی سے ان کے چہرے کی افسردگی ڈھلے گی نہیں اور نہ وہ سلوٹیں اور لکیریں مٹیں گی۔ صرف میرا ہاتھ خالی رہ جائے گا۔ اب ان خالی ہاتھوں کو ملوں یا ان سے کرچیاں چنوں۔ نہ وہ آئے گا، نہ ان کرچیوں سے وہ پیکر ڈھلے گا جسے میں نے بچپن سے سجا سنوار کر رکھا تھا، میں نے اور اُن لمحوں نے ! دونوں نے مل کر اس ایک پیکر کو ڈھالا تھا۔ لیکن ——— لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وقت کی مسموم ہوا نے اُسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور میں دیکھتا رہ گیا۔ اور اب ان افسردہ لوگوں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ میں ایک میرا اضافہ ہو گیا۔ اپنی سراسیمگی اور اپنے متوحش چہرے لئے کہاں جاؤں؟

سامنے کپڑوں کی جو الماری کھڑی ہے، اس کے اندر ایک کپڑا ایسا بھی ہے، جو میرے بدن پر اب نہیں آ سکتا۔ کبھی پہنا کرتا تھا۔ کب؟ شاید ایک سال کی عمر میں، یا اس کے بعد عمر کے مختلف مراحل میں اور اُس حد تک جب تک میں اُسے پہن پایا ہوں گا۔ وہ لباس جب مجھ سے چھوٹا ہو گیا ہو گا۔

یا [illegible] اُسے الماری کی زینت بنا دیا [illegible] یاد ہیں۔ کچھ دھندلی دھندلی [illegible] ، اور کچھ سامنے کی چیزوں کی طرح صاف، واضح اور عیاں ——————

"بیٹا! جب تم بڑے ہو جاؤ گے، اس لباس کے قابل خود کو بنا ؤ گے نا؟"

"یس انکل، میں اسے حاصل کروں گا۔" میں نے انکل سے وعدہ کیا تھا۔

اور آج انکل کا چہرہ میری آنکھوں میں ہے۔ بڑی بڑی مونچھیں جو چہرے کو بارعب اور پُر وقار بناتی تھیں۔ جسم پر وہی لباس۔ بالکل وہی جو میری الماری میں اب بھی موجود ہے۔ جسے میں اب نہیں پہن سکتا۔ اب کبھی خود کو اس کے مقابل نہیں لا سکتا —

"انکل مجھے معاف کر دو —"

میں رونا چاہتا ہوں۔ لیکن رو بھی نہیں سکتا۔ اب آخر کس کے خلاف احتجاج کروں؟ حکومت کے خلاف، قانون کے خلاف یا اپنے خلاف —————— ؟ لیکن وہ چہرے وہ اب بھی روتے ہیں، جن کے آنسوؤں کو زنجیر بنا کر "انہوں نے" میرے پاؤں میں ڈال دی تھی۔ جن کے چہروں کی افسردگی، لکیریں اداسیاں دکھا کر مجھے فریب دیا گیا تھا اور مجھ سے میرا اپنا پن چھین لیا گیا تھا۔ ایک سال کی بھیک مانگی گئی تھی۔

لیکن یہ تیاگ، ان لمحوں کا تیاگ، جن کی قیمت صدیوں میں نہیں چکائی جا سکتی، یونہی ضائع گیا۔ وہ سراب تھا۔ جسے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ بتایا گیا تھا۔ اور جس کے جال میں میں ایسا جکڑ گیا کہ میرا اپنا سپنا یوں بے سہارا رہ کر بکھر گیا —؟

میں کیا کرتا۔ مجھ سے کہا گیا تھا۔

تم جوان ہو۔ تم دیش کے معمار ہو۔ ہماری مثبت تحریک کو زندگی دو، اسے استحکام دو، دیش کو آگے لے جانے کے لئے ہمیں تمہارا ساتھ چاہئے۔ ہمارا ساتھ دو —— دیش کے بھوکے ننگے عوام، جو تمہارے ہم قوم ہیں، گرانی کے بوجھ سے اس قدر جھک گئے ہیں، دب گئے ہیں کہ ان سے چلا نہیں جاتا، ان کو سہارا دو — انھیں اٹھاؤ۔ اس کے لئے تمہیں ایثار کرنا ہوگا قربانی دینی ہوگی، ایک سال کا بلیدان دینا ہوگا— تم جوان ہو تم میں یہ حوصلہ ہونا چاہئے، یہ جذبہ ہونا چاہئے۔ ——

بس میرے اندر لاوا اُبل پڑا۔ میں نے اس سراب کو دیکھا اور اس کی سندرتا کے جال میں پھنس گیا، اور اب آنکھ کھلی تو سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ سارا اثاثہ۔ کل حسرتیں، خواہشیں اور اُمنگیں۔ اور حوصلے —— ! حوصلے ایسے پست ہوئے جیسے وہ کبھی رہے ہی نہ ہوں۔ میں نے خود کو اتنا بے بس، اس قدر کمزور کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

میرے انکل فوج میں افسر تھے۔ اپنی وردی سے انھیں بے حد پیار تھا۔ اس کی حفاظت اور اس کا پیار ان کی زندگی تھی۔ اس زندگی کا اَنت وہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی خواہش تھی، میں بڑا ہو کر فوجی افسر بنوں۔ میری پہلی سالگرہ پر انہوں نے مجھے ایک فوجی لباس دیا تھا۔ جو میری الماری میں اب بھی موجود ہے۔ لیکن اب میں انکل کی خواہش پوری نہیں کر سکتا، میں اس لباس کو نہیں پہن سکتا۔ وہ لباس بہت بڑا ہے اور میں بے حد چھوٹا — !

میں نے اپنی ساری زندگی خود کو اس قدر چھوٹا اور کمزور کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نے وہ حوصلہ پایا تھا کہ میری ہر خواہش حصارِ زیست کی تنگ دامانی سے نکل کر تکمیل کو پہونچتی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں اب کر بھی کیا سکتا ہوں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ وقت گزر چکا ہے۔

لوگ مجھے مبارک باد دیتے ہیں۔ میں نے فرسٹ کلاس فرسٹ لایا ہے۔ لیکن میں کس کس کو بتاؤں کہ زندگی کی

دوڑ میں میں صرف ایک لمحہ کے لئے چوک گیا اور یہ لمحہ اس قدر قیمتی اور اہم تھا کہ اس کا تدارک ممکن نہیں، جس کا انکشاف اب ہوا۔ میں نے ساعتوں کے سمندر میں وہ مدت گیپ دی جو میری زندگی اور مقصد کے درمیان ایک وسیع گیپ ہو گیا ہے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں۔ نہ کسی کو دینے کے لئے، نہ اپنی ہی سانسوں کو متوازن کرنے کے لئے ——— !

دوسروں کی زندگی سے ایک سال کے روپ ساری زندگی، زندگی کا سارا خواب چھین لینے والوں کے پاس کسی کو دینے کے لئے ہوگا بھی کیا؟ ساری زندگی قابل قدر نہیں ہوتی بلکہ اس کے کچھ لمحے، جو بدنصیب کھو دیتے ہیں اور خوش نصیب اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے ——— !

میرے سامنے گریجویشن کی فرسٹ کلاس کی ڈگری، اس لئے ردّی کاغذ کی سی بے وقعت پڑی ہے کہ اس کی عمر ایک سال بڑھ گئی ہے اور میں اس فارم کو پُر نہیں کر سکتا جو نیشنل ڈیفنس اکیڈمی، ڈیرہ دون سے میں نے منگوایا ہے، اس لئے کہ اس فارم کی مطلوبہ عمر ایک سال پیچھے چھوٹ گئی ہے ——

بقیہ: شاید

کہاں پہ رواں ہو ؟
ندی کے سینے پہ چراغ کبھی ڈگمگاتا ہے، کبھی لرزتا
ہے، کبھی ہچکولے کھاتا ہے۔
اس سارے خرابے میں میں کہاں ہوں ؟ تم کہاں ہو ؟
کیا یہاں تم ہو ؟ کیا وہاں میں رہوں ؟
کچھ واضح نہیں.... سب دھند.... کہر.... اندھیرا
اسرار .... کچھ ہاں.... کچھ نہیں.... جانے کیا ہے.....
کیا نہیں.....
شاید.... بس اک رات! جو شبنم میں نہائی اور
دھند میں بھیگی ہوئی ہے۔
اک مرادل! جہاں ستارے اوس اور
کہر کی دھند میں کھوتے جا رہے ہیں....
اک چراغ! جو ندی کے سینے پر کبھی ڈگمگاتا
ہے، کبھی لرزتا ہے، کبھی ہچکولے کھاتا
ہے.....
شاید یہ بھی نہیں...
شاید وہ بھی نہیں......
شاید سب کچھ......
شاید کچھ بھی نہیں ....
شاید.......... !
شاید.......... !!
شاید.......... !!!

[illegible] کیوں کو

[illegible] سہروردی

[illegible] بوند بھی
[illegible] جسم کے مسوں میں اُتر گیا
[illegible]ھوں کا شور تھا
اُتر گئیں
[illegible]دار جھاڑیوں سے
[illegible]
اس طرح اُترتے جا
کہ
لمحہ لمحہ جاوداں بنے
مرحبا کہے
چٹانوں کے
[illegible]
[illegible]ئنات کا رواں رواں مست ہو
نشیب اور فراز کا
فاصلہ
ایک ہی جست میں ختم کر
بند کر دے کھڑکیوں کو
روک دے ہواؤں کو
روشنی کو جسم میں اُتار لے
بوند بوند نچوڑ لے
چھپکلی کے ذہن میں
پتنگا جاں بلب ہوا
بند کر دے کھڑکیوں کو
بند کر دے کھڑکیوں کو

رات کیوں جل گئی

حمید سہروردی

رات
اتنی تیزی سے بڑھی
کہ
خواب پاش پاش ہو گئے
رات کیوں جل گئی
ابھی ابھی تو آیا تھا
پروانہ جلنے کے لئے
وہ کون تھا
جو رات کی چھاتیوں کو
نوچ نوچ کر
بے حال کر گیا
ایک طویل سلسلہ
ایک لمبی خاموشی
اب کہاں سے آئے گا
وہ
ہر طرف مُنہ کھولے بیٹھے ہیں
اجگر
پھر رات کیوں جل گئی

ورثہ

فکری بدایونی

اشارہ بس یہی کافی ہے
وضو کا بہتا پانی جس طرف جائے
اُدھر جاؤ

ہاں
تم اُدھر جاؤ
اشارہ اس مقدس جد کا اب تک یاد ہے مجھکو
وہ کھڑکی
جس کے آگے

راہ داری
رازداروں کے لئے رہی ہوگی
بہت ہی تنگ تھی لیکن
سحر آلود محرابوں میں کھلتی تھی
اُسی کھڑکی سے
میرا بھی گذر جس روز ہو جاتا
سحر آلود محرابوں میں رکھے آفتابوں کی شعاعیں
پھیلنے لگتیں
مگر میں اس طرف جاتا
وضو کا بہتا پانی جس طرف جاتا
اشارہ اس مقدس جد کا مجھ کو یاد آجاتا
"وضو کا بہتا پانی جس طرف جائے
ادھر جاؤ

ہاں
تم ادھر جاؤ"
خوشی کا ایک لمحہ سینکڑوں صدیوں پہ چھا جاتا
وہ اس بوڑھے مفکر کا
مرے اشعار سُن سُن کر

تڑپنا، لوٹنا، ہنسنا
وہ مُنہ پر ہاتھ رکھ کر
کھلکھلانا ماہتابوں کا
وہ اُس کا شعر سُن سُن کر
مری ڈھارس بندھانا
داد دینا
برف رکھنا میرے ماتھے پر
سحر آلود محرابوں میں جنت کا اُتر آنا
ابھی تک یاد ہے مجھ کو
یہی ورثہ ہے میری گذری دنیا کا
اسی کو
اگلی دنیا بھی ہمیشہ یاد رکھے گی
جو میں نے اس جہاں کی قید میں اب تک گزارا ہے
بہت بے تاب ہو کر
اُلجھی سمتوں کو سنوارا ہے
اسی ورثے کے بدلے زہر غم مجھ کو گوارا ہے
میں اب بھی بے خیالی میں قدم جب بھی اُٹھاتا ہوں
اشارہ اس مقدس جد کا مجھ کو یاد آتا ہے
"وضو کا بہتا پانی جس طرف جائے
تم ادھر جاؤ
ہاں
تم ادھر جاؤ"

نظمانے

محسن بھوپالی

میں نے ایک مکمل افسانہ مختصر نظم میں کہنے کا تجربہ کیا ہے۔ اور اس نئی صنفِ سخن کو "نظمانہ" کا نام دیا ہے۔ (محسن)

رقاصہ

موہنیا !
ڈانسنگ ہال کے شوخ اسٹیج پر،
ہے تماشائیوں کے گھروں کے لئے
شعلۂ بے اماں !

اور اپنے محلے میں بھی یہ
ایک تاجر کی بیوی ہے
یہ چار بچوں کی ماں !

— —

دست شناسی

وہ ناقی بس ———

لہو میں تر بتر ——— اک جواں لاشہ،
سڑک پر چھوڑ کر
تیزی سے آگے بڑھ گئی

میں حیرت زدہ رہ گیا تھا ——— دیکھ کر
لاش کی ٹھنڈی کلائی کے قریب
ہتھیلی پہ تھی
عمر کی لمبی لکیر !

— —

خواہش کے بعد

تنہا تماپوری

بستی کے کنارے لرزاں رشتے
لمس کی خوش تعمیری کو ہم سفری دے کر
گنگ اندھیروں میں لہجوں کی جوت سجا کر
پانی میں کھوئی شئے کو آواز بنا کر
اپنی خوش تقدیری کے سائے میں بیٹھے
اونگھ رہے ہیں
گرم چبھن کی لہر جواں چہروں پہ ابھارے
کھلی فضا میں کوئی بہانہ بستی بستی گونج رہا ہے ...

رات سے پہلے
شام کے جوگی کی انگلی میں پھنسا ہوا
پھر چاپ
شہروں میں بجنے لگا ہے

— —

مجھ کو اور جینا ہے

تنہا تماپوری

وہ صدائے گم گشتہ، سسکیاں اٹھا لائی
شور میرے کاندھوں پر بوجھ بن کے بیٹھا ہے
اجنبی دیاروں سے کاروان آتے ہیں
میرے بچھڑے خوابوں کے ۔
جانے اور کون آئے !
وقت خالی چہرہ ہے
دودھیا اندھیرا ہے
چاند کچھ نکیلا ہے
اور مجھ کو جینا ہے !!

— —

آخری انگلی کی پیشین گوئی

فخر رضوی

تشدد زدہ انگلیاں
جب فضاؤں میں تحلیل ہو جائیں گی
جب ہواؤں پہ لکھے ہوئے نام
جو معجزہ کی ولادت پہ خوشیاں مناتے تھے
انجان وادی میں روپوش ہو جائیں گے
اور پاؤں کی زندہ حرارت
بدلتے ہوئے موسموں کی طرح
رنگ اپنا بدلنے لگی .
تو ہم در بدر
وقت کی سرد سوغات کو
اپنے مفلوج کندھوں پہ لادے ہوئے
حکم ہجرت کی تکمیل کرتے پھریں گے

— —

ڈاکٹر سیّد ظہیر احسن

یادوں کے سائے

۵ر فروری

ہیلو۔ گڈ مارننگ۔

گڈ مارننگ مسٹر گورڈن۔ ہاؤ ار یو۔

او۔ یس۔ نوٹ ٹو بیڈ۔ تھینک یو۔ واٹ اباؤٹ یو۔

اوکے۔ تھینک یو

ہیپی مومنٹ مس آشا سنگھ

نو۔ واٹ ایٹ۔ ہوائز شی۔ آئی ڈو ناٹ نو

کیاں۔ لٹ می انٹروڈیوس یو ٹو ہر۔

اوہ۔ آئی ام سوری۔ آئی ام ویری بیزی ایٹ دی

مومنٹ۔ مور اوور ویر از نو ہری اباؤٹ اِٹ۔

رائٹ۔ گڈ بائی۔

بائی۔ بائی۔

۶ر فروری

لنچ پر جاتے ہوئے ساتویں منزل پر میں لفٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ جانے کہاں سے ایک ہندوستانی لڑکی آتی ہوئی نظر آئی۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس نے وِش کیا۔ میں نے اس کی اسمائیل (smiles) کا جواب بڑی بے نیازی سے دیا اور لفٹ میں گھس کر نیچے اتر گیا۔

۷ر فروری

آج ہمارے کمرے میں مسز رچارڈز کی جگہ دبلی لڑکی آئی جسے میں نے کل لفٹ کے قریب دیکھا تھا۔ مسٹر لٹن سے کچھ پوچھنے کے بعد میرے قریب آئی۔ اور کہا۔

آداب عرض ہے۔

آداب۔ آپ کا سروکار لکھنؤ سے تو نہیں۔

جی۔ آپ کو کیسے معلوم

بس یوں ہی۔

جی دراصل میرا سروکار کشمیر سے ہے

پھر تو آپ جنت کی رہنے والی ہیں۔ اپسرا

اچھا۔ پھر ملاقات ہوگی۔ اور وہ مسکراتی چلی گئی۔

آج ہی پھر جب میں کسی کام سے اس کے کمرے میں گیا تو اس نے پوچھا۔

آپ لنچ پر کس وقت اور کہاں جاتے ہیں۔

جی۔ میں اس بارے میں بالکل PARTICULAR نہیں ہوں

آج جائیں گے۔ کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں۔ کیا مہربانی کر کے جاتے وقت آپ مجھے لے لیں گے۔

دیکھئے۔

میں نے اس کی باتوں پر دھیان بھی نہ دیا۔ تنہا لنچ پر گیا۔ پھر پوسٹ آفس گیا۔ ایروسلے۔ بھیل۔ سگریٹ، لائبریری سے

کتاب لی۔ واپس آگیا۔

۸ر فروری

اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میری اس کی پھر ملاقات ہو گئی۔ لنچ پر ساتھ چلنے کا اصرار ہوا۔ میں نے ٹالنا چاہا۔ بلا وجہ بلا ضرورت۔ اور پھر جب کہ جلد ہی میں اپنے ملک کو لوٹنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ حسب دستور لنچ پر تنہا نکلا۔ ٹکٹ، لفافے۔ ایروپلے کچھ پھل خریدے۔ دس منٹ وکٹوریہ گارڈن میں ٹہلنے کے بعد اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ جب ملاقات ہوئی تو شکایت اور التجا کے ملے جلے لہجہ میں لنچ پر ساتھ چلنے کی بات کرنے لگی۔

آپ کو ساتھ چلنے میں کیا اعتراض ہے۔ کوئی نزاکت ہے کیا — ؟

پیچھا چھڑاتے ہوئے میں نے کہا

اچھا۔ اچھا۔ بائی۔ بائی۔ ذرا میں جلدی میں ہوں۔

۱۴ر فروری

آج وہ کئی دنوں کے بعد ملی۔ SMILE کے ساتھ ایک نے دوسرے کو خوش آمدید کہا۔ لنچ کی بات آئی۔ وہی اصرار۔ وہی التجا۔ میں راضی ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شفق دوڑ گئی۔ لنچ پر جانے کے لئے لفٹ کے پاس وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم دونوں ڈپارٹمنٹ کی کینٹین پہنچے۔ آرڈر اس نے PLACE کیا۔ لنچ آنے سے پہلے باتیں ہوتی رہیں۔

آپ کا نام؟

جو آپ پسند کریں۔

نہیں۔ نہیں۔ سرکاری نام تو میں جانتی ہوں۔ اور یہاں تو آخری نام (SURNAME) ہی اول بن جاتا ہے۔

جی۔ تو پھر قصہ کیجئے۔

تو مجنوں ہی کیوں نہ کہوں۔

اچھا یہ بات ہے۔

آپ کا خیال

میں آپ کو کیا کہوں

جو چاہیں۔ کوئی نام رکھ دیں۔

اچھا۔ تو پھر میں آپ کو آشا کہوں گا۔

بڑی خوشی ہوگی۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ لنچ آگیا۔ اس درمیان میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس میں اشاروں کو سمجھنے کی اچھی صلاحیت ہے اور ذہنی ہم سفر بننے کی خوبیاں موجود ہیں۔ لنچ کے درمیان کبھی کبھی میں اسے آشا کہہ دیتا اور وہ زیر لب مسکرا دیتی۔ ذہنی تک رسائی کے ساتھ جسم کے پیچ و خم بھی نظر ہوتے۔ لنچ کے بعد بل PAYMENT کے سلسلے میں بحث و تکرار کا اندازہ ہونے لگا۔ بڑا پایا۔ بڑا اترا لا۔ ضد کر کے میں نے بل PAY کی۔ کونٹر پر کیشیئر کو اس نئی حالت میں لطف آ رہا تھا۔ اور ہنس رہا تھا۔ بل PAY کر کے ہم اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے کمرے میں پھر آئی۔ ایک پرزہ رکھ کر چل دی۔ میں نے کھولا تو اس پر لکھا تھا۔

WOULD YOU PLEASE ACCEPT IT.
WHO KNOWS ABOUT TOMORROW

اور اس کے ساتھ اس کے لنچ کے حصے کے پیسے بھی تھے۔ مجھے اس حرکت سے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے طے کیا اب اس سے نہ ملوں گا۔ اس کا طرز عمل مغربی اور ساہوکارانہ ہے۔ چونی چونی کا حساب مجھے پسند نہیں۔ دوستی کا ہے کی۔ کیا لینا دینا مروت کیا ہے۔

۲۶ر فروری

کئی دنوں سے میں ڈپارٹمنٹ نہ جا سکا تھا۔ جانے پر معلوم ہوا

[illegible] غائب ہو گئے۔ کئی دنوں سے
[illegible] TDT آئی ہو۔
[illegible] نظر آئی۔ اپنے کمرے کی طرف جا رہی
تھی۔ تھوڑی دیر بعد میرے کمرے کی طرف آئی۔
آداب عرض
[illegible] مبارک۔ آپ اچھی ہیں۔
ارے جائیے۔ آپ کو کیا۔ آپ نے میری خبر تک نہ لی نہ خود
آئے نہ خط لکھا۔ فون تک کرنا گوارا نہ ہوا آپ کو۔ آپ کو کیا
فکر۔ کیا نوبت۔ آپ تو سوچتے ہوں گے۔ چلو اچھا ہوا اگر
زندہ رہی تو کیا۔ مر گئی تو کیا۔ آپ نے یہ بھی پتا نہ لگایا کہ میں
کس حال میں ہوں۔ کس حادثہ کا شکار ہو ئی۔
کئی منٹ تک پیاری خفگی کا اظہار کر کے اپنے کمرے کی
طرف لوٹ گئی۔ پر میرے دل و دماغ میں مسرت کا طوفان اٹھا کر
چلی دی۔ میری سمجھ نہ سکی۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ویسے میں یہ جانتا
ہوں کہ میرا اس کا ساتھ کیا۔ سا بخذ اور سویرا کبھی نہیں ملتا۔
دھرتی اور آکاش کی دوستی کیسی۔ میری دوستی کے نصیب میں
کانٹے ہیں۔ سیاہ لکیریں۔
پھر بھی وقت پر لنچ کے لئے APPOINTMENT کیا
وقت آیا۔ ہم ایک ساتھ نکلے۔ پورس فیری رود ڈپنگ
بار میں داخل ہوئے۔ آرڈر PLACE کیا گیا۔ بات ہوتی
رہی۔
آج تو آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔
شکریہ۔ خیر تو ہے۔
آپ کی انگلیاں ہیں کہ روشنی کی قندیلیں۔ اور آنکھیں
RUN۔ آواز کو کترا رہے جھرنے کا گیت۔
دیکھئے۔ دیکھئے۔ آپ بہکے۔ بہت بناتے ہیں آپ
بنتے رہتے ہیں۔ میں صدقے۔ یہ کہاں سیکھیں ہیں آپ نے۔
اچھا یہ بتائیے۔ آپ لندن کس منصوبہ کے تحت آئے۔

جی۔ بس آپ کی تلاش میں۔ [illegible]
ارے۔ ارے چھوڑئیے۔ [illegible] تعلیم، اور
یہاں آنے سے پہلے مشغولیت۔
تعلیم، میٹرک ۔۔ مشغولیت، بندگی۔
آپ کا بیان جانے کیوں [illegible]
MYSTERIOUS بھی [illegible]
جائے۔ دیکھوں گی۔ آپ شاعر تو نہیں۔
تھا تو نہیں۔ پر چلتا پھرتا صرف [illegible]
گیت گانے لگے۔ میں آپ میں کلاکار کی روح دیکھتا ہوں۔
کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ [illegible] خود خیال کیا
آپ کو غالب کے اشعار سے دلچسپی ہے۔
اردو کے دو شاعر میرے محبوب ہیں۔ غالب اور ساحر
لدھیانوی۔ تنہائی میں ان کے شعر گنگنا کر جی بہلا لیتی ہوں۔
یہ دونوں آپ کے محبوب، اور آپ
مجھ سے نہ پوچھئے۔
تب تو آپ واقعی کلاکار ہیں۔ چلتا پھرتا جادو۔
ایک سُندر دنیا جس میں راگ اور مُحر سو رہے ہیں۔ کوئی
جگا دے۔ ساز دل کے بربط کو کوئی چھیڑ دے۔ آپ بہت ہی
اچھی ہیں۔
ارے۔ اسے چھوڑئے۔ جب میری باتوں سے تنگ
آنے لگتے ہیں۔ میری تعریفیں شروع کر دیتے ہیں۔ اچھا تو چلئے
چلئے۔ اور ہم لوگ اپنے اپنے AIR TIGHT
کمروں میں گھس گئے۔ لیکن پانچ ہی منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
ہیلو۔
ہیلو۔ میں بول رہی ہوں آشا۔
حکم۔
میں اپنے کمرے میں تنہا ہوں۔ آجائیے۔
میں اپنے کمرے سے نکل کر اس کے پاس چلا گیا۔ تقریباً

ایک گھنٹہ دل چسپ رہی۔ پھر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ دیر تک سوچتا رہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھ میں یہ تبدیلی کیسی۔ اس لڑکی کی طرف میرا رویہ تو NO LIFT کا تھا۔ پر اب یہ دلچسپی کیا معنی۔ اس کے بغیر ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں۔

۲۷ر فروری

ہیلو۔

ہیلو۔ آشا SPEAKING

جی آداب عرض ہے۔

آداب عرض ہے

آپ اچھی ہیں۔

جی۔ بس ٹھیک ہوں۔

اور کیسے کچھ سنائیے۔

ارے چھوڑیئے۔ آپ سے کون بات کرے۔ آپ تو پتھر ہیں۔

جی ——————

سچ ہے۔ ٹھیک۔

میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ مجھے پتھر کہنا۔ خیالوں کا سمندر تو نہیں۔ اٹھتا ہوا طوفان تو نہیں۔ مجھ پر سرور کی کیفیت سی چھائی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی بائیبل کی یہ ہدایت بھی سامنے آتی ہے کہ BOAST NOT THY SELF FOR THOU KNOWEST NOT WHAT A DAY MAY BRING FORTH

لنچ کے لئے لفٹ سے نیچے اترا تو سامنے گیٹ پر انتظار مجسم پایا مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

معاف کیجئے۔ کچھ ضروری کاغذات دستخط کے لئے آگئے تھے۔ فون بھی نہ کر سکا۔ آپ کو ناحق انتظار کرنا پڑا۔

نہیں۔ نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے تو اس میں لطف مل رہا تھا۔ پھر آپ کی جیسی مرضی۔ چلئے ریستوران میں۔

کس ریستوراں میں۔

آپ جہاں پسند کریں۔ مجھے آپ کے انتخاب پر بھروسہ ہے۔

اوہو۔ آپ بڑے اچھے ہیں۔

اور پھر ہم لوگ ملک بار ریستوراں (MILK BAR) میں داخل ہو گئے۔ مینو پر اصرار۔ اصرار پر تکرار۔ تکرار پر قسمیں چلنے لگیں۔ آخر آرڈر دیا گیا۔ یہی فش اینڈ چپس۔ سینڈوچ۔ پیسٹری کوفی۔ پر میں نے کوفی کی جگہ پیپسی منگوائی۔ کھانے بھر باتیں ہوتی رہیں۔ وہاں سے نکل کر سینٹ جانس گارڈن میں بیٹھا۔ کبھی افسانے میں، کبھی شعر و ادب کی رنگ میں دل چسپی رہی۔ میری تفصیلات کے جاننے کی بڑی فکر تھی اس کو۔ پر میں یہی کہہ دیتا۔

کیا موجودہ سطح ہماری ملاقات کے لئے کافی نہیں۔ مناسب نہیں۔ کیا ماضی میں جھانکنا آپ کے لئے ضروری ہے۔ اچھا تو پھر ایک روز سب معلوم ہو جائے گا۔ میں سب بتا دوں گا۔ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ انتظار اور ابھی انتظار۔

پر یہ پردہ داری کیوں۔ کیا آپ مجھے ــ

اور پھر ہم گارڈن سے نکل کر اپنی عظیم عمارت کی طرف چلے۔ لفٹ سے اوپر آئے۔ اور پھر جسمانی طور پر الگ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی وہ ایسی تیز نشتر آمیز باتیں کر جاتی کہ میرے لئے ہوش میں رہنا دشوار ہو جاتا۔ خیال بہکنے لگتے۔ نہیں نہیں۔ یہ سب کیا۔ مجھے اپنے ملک کو لوٹ جانا چاہئے۔ وہاں ہماری ذمہ داریاں میرا انتظار کر رہی ہیں۔

۲۸ر فروری

پکیڈلی ٹیوب اسٹیشن سے نکل کر باہر آیا تو اسے اپنے انتظار میں کھڑا پایا۔ دبے پاؤں قریب پہنچ کر میں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

آپ آگئے۔ بڑی دیر کی مہربان آتے آتے

آپ کی [illegible] ہمارا سا گیت۔
آپ کے لئے۔ آپ کی چاہت
نہیں آشا۔ یہ بات نہیں۔
پھر کیا بات ہے۔ کہئے نا۔ قسم سے کہئے۔ آپ کو معلوم ہے نا۔
نہیں کوئی بات نہیں۔ چھوڑو بھی
اچھا ہم بھی دیکھیں گے آپ کے صبر و قرار کا اور اپنے ضبط کی نمائش کو۔
آج ضروری کاموں کی بھیڑ میں ایسا کھویا کہ لنچ پر نہ جا سکا۔

۲۹ فروری

پکیڈلی سرکس بس اسٹینڈ پر میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ نہیں آئی۔ مایوس پارلیامنٹ اسٹریٹ کو جانے والی ایک بس میں سوار ہو گیا۔ نگاہیں ڈھونڈتی ہوئی پیچھے مڑیں تو دوسری بس میں وہ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ مجھے اشاروں سے بلایا۔ مگر بسیں چل رہی تھیں۔ اگلی ٹرافک لائٹ کے پاس رکی تو میں کود کر اس کی بس میں گھس پڑا۔ مسافر ہنسنے لگے کنڈکٹر نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا HOW IS THAT. YOU ARE NOT EXPECTED TO DO LIKE THAT.

میں نے جواب دیا۔ YES. I KNOW. YOU JUST ISSUE ME ANOTHER TICKET. PLEASE THATS ALL

پھر ہم ساتھ سفر کرنے لگے۔ یہ میرا دیوانہ پن ہے یا [illegible] گیارہ بجے فون کیا۔ اس کے ساتھ لنچ پر چلنے کی بات طے ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر موسن اور مس ولسن کے فون آئے شکایت کے لہجے میں دونوں نے ایک بات کہی کہ تم کہاں رہتے ہو۔ سارا ہفتہ ختم ہو گیا۔ تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ راہ میں کہیں نظر نہیں آئے۔ فون پر مشکل سے ملتے ہو۔ کیا چکر ہے۔ کہاں پھنسے ہو۔ کہاں الجھ گئے ہو۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ بس ہاں۔ نہیں۔ یوں ہی۔ اب ملاقات ہوگی۔ اور اسی طرح کی باتیں۔ پھر جب لنچ کے لئے نکلا تو اسے بے تابی سے گیٹ کے پاس انتظار کرتے پایا۔

بہت تنگ کرتے ہیں آپ۔

اچھا۔ سرکار، اب نہ ہوگی دیر۔

آرمی اینڈ نیوی (ARMY & NAVY) کے گلابی ریستوراں میں لنچ لیا۔ وہاں سے نکل کر وکٹوریہ گارڈن کی سبز گھاس پر ہم دونوں لیٹ گئے۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا۔

آپ تو دیوانہ ہیں۔ بالکل مجنوں۔ آپ ایسا کیجئے کہ اپنی موجودہ رہائش گاہ سے میرے یہاں SHIFT کر جائیے۔ آئیے ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ساتھ رہیں۔ ساتھ آئیں، ساتھ جائیں۔ زندگی چند ہی دن تو ملے ہیں۔ یہ ایک ساتھ گزاریں۔ کتنا اچھا ہو پھر تو۔

نہیں آشا، بڑی نزاکتیں ہیں۔

اور لطافتیں بھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے ہم بالکل ایک ہیں۔ جیسے پچھلے جنم میں ہم ایک تھے۔ ہمارے درمیان یہ موجودہ دوری کیوں۔ اسے نہ رکھئے۔ نہیں آپ کو میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ میری قسم۔

آشا۔ آشا۔ میں جلد ہی اپنے وطن لوٹ جاؤں گا اگر پروگرام میں کوئی بڑی تبدیلی کرنا پڑی اور زیادہ دنوں تک ٹھہرنے کا فیصلہ کرنا پڑا تو آپ کی خواہش کی تکمیل کرنے میں بڑی مسرت و لذت محسوس کروں گا۔

آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ بس یہ طے۔ اب تو خوش ہیں آپ۔

نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ کیوں نہیں چلتے۔ آپ کو کیا انکار
ہے۔ کیوں یہ عذر اور اعتراض۔ اچھا تو پھر یہ بات میری مان
لیں کہ آپ ابھی آجائیں۔ جب تک جی چاہے رہیں۔ جب چاہیں
شفٹ کر جائیں۔ اگر آپ محسوس کریں کہ ADJUSTMENT
میں دشواری پیدا ہو تو آپ کو اختیار ہوگا کہ چھوڑ دیں۔ آپ
یوں فاصلہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک نہیں۔ ہماری آپ
کی دوستی صرف لنچ اور گارڈن تک تو نہیں ہونی چاہئے۔ کیا
میں اس لائق ———————

نہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں۔ بس یوں ہی۔
اچھا ہم بھی دیکھیں گے۔ آپ کب تک چھپائیں گے۔
کوشش کیجئے۔

اس درمیان لندن سے کہیں باہر ایسٹر کی چھٹی میں
HOLIDAYING پر چلنے کی بات آئی۔ اور اس نے پوچھا۔
کہاں چلیں گے۔ پیرس۔ برلن۔ اوسلو۔ اسٹاک ہوم
ISLES OF WHITE!
دیکھا جائے گا۔
وقت کے دھارے نکل کر بہت دور جا چکے تھے۔
اس نے گھاس پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
چلئے۔ اور پھر آہستہ آہستہ جانے لگی۔
میں نے کہا۔ آپ نہیں جائیں گی مجھے چھوڑ کر۔ میں
آتا ہوں۔ دیکھوں گا آپ کس طرح جاتی ہیں۔ تھوڑی دور
جا کر رک گئی۔ پھر لوٹ کر آئی۔ میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور
ہم دونوں ہنستے ہوئے ڈپارٹمنٹ کے کمروں میں چلے گئے۔

۵ر مارچ

ہیلو
حضور۔ کہئے۔ مزاج اچھا ہے۔
جی آپ کیا کر رہے ہیں۔ بہت مصروف ہیں کیا۔

نہیں تو
اچھا لنچ پر
او کے۔ مائی لو
او کے۔ ڈیری
لنچ پر اور باتوں کے علاوہ اس نے کہا۔
آپ میرے یہاں کیوں شفٹ نہیں کرتے۔ کیوں میرے
یہاں نہیں چلتے۔ آپ کے وقار کو ٹھیس لگ جائے گی کیا۔
کوئی خطرہ ہے کیا۔ آپ چلئے۔ میں آپ کے لئے پیاز کی بھجیا
پکوڑے۔ لسی۔ قورمہ۔ پلاؤ۔ اور کتنی ہی چیزیں۔ میری تمنا
کا آپ کو ذرا بھی خیال نہیں۔ آپ تو میرے بالکل اپنے۔
نہیں آشا۔ میری مجبوریاں ہیں۔ اور پھر اپنے کو اتنی
اونچی جگہ کے لائق نہیں پاتا۔
او۔ یہ بات ہے۔ اچھا۔ کل سے ہمارا آپ کا کوئی
سروکار نہیں۔ کوئی واسطہ نہیں۔ دوستی اور آرزو نے دم توڑ دیا۔
مجھے افسوس ہے۔ آپ سے مل کر میں نے بھول کی۔
چاند کو چھونے کی کوشش کی تھی میں نے۔ یہ دیوانگی تھی میری۔
اب آپ سے شاید نہ ملوں گی۔ واپس چلیں اور ہم واپس
آگئے۔ اس کے کمرہ تک حسب دستور پہنچانے گیا تو اس نے کہا
شکریہ۔ مجھے فون نہ کریں گے۔ میں بھی نہ کروں گی۔
مرضی سرکار کی۔

۶ر مارچ

ہیلو
آشا SPEAKING
شکریہ۔ کیسے کیسے یاد کیا۔
جی۔ بس یوں ہی۔ خیال آیا دریافت کروں آپ
آئے ہیں کہ نہیں۔
اب کیا خیال ہے؟

...۔ تو آپ جا رہے ہیں انڈیا۔ چلئے
... جا رہے ہیں۔ چھوڑے جاتے ہیں۔
... تم میری مجبوریاں کیوں نہیں سمجھتیں۔ تم سے دور
... کو اداس کرتا ہوا آتا۔
پھر آپ میری کوئی بات مانتے ہی نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ
... بات کو اچھال نہیں سکتی۔ پھر بھی۔ آپ کے انداز
... بتاتا ہے۔ اور میں بتاؤں۔ میری جگہ کوئی دوسری
... تو وہ بھی روتی اور آپ بھی روتے۔
چھوڑیئے۔ کوئی اور بات کریں۔
نہیں مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ اور اس نے
ریسیور رکھ دیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر گھنٹی بجی۔
ہیلو ہے۔ موڈ لائن پہ ہے۔
... اوں
بہتر۔ حضور۔
جب میں گیٹ سے باہر آیا تو مسکرا کر اس نے استقبال
کیا۔ پھر وہی مسکراہٹیں۔ وہی نغمہ ریزی۔ وہی پیار۔ یا اللہ
ان باتوں کا مطلب کیا سمجھوں۔ آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
مجبوریوں اور پابندیوں کے باوجود مسرت کا یہ احساس۔ قربت
کی یہ تمنا۔ دوری کی کسک۔ کیا معنی۔ یہ رنجش۔ یہ خفگی۔ آپ
ہی مجھ نا۔ آپ ہی من جانا۔ اس کے بعد مزے مزے کی شکایتیں
وہ حکایتیں۔ یہ سب کیا علامتیں ہیں۔ لنچ کے بعد ٹیمس کے
کنارے وکٹوریہ گارڈن میں گھاس پہ لیٹے لیٹے پیاری پیاری
باتیں کرتے رہے۔ گھنٹہ بھر بعد ڈپارٹمنٹ کو لوٹے۔ شام میں
گھر لوٹتے ہوئے بس کے انتظار میں ہم دونوں کھڑے تھے۔ پر
بس نظر آتی تھی۔ اس نے کہا۔
ملرل والی ٹافی سامنے کی دکان سے لا دیجئے، یا
کیڈبری۔
میں نے کہا نہیں۔ آپ خود سے لے آئیں یا پھر میرے
ساتھ چلیں۔
آخر کیو (QUEUE) توڑ کر ہم دونوں دوڑتے ہوئے
سڑک کراس کر کے کنفکشنری شاپ پہنچ گئے۔ ٹافی لی اور
پھر ہنستے ہوئے بس اسٹینڈ پر اپنے نمبروں پر آ گئے۔ کسی نے
اعتراض نہ کیا۔ بس سے روانہ ہوئے۔ ٹرافلگار اسکوائر ٹیوب
میں اسکیلیٹر سے اتر کر گاڑی میں داخل ہوئے۔ پھر پکیڈلی سرکس
میں گاڑی بدلی۔ اس کے DIRECTION میں جانے والی
گاڑی میں اس کا ساتھ دینے کے خیال سے داخل ہو گیا۔ کئی
اسٹیشن پر اترنا چاہا پر اس نے اترنے نہ دیا۔ گاڑی زمین دوز
لائنوں پہ بھاگتی تھرکتی چلتی رہی۔ اور ہم باتیں کرتے رہے
اس نے کہا۔
میں بھی کیا ہوں۔ سوچتی رہی پر گتھی کھلتی نہیں۔ آپ کے
سخت اور حوصلہ شکن رویہ کے باوجود ملتی رہی۔ کئی بار سوچا۔
چاہا۔ طے کیا کہ آپ سے نہ ملوں۔ باتیں نہ کروں۔ فون نہ
کروں۔ مجھے واقعی آپ سے نہیں ملنا چاہئے تھا ...... مگر......
آپ کی طرف برابر کھنچتی چلی گئی ..... باتوں ہی باتوں میں
بہت دور نکل آیا تھا۔ نائٹس برج میں چاہا کہ رخصت
لوں۔ گاڑی رکی۔ اترنا چاہا۔ پر اس نے ہاتھ تھام لیا۔ دروازہ
بند ہو گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ ہم پکیڈلی لائن پر سفر کر رہے تھے،
یہاں تک کہ اس کی رہائش گاہ کے ٹیوب اسٹیشن پہنچ گیا۔ ہم
لوگ اتر گئے۔ گاڑی MOVE کر گئی۔ میں نے دیکھا وہ بہت
خوش تھی۔ کہنے لگی لگن سچی ہو تو آدمی کامیاب ہو جاتا ہے۔
یہاں تک تو میں آپ کو لے ہی آئی۔
پھر اس نے مجھے شب بخیر کے ساتھ رخصت کیا۔ گھر
پہنچ کر حالات کا سروے کیا کہ یہ کھیل تماشا ختم کر دینا چاہئے۔
دشواریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ پروگرام پر اثر پڑنے لگا۔

۱۴ر مارچ

ہیلو

ڈیمی
کون
آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں ہوں۔ آشا
او۔ ڈیئر ویری سوری
جی میں سمجھتی نہیں ہوں کیا۔ یہ رنگ آنے والے رنگ
دن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ نہ جائیے۔ انڈیا نہ جائیے۔
میں آپ کو جانے نہ دوں گی۔ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔
عجیب لڑکی ہے۔ انگلش ویدر کی طرح۔ کبھی رنجش اور
خفگی کے گھنیرے بادل کبھی صبح کی مسکراتی کرن۔

۲۲ مارچ

دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔ لنچ پر ساتھ چلنے کی بات
طے پائی۔ لنچ کے وقت گیٹ پر میرا انتظار تھا اسے۔ رنجش اور
پیار کی خوب صورت تصویر۔ روشن روشن۔ دل کش دل کش۔
لنچ پر پھر وہی مچلنا۔ وہی اصرار، وہی نغمہ باری۔ آپ میرے
یہاں چلئے۔ میری بات مان لیجئے۔ میری بڑی آرزو ہے یہ۔
اچھا۔ میں آؤں گا۔
سچ۔ کب۔
اگلے
WEEK END یا SUNDAY کو
اور وہ خوشی سے اپنی سیٹ پر اچھل پڑی۔ جیسے کوہ نور
پا لیا ہو۔ پھر ہم دونوں وکٹوریہ گارڈن آ گئے۔ اس نے
غالب کی غزل " ابنِ مریم ہوا کرے کوئی " سنائی اور ایک
فلمی گیت " یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم ملے تھے "۔ تھوڑی دیر
اس کی لہروں کے ساز پر اس کے گیت میں کھویا رہا۔ آخر سکوت
ٹوٹا اور پھر ہم دونوں ڈپارٹمنٹ کی طرف لوٹ آئے۔

۲ مارچ

آج کی صبح بڑی حسین تھی۔ کئی دنوں کے بعد سورج کی کرنوں نے

دھرتی کو پیار کیا تھا۔ فٹ پاتھ اور سڑکوں پر چاندنی بکھر
رہی تھیں۔ بڑی ہماہمی کا سماں تھا۔ میں نے ساڑھے دس
بجے پروگرام کے مطابق آشا کو فون کیا۔
ہیلو۔
جی۔
میں نہیں بولتی۔ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ آپ
آئے نہیں۔ ابھی فون آیا ہے۔ کہاں ہیں آپ۔ کیا کر رہے ہیں۔
جلدی آئیے۔ ابھی تک آئے بھی نہیں۔
میرے حضور۔ بدگمان نہ ہو۔
گیارہ بجے ایکٹن ٹاؤن ٹیوب اسٹیشن سے نکل کر
میں اس کی رہائش گاہ پہنچا۔ وہ گیٹ پر انتظار مجسم بنی شرابی
شرابی، گلابی گلابی کھڑی تھی۔ نظر پڑتے ہی جیسے دوڑنے لگی۔
جذبات مسرت سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ سادگی میں اس کے
حسن بلاخیز نے ہر شے کو مبہوت کر رکھا تھا۔ اس نے خوشی میں
جھولتے ہوئے کہا۔
خوش آمدید ڈیئر
نئی صبح اور کامیابی مبارک۔
اور پھر ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک خوبصورت سے
ڈرائنگ روم میں بڑے سے صوفہ پر ایک ہی ساتھ بیٹھ گئے۔
سامنے .T.V پر ویت نام کی تباہ کن جنگ کے تماشے پیش ہو رہے
تھے۔ اس نے پیار سے پوچھا کیا پئیں گے آپ۔ لسی۔ کوک
پیپسی۔ کوفی۔ چائے۔ شیری۔ میرے ہاتھوں سے۔ آشا تمہیں
کیا ہو گیا ہے۔ کوئی ایسی بات تو نہیں۔ چاند زمین پر تو نہیں اتر
آیا۔ سورج برفیلا تو نہیں پڑ گیا۔ ٹیمس کے کنارے تو نہیں جل
بیٹھے۔ ایسی انہونی یا خوشی کی کیا بات آ گئی۔ میں اپنے آپ کو
مانند مہمان بھی نہیں لایا۔
میں آپ کو بتا ہی نہیں سکتی۔ میں نے کیا پا لیا ہے۔ میری
روح خوشی میں ناچ رہی ہے۔ انگ انگ میں شراب دوڑ رہی ہے۔

[illegible] ہے۔ کیا بتاؤں۔
[illegible] ہے۔
[illegible] اہتمام کیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر many
[illegible]۔ پلاؤ۔ مرغ کا قورمہ۔ کباب۔ مچھلی
[illegible]۔ قیمہ۔ کئی طرح کے حلوے۔ ان کے
[illegible] کیک۔ اور اورنج اسکواش مکرا۔
[illegible]۔ لطف کھاتے رہے۔ دس بجے
ان کو [illegible] گھومنے نکلے۔ میں نے اس کی دو SNAPS
[illegible] دیکھنے چلا گیا۔
رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک ہم ایک ساتھ شہر میں
گھومتے رہے۔ وقت گھومتا رہا۔ اس نے رخصت ہوتے ہوئے
مجھ سے کہا۔

تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

اچھا میرے دوست میرے ساتھی شب بخیر۔
شب بخیر ہالو

۱۵ اپریل

ساری رات نیند نہ آئی پاس۔ پیار کی کشتی پر سوار خیال
کی لہروں پہ کہیں دور۔ افق کے پار نکل گئی ہوگی۔ میں سوچتا ہوں
ہماری ملاقاتیں اس منزل پہ آ گئی ہیں کہ پھسل بھی سکتی ہیں۔ یہ
تماشا دل چسپ سہی پر اب مناسب نہیں۔ ختم کرنا دشوار تو
ہے مگر ضروری سا ہو جاتا ہے۔ ڈپارٹمنٹ کچھ سویرے ہی پہنچ گیا
دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔

ہیلو
آپ کی آشا
ہالو
کل رات کیسی گزری؟

بس کچھ نہ پوچھئے۔ جب ہی تو طبیعت ٹھیک نہیں۔
کیوں۔ کیا ہوا۔ کہئے تو۔ اچھا لنچ پر۔
جی۔ میں آج لنچ پر نہیں جا سکوں گا۔
کیا ہو گیا ہے۔ بولئے نا۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔ میں نے
کچھ کہہ دیا۔ نہیں۔ نہیں۔ آپ کو چلنا ہوگا۔
جی۔ آج نہیں۔
اچھا۔ اور پھر اس کی آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئی
بے حد اداس ہو کر اس نے رسیور رکھ دیا۔
ایک ہی گھنٹہ بعد پھر اس کا فون آیا۔
ہیلو
آپ کیسے ہیں۔ طبیعت کیسی ہے۔ اب کچھ کہتے کیوں نہیں
چھوڑیئے۔ آپ لنچ پر جا رہی ہیں۔
آپ ہی نہیں تو پھر کیا جاؤں گی۔ کیا کروں گی جا کر۔
اچھا تو پھر میں چلوں گا۔ خوش ہو گئیں آپ۔
لنچ پر ساتھ گئے۔ پھر وکٹوریہ گارڈن کی سبز گھاس پر
لیٹے باتیں کرتے رہے۔ اس نے کہا۔
آپ بہت اچھے ہیں۔
نہیں آپ بہت اچھی ہیں۔ اور جب میں کچھ سوچنے
لگتا تو کہتی۔
دیکھئے۔ دیکھئے۔ آپ خیالوں میں کھوئے۔ جب
آپ الجھے الجھے سے خیالات میں ہوتے ہیں تو بڑے اچھے
معلوم ہوتے ہیں۔ پر جانے کیوں اس طرح کتراتے ہیں۔ کیا ملنا
بھی جرم ہے آپ کی نظر میں۔
کاش ایسی باتیں کہہ کر کیوں شرمندہ اور سوگوار کرتی ہو
تم کو کیسے بتاؤں ـــ
پھر گھاس سے اٹھ کر ہم دونوں ٹیمس کے کنارے
دوڑتے رہے۔ پھر ڈپارٹمنٹ میں لوٹ آئے۔ تھوڑی
دیر بعد جب وہ میرے کمرے میں آئی۔ میں تنہا تھا۔ میرے

کاندھے پر سر رکھ کر کچھ سوچتی رہی۔ اس درمیان اس کی آنکھوں سے موتی کے دو قطرے ٹپک پڑے۔ مجھے شرارت کی سوجھی۔ سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی۔ میں نے اپنا فیلٹ ہیٹ اسے پہنا دیا۔ وہ ہنس پڑی ہنستی رہی اور کہتی رہی۔

ارے ارے تم ٹھیرئیے۔ کیا کر رہے ہیں۔ بہت وہ ہیں آپ۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔ اچھا آپ انڈیا تو نہیں جائیں گے اب آپ کو نہیں جانا ہوگا۔ میں نہیں جانے دوں گی۔ اگر چل دیے تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ کہیے آپ جائیں گے نہیں۔ کہئے۔ اگر گئے تو لوٹ آئیں گے۔ میری کشش آپ کو کھینچ لائے گی۔

آشا، چھوڑو ان باتوں کو۔ وقت کی سہانی گھڑیوں کو یوں مجروح کر رہی ہو۔

نہیں، آپ کچھ کہتے نہیں۔ کچھ سمجھتے نہیں۔ کچھ ...تے نہیں۔ کچھ سنتے نہیں۔ اچھا ایسٹر کی چھٹی پر HOLIDAY-ING کرنے ہم لوگ لندن سے باہر چلیں۔

ابھی سے نہیں کہہ سکتا۔ میرا پروگرام گلاسگو جانے کا ہے اپنے ایک دوست کو لکھ بھی چکا ہوں۔

ایسا کون مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔ میں توڑ سکتی ہوں COMMITMENT۔

او ہو ڈیر۔ تمہارا حکم میری عبادت ہے۔

۱۱/اپریل

اس کی خواہش اور اپنے وعدہ کے مطابق گیارہ ...اس کے یہاں پہنچ گیا۔ اس نے مسکرا کر SHAKE HAND ...تے ہوئے پوچھا۔ کہاں چلیں گے ہم لوگ۔ برائٹن۔ ساؤتھ...ن۔ بوگنر۔ پورٹس ماؤتھ یا بلیک پول۔ اور بات برائٹن پر ہوئی۔

کھانا کھا کر کار سے ہم لوگ یہاں پہنچے۔ لندن سے ...ن میل دکھن۔ انگلش چینل کو چومتا ہوا کنارا۔ ایک خوبصورت سی بیچ (SEA BEACH)۔ سمندر کا ... کنارے فضا میں بکھرے ہوئے۔ نیلا سمندر، نیلا آکاش۔ تفریح کی بڑی پیاری جگہ اور پھر جیکی ساتھ ہو پیارا ہو۔ تقریباً ... گھنٹے میں ہم لوگ یہاں پہنچے تھے۔ سیاہ بل کھاتی، لہراتی سڑک پر ہل میں نغمہ طرازی کرتی آتی تھی۔ سارا راستہ سبزہ زار ... اونچے نیچے پہاڑی راستوں کے دونوں طرف اونچے نیچے درختوں کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم دونوں بھاگتے جاگتے سوتے سوتے سے ریگ پر گھنٹوں پڑے رہے۔ کبھی میں آشا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا۔ کبھی وہ میرے کانوں میں تنکے سے گدگدی لگا دیتی۔ سارے ساحل پر پیار پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس کی چند SNAPS کی۔ شام کی چائے ایک ریستوراں میں پی۔ ساڑھے سات بجے واپس ہوئے۔ پھر لوٹ کر لندن شہر کی سیر ہوئی۔ گیارہ بجے رخصت ہو کر اپنے رہائشی کمرے میں لوٹ آیا۔

۱۳/اپریل

آج کا دن بڑا سیاہ گھناؤنا اور منحوس گزرا۔ ساڑھے دس بجے اس کا فون آیا۔ مجھے اپنے گھر بلایا۔ گیارہ بجے میں اس کے پاس پہنچا۔ خیال تھا دوستی کی ڈور کافی مضبوط ہو چکی ہے اب تو کوئی خطرہ نہیں۔ پر بات الٹی نکل آئی۔ ڈرائنگ روم میں میں نے بیٹھے بیٹھے دیکھا اس کی آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں مگر چہرہ سرخ گلاب کا پھول۔ بات ہی بات میں برہمی بڑھتی چلی گئی۔ اور جیسے کمرے میں طوفان آگیا ہو۔ جانے وہ کس کس انداز میں۔ کس کس پوز میں خفگی اور غصہ کا اظہار کرتی رہی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ آپ مجرم ہیں۔ گناہگار ہیں۔ آپ نے میرا ذہنی سکون کچل ڈالا ہے۔ میرے انگ انگ میں آگ دوڑا دی ہے۔ میں تڑپتی رہتی ہوں۔ آپ کو کیا حق تھا مجھے اس طرح پریشان کرنے کا۔ جب آپ میری بات ماننے کو تیار نہیں۔ یہ کھیل کس لئے شروع کیا تھا۔ بتائیے بتائیے۔ آپ کو کیا حق تھا۔

[illegible] ہو رہی ہیں۔ میں اپنے
[illegible] بہت سا۔ خوبصورت کو بے انتہا
[illegible] کا اور اس کے یہاں شفٹ کرنے کی تجویز
[illegible] فضا کی گرمیاں آہستہ آہستگی آنے لگی۔
[illegible]۔ اس نے گنگنائے۔ ہم دونوں ایک
[illegible] مختلف مرحلوں سے گزر رہے ہو۔ کبھی
[illegible] جائے۔ وہ بے انتہا خوش ہو رہی تھی۔
[illegible] کو بستر پر گر پڑا۔ ذہنی اور جسمانی تھکن
[illegible] جنگ سے لوٹا ہوں۔ جیسے کسی نے پہاڑ سے
[illegible] دیا ہو۔ جیسے چیخ چلاتے چلاتے تھک گیا ہوں۔ یہ
[illegible] OBJECT ہے۔ ہر شخص کی زندگی کسی OBJECT
کے پیچھے ہوتی ہے۔ اور یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

۲۹ر اپریل

ہیلو
آشا SPEAKING
ہم
آپ اچھے ہیں
آپ کی پیار بھری سلامت۔ میرا جنون سلامت
ایک خطرناک بیماری۔ بے وفا۔ آپ سے اب کیا
کہوں۔ کہوں کیسے۔ تھک کر مایوس ہو گئی۔ [illegible]۔
ٹھیک۔ ڈیر
کافی دیر تک ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وکٹوریہ گارڈن
[illegible] ہم دونوں لیٹ گئے۔
تو آپ انتظار ہے ہیں۔ جانے میں اب زندگی میں
کسی سے نہ مل سکوں گی۔ جانے پھر اس جنم میں ملاقات ہو نہ ہو۔
نہیں ایسا نہیں۔ ایمان کہئے۔ میں چاہوں گا کہ آپ کے
پاس واپس آجاؤں۔ کوشش کروں گا کہ لوٹ آؤں۔

خیال کرے۔ پر میں تو جی ہار چکی۔ کاش میری محبت آپ کو
روک سکتی۔ آپ کو واپس لا سکتی۔
گارڈن سے لوٹتے ہوئے اس نے میرے لئے ایک
خوبصورت سی KEY RING خریدی۔ نشانی دی۔
پھر ہم ڈپارٹمنٹ کی طرف لوٹ آئے۔

۱۲ر مئی

تین بجے دن میں جب کہ میں اپنے احباب کے درمیان
گھرا ہوا تھا کہ وہ اپنی کار سے میرے یہاں مجھ سے ملنے آگئی۔
اٹھتے ہوئے بازار میں افراتفری تھی۔ [illegible]
تھا۔ مل کر جاتے وقت فون پر بات کر لینے کا وعدہ لے کر
رخصت ہوئی۔

۱۳ر مئی

ہیتھرو ایر پورٹ پہنچ کر حسب وعدہ میں نے اسے
رنگ کیا۔
ہیلو
میری سرکار۔ میں رخصت۔ الوداع
آپ نے میری کچھ نہ مانی
واپس آکر سب کچھ مان لوں گا
کون جانے کل کی بات۔ قیامت کا کوئی اور وعدہ
تو نہیں۔
اچھا صنم۔ میرا سلام۔ خدا حافظ
اچھا ساتھی۔ خدا حافظ

اپنی تخلیق کے اختتام پر اپنا پتہ جلی حروف میں
ضرور تحریر کریں۔ (ادارہ)

قارئین

سواد و صوت

پاکستان سے ایک خط

راول پنڈی ——————— رشید امجد

پیارے بھائی،

آپ کا ۱۰ اکتوبر کا خط مسقط سے ہوتا ہوا آج ملا ہے۔ آپ نے جس پیکٹ کا ذکر کیا ہے، وہ ابھی نہیں پہنچا۔ بہرحال اب تو براہ راست ڈاک کی ترسیل بھی شروع ہو گئی ہے۔

طویل عرصے بعد آپ سے یہ ملاقات ہوئی ہے۔ میں تو وہاں کے دوستوں اور ان کی چیزیں پڑھنے کو ترس گیا ہوں۔ اس دوران یہاں تو ادب کی دنیا میں بڑے انقلاب آئے ہیں۔ بہت سے نئے لکھنے والے از قسم افتخار جالب وغیرہ علامتی میدان چھوڑ کر سیاست میں جا گھسے ہیں۔ یہاں تو اب جدید ادب لکھنے والے گنتی کے چار لوگ ہیں۔ سیاسی وبا نے بہت سوں کو کھا لیا، جو زندہ بچے ہیں وہ بھی مر رہے ہیں۔ ادبی پرچوں کا بہت برا حال ہے۔ کئی پرچے بند ہو گئے ہیں۔ 'نقوش' اب دوسالہ، بلکہ سہ سالہ ہو گیا ہے۔ فنون، اوراق اور سیپ سال میں ایک دو بار چھپ جاتے ہیں۔ اوراق کی حالت سب بہتر ہے۔ ادبی کتابیں کبھی کبھار چھپتی ہیں، کیونکہ کاغذ کپڑے سے بھی مہنگا ہے۔ اور یوں بھی یہاں ادب کی عملاً چھٹی ہو چکی ہے۔ ادیبوں کو اب صرف ادیب ہی پڑھتے ہیں۔ ڈائجسٹوں نے ادبی پرچوں کا ستیاناس کر دیا ہے، ادب کی دنیا کے حالات اس سے بھی مخدوش ہیں۔

بہرحال — آپ کے یہاں کیا صورت حال ہے۔ میرے پاس آہنگ کا آخری پرچہ، چھ تھا شمارہ آیا تھا اس کے بعد کوئی پرچہ نہیں ملا۔ آپ نے مسقط کے پتے پر جو پکیٹ بھیجا ہے، وہ مجھے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر کچھ پرچے ہوں تو اب براہ راست بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔

ڈھاکہ ——————— الجب جوہر

ان شماروں میں (شمارہ ۵۲ اور ۵۳، ۵۴) پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کو دیکھ کر بے حد مسرت حاصل ہوئی ہے، ایک مدت بعد ان کی تخلیقات نظروں سے گزری، ورنہ ہمارے لئے تو خواب ہی بن چکی تھیں۔ گذشتہ کسی خط میں آپ نے لکھا تھا کہ اکتوبر کے "آہنگ" میں کلام حیدری صاحب کا افسانہ شامل ہے۔ لیکن انتہائی مایوسی ہوئی نومبر دسمبر کے مشترکہ شمارہ میں بھی کلام صاحب کا افسانہ موجود نہیں۔ امید ہے جنوری کے شمارہ میں آپ کلام صاحب کا افسانہ ضرور شامل کریں گے۔ "صفر" کا بھی انتظار ہے۔ کاش! کوئی ایسی صورت نکلتی کہ میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا۔ اکتوبر کے شمارے میں مجھے خاص طور پر جو تخلیقات بے حد پسند آئیں ان میں جناب وزیر آغا، جناب وہاب اشرفی کے اعلیٰ ترین مقالے، محترمہ

[illegible] کا [illegible] فرید [illegible]
[illegible] ہوا [illegible] کی [illegible] لین [illegible]
[illegible] آخر [illegible] سوہن راہی کی نظمیں شامل
[illegible] مشترکہ شمارہ [illegible] بہت سادہ [illegible]
[illegible] خصوصی طور پر قتیل شفائی ، سوہن راہی ، بلونت
ارشد [illegible] ، ابوالحسن ، عبدالصمد ، کاشی [illegible]
[illegible] اور [illegible] چودھری صاحبان کی تخلیقات
متاثر کرتی ہیں ۔ میری جانب سے ان تمام فن کاروں کی خدمت
میں خلوص پیش کریں ۔ [illegible] کے شمارے میں آپ نے اعلان
کیا تھا کہ اگلے شمارے میں فضا ابن فیضی کو جناب وہاب
اشرفی کا مقالہ شامل ہوگا لیکن مشترکہ شمارے میں دیکھ کر مایوسی ہوئی ۔

[illegible] ــــــــــــ نازش انصاری

نئے آہنگ (شمارہ ۵ ، ۶) کا انتخاب بہت
سخت تھا ۔ اسے پڑھ کر بہت دن بعد ذہنی آسودگی حاصل
ہوئی ۔ ان دنوں بیشتر رسائل کا انتخاب مایوس کن ہوتا
ہے مگر آہنگ اپنے قاری کو مایوس نہیں کرتا ۔

آپ نے لکھا ہے کہ "ہم آہنگ کو جن مزید خوبیوں سے
آراستہ کرنا چاہتے ہیں اس میں ہنوز کامیابی نہیں مل سکی ہے"
تو عرض ہے کہ میرے نزدیک فن کار بے چین اور بے قرار روح
کا ہی دوسرا نام ہے ۔ اسے اطمینان اچھا نہیں لگتا اور وہ
خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہی پوری زندگی گزار دیتا
ہے ۔ آپ چونکہ بنیادی طور پر فن کار ہیں اس لئے آہنگ کو اپنے
دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر دینا چاہتے ہیں ۔
خوب سے خوب تر کی اس تلاش میں آپ اکیلے
نہیں ہیں بلکہ دیگر فنکاروں کے ساتھ ساتھ میں بھی آپ
[illegible] اتنا ہو کہ آپ منزل نظر میں رکھے ہوئے ہیں ۔

[illegible] ــــــــــــ خلیل تنویر

آپ سے گزارش ہے کہ " آہنگ " کے لیے پاک
کے شعرا کا پورا پورا تعاون حاصل کریں ۔ آہنگ
فن حصہ کو ابھی اور زیادہ تابناک بناتا ہے ۔

بھوپال ــــــــــــ عبدالرحیم نشتر

بہت دنوں بعد سرحد پار کے دوستوں کی تخلیقات
پڑھنے کو ملیں ۔ امید ہے آپ آئندہ بھی اس طرف کے فن
کاروں سے ملاتے رہیں گے ۔

بقیہ : اسی قافلے کا مسافر

سے لیا ہوگیا کیوں کہ میری چھٹیاں ختم ہو گئیں تھیں ۔ جا
وقت میں نے سوچا کہ مجھے بھیا سے مل لینا چاہیے اور میرے
قدم ان کے گھر کی جانب اٹھ گئے ۔ جب میں بھیا کے گھر پہونچا
تو اندھیرا پھیل چکا تھا ۔ میں گھر میں داخل ہونے ہی والا
اندر سے بھیا کے بولنے کی آواز سنائی دی اور میں ٹھٹھک
کر رک گیا ۔ بھیا کسی سے کہہ رہے تھے ـــــ
" اسی بات کا تو افسوس ہے کہ بڑھا بچ گیا ۔ میرے
ایک ہزار روپے مفت میں برباد ہوئے اس وقت ایک ہزار
بزنس میں ڈالتا تو پانچ ہزار بن جاتے "
"اب کون جانتا تھا کہ وہ بچ ہی جائیں گے"
یہ مجھلے بھیا کی آواز تھی ۔
اچانک ہی میرے سامنے لال پیلی چنگاریاں سی اڑیں
اور میں بڑے بھیا سے ملے بغیر ہی واپس ہو گیا ۔ لوٹتے وقت
میں نے سوچا کہ مجھے بھیا جیسے انسان سے نفرت کرنی چاہیے
اور میں نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا ۔ لیکن بہت دور تک
جھانکنے کے باوجود مجھے اپنے اندر بھیا کے لئے نفرت کا کوئی
سراغ نہ مل سکا ۔
●●

BAIRAGI, GAYA.

Hind Litho Press ...

کلچرل اکیڈمی، ریڈ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

آہنگ (۴)

اپریل ۱۹۷۵ء

شمارہ ۵۸

فون: ۵۳ / ۴۳۲

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

فی شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

کتابت:
قمر نظامی

طباعت:
ہند لیتھو پریس میکلوڈ گنج گیا

مدیر

کلام حیدری

محتویات

مزامیر

مضامین

افسانے

نظمیں

غزلیں

نئی نظم کا مطالعہ

تبصرہ

—— ——

حرف امیر

پچھلی بار ہم نے انہی اسا تذہ کا ذکر کیا تھا کہ اُردو بھاگئے جیسے ہو سکا یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں وغیرہ سے دور کر دیا جائے گا۔ کیونکہ ابھی ۱۹۷۵ء ہی ہے ہیں اگر ہم پچھلے بیس سالوں کا سنجیدگی کے ساتھ بامعنی جائزہ لیں تو ہمیں یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہیں گے کہ اُردو دانوں کی تعداد تیزی کے ساتھ گھٹتی چلی جا رہی ہے اور اگر اسی رفتار سے بھی (خدا کرے آگے رفتار تیز رہے گی) اُردو دانوں کی تعداد گھٹتی رہی تو اس صدی کے ختم اور اکیسویں صدی کے شروع تک حیات ہیں انجمن میں نہ ملے گی کہ اُردو اخبارات اور رسائل فروخت کیوں نہیں ہوتے ہیں۔

یقین کیجیے، ابھی جو جو مثبت سرکار کی جانب سے اُردو کی ترقی کے لئے کیے جا رہے ہیں وہ ہمیں بہلانے کے لئے ہیں ہم نہیں کہتے کہ حکومت یہ کوشش دانستہ کر رہی ہے لیکن وہ جن حضرات کے ذریعہ " ترقی اُردو " کے لئے کوشاں نظر آتی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے۔

آج کل اُردو میں لغات تالیف کرانے اور کتابیں لکھوانے کا جیسے جنون سا ہو گیا ہے، سرکار مختلف اداروں کے ذریعہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ بڑے بڑے جغادری اردو پروفیسروں سے کتابیں لکھوا رہی ہے ریٹائرڈ پروفیسر حضرات ہزاروں ہزار کی رقم کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اور جو یہ نہیں کر رہا ہے وہ ہزاروں کی تنخواہ کے ساتھ کچھ نہ کرنے کی خدمت پر مامور ہے۔

اُردو اخبارات و رسائل کہتے ہیں اُردو میں اچھی چیزیں کم لکھی جا رہی ہیں۔
ہم کہتے ہیں اُردو میں لکھ کر کسی کو کیا ملتا ہے؟ شہرت؟ دولت؟ تسکین؟
اُردو رسائل کہتے ہیں ہمارے رسالے کی تعدادِ اشاعت ہزار سے اوپر نہیں جاتی۔
ہم کہتے ہیں، اسے بھی غنیمت سمجھئے، اُردو جانتا ہی کون ہے کہ خریدے گا؟
اُردو کے پروفیسر اور ٹیچر کہتے ہیں اُردو پڑھنے والے طلبا کم ہوتے جا رہے ہیں۔
ہم کہتے ہیں کیوں نہ کم ہوں، کس بورڈ، کس انجمن، کس اکیڈمی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اُردو پڑھانے پر نظر رکھے؟

ساٹھ سے اوپر برس والے اُردو ادیبوں، شاعروں اور ٹیچروں کو دنیا سے رخصت ہو جانے دیجئے پھر دیکھئے گا کہ ان کی جگہ لینے والا تو کیا ان کو پڑھنے والا بھی نہ ملے گا اور سمجھنے والا؟ وہ کہاں۔
اکیسویں صدی سے قبل رخصت ہو جانے والے اُردو کے لوگ خوش قسمت ہوں گے

— —

غزل

حسن نعیم

(عظیم آباد کے نام)

فرسنگ کیا؟ تلاش کے صحرا میں میل کیا
روکے گی کوہسار کے چشموں کو جھیل کیا

سر میں ہو شورِ عشق تو دل کیا صلاح دے؟
طوفاں کے کاروبار میں خس ہو دخیل کیا؟

غم گیں ہے کج کلاہیٔ بے تابِ شاہدی
بخشش پہ اک رذیل کی خوش ہیں جمیل کیا

صف میں ہے شہریار کے آلِ حبیب بھی
شاہِ نجف کا واسطہ اب دے قتیل کیا!

ہم ہیں تو روحِ شاد! زمانے کا غم نہ کر
ہم سا یگانہ دے گا زمانے کو ڈھیل کیا

دانش وروں کے قحط میں، سید حسن نعیم
بیدل کی باؤلی پہ لگائیں سبیل کیا؟

صادق

□

غور کر اس مسئلے پہ ذرا غور کر
غور کرنے سے تیرے کوئی مسئلہ
حل ہوا ہے کبھی ؟
اور نہیں تو ذرا غور کر
اس کا باعث ہے کیا ؟
تو جو باعث کے گرداب میں آئے گا
پائے گا تھاہ باعث کی
لیکن نہیں پائے گا
سطح اور تھاہ کے بیچ لہرائے گا
سطح سے تھاہ تک
تھاہ سے سطح تک
آئے گا جائے گا۔ خوب چکرائے گا
اپنا باعث بھی لیکن نہ ہاتھ آئے گا
غور کر ——

□

سارے موضوع
مٹی میں بکھرے ہوئے
دیکھتا جا، مگر
اپنے ہاتھوں اٹھانے کی کوشش نہ کر
ذائقے چٹکیوں میں نہیں آئیں گے
لمس کانوں کے پردوں سے ٹکرائیں گے
گندھ پلکوں میں آکر اٹک جائے گی
جیبھ پر ہر سماعت بھٹک جائے گی
اور نظر، ناک میں ہی سٹک جائے گی
باگ ہاتھوں میں رکھ
بات موضوع سے پھوٹ کر آئے گی
سارے بکھراؤ جس دن سمٹ آئیں گے
خود بہ خود ساری مٹی بکھر جائے گی

دو نظمیں

□

خدا، آسمان — اور میں
سب گواہ ہیں
مٹّی سے تخلیق کا عمل
کوئی حادثہ نہ تھا
حادثہ تھا البتہ
تخلیق سے مزید تخلیق کا عمل
پسلی سے عورت
اور عورت سے بچے
اور ان بچوں سے
پھر بچے
اور پھر
ان سے آباد ایک دنیا
جس میں
لمحہ لمحہ
بدلتا جا رہا ہے
سب کچھ — سبھی کچھ
خدا، آسمان اور میں۔

□

کھڑکی سے نظر آنے والا آکاش
گل مہر کی شاخیں
دھوپ، پرندے
دیواریں، فرش اور چھت
اور میں — اور تم
سچ
صرف اتنا ہی نہیں
جتنا ہم تم دیکھ پائے ہیں

انور سدید

مصطفیٰ زیدی کا عشق

مصطفیٰ زیدی کی شاعری کا ایک بنیادی رجحان عشق ہے۔ اس کی شاعری جذبے کی وارفتگی سے شروع ہوتی ہے اور تخیل کی ایک عمودی جست بھر کر جب دوبارہ اعتدال کی راہ اختیار کرتی ہے تو ایک ایسے ارتعاش (VIBERATION) میں تبدیل ہو جاتی ہے جو اس کے دل پر ہر وقت ضرب لگاتا ہے اور عشق کی آگ کو اک سوزِ تازہ پہنچاتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مصطفیٰ زیدی کے ہاں جذبہ محض لمحاتی ابال نہیں بلکہ ایک مسلسل عمل ہے جس میں فراق کے لمحے تو آتے ہیں لیکن ان لمحوں میں بھی جذبے کا زیر و بم ختم نہیں ہوتا بلکہ یاد کے متحرک کل میں ڈھل کر اس کے جسم و جان کو ایک گنجِ سوختہ بنائے رکھتا ہے۔ اور یہ یاد رکھنا بھی مناسب ہے کہ مصطفیٰ زیدی کے عشق میں وصال اور فراق دونوں کا ہی تجربہ موجود ہے اور اس نے دونوں کی حدت میں اپنے آپ کو یکساں طور پر پگھلایا ہے۔

بادی النظر میں عشق اور جذبے میں فرق نوعیت کا نہیں بلکہ درجے کا ہے۔ جذبہ جب اپنی انتہا کو پہنچ کر والہانہ صورت اختیار کر لیتا ہے تو عشق کہلاتا ہے۔ اور اپنی ابتدائی کمزوری حالت میں ایک ایسی حسین ہستی کا طالب ہوتا ہے جو اپنی مرئی صورت میں ناظر کے معیارِ حسن پر پوری اتر سکے۔ یہ مرئی صورت وہ محبوب ہے جو شاعر کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے اور اس کے شعروں کے عقب سے بار بار یوں جھانکتی ہے کہ اس کے خد و خال۔ اس کا لباس اور اس کے جسم کی خوشبو تک اس کی نفسیات تک سے قاری پوری آگہی حاصل کر لیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حسن اور عشق کے پیکر مختلف ہوتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ دونوں ایک ہی ذہنی کیفیت کے مظہر ہیں۔ چنانچہ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن ہو اور جہاں حسن ہو وہاں عشق کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اور غالب کے قول کے مطابق تو عشق اور حسن میں تخصیص ممکن ہی نہیں۔

شوخیِ حسن و عشق ہے آئینہ دار ہم دگر
خار کو بے نیام جان ہم کو برہنہ پا سمجھ

تاہم اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ حسن عشق کے تارِ نظر میں ہی نہاں ہوتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھ کا آئینہ جتنا صاف ہوگا محبوب کی صورت اور اوصاف کا انعکاس بھی اتنا ہی حسین ہوگا۔ گویا حسن کے انفرادی اعتراف میں عاشق کی اپنی ذات کا منفرد اعلان بھی چھپا ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو غزل میں محبوب کی عمومی صفات کے باوجود بیشتر نامور شعراء نے اپنی شخصیت کا اظہار انوکھے پہلوؤں سے کیا ہے۔ اور یوں ہمیں محبوب کے انفرادی نقوش اور شاعر کی اپنی مزاجی کیفیت سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ولی دکنی کو لیجئے۔ اس کے ہاں جمال پرستی کی غیر تربیت یافتہ شکل ملتی ہے۔ اس کا محبوب مثالی حسن کا نمونہ ہے اور وہ اس محبوب کا سراپا بیان کرنے میں بھدی وارفتگی کا ثبوت دیتا ہے۔

تکہ ترا آفتاب محشر ہے   ذرا اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

جب سے کھایا ہے پان اے آفتاب   تیرے لعل لب بدخشانی ہوئے

فغاں، آبرو، شاہ حاتم، یک رنگ، سودا اور میر وغیرہ کے ہاں محبوب ایک ایسے جنگجو کے مماثل ہے جو ابرو کے تیر تیغ سے عاشق کو قتل کرنا ہی جانتا ہے۔ اور جس کے ہاں عاشق پر رحم کھانے یا اس کی دل جوئی کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لکھنوی شعرا مثلاً جرأت، انشا، مصحفی اور آتش وغیرہ کے ہاں ایک ایسے محبوب کے نقوش ملتے ہیں جس کا شباب بالاخانوں میں پروان چڑھا ہے اور اس لئے اس میں آرائش، بناوٹ اور لگاوٹ وغیرہ کا مصنوعی پن زیادہ نظر آتا ہے۔ ان سب کے برعکس مومن کا محبوب ایک ایسی عورت ہے جو گھر کی چار دیواری میں پرورش پاتی ہے اور شرم و حیا کے داخلی حسن سے مرد کا من موہ لیتی ہے۔ غالب کا محبوب ہر چند ایک مرصع نقش نہیں بلکہ ایک ذی روح انسانی ہستی ہے لیکن وہ خد و خال کی پرستش کرنے کے بجائے حسن کی تاثیر کو اہمیت دیتا ہے۔ اور جہاں اس نے قامت، زلف اور رنگ جیسے مناظر حسن کی شوخ و شنگ مصوری کی ہے وہاں بھی ایک مکمل آئینہ خانہ تعمیر کرنے کے بجائے اس نے ایجاز و اختصار سے کام لے کر قاری کے ذوق نگہ کو تصویر کی تکمیل کی دعوت دی ہے۔ داغ کا محبوب واضح طور پر بازاری ہے اور شاید اسی لئے اس کے عشق میں گہرائی کم ہے۔ حسرت موہانی کے ہاں عشق کا لپکتا ہوا شعلہ تو ملتا ہے لیکن یہ ایک گیلی لکڑی کے مماثل ہے جو اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور اس کا محبوب وہ چھوئی موئی، پردہ دار کمسن ہے جو اپنے جذبات کا کھلا اظہار کرنے پر بھی قادر نہیں ہے۔

بیسویں صدی نے جہاں دوسرے سماجی اور معاشی مسائل کو نئے زاویوں سے ابھارا وہاں عشق کے موضوع کو بھی متاثر کیا اور محبوب کی مقناطیسی قوت ختم کر دی۔ غم روزگار کی آندھی چلی تو غم یار عنقا ہونے لگا اور بعض فراجن کے ہاں تخلیقی شعلہ مقصد کے بطن سے جنم لیتا ہے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اس اندازِ فکر کا نقصان یہ ہوا کہ جذبہ جو سود و زیاں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ غم زمانہ کے ترازو میں تلنے لگا۔ محبوب اپنی جمالیاتی قدر و قیمت سے عاری ہو گیا۔ عشق خمارِ گندم بن گیا اور عاشق ایک ایسے مزدور کی صورت میں ظاہر ہوا جو غم روزگار میں زندگی کی ایک اہم ترین جبلت کو جبری طور پر نثار کرنے پر مجبور تھا۔

مصطفیٰ زیدی کے ہاں جمالیاتی احساس کو مقصد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینے کا ہلکا سا پرتو بھی نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند فکر کا یہ زاویہ اسے متاثر نہیں کر سکا۔ پھر اس کے ہاں جذبہ اور فکر آپس میں بہت کم متصادم ہوتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ مصطفیٰ زیدی کے ہاں جذبے کا لاوا بے حد تیز ہے۔ وہ آہستہ آہستہ سلگنے کی بجائے ایک بڑے آتش فشاں پہاڑ کی طرح سارا لاوا ایک ہی مرتبہ اگل ڈالنا چاہتا ہے۔ اور اس بات کا منتظر نظر آتا ہے کہ

"آج کیا سانحہ گزرا ہے، خبر تو لاؤ"

دوسرے لفظوں میں جذبات پر بند باندھنے کے کسی خارجی فلسفے کو خاطر میں لائے بغیر عشق مصطفیٰ زیدی کی اپنی ہی ذات کا

(۱) ڈاکٹر وزیر آغا ۔ اردو شاعری میں محبوب کا تصور

[illegible] کے اپنے شخصیت میں محصور ہے۔ چنانچہ وہ برملا کہتا ہے۔

[illegible] آتشِ دنیا بھی مگر — شعلہ جس نے مجھے پھونکا، مرے اندر سے اٹھا
[illegible] کو ضرورت نہ رہی — آگ بھی، ابر بھی، طوفان بھی، ساغر سے اٹھا

مصطفےٰ زیدی کی شاعری میں جس محبوب کا سراپا ابھرتا ہے اسے غزل کی روایت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہی [illegible] مصطفےٰ زیدی نے دنیا بھر کے سفر اور مختلف خطوں کی عورتوں سے مل کر محبوب کی جو بنیادی تصویر مرتب کی ہے وہی طوائف ہے جو داغ کے زمانے میں کوٹھے پر بیٹھتی تھی اور اب مصطفےٰ زیدی کے زمانے میں معاشیات کا سادہ سوال [illegible] اور عزتِ سادات تک خریدنے کی جرأت رکھتی ہے۔

یہ سوچا تھا کہ بڑھتے ہوئے اندھیروں میں — افق کی موج پہ بکھرا ہوا ہلال ہو تم
تصورات میں تم نے کنول جلائے ہیں — وفا کا روپ ہو، احساس کا جمال ہو تم
کسی کا خواب ہیں نکھرا ہوا تبسم ہو — کسی کا پیار سے آیا ہوا خیال ہو تم
مگر یہ آج زمانے نے کر دیا ثابت — معاشیات کا سیدھا سا اک سوال ہو تم

اک جنسِ عشق تھا سو غرض مانگ مانگ کر — رسوا اسے بھی کر گئی سوداگروں کی ذات

چلے بہ جیب دریدہ بہ دامنِ صد چاک — کہ جیسے جنسِ دل و جاں گنوا کے آئے ہیں
تمام نقدِ سیادت لٹا کے آئے ہیں
بہت سے آئے ہیں تیری گلی میں لیکن میں — متاعِ عزتِ سادات لے کے آیا ہوں

مصطفےٰ زیدی نے حسن کی جو دلآویز تصویریں پیش کی ہیں ان میں نسوانی مزاج کے رنگ الگ الگ پرکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں وہ لڑکی بھی ہے،

جس کی ہر ہر ادا تھی کالج میں — زندگانی کے خواب کی تعبیر
جس کے تیور میں بے رخی کی ادا — جس کی آنکھوں میں التفات کے تیر
شعلگی جیسے جوش کے اشعار — سادگی جس طرح تغزلِ میر

اور وہ صورت غماز بھی جس کے تغافل میں ترغیب موجود ہے۔

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت — کہ مشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے
اے مرے دل کے دھڑکنے سے بتانے [illegible] — تیری صورت تیری غماز بنی جاتی ہے

اور وہ عورت بھی جو لہو کی شکست اقدام پر قہقہہ لگاتی ہے تو زرد کوبہ ہنسی مزاجِ زیست سے مختلف نظر آنے لگتی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ یہ تیری بے حجاب ہنسی
مزاجِ زیست سے اس درجہ مختلف کیوں ہے

تاہم اس کی انفرادی عطایہ ہے کہ اس نے عشق کے لپکتے ہوئے شعلے کو حسن کے لٹتے ہوئے نظارے پر قربان کر کے اپنی شاعری کو محبوب کی ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت سے متعارف کرایا جس کا جلوہ عام ہے اور جو کسی کا میت نہیں۔

جب بھی کسی حسینہ نے جھٹکے سیاہ بال — کتنے جوان مر گئے انداز دیکھ کر
خواجہ کو بھی دکھا کے ساقِ صاف کی — مرصر نے کتنی بار گرفتار کر لیا

سنا ہے اب کے برس جشنِ عام بھی ہوگا — سنا ہے رات کا کچھ انتظام بھی ہوگا

اے دل اے دل رقص سے آگے کوئی کسی کا میت نہیں — تیری لٹی ہاری آنکھوں میں چھنیں ہیں سنگیت نہیں

ناچ اے لبِ رخسار کے جلتے ہوئے حلقے
اس لمس کی تہذیب و تمدن سے لپٹ کر
اس شاہدۂ زیست کے اقرار سے کٹ کر

دلچسپ بات یہ ہے کہ عورت کا تجارتی چلن اور رسوائی جاننے کے باوجود مصطفیٰ زیدی نے اپنی حسی سطح پر اس حسن کی والہانہ پرستش کی ہے۔ ہر قدم پر دھوکا کھایا ہے لیکن ہر مرتبہ اس لذتِ سوزاں کو حاصل کرنے اور جذبۂ عصیاں کو آسودہ کرنے کے لئے تند و تیز خواہشات کے سمندر کو متلاطم رکھا ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی بیشتر نظموں میں ایک ایسی عورت کا سراپا ابھرتا ہے جو کبھی اس کی دسترس میں تھی اور اب اس سے بہت دور ہے۔ فراق، محرومی اور دوری کا یہ لمحہ زیدی کی شاعری میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس لمحے میں جب یاد انگارہ بن جاتی ہے تو اس کے سینے کے زخم لو دینے لگتے ہیں اور اس کا تخلیقی الاؤ سلگ اٹھتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی درحقیقت محرومیوں کا شاعر ہے۔ لیکن جب اس کی تمناؤں کے بر آنے کی ذرا سی امید بھی ہوتی ہے تو وہ اپنا شبستان پوری وارفتگی سے آراستہ کرتا ہے

تری راہ میں ہم نے کلیاں بکھیری تھیں، تارے سجائے تھے، کیا کچھ کیا تھا
جو برسوں سے چاک و دریدہ چلا آرہا تھا وہ اپنا گریباں سیا تھا
نئے پھول مالی سے منگوائے تھے، بام و در پر نیا رنگ و روغن کیا تھا
کتابیں سلیقے سے رکھ دی تھیں، بوتل ہٹا دی تھی، گھر میں چراغاں کیا تھا

ہر چند استقبال کے اس انداز میں "سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں" کی ہلکی سی گونج سنائی دیتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اختر شیرانی کا محبوب محض سوچا ہوا محبوب ہے۔ اس کی کوئی مرئی حیثیت نہیں۔ لیکن مصطفیٰ زیدی کا محبوب ایک مرئی اور جاندار ہستی ہے۔ اس کے خد و خال کی جاذبیت اور اس کے خال و رخ کی رعنائی تخیل نہیں بلکہ شاعر ان لطافتوں سے اکتسابِ لذت کر چکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب اسے اس لذتِ رفتہ کی یاد آتی ہے تو وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتا

لبوں میں پھولوں کے حاشئے ہیں — اداس کاسے میں انجمیں ہیں
یہ تم ہو، یہ ہونٹ، یہ آنکھیں — مجھے یقیں ہے، مجھے یقیں ہے

[illegible] گیت کی تان — میرے دل میں تیری آواز ابھر آئی ہے
جب بھی بال بکھر جاتے ہیں دیوانوں پر — تیری ہی شکل کتابوں میں نظر آئی ہے

مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا سلگتا ہوا رس — گنگناتے ہوئے عارض کا دہکتا ہوا تل
جھلملاتے ہوئے آویزوں کی مبہم فریاد — سرسراتے ہوئے لمحوں کے دھڑکتے ہوئے دل
آنکھ جھک جاتی ہے جب بند قبا کھلتے ہیں
تجھ میں اٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے

فن کار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی — وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی
اترا تھا جس پہ باب حیا کا ورق ورق — بستر کے ایک ایک شکن کی شریک تھی

فرقت کی اس سوزش نے مصطفیٰ زیدی کو ایک منفی ردعمل سے دوچار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نظر میں مرد و عورت کے آزاد جنسی اختلاط سے بڑھ کر اور کوئی رشتہ اہم نہ رہا۔ اور یہاں وہ اتنا بڑا باغی نظر آتا ہے کہ وہ سماج کی رسمی حیثیت کو قبول نہیں کرتا ۔ معاشرے کی پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتا اور تقدیس کے رشتوں کو بھی حصولِ لذت کا وسیلہ بنا لیتا ہے۔

کیا یہی ہونٹ ہیں جو مرے واسطے — انگبیں تھے مے ناب تھے آگ تھے
کیا یہی جسم ہے جس کے سب زلزلے — میری آغوش میں راگ ہی راگ تھے

ہاں بڑی چیز ہے راہ و رسم جہاں — دوست خاوند بہنیں اور قفس پاسباں
ننگ و ناموس سینے کی چنگاریاں — وہ ترا امتحاں یہ مرا امتحاں

رکھ لیا اپنے رشتوں کا تو نے بھرم — آبگینہ تھا دل ، اس کو بھی سہہ گیا
تو مجھے "بھائی" کہتی رہی اور میں — کیا بتاؤں تجھے دیکھتا رہ گیا

ہر چند یہ ایک معاشرتی خرابی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ہمارے ملک میں جہاں عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط میں پابندیاں حائل ہیں محدود ملاقات کا چور دروازہ یہی ہے جس کی نشاندہی راجہ مہدی علی خاں نے بھی کی ہے

دن کو کہتی ہے جس کو وہ بھائی — رات کو چھپ کے اس سے ملتی ہے

لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو مصطفیٰ زیدی کے ہاں معاملہ ذرا مختلف نظر آتا ہے ۔ وہ جذبات کی عبادت وفورِ شوق سے کرتا ہے اس کے یہاں عاشق اور شاعر دونوں باہم مدغم ہو گئے ہیں اور وہ عیار جو سود و زیاں کا سلیقہ رکھتا ہے غائب ہو گیا ہے ۔ اسی لئے

وہ عشق کے ایوان میں کسی چور دروازے سے داخل ہونے کا قائل نہیں۔ لیکن دوسری طرف اس کی خواہشات کا پھیلاؤ اور کینوس کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ وہ دنیا کے سارے حسن کو اپنی ہی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کی شرکت کسی مقام اور کسی سطح پر بھی قبول نہیں کرتا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب اس کی جانی پہچانی عورت اس کے لیے اجنبی بن جاتی ہے تو وہ اس طوائف صفت عورت کو قبول نہیں کرتا جذباتی تشنج کی اس کیفیت میں وہ کراہتا ہے۔ بلبلاتا ہے اور جب اس صورت حال کو بدل نہیں سکتا تو مصطفیٰ زیدی معصیت تک سے گریز نہیں کرتا۔ بلکہ انتقام پر اتر آتا ہے اور جو اس کی عطا کی ہوئی دولت پر قناعت کرنے کی بجائے شراب کا سہارا تلاش کرنے لگتا ہے۔ شراب — جو حواس کو شدت سے برانگیختہ کرنے کا مجرب ترین نسخہ ہے۔

پہلے تیری محبتیں چن کر — آرزو کے محل سجاتے تھے
بے نیازانہ زیست کرتے تھے — صرف تجھ کو گلے لگاتے تھے

اور اب یا شراب پیتے ہیں — یا فلک کو دعائیں دیتے ہیں
تیرے خاوند کی معیت میں ہم — دور سے تجھ کو دیکھ لیتے ہیں

نگارِ ارضِ نیل کے سنہرے جسم کے گداز سے لپٹ کے ایک ایک آرزو چمک گئی
نگارِ ارضِ نیل کی لٹیں کھلیں تو دور دور تک ہوا مہک گئی
ہوا مہک گئی تو کیا
کہ میں ڈٹال اور سپرٹ کا میہمان تھا

عورت کی اسی طوائفیت نے مصطفیٰ زیدی کے اعتماد کو بری طرح پامال کیا اور فراق کا لمحہ جب بھی آتا اس کا ذہن شکوک اور وسوسوں کی آماجگاہ بن جاتا۔

میں اسپتال کے بستر میں تم سے اتنی دور
یہ سوچتا ہوں کہ ایسی عجیب دنیا میں
نہ جانے آج کے دن کیا نہیں ہوا ہوگا

کسی نے بڑھ کے ستارے قفس کیے ہوں گے
کسی کے ہاتھ میں مہتاب آ گیا ہوگا
جلائی ہوں گی کسی کے نفس نے قندیلیں
کسی کی بزم میں خورشید ناچتا ہوگا

لے مرے دل کے دھڑکنے سے بظاہر غافل — تیری صورت تری غماز بنی جاتی ہے
ہم سفر! جنھیں گرم کیے بیٹھے ہیں — تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

مصطفیٰ عورت کے اس انداز عمل نے اس کے یہاں ایک ایسے فلسفے کو مرتب کیا ہے اس نے خود "فلسفۂ معصیت" کا عنوان دیا ہے مصطفیٰ زیدی کے ہاں ذاتی انکشاف کی بے نہایت رو ملتی ہے۔ اس کا عشق ارضی اور محبت جسمانی ہے۔ اس کے ہاں مصحفی اور فراق کی لمس پسندی کی وافر شدت ملتی ہے۔ اس کی شاعری میں حسن نسبتاً جامد اور غیر منفعل ہے۔ لیکن عشق فعل اور ہمہ وقت برانگیختہ نظر آتا ہے۔ جذبات کا تموج ایک فکری ذہن کے برعکس مضطرب احساسات کا جن میں پلنے کی کیفیت زیادہ مظہر ہے۔ چنانچہ اس کا فلسفۂ معصیت بھی الجھا ہوا نہیں بلکہ اس کا واضح اظہار اس کے ان اشعار میں موجود ہے:

مرے سینے میں گناہوں کی فراوانی ہے — دشت کی دھوپ ہے طوفان کی طغیانی ہے

ہر ایک پور میں کھل جائیں سینکڑوں گرہیں
ہر ایک قطرۂ شبنم میں سوز قلزم ہے
رچی ہوئی ہے بدن میں لہو کی قوس قزح

بس ایک خندۂ بے باک ہی سے کیا ہوگا
لہو کی زحمت اقدام بھی ضروری ہے
ذرا سی جرأت ادراک ہی سے کیا ہوگا
گریز و رجعت و تخریب ہی سہی لیکن
کوئی تڑپ، کوئی حسرت، کوئی مراد تو ہے

چاک پیراہن دل چاک کیا اور نہ سیا — عقل کو دانۂ گندم کے عوض بیچ دیا

لہو کی زحمت اقدام۔ چاک پیراہن دل اور دانۂ گندم وغیرہ ایسے تلازمے ہیں جن سے مصطفیٰ زیدی کے فلسفۂ معصیت کا پورا تفسیر سامنے آجاتی ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ مصطفیٰ زیدی کی شاعری میں جنسی جذبہ اس کی ذات کی آسودگی کا عنوان نہیں۔ بلکہ یہ اس کی زندگی کا ایک ایسا نقطہ ہے جس سے اس کی شخصیت کا اثبات ہوتا ہے۔ عورت اس کی نظر میں ایک ایسا سومنات ہے جس پر ضرب لگانا اور جسے گرانا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ نقدِ سیادت گنوانے اور عقل کو دانۂ گندم کے عوض بیچنے کے بعد بھی اگر اسے شکست ہو جائے تو یہ شکست ایک حسرت، ایک تڑپ میں تبدیل ہو جاتی ہے جو اسے نیے سومنات سر کرنے کے لئے ہمیشہ مائل بہ پیکار رکھتی ہے۔

تری ہنسی سے تو میری شکست ہی بہتر
کہ میری شکست میں تھوڑا سا اعتماد تو ہے

چلے بہ جیب دریدہ، بہ دامنِ صد چاک — کہ جیسے جنسِ دل و جاں گنوا کے آئے ہیں
تمام نقدِ سیادت لٹا کے آئے ہیں

نئے شوالے میں جا کر کسی کے تیشے نے — بہت سے بُت تو گرائے بہت سے بت نہ گرے

دلچسپ بات یہ ہے کہ ماہ و مشتری دسترس میں ہونے کے باوجود نئے بت گرانے کے لئے ہی اس نے مسافرت اختیار کی۔ اور ولیس کا سفر قبول کیا اور قسم قسم کی عورتوں سے شناسائی پیدا کر کے نئے نئے افق فتح کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ اور ہیں جو اجنبی دیار کی ہوس میں تھے
کہ ہم اسی زمیں کی زلفِ نارسا کے بس میں تھے
نہیں تو مہر و ماہ و مشتری بھی دسترس میں تھے

مصطفٰے زیدی کے کاندھوں پر صحرا کا طلسم ہے اور اس کے سینے میں سیلاب کا درد ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیلاب اپنا سارا طغیان صحرا کی ریت میں کھو چکا ہے۔ اس کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ ہے اور آنکھوں میں اترے ہوئے نشے کی شکست۔ اور اب جبکہ جنسِ مخالف کے چراغ کی ضمنی لو تیز تر ہو گئی ہے اس کے اپنے ستاروں پر آنسوؤں کی نمی جم چکی ہے۔

تیرے نزدیک سے کترا کے نکل جاتے ہیں — تیرے ایوانِ لب و فکر کے دربان زیدی
تیرے وجدان کا خورشید کہاں ڈوب گیا — کیا ہوا فلسفۂ عصمتِ عصیاں زیدی
ہائے تو راکھ کی مانند بجھا بیٹھا ہے — شعلہ رخ، شعلہ صفت، شعلہ خراماں زیدی
آگ کے سامنے جس طرح کوئی موم کا بت — دھوپ میں جیسے طلسمات کی پریاں زیدی

نئے شوالے میں جا کر کسی کے تیشے نے — بہت سے بُت تو گرائے بہت سے بت نہ گرے

میرے چہرے کو مت دیکھو
اس میں کوئی وعدۂ فردا، اس میں کوئی آنچ نہ کل آئے
اب اس دریا تک مت آؤ جس کی لہریں ٹوٹ چکی ہیں
اس سینے سے لو نہ لگاؤ۔ جس کی نبضیں چھوٹ چکی ہیں

[illegible] منزل میں روایات خضر	آج بیمار ہے صدیوں کا مسیحا ہوشے
[illegible] کرسے میں اتر آئی ہے	تابشیٔ زمزمہ و حدت صہبا ہوشے

[illegible] مصطفےٰ زیدی کا عشق خالصتاً ارضی ہے چنانچہ اس کی دوسری جہت وطن کی محبت ہے۔ ذرا غور سے دیکھیں [illegible] نظروں میں وطن کی سرزمین بھی عورت ہی کا استعارہ ہے۔ مصطفےٰ زیدی کے شعروں میں فطرت بھی عورت کے روپ میں [illegible] ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے جمال کا پرتو دکھانے کے لئے وہ تمام آرائشی وسیلے استعمال میں لاتا ہے جن سے عورت کے حسن میں کشش پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کی نظم "بیل کا سل پر ایک شام" کے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں :

فضا نے آنکھوں میں کاجل سے نقش کی تحریر
شفق نے کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالیں
سرود سحر و طلسمات کے جزیرے میں
نگارِ ساحلِ مغرب کہاں سنور کے چلی

مصطفےٰ زیدی کو وطن سے فرقت کا لمحہ بھی اسی طرح گراں ہے جس طرح اپنی محبوبہ کے بدن سے محرومی کا لمحہ۔ چنانچہ یہ لمحہ جب بھی اس پر آتا ہے تو اس کے دل و جان پر ایک قیامت گزر جاتی ہے۔ بے شک اس لمحے میں اس کا پہلو زہرہ وشوں اور لالہ رخوں اور [illegible] بدنوں سے آباد ہے۔ اس کا جسم لمسِ لطیف کے استلذاذ سے بہرہ افروز ہے اور اسے ازل سے تا بہ ابد ایک ہی مدت کا احساس ہو رہا ہے لیکن جب وہ وطن کی سرزمین کی طرف لوٹتا ہے تو اس کے پیکر میں وطن کے ایک ایک ذرے سے لپٹنے کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں گناہ کردہ آلودگی نظر نہیں آتی جس پر زیدی نے تفاخر کیا ہے بلکہ یہاں اس کے لہجے میں عقیدت مندی اور انکسار کی جھلکیاں زیادہ نمایاں ہیں :

میرے وطن تری خدمت میں لے کے آیا ہوں
جگہ جگہ کے طلسمات، دیس دیس کے رنگ
پرانے ذہن کی راکھ اور نئے دلوں کی امنگ
سنبھال میرا یہ ہدیۂ غم ادراک
جو مجھ کو سات سمندر کا زہر پی کے ملا
ثقافتوں کے ہر آتش فشاں میں جی کے ملا

درحقیقت یہاں وطن اس عظیم ماں کی علامت ہے جس کی آغوشِ رحمت کی طرف مصطفےٰ زیدی نے بڑے عرصے کے بعد مراجعت کی ہے۔ اور جس کے سینے سے لگ کر اس نے اپنی محرومیوں، نارسائیوں اور پریشانیوں کی زہرہ گداز داستان سسک سسک کر سنائی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مصطفےٰ زیدی کے عشق کا ایک اہم زاویہ وطن کے حوالے سے ماں کی محبت ہے اور اس میں تقدیس اور خود سپردگی کی پوری کیفیت موجود ہے۔

مصطفےٰ زیدی کے عشق کے اس دوسرے زاویے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس کے ہاں حسیت اور تقدیس

دونوں کا گہرا امتزاج موجود ہے۔ ہر چند اس نے تقدیس کے برعکس معصیت کو خود انکشافی کے لئے زیادہ استعمال کیا [illegible] بات یہ ہے کہ ان دونوں زاویوں کے اظہار کے لئے اس کی شاعری میں مرکزیت عورت ہی کو حاصل ہے۔ [illegible] نظموں میں سوسائٹی گرل اور وطن کے علاوہ عورت کا ایک تیسرا روپ بھی ابھرتا ہے اور یہ گھریلو عورت ہے جس کے حسن [illegible] زیدی اگر شدت سے نہیں تو کم از کم جذباتی حد تک ضرور مبتلا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مصطفیٰ زیدی محبوبہ کی آگ [illegible] لئے سوسائٹی گرل کے ساقِ سیمیں پر کوثر کا لہو بھی توڑ ڈالتا ہے جب پاکیزگی اور پوترتا کی ایک مثالی صورت دیکھتا [illegible] بدنامیوں کو ندامتوں کے کاسے میں ڈال کر اس کے حضور میں پیش کر دیتا ہے۔ اس اچھوتی عورت کی تصویر زیدی نے یوں [illegible]

تری مقدس جبیں پہ میں نے
سحر کی پہلی کرن کو دیکھا
ترے لبوں کی حلاوتوں میں
سپردگی کی لگن کو دیکھا
لطیف مانوس سادگی میں
رچے ہوئے بانکپن کو دیکھا

اسی بیاہتا گھریلو عورت کا ایک خوب صورت نقش اس کی نظم "پردیسی" میں بھی ملتا ہے۔

سات سمندر پار سے گوری آئی پیا کے دیس
روپ بدیسی۔ لیکن جیون پورب کا سندیس
لمبی لمبی پلکیں جن میں تلواروں کی کاٹ
نیلی نیلی آنکھیں جیسے جمنا جی کے پاٹ
انکھڑیاں یا ٹھنڈے ٹھنڈے دریاؤں میں سیپ
روشن روشن چہرہ جیسے دیوالی کا دیپ
ٹوٹی پھوٹی اردو، جس کے الٹے سیدھے بھیس
آئی پیا کے دیس

محبوب کے اس تیسرے زاویے میں مصطفیٰ زیدی نے بیوی کا روپ پیش کیا ہے جو مرد کے دکھ سکھ کی شریک ہوتی ہے اور راحت و ذہنی سکون مہیا کر کے اس کی زندگی کو تحرک اور دوام بخشتی ہے۔

عورت کے ان تین زاویوں سے جو مرکزی تصویر بنتی ہے، اس راجہ اندر کا نام مصطفیٰ زیدی ہے۔ لیکن مصطفیٰ زیدی کے حوالے سے عورت کا جو روپ زیادہ واضح صورت میں سامنے آتا ہے اس کا عنوان "کوہِ ندا" ہے۔ یوں بھی معاشرے میں طوائف کو اسی لئے قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے کہ جو اس کے چنگل میں ایک دفعہ پھنس جاتا ہے پھر نکلنے کی راہ نہیں پاتا۔ اور ذہنی، اقتصادی جسمانی غرض ہر قسم کا بلیدان دینے کے باوجود بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کوہِ ندا مصطفیٰ زیدی کی شاعری میں "طوائف صفت" عورت کا ہی استعارہ ہے۔ یہ کوہِ ندا جب بھی پکارتا مصطفیٰ زیدی پورے خروش جذبات سے اس کی [illegible]

ہر مرتبہ ایک [illegible] چوٹی کو سر کر کے ایک دفعہ دیکھا پھر دیکھنے کی حسرت لے کر لوٹ آتا۔ آخر کار اسے احساس ہو گیا کہ

دیر سے نیند کی ترسی ہوئی آنکھوں کے لئے
خواب آوردنشۂ عارض و مژگاں کب تک
کتنے دن اور پکارے گی تمہیں جسم کی پیاس
نغمہ و غمزہ و انداز و ادا کی جانب (کوہِ ندا)

لیکن جب کوہِ ندا کی جانب سے ایک آخری آواز آئی تو وہ اس بلاوے کو بھی رد نہ کر سکا اور چلّا اٹھا۔

ایہا الناس چلو کوہِ ندا کی جانب

اور پھر ایسا گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ کوہِ ندا سے آج تک کون لوٹ کر آیا ہے —

یوسف ناظم

اِستفسار

مانا کہ تم کو دخل ہے علمِ نجوم میں
تسلیم یہ کہ ماہرِ علمِ جفر بھی ہو
جوتش کے فن سے تم کو شغف بھی ہے بے پناہ
چہروں میں جھانکتے ہو قیافہ شناس ہو
کیا ہوگا کل کے دن یہ بتانے میں طاق ہو
تم کو خبر ہے کیا ہے بُرا کیا مفید ہے
تم کو پتا ہے کون سی ساعت سعید ہے
دل میں چھپا ہے لوگوں کے کیا جانتے ہو تم
کس سمت میں چلے گی ہوا جانتے ہو تم

ہم تم سے پوچھتے ہیں بتاؤ ہمیں یہ راز
یہ سبز باغ کس طرح اتنے ہرے ہوئے
کھوٹے تھے جتنے سکّے وہ کیسے کھرے ہوئے

کیسے لہو سفید ہوا، دل ہوئے سیاہ
کیسے جزائے خیر کے لائق ہوئے گناہ
کیسے ہُنر کے عیب کو درجہ ملا یہاں
کس طرح تیر پہنچے ہیں ہم تک بنا کماں

یہ سب سوال ایسے ہیں کچھ کہہ نہ پاؤگے
کہہ بھی دیا تو یاد رکھو مُنہ کی کھاؤگے

ڈاکٹر ظہورالدین

سنسکرت میں رسوں کا بیان

سنسکرت زبان و ادب کے ابتدائی ایام سے ہی یہ تصور ادیبوں اور شاعروں کے اذہان پر چھایا رہا ہے کہ شاعری اور ادب کا بنیادی مقصد در اصل انسان کی ترجمانی کرنا ہے آدمی کی ترجمانی کا مفہوم اُن کی نظر میں ہمیشہ انسان کی داخلی شخصیت کی مکمل ترجمانی و عکاسی رہا ہے۔ یہ اسی رجحان کا نتیجہ ہے کہ سنسکرت کے قدیم ادیبوں نے انسانی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کئے۔ انسانی شخصیت کی اساس چونکہ جذبات پر کھڑی ہے اس لئے سنسکرت کے قدیم ادیبوں نے ان جذبات کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی جو انسانی شخصیت کے شیش محل کے لئے اینٹ اور گارے کا کام دیتے ہیں۔ اس طرح جذبات کی وہ گروہ بندی وجود میں آئی جسے آج رسوں کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

رس کا اُردو ترجمہ جذبہ ہے۔

سنسکرت تنقید کا سارا کارگہ رسوں کے تانے بانے پر ہی پھیلا ہوا ہے۔ سنسکرت ادب کے قدیم نقاد انسانی جذبوں کو سامنے رکھ کر ادب کی قدر و قیمت کا تعین عمل میں لاتے رہے۔ جذبہ بے شک فنون لطیفہ کی بنیادی شرط یا قدر ہے۔ لیکن محض اس کا سہارا لے کر کوئی نقاد ادب کے بحر ذخار کو پار نہیں کرسکتا۔ سنسکرت کے نقاد جسے شہتیر سمجھے رہے وہ در اصل محض ایک تنکا تھا۔ اور ان کا انجام وہی ہوا، جو تنکوں کا سہارا لینے والوں کا مقدر ہے۔

سنسکرت کے قدیم نقاد انسان کو نو بنیادی جذبوں کا مرکب قرار دیتے ہیں۔ یہی جذبے اس کو روزمرہ زندگی میں کبھی ایک صورت اور کبھی دوسری اختیار کرکے اشیاء سے متعلق اس کے ردعمل اور رویہ کو تشکیل دیتے ہیں سنسکرت کے قدیم ادیب انھیں انسانی جذبوں کو الفاظ و عمل کے روپ میں پیش کرنا اپنا مدعا و مقصد سمجھتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ ان جذبات سے وابستہ مختلف نفسیاتی حالتوں کی ہو بہو عکاسی کرنا ہی شاعری اور ادب کا بنیادی مقصد ہے۔ اور جو ادیب ان مقاصد سے زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہے وہ ادب کے میدان میں اتنا ہی اعلیٰ اور برتر مقام حاصل کرتا ہے۔ سنسکرت کا قدیم نقاد ممت (MAMAT) کاویہ پرکاش میں[1] اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"شاعر کا کلام نہ صرف اعلیٰ ہوتا ہے بلکہ وہ تمام کائنات کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ فطرت کے قوانین اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ وہ اُن سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کا مقصد صرف حظ کی ترسیل کو ممکن بنانا ہے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے کسی شے کا سہارا نہیں لیتا بلکہ نو انسانی جذبوں (رسوں) کو پیش کرنے میں ہی خوشی محسوس کرتا ہے۔"

رسوں سے متعلق ابھینو گپتا کے فلسفہ کو تقریباً تیرہ سبھی

ادیبوں نے قبول کیا ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ بعد کے یہ شعرا ابھینو گپتا کی طرح محض رسوں کو ہی شاعری کی روح قرار نہیں دیتے وہ اسے شاعری کی مختلف ضروری شرطوں میں سے ایک شرط کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

جذبات کی ان مختلف کیفیتوں سے ہم کنار ہونے کا انحصار صرف شاعروں یا فن پاروں پر ہی نہیں بلکہ ناظرین کے ذاتی اور داخلی میلانات و رجحانات پر بھی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ان کی تاثیر کا دار و مدار ناظرین کی شخصی خصوصیات پر زیادہ ہے۔ ایک شخص کسی فن پارہ کے مطالعہ کے بعد کس قدر متاثر ہوتا ہے اور متاثر ہونے کے بعد اس کے باطن میں کوئی جذبہ کس حد تک بیدار ہوتا ہے اس کا دار و مدار شخصی خصوصیات پر زیادہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایک جذبہ کی مناسب ترسیل کے لئے شاعر اور قاری دونوں کے مابین نفسیاتی ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس کا انحصار اسی ہم آہنگی پر ہے۔ صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ کوئی شاعر کسی جذبے کا بہترین اظہار عمل میں لائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قاری کے پاس متذکرہ جذبہ سے مناسب تاثر حاصل کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔

رسوں کا بنیادی تعلق ڈرامہ اور رزمیہ نظم سے ہے کیونکہ ان میں ان جذبات کو پیش کرنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ تاہم دوسری اصناف میں ان کے بیان و اظہار پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

رسوں کی تعداد سے متعلق بھی گو مختلف ادیبوں نے مختلف خیالات پیش کئے ہیں۔ تاہم ان میں سے اکثر بنیادی رسوں کی تعداد نو ہی بتاتے ہیں۔ وشوا ناتھ کرونڑ، ادبھوت، ویر، ہاسیہ، بھیانک، شرنگار، رودر اور پرن کے ساتھ ساتھ سنت اور وت سلیہ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جبکہ ممت کا دیہ پرکاش میں جن نو رسوں کا ذکر کرتا ہے وہ ادبھوت، شرنگار، رودر، کرونڑ، ویر، بھیانک، ہاسیہ، وی بھتس اور سنت رس ہیں۔ یہ بھی جذبے انسانی شخصیت کا لاینفک حصہ ہیں۔ سنسکرت شعرا ادیبوں نے انھیں جذبوں کے اظہار کو اپنا شعار بنایا۔

ادبھوت رس جذبۂ حیرانگی ہے۔ اس کی غالب کیفیت مزاج حالت حیرانگی (VISMAYA) کے نام منسوب کی جاتی ہے۔ اس جذبے کی تحریک ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کوئی ایسی شئے ہمارے سامنے آئے جو تحیر آمیز یعنی کوئی ایسی شئے جو ہمیں حیران و ششدر کر دے۔ اس جذبے کا خارجی اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً ہماری آنکھیں پھیل جاتی ہیں۔ ہم بنا پلکیں جھپکائے کسی شئے کو گھورتے ہیں۔ انگلیاں مروڑنا اور گنگ رہ جانا بھی اسی کے تاثرات میں شمار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی وجہ سے ہماری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور ہمیں اپنی آواز گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈرامہ میں اگر اسٹیج پر اس جذبے کو عملی طور پر پیش کرنا مطلوب ہو تو کردار کو ان تمام کیفیاتی حالتوں کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

سنسکرت کے کچھ نقاد اسے عام انسانی جذبوں میں نہ صرف اہم تصور کرتے ہیں بلکہ وہ اسے سبھی دوسرے جذبوں (رسوں) کی بنیاد بھی قرار دیتے ہیں۔ رام چندر اور گن چندر ادبھوت رس سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ناٹکوں اور روپکوں کا اختتام ہمیشہ اسی رس پر ہونا چاہئے یعنی ڈرامے کے آخر میں کوئی ایسا معرکہ ضرور سر کیا جانا چاہئے جو ناممکن ہو۔ اگر ڈرامہ نگار اپنے ڈرامے کا انجام یوں نہیں کرتا تو ڈرامہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

دھرم دت ہر رس میں ادبھوت رس کی موجودگی کا انکشاف کرتا ہے جبکہ نارائن محض ادبھوت رس کو ہی واحد حقیقی رس قرار دیتا ہے۔

سنت رس کا تعلق اخلاق سے ہے۔ یہ جذبہ انسان کو بااخلاق اور مہذب بناتا ہے۔ یہ NIRVIDA یا SAMAS سے ظہور پاتا ہے۔ سکون اور احساس طمانیت اس کا بنیادی عنصر یا ستھائی بھاؤ ہے۔ اپنشد کا مطالعہ ریاضت گاہوں کا دورہ اور روشن ضمیر و غیب داں اصحاب سے بات چیت ہمارے وجود میں اس جذبے کو بیدار کرتی ہے۔ نفسانی خواہشات میں دلچسپی نہ لینا، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرنا، تفکر اور عمل میں ثابت قدمی اس جذبے کے "ANUBHA VAS" ہیں۔

دیتی کال کا مشہور نقاد کل پتی اس جذبے سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سنت رس کو ڈرامے کی بجائے نظم میں پیش کرنا چاہئے کیونکہ ڈرامہ میں مختلف واقعات کی موجودگی اتنا قوی تاثر پیدا نہیں کر پاتی جتنا کہ شاعری یا نظم میں ممکن ہے۔ یہاں موضوع کی وحدت تاثر کو چوگنا کر دیتی ہے۔

کچھ دوسرے نقاد ایسے بھی ہیں جو اس رس کو شاعری کا موضوع بنانے سے احتراز کرتے ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق ایسا کرنے سے شاعری، شاعری نہیں بلکہ محض اخلاقی درس بن کر رہ جاتی ہے۔

بھٹ پربھاکر کی طرح کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ اس جذبہ کو درست طریقہ سے صرف SRAVYA KAVYAS میں نہ کہ ڈرامہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جگن ناتھ اور بعد کے دوسرے نقاد اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ رس کسی بھی صنف ادب میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس دلیل کو اکثر تسلیم کیا گیا ہے۔

بہر حال ان تمام متضاد نظریات کے باوجود اسے شاعری اور ڈرامہ دونوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔

پرین رس کا مرکزی عنصر سنہ ہے۔ یہ دو دلوں کے مابین معصوم جذبۂ محبت یا الفت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس رس کو سب سے پہلے رود ررت اور پھر بھوج راج نے دریافت کیا۔ یہ جذبہ اکثر انھیں لوگوں کے اندر بیدار ہوتا ہے جو اعلیٰ فطرت کے مالک ہوتے ہیں۔ ڈرامہ میں اسٹیج پر اس جذبہ کو پیش کرنے والے کردار کی آنکھیں متعلقہ شخص کو دیکھ کر (جس سے متعلق یہ جذبہ بیدار ہو) نم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اسی کانپتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے جن میں خوشی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

پرین رس سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے رود ررت کہتا ہے کہ دو دوستوں کے مابین معصوم رشتۂ محبت کو ہی پرین رس قرار دینا چاہئے جبکہ بھوج راج اس کے دائرہ کو مزید وسیع کرتے ہوئے کہتا ہے کہ صرف دو دوستوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ عاشق اور معشوق کے مابین بھی یہ معصوم رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ عاشق اور معشوق کا مفہوم بھوج راج کے ذہن میں عورت اور مرد کے مابین موجود رشتۂ محبت سے ہے۔

"سنہ" کے علاوہ "رتی" اور "پرتی" کو بھی پرین رس کے بنیادی عناصر میں شمار کیا جاتا ہے۔ "رتی" کا مفہوم اس جذبے سے ہے جو اکثر ہمارے باطن میں اس وقت بیدار ہوتا ہے جب ہم کسی من پسند شئے کو اپنے سامنے پاتے ہیں۔ "پرتی" لذت، ذائقہ اور مشغلہ کا ہم معنی ہے یعنی پرتی وہ جذبہ ہے جو ہمارے اندر اس وقت کروٹ لیتا ہے جب ہم کسی من پسند مشغلہ، ذائقہ یا لذت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ ہمارے سبھی ذاتی مشغلے ہمیں پرتی سے ہم کنار کرتے ہیں۔

شرنگار رس کا تعلق عشق سے ہے اور اس کا بنیادی عنصر احساس جمال ہے۔ اس رس کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ عورت اور مرد کے مابین اس رشتۂ محبت سے

...ے جواز ازدواجی زندگی سے محظوظ ہونے کے لئے
... درمیان قائم ہوتا ہے۔ اس جذبے کو بیدار کرنے کی
...ت داخلی اور خارجی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ داخلی وجوہ
...بوبہ کی نازک مزاجی، نفاست پسندی، خیال کی بلندی
...پاکیزگی، صبر، برداشت کا مادہ، احسان مندی، رویہ کی
...، خدا پرستی، تقویٰ اور عالی ظرفی وغیرہ ہیں۔ بول چال
...وبیوں میں، اظہار کی مٹھاس، ترنم آواز اور بولنے کا
...ش انداز شامل ہیں۔ خارجی خصوصیات جنس کے مطابق
...تلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک مرد کو پرکشش بنانے والی
...صوصیات بذیل ہیں:

خوب صورت نقش، متناسب جسم، قبول صورتی
...درا رنگ، عالی نسب اور جوانی۔

عورتوں کے لئے مندرجہ ذیل خارجی خصوصیات ضروری
...ہیں:۔

عمر، روپ، چہرہ مہرہ، حسن، دلکشی، دلآویزی
...موہ لینے کی قوت، مٹھاس اور نزاکت وغیرہ۔

بھارت اس دنیا کی ہر مقدس، پاک یا قابل دید
شئے کو شرنگار کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ رودرت
(RODART) اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ
جو تلذذ شرنگار رس پیدا کرتا ہے وہ کوئی دوسرا رس پیدا
نہیں کر سکتا۔ یہ جذبہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور اس
کے بغیر شاعری کثیر درجہ تک ہی محدود رہتی ہے۔

بھوج راج تو شرنگار کو ہی صرف رس کا نام
دیتا ہے۔ دوسرے رس اس کے خیال کے مطابق شرنگار کے
مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ شرنگار رس کو
خودی اور انا کے مترادف قرار دیتا ہے۔

کرونا رس دکھ کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ جذبہ کسی
[illegible]

ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی حل نہ ہونے والی شکل میں بگڑ جانے کی
وجہ سے بھی ہم اس جذبہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ مرنے والے
کی خوبیوں کا بیان، اس کی باتوں کا ذکر، اس کے استعمال
میں رہی اشیاء کا نظارہ، اس کے گھر جانے یا ایسے مواقع
جہاں اس کی غیر حاضری کو محسوس کیا جائے مثلاً اس کی سالانہ
تقریبات وغیرہ اس جذبہ کو پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔
آنسو بہانا، چیخنا چلانا، اور آواز کا گھٹ جانا اس جذبہ
کے ضروری نتائج (ANUBHAVAS) ہیں۔ بایں
غشی، غم زدگی، بے چینی، پریشانی، روکھا پن، مدہوشی،
اس کے ذیلی یا ضمنی احساسات ہیں۔ پیلاہٹ، کپکپی، آواز
کا تبدیل اور مدہوشی اس کی وہ جسمانی حالتیں ہیں جو دکھ
اٹھانے والے شخص پر طاری ہوتی ہیں۔

"رودر" رس کا استھائی بھاؤ (بنیادی عنصر)
کرودھ یا غصہ ہے۔ اس قسم کے جذبہ سے دوچار ہونے کی
وجہ اکثر کوئی ایسا شخص (ALAMBANA) ہوتا ہے
جس نے اپنے کسی عمل کی وجہ سے تکلیف پہنچائی ہو۔ جس نے
کوئی ایسا نامناسب کام کیا ہو جس سے دل میں غصہ کا ایک
طوفان کھولنے لگے۔ اس کا کوئی جارحانہ عمل، تکبر، گستاخی
اس جذبے کو ابھارنے (UDDIPANA) کا کام
کرتے ہیں۔

اس کا استعمال بھی زیادہ تر ڈرامہ میں ہی ہوتا ہے
اس جذبہ کو اسٹیج پر پیش کرنے والا کردار ہتھیار اٹھا لیتا
ہے۔ اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ
سکڑ بھی جاتی ہیں۔ دانت کچکچانے لگتے ہیں، آواز میں بھی
گرج پیدا ہو جاتی ہے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار
ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے مدمقابل کو طرح طرح کی دھمکیاں
دینے لگتا ہے۔ جیسے وہ لڑنے کے لئے تیار ہو۔ یہ سب اس
کے استھائی بھاؤ ہیں۔

ویر رس کا بنیادی عنصر اتسا ہ یعنی حوصلہ ہے۔ اس رس کے تحت بہادری اور جوش و حوصلہ ایسی خصوصیات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس جوش و حوصلہ کا مظاہرہ اکثر تحفہ (DANA) دیتے وقت یا رحم (DAYA) کا مظاہرہ کرتے وقت یا دشمن سے لڑائی (YUDDHA) کرتے وقت یا اپنا فرض (DHARMA) نبھاتے وقت کیا جاتا ہے۔ یہی چار قسم کے جذبات ڈرامہ میں چار قسم کے کرداروں کو پیدا کرتے ہیں۔ ان چاروں کو سنسکرت میں DANA VIRA, DAYAVIRA, YUDDHAVIRA اور DHARMAVIRA کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی رودر رس کی طرح غصہ پایا جاتا ہے لیکن یہاں غصہ، حوصلہ اور ولولہ کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ جبکہ رودر رس میں غصہ حیوانی نوعیت رکھتا ہے رودر رس کے تحت غصہ طاری ہونے پر انسان اپنا ذہنی توازن کھو دیتا ہے جبکہ ویر رس کے تحت غصہ طاری ہونے پر انسان کا ذہنی توازن قائم رہتا ہے۔ رودر رس والے غصے کی صورت میں کردار ردعمل کا شکار ہو جاتا ہے، جبکہ ویر رس میں ایسا نہیں ہوتا۔

ہاسیہ رس کا تعلق ہنسنے ہنسانے یا مزاح پیدا کرنے سے ہے۔ اس کا مقصد ہمیشہ تفریح کے زیادہ سے زیادہ سامان پیدا کرنا ہوتا ہے۔ بھارت نے شرنگار کو ہاسیہ رس کا ہی ایک حصہ بتایا ہے۔

وبھاتسا یا وبھتس رس مایوسی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے بھارت کہتا ہے کہ یہ مایوسی سے تعلق رکھنے والے جذبات کو ابھارتا ہے ایسے حالات میں ہم مایوسی پیدا کرنے والی شئے کو ایک بار دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دوبارہ اُسے دیکھنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ ممت (MAMAT) کے کہنے کے وبھتس رس کے دوران ہمارا من پھیلتا ہے۔ وامن (VAMANA) اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ چونکہ اشیاء کو دیکھ کر ہم مایوس ہو جاتے ہیں اس لئے انھیں ترک کر دینے کی خواہش بڑی شدت سے ہمارے اندر نمودار ہوتی ہے۔ ممت وبھتس کی وضاحت ایک مثال کی مدد سے یوں کرتا ہے:

> "مُردے کے جسم پر سے کھال اتارنے، کندھوں کو ٹھوس اور کمر پر سے گوشت کھانے کے بعد جب کوئی بھوکا دیو اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے اپنے دانتوں کی نمائش کرنے کے بعد ہڈیوں پر بچا کچا گوشت پھر سے کھانے لگتا ہے تو اُسے دیکھ کر ہمارے باطن میں وبھتس [illegible] بنتا ہے۔"

بھیانک کا تعلق خوف و ہراس سے ہے۔ ممت اس کی وضاحت بھاگتے ہوئے اس ہرن کی مثال دے کر کرتا ہے جو اپنے تعاقب میں آتے ہوئے شکاریوں کو دیکھ کر پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے بار بار مڑ کر دیکھتا ہے خوف کی وجہ سے اس کی پچھلی ٹانگیں اگلی ٹانگوں میں گھستی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنسکرت کے نقاد جب وبھتس اور بھیانک رسوں کو مایوسی اور خوف و ہراس سے منسوب کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کس قسم کی مایوسی اور خوف و ہراس سے ہوتا ہے۔

جدید نقادوں نے جذبات کی چند مزید کیفیتوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ بہت حد تک بنیادی نو رسوں سے ہی تعلق رکھتی ہیں یا یوں کہیے کہ وہ بنیادی نو رسوں کی ہی ذیلی کیفیتیں ہیں۔ سنسکرت تنقید میں بنیادی رسوں کی تقسیم کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔

———

حق اعظمی

ری لے لن

———— مجھے یوں چکانا پڑا قرض اپنا
کہ جب دائرے، چوڑی صدیوں کے سمٹے،
تو مجھ کو جڑیں اپنی
اپنی جگہ سے اٹھا کر وہاں نصب کرنا پڑی تھیں جہاں پانیوں کی ولایت کی بنیاد ڈالی گئی تھی
ہواؤں کے دامن پہ تحریر تھی ہر کہانی
ستاروں کی تفریق کا صرف حاصل
دھوئیں
لوہے
کاغذ کے مٹیلے پھیلے سمندر ، رتوں کے اشاروں پہ ٹھہرے
کشادہ ، نگہدار لمحے
تسلسل پہ سیل رواں کے تسلط
اسی سے یہ پیہم پنپتی چلی جا رہی ہیں
کہ اب ان کو
مٹی سے رغبت نہیں ہے

————

مسعود مفتی

نقارہ

جب اس نے دیکھا کہ ایک عورت بھی اُسی کی طرف دیکھ رہی ہے تو اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

وہ جنگی قیدی تھا اور سب لوگ اُسے تماشے کی طرح دیکھ رہے تھے۔ اس سے اُسے خفت بھی ہو رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ کبھی کبھی تن بھی جاتا کہ میں ملک کی خاطر گرفتار ہوا ہوں۔ خفت کیسی۔ یہ تو فخر کی بات ہے۔ مگر اگلے لمحے اسے خیال آتا کہ ہوں تو شکست خوردہ۔ اور اسے اپنے پر ندامت ہونے لگتی۔ کبھی خفت، کبھی فخر اور کبھی ندامت کے متضاد جذبوں میں لوٹ پوٹ ہوتا۔ وہ لوگوں کی نظروں کا مقابلہ کرتا رہا مگر اس عورت کی طرف نہ دیکھ سکا۔

وہ بنیادی طور پر ایک حساس فرد تھا۔ مگر جب سے ہندوستان کی قید میں تھا۔ بہت ہی حساس ہو گیا تھا۔ چھپے ہوئے زخم کی طرح جو ہوا کے تیز جھونکے کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ لوگوں کی آنکھوں میں اب وہ کچھ دیکھ لیتا تھا جو پہلے نہ دیکھ سکتا تھا۔ پہلے آنکھوں میں صرف نظر ہوتی تھی اب اسی نظر میں اُسے معنی بھی صاف ظاہر ہونے لگے۔ کیونکہ اُس کی مجروح حیات نے اسے خود نئی نظر عطا کر دی تھی۔ اب وہ ہندوستانیوں کے تبسم کے پیچھے چھپی ہوئی نفرت دیکھ سکتا تھا۔ اپنے کیمپ کے پاس سے گزرنے والوں کی آنکھوں میں استہزا اور حقارت دیکھ سکتا تھا۔ کسی ایک آدھ آنکھ میں ترس کی ڈھکی چھپی رمق ڈھونڈ لیتا تھا۔ خاردار تاروں کے پیچھے گھومنے والے شہریوں کی آنکھوں میں بے رحمی کے مختلف مدارج محسوس کر سکتا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی آنکھوں میں ان کے مختلف موڈ پڑھ لیتا تھا کہ وہ اس وقت مایوس ہیں۔ خوش ہیں۔ سُتے ہوئے ہیں۔ اندر سے بکھرے ہوئے اور پریشان ہیں یا پُر امید ہیں۔ لوگوں کی آنکھیں اس کے لئے ایک آئینہ تھیں۔ جس میں ان کی پوری ذات اور اس ذات کا سارا موڈ جھلکتا نظر آتا تھا۔

اس نے اس دفعہ نگاہ اُٹھائی تو پھر اُس کی اپنی آنکھیں جھک گئیں اور وہ سوچنے لگا کہ اس عورت کی نظر میں کیا ہے وہ دوسرے لوگوں کی طرح خالی خولی تماشائی کی آنکھ نہ تھی اُس میں ہندوستانیوں والی حقارت بھی نہ تھی لیکن وہ اور بھی کچھ نہ تھا۔ کیا تھا؟ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا۔

وہ ملٹری اسپتال کے کانوں والے آؤٹ ڈور وارڈ میں ایک بنچ پر تھا۔ کمرہ میں اور بھی بہت سے لوگ تھے مگر وہ سب ہندوستانی تھے۔ اور یہ اکیلا پاکستانی جنگی قیدی ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کے بالکل پاس ایک انڈین فوجی سنتری سنگین والی بندوق اُٹھائے کھڑا تھا۔ کمرے کے دروازے کے باہر باقی گارڈ والے بھی بندوقیں مع سنگینوں کے اٹھائے کھڑے۔ چار آدمیوں کی یہ گارڈ اسے اور ایک اور قیدی کو ہسپتال میں لائی تھی۔ دوسرا قیدی دوسرے وارڈ میں گیا ہوا تھا۔

قید میں ڈیڑھ برس گزارنے کے بعد آج وہ پہلی دفعہ کیمپ سے باہر لایا گیا تھا۔ یہ کیمپ عام اصطلاح میں کیج (CAGE) یعنی پنجرہ

کیا گیا تھا اور بارکوں کے ارد گرد خاردار تاروں کے تین سلسلے [illegible] کر بنایا گیا تھا۔ یہ ڈیڑھ برس وہ تاروں کے اندر سے باہر کی طرف دیکھتا رہا تھا اور اس طرح دیکھنے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اس کی نظر ٹرک اور اپنے درمیان تاروں کے وجود کو محسوس نہ کرتی تھی۔ مگر جب بند گاڑی میں سوار کرانے کے لیے اسے گیٹ سے باہر لایا گیا تو اس نے پہلی دفعہ اپنے کیمپ کو باہر سے دیکھا۔ وہ تاروں کے پہلے سلسلے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے بعد ٹرک تھی جس پر مسلح سنتری گشت کر رہے تھے۔ پھر تاروں کا دوسرا سلسلہ تھا۔ پھر ایک اور ٹرک اور سنتری۔ پھر تاروں کا تیسرا سلسلہ اس کے پیچھے بارکیں اور بارکوں میں گھومتے ہوئے پاکستانی جنگی قیدی مگر بارکیں اور قیدی تو مبہم سا پس منظر بناتے تھے۔ اصل نظارہ ان تاروں کا تھا جو پورے منظر میں کسی عظیم الجثہ خوفناک کنکھجورے کی طرح اپنے کانٹے بکھیر رہی تھی اور ان کے درمیان ہندوستانی فوجی سنتری رائفلیں اور شین گنیں اٹھائے، بھاری بھاری بوٹ پہنے ٹہل رہے تھے۔ اُسے یہ نظارہ بہت ہی بھیانک لگا۔ اور چڑیا گھر کے وہ مناظر یاد آئے جب وہ بچپن میں پنجروں کے باہر کھڑا ہو کر اندر گھومنے والے جانوروں کو دیکھا کرتا تھا۔ پھر اس کے کان میں زور کی ٹیس اٹھی اور وہ نظارے اور درد سے دل برداشتہ ہو کر جلدی سے بند گاڑی میں گھس گیا جس میں سب لوگ ٹھسا ٹھس بھر گئے تھے اور سنتریوں کی بندوقیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے عجیب عجیب زاویے بنا رہی تھیں ایک بندوق کا بٹ اس کی پسلی میں چبھ رہا تھا۔

چلتی ہوئی بند گاڑی میں اسے کان کے درد نے کئی دفعہ بے حال کیا مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ احساس یہ تھا کہ گاڑی سڑکوں پر بھاگتی جا رہی ہے۔ زندگی کی لہروں میں ایک کشتی کی طرح اور وہ زندگی کے اتنا قریب ہونے کے باوجود نہ تو اُسے دیکھ سکتا ہے۔ نہ چھو سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔

ہسپتال میں جب اسے گاڑی سے اتارا گیا تو باوجود اس کے کہ چاروں سنتری پہلے اتر کر ارد گرد بندوقیں تانے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُسے آسودگی کا احساس ہوا۔ کیونکہ اس کے پاؤں ڈیڑھ برس میں پہلی دفعہ ایسی زمین پر لگے تھے جس پر دوسرے لوگ آزادانہ گھوم رہے تھے اور سر پر آزاد فضا تھی مگر اگلے ہی لمحہ وہ بجھ سا گیا۔ جب چاروں طرف سے لوگوں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں۔ کوئی رک گئے اور اسے عجیب تماشا سمجھ کر دیکھنے لگے۔ کوئی چلتے گئے مگر مڑ مڑ کر دیکھتے گئے دور برآمدوں میں بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر اسے دیکھنے لگے۔ مائیں بچوں کو انگلی اٹھا اٹھا کر دکھا رہی تھیں اور عورتیں آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

دو نرسیں قریب سے گزریں۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ اور پھر بڑی طنز سے اس کی طرف دیکھ کر ہنس دیں وہ غصے سے تلملا اٹھا۔ اور ایک گالی اس کے لبوں تک آ کر رک گئی۔ کیونکہ سنتریوں کی موجودگی اُسے یاد آ گئی تھی۔

اب وہ تین گھنٹے سے بنچ پر بیٹھا تھا۔ مگر اس انتظار میں بھی خوش تھا۔ کیونکہ پچھلے تین ماہ سے اُسے کان کی تکلیف تھی اور ڈاکٹر ڈھنگ سے دیکھ نہ سکا تھا۔

ان کے کیمپ میں میڈیکل انسپکشن روم تھا جہاں انڈین ڈاکٹر آتا تھا۔ کہتے تو تھے کہ وہ روزانہ آتا ہے۔ مگر ناغے اکثر تھے اور بے قاعدہ تھے۔ جب اسے کان میں تکلیف شروع ہوئی تو وہ اسے دکھانے گیا۔ مگر اس نے کہا کہ وہ کان دیکھنے کا آلہ نہیں لایا۔ اگلے دن لائے گا تو دیکھے گا اگلے دن وہ آیا ہی نہیں۔ اس سے اگلے دن آلہ لانا بھول گیا۔ پھر دو تین دن نہ آ سکا اور بعد ازاں آلہ نہ لا سکا۔ بالآخر پندرہ روز بعد جب آلہ لایا گیا تو اس نے چند لمحوں کے لئے کان میں جھانکا اور کہا کہ یہ تو سپیشلسٹ دیکھے گا۔ اگلے اڑھائی مہینے میں سپیشلسٹ نہ دیکھ سکا کیونکہ

کبھی کبھی کیمپ میں آتا تھا۔ اس طرح تین چار ہفتے ضائع چلے گئے۔ پھر سپیشلسٹ آیا۔ اس نے کان دیکھا اور کہا کہ ہسپتال آکر دکھاتا اور مہینے بھر کی تاریخ دے دی۔
اس کے بعد بھی کئی ہفتے ضائع کئے گئے۔ کیونکہ کیمپ والے کبھی تو بھجوانے کے لئے گاڑی کا بندوبست نہ کر سکے۔ اور کبھی گاشد گی تو گارڈ کا انتظام نہ ہو سکا اور کبھی وہ ہسپتال پہنچا تو سپیشلسٹ یا تو فارغ نہ تھا یا موجود نہ تھا۔

اس لئے آج تین ماہ کی تکلیف کے بعد اسے تین گھنٹے کا انتظار برا نہیں لگ رہا تھا۔ البتہ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ آج اس کا نمبر آجائے۔ جنگی قیدی عام طور پر آخر میں دیکھے جاتے تھے۔ جب وہ آیا تو کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اطمینان سے بیٹھا ان کو دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سنتریوں کی موجودگی اور ان کی سنگینوں سے بے نیاز ہو گیا۔ ڈیڑھ سال بعد کیمپ سے باہر نکل کر وارڈ میں آنا اس کے لئے بہت بڑی تبدیلی تھی اور اس کا مزہ لیتے ہوئے وہ لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر دل ہی دل میں ان کی آزادیوں اور اپنی پابندیوں کا موازنہ کرنے لگا۔

اس وقت اس نے پہلی دفعہ اس عورت کو دیکھا۔
کمرہ کافی کھلا تھا۔ اس سے ملحق سپیشلسٹ کا کمرہ تھا اور دونوں کمروں کو ایک کھلا راستہ ملاتا تھا۔ جو بڑے کمرے کا ہی حصہ تھا۔ اور بڑے کمرے میں چھوٹا سا ڈریسنگ روم بنا دینے سے بن گیا تھا۔ سب مریض اسی راستے سے گزر کر سپیشلسٹ کے کمرے میں جاتے تھے۔ اسی راستے میں دیوار کے ساتھ دو تین بنچ لگائے ہوئے تھے جس پر مریض عورتیں بیٹھی تھیں۔ یہ راستہ ڈریسنگ روم کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے بڑے کمرے سے نظر نہیں آتا تھا۔ سوائے اس حصے کے جو راستے کے بالکل سامنے تھا اور جس کے ایک کونے میں وہ بیٹھا تھا۔

کمرے میں لوگ کم رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر دو چار مرد مریضوں کو دیکھنے کے بعد ایک آدھ مریض عورت کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہ عورت غالباً سب سے اخیر میں آئی تھی کہ بنچ کے سرے پر بیٹھی تھی اور اس سے پرے والی عورتیں ایک ایک کر کے کم ہو رہی تھیں اور بنچ کا پرلا حصہ خالی ہو رہا تھا۔

کمرے میں دو چار پرانے میگزین پڑے تھے جن کے ٹائیٹل پھٹ چکے تھے۔ کونے مڑ چکے تھے اور صفحوں پر اشتہاروں کے ہنستے مسکراتے خوب صورت چہرے دکھتا رہا۔
سنتری کھڑا کھڑا تھک گیا تھا اور اب بوریت دور کرنے کو اپنی جگہ تبدیل کر کے دروازے کے سامنے چلا گیا تھا جہاں سے وہ قیدی کو بھی دیکھ سکتا تھا اور باہر کی دنیا سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کمرے میں آٹھ دس لوگ باقی رہ گئے تھے۔ وہ غور سے کبھی ایک چہرے کو دیکھتا کبھی دوسرے کو۔ اُن کے ہنسنے کے انداز باتوں کے اتار چڑھاؤ، آواز کی قسمیں۔ لباس کے طریقے اور چہروں کے نقش و نگار دیکھتا رہا۔ چند ایک سکھ بھی تھے۔ ان کی داڑھیاں اور مونچھیں رکھنے کے بھی کئی انداز تھے۔ کچھ زلفوں کی طرح سلیقے سے سنوارتے تھے۔ کچھ گھاس پھونس کی طرح کھلی بکھیر دیتے تھے۔

وہ ان سب کو دیکھتا رہا۔ ان کی باتیں سنتا رہا۔ مگر نہ کسی نے اُس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ نہ اُس نے کسی سے کی۔ نہ ہی سنتری یہ چاہتے تھے کہ وہ لوگوں سے رابطہ رکھے۔ اس لئے وہ خاموشی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا۔

اس اثنا میں اس نے کتنی ہی مرتبہ اس عورت کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ شروع میں تو تماشائی کی آنکھ سمجھ کر وہ خفیف ہوا تھا۔ مگر بعد میں جب باقی لوگوں نے اسے

دیکھنا بند کر دیا تھا تو وہ پھر بھی دیکھتی رہی۔ وہ اپنے دل میں ان آنکھوں کے موڈ کو جانچنے کی بار بار کوشش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔

ان آنکھوں میں کسی قسم کی دعوت نہ تھی۔ بے حیائی نہ تھی، حرارت نہ تھی۔

اس نظر میں کوئی ایسا رنگ نہ تھا جو حوا زادیاں مرد کی توجہ حاصل کرنے کے لئے دانستہ نظر وں میں بھرتی ہیں۔

اس نظر میں فحاشی والی چمک نہ تھی اور شہوت والی لرزش نہ تھی۔

اس نے جب چند بار اُسے اپنی طرف دیکھتے پایا تو دو چار دفعہ نظریں ملا کر بھی دیکھا۔ مگر اس کی بھرپور نظر سے بھی ان آنکھوں کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اور وہ جذبات سے یکسر خالی رہیں۔

ایک سیدھی سادی نظر جو اسے دیکھے جاتی ہے۔ جو دزدیدہ بھی نہیں اور دلبر بھی نہیں۔ جب چاہتی ہے دیکھ لیتی ہے۔ اگر پکڑی گئی تو نہ شرم نہ شوخی۔ جب چاہتی ہے آنکھیں جھکا لیتی ہے اور گود میں لئے ہوئے بچے کو دیکھنے لگتی ہے۔

بعض دفعہ اسے شک ہوا کہ ان آنکھوں میں ہمدردی کی ہلکی سی جھلک ہے۔ مگر یہ رنگ اتنا مدھم اور غیر واضح تھا کہ اسے یقین نہ آتا تھا۔ جب چاروں طرف دشمن بیٹھے ہوں جن آنکھوں میں حقارت یا استہزاء یا احساس برتری یا لاتعلقی ہو تو کسی ایک آنکھ میں ہمدردی پر یقین نہیں آسکتا۔

اور پھر اب تک اس نے ہندوستانیوں کو جتنا بھی دیکھا تھا اس کے بعد ان سے کسی ہمدردی کی توقع رکھنا عبث تھا۔

وہ دل ہی دل میں حیران ہوتا رہا کہ اس خاموش سپاٹ اور بے معنی نظر کا مقصد کیا ہے۔؟ کیا وہ اس کی طرف مائل ہے؛ کیا وہ اس کی صورت پسند کرتی ہے؟ مگر یہ ناممکن تھا کیونکہ ڈیڑھ برس کی صعوبتوں نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں اُبھر آئی تھیں اور اب ان میں سے بعض لٹکنے کے انداز اختیار کر رہی تھیں آج صبح ہسپتال آنے سے پہلے اُس نے شیشے میں جھانکا تھا تو یوں لگا تھا جیسے کوئی انتہائی مضمحل اور ادھیڑ عمر اجنبی چہرہ شیشے میں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس وقت اسے اپنی حالت پر بڑا ہی دکھ ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے۔ گردن کا گوشت ڈھیلا تھا۔ سر کے بال زیادہ سفید اور کم کالے تھے۔ گالیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور ہونٹ چہرے سے باہر کو لٹکے ہوئے لگ رہے تھے۔

اب اس نے وہ چہرہ یاد کیا تو اسے یہ بات عجیب لگی کہ کوئی عورت اس چہرے میں بھی کشش محسوس کر سکتی ہے۔

پھر وہ تکلیف میں بھی تو تھا۔ اس کے کان میں مسلسل درد تو نہ تھا۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد درد کی ہلکی سی لہر اٹھتی تھی جو تیز ہوتے ہوتے ٹیس بن جاتی۔ اور دو چار منٹ تک اُسے بے حال کئے رکھتی۔ اس اثناء میں وہ درد کو دبانے کے لئے آنکھیں میچ میچ کر چہرے کو سکوڑتا رہتا اور اس کے نقوش بگڑ بگڑ جاتے ایسے چہرے کو کون سی عورت پسند کرے گی۔؟

پھر وہ کیوں اس کی طرف دیکھتی ہے؟۔ اس خاموش سپاٹ اور بے معنی نظر کا مقصد کیا ہے؟

اس عورت نے عمر میں پہلی دفعہ جنگی قیدی دیکھا تھا۔ مگر عمر بھر جنگی قیدیوں کی باتیں کی تھیں۔

آج سے تیس سال پہلے وہ پانچ برس کی تھی۔ جب دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی

اسے زندگی کی پہلی یادوں میں سے صرف یہ بات یاد تھی کہ گھر میں ماں رویا کرتی تھی۔ کیونکہ باپ جاپانیوں کی قید میں تھا نانا اس کی ماں کو تسلیاں دیا کرتا تھا کہ قید سے تو اچھا ہے

محفوظ تو ہے۔ دشمن کے گولوں سے بچا ہوا تو ہے۔ مگر ماں تھی
کہ اسے کسی پل چین نہ پڑتا تھا۔
آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلتی تو پہلو میں ماں نہ ہوتی
وہ اُٹھ کر دیکھتی تو ماں صحن میں بے قراری سے چکر کاٹ رہی
ہوتی یا چارپائی سے ذرا دور فرش پر بیٹھی رو رہی ہوتی کہ
اس کی سسکیوں سے ساتھ والے لوگ جاگ نہ جائیں۔
خاندان کے بزرگ آتے تو ماں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
جنگ ختم ہونے اور جنگی قیدیوں کی رہائی کی دعائیں مانگتے۔
وہ ماں سے اپنی خواہشات کا اظہار کرتی تو کتنی تو پوری
ہو جاتیں اور کتنی ہی اس وعدے پر ٹال دی جاتیں کہ تمہارا
باپ جنگ سے چھوٹ کر آجائے گا تو کریں گے۔
گاؤں کے اور بچوں کے باپ بھی جنگ پر تھے۔ کبھی
کبھار ان کے خطوط آتے تو بچے خوشی خوشی سب کو سناتے
مگر اس کے باپ کا خط کبھی نہ آتا تھا۔ کیونکہ وہ جاپانیوں کا
جنگی قیدی تھا۔
اس کے گھر میں اُٹھتے بیٹھتے باپ کا تذکرہ ہوتا جو
آنکھوں سے اوجھل تھا۔ قیاس آرائیاں ہوتیں کہ جنگی قیدی
کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ جنگ کی ہر خبر بڑے غور سے
سنی جاتی۔ پھر اس کا بڑی تفصیل سے تجزیہ کیا جاتا اور یہ سوچا
جاتا کہ جنگی قیدیوں کی واپسی کے امکانات کیا ہیں۔ گھر
کی ساری فضا پر جنگ اور جنگی قیدی چھائے تھے۔ ان کی
باتوں میں بسے تھے۔ ان کے ذہن پر سوار تھے اور ان کی
خوابوں میں آتے تھے۔
اس لڑکی نے ہوش سنبھالا تو سوائے جنگی قیدی کے
اس نے اور کسی چیز کا ذکر نہیں سنا۔ بچپن کی دماغی اڑان
اسی ذکر تک پہنچ پاتی تھی۔ اور اُس کے دل و دماغ ایک
لامحدود انتظار میں ڈوبے تھے کہ اس کا باپ کبھی نہ کبھی
قید سے چھوٹ کر گھر آجائے گا۔

مگر ایک دن خبر ملی کہ اُس کا باپ جاپانیوں کی قید
میں مر گیا ہے۔
جب یہ خبر پہنچی تو اسے یقین نہ آیا کہ یوں بھی ہو سکتا
ہے۔ جس ذات کے گرد سارے گھر کی سوچیں گھوم رہی ہوں۔
امنگیں اس کے سہارے زندہ ہوں۔ امیدیں اس سے
جنم لیتی ہوں وہ ذات ایک دم کیسے مر سکتی ہے۔
اس خبر سے اُس کے گھر میں بھونچال نہ آیا۔ فقط سکوت
چھا گیا۔ جو کوئی جہاں بھی تھا ساکن ہو کر رہ گیا۔ گویا سکتے کے
عالم میں ہو۔
اب کوئی باپ کا ذکر نہ کرتا تھا۔ جنگ کی خبر نہ سنتا تھا
قیاس آرائی نہ کرتا تھا۔ سب لوگ جیسے خوف زدہ سے
تھے اور ان چیزوں کا ذکر کرنے سے گھبراتے تھے۔
چند ماہ اس خاموشی کے عالم میں گزر گئے۔ اداس
غمگین اور بے روح خاموشی۔ جس میں زندگی عجب سہمے
سہمے انداز میں تھکی تھکی چال چل رہی تھی اور اس لڑکی کے
دل میں ایک کسک ہر وقت تڑپتی رہتی تھی کہ اس نے اپنے
باپ کو نہیں دیکھا۔
وہ دوسروں کے باپ دیکھتی تو دل ہی دل میں حیران
ہوتی رہتی کہ یہ بچے اپنے باپ سے اتنی بے تکلفی سے بات چیت
کیسے کر لیتے ہیں۔ ان میں اتنی اپنائیت کیسے ہوتی ہے۔ وہ
اکیلے میں درخت کے تنے اور برآمدے کے ستون کو باپ سمجھ کر
ان سے باتیں کرتی مگر وہ اپنائیت تو کیا دکھاتے جواب
بھی نہ دے سکتے تھے۔
پھر ایک دن اُن کے گھر میں زور زور سے رونا پیٹنا
ہوا۔ کیونکہ ہمسائے کا جوان لڑکا جنگ کے خاتمے کے بعد
واپس آگیا تھا۔ وہ بھی اس کے باپ کے ساتھ جنگی قیدی تھا
مگر کیمپ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا
کہ وہ اس کے باپ کے آخری دنوں میں اس کے ساتھ ہی تھا۔

اس نے سارا واقعہ سنایا۔ کس طرح وہ بیمار تھا۔ مگر علاج کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا اور وہ آہستہ آہستہ گھلتا گیا لیکن بیماری سے زیادہ جو چیز تنگ کرتی تھی۔ وہ احساس محرومی تھا جو یسے تو قید میں ہر شخص کو ہوتا ہے۔ مگر بیمار آدمی زیادہ محسوس کرتا ہے۔ اصل میں قید نام ہی محرومی کا ہے۔ جس چیز کے جس وقت دل چاہے وہ اُس وقت نہ مل سکے اور آدمی اُس کے حصول کے لئے کوشش کے بھی قابل نہ ہو۔ بے بسی کی یہ حالت محرومی کو اور بڑھاتی ہے۔

اس نے بتایا کہ وہ اپنی بیوی اور بچی کو بہت یاد کرتا تھا۔ بیماری سے زیادہ اُسے تکلیف یہ تھی کہ اُس کے بیمار جسم کو سہلانے کے لئے اس کی بیوی اور بچے کے ہاتھ نہیں۔ پھر ان کے خط بھی نہیں۔ اگر ان کے چہرے نہیں تو ان کی تحریر تو پڑھ سکتا۔ وہ بے چارگی کے عالم میں بچی اور بیوی کا نام لے کر بڑبڑاتا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ اگر کوئی اس کی مناسب تیمارداری کرنے والا ہوتا تو وہ شاید بچ جاتا۔

یہ باتیں سُن کر ان کے گھر میں ایسے نوحے ہوئے گویا پہلی دفعہ مرنے کی خبر سنی ہے اور یہ آٹھ سالہ لڑکی آئینے کے سامنے اپنے منہ پر طمانچے مارتی رہی کہ وہ اپنے باپ کے لئے کچھ بھی نہ کر سکی۔ وہ جنگی قیدی تھا۔ یہ تو نہیں تھی کہ مشکل وقت میں اس کے پاس نہ پہنچ سکی۔ بچپن میں الف لیلیٰ کی کہانیاں سننے والی بچی یہ سمجھی کہ اگر وہ ذرا سی بھی ہمت کرتی تو کوئی نہ کوئی اُڑن کھٹولا اسے ضرور باپ تک پہنچا دیتا۔ اس نے خواہش ہی نہیں کی۔ ہمت ہی نہیں کی۔ اس انداز میں سوچا ہی نہیں۔ ورنہ شاید اس کا باپ نہ مرتا اور اس کی تیمارداری سے صحت یاب ہو جاتا۔

پھر عمر بڑھنے سے لڑکی کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی آزادی کے باوجود وہاں نہ پہنچ سکتی تھی۔ اور کچھ کر بھی نہ سکتی تھی۔ مگر اس کے باپ کا احساسِ محرومی اس تک پہنچ گیا اور وہ اب اس لڑکی کا احساسِ محرومی بن گیا کہ وہ اپنے مجبور بیمار اور لاچار باپ کی خدمت سے محروم رہی۔

اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہ تھا مگر بعض اوقات یہ احساس محرومی اتنا شدید ہو جاتا کہ احساسِ جرم کی طرح تنگ کرنے لگتا۔ اور وہ یہی دل میں لئے جوان ہو گئی۔

اور آج وہ ایک جنگی قیدی کو دیکھ رہی تھی۔ پہلی دفعہ اور اچانک۔

جس چیز کا ساری عمر اس نے اس انداز میں ذکر سنا تھا کہ وہ اس کی نس نس میں رچ گئی تھی۔ وہ چیز آج اس کے سامنے موجود تھی۔ وہ جب اسے دیکھتی تو وہ گوشت پوست کا انسان نظر نہیں آتا تھا۔ بلکہ اس کے ذہن میں رہنے والا بے بسی اور محرومی کے عناصر سے بنا ہوا برسوں پرانا تصور تھا۔ اس کی آنکھیں اُس جنگی قیدی کو دیکھتی تھیں مگر ذہن اُس تصور کو دیکھتا تھا۔ اس لئے دیکھنے کا انداز عجیب سا تھا۔ کیونکہ آنکھوں اور ذہن کا آپس میں رابطہ نہ تھا۔

اس کے دل میں وہی احساسِ جرم ہولے سے رینگا مگر وہ اس تصور کے لئے کیا کر سکتی تھی۔ وہ تو اس وقت سنتریوں کے قبضے میں تھا۔ اس لئے وہ دیکھتی رہی بار بار۔

اس عورت کو پاکستانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عام ہندوستانیوں کی طرح اُس کا دل بھی پاکستان دشمنی سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اس وقت وہ ایک پاکستانی جنگی قیدی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ اس تصور کو دیکھ رہی تھی۔ جو عمر بھر اس کے دل و دماغ پر چھایا رہا اور اندر ہی اندر گھومتا رہا مگر باہر کبھی نظر نہیں آیا۔

اور وہ خالی خولی نظروں سے دیکھتی رہی جن میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ فقط یہ احساس تھا کہ اس کا ذہنی تصور دماغ سے نکل کر باہر آ گیا ہے اور اُسی تصور کی خدمت کی دیرینہ خواہش

کی تسکین کے لئے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ کچھ بھی نہیں۔

کافی دیر بیٹھنے کے باوجود بھی وہ جنگی قیدی نہ سمجھ سکا کہ وہ اُسے کیوں دیکھتی ہے؟

کمرے میں اب تین چار لوگ رہ گئے تھے۔ سنتری جو کافی دیر سے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ اب اُکتا کر باہر چلا گیا اور جانے سے پہلے قیدی پر خشمگیں نظر ڈالتا گیا کہ خبردار رہو۔ باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہوں اور تم مجھے کھڑکی میں سے نظر آتے رہو گے۔

ایک مریض ڈاکٹر کے کمرے سے باہر آیا۔ وہ غالباً ڈریسنگ کروا کر آ رہا تھا کیونکہ کان پر ہاتھ رکھے تھا۔ اور درد کی شدت سے اس کی ایک آنکھ بند ہوئی جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر قیدی کو بھی اپنے کان میں از سرِ نو درد کی ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی۔

چند لمحوں بعد ایک نوجوان جوڑا اندر داخل ہوا لڑکا ہندوستانی فوج کا افسر تھا۔ اور وردی میں تھا۔ لڑکی ساڑھی میں تھی اور جدید وضع قطع کا نمونہ تھی۔ ساڑھی کا بلاؤز مختصر ترین تھا اور پیٹی کوٹ بھی ذرا نیچے ہی بندھا تھا۔ اس لئے اس کی قریباً ساری پشت اور پیٹ بالکل برہنہ تھے۔ سامنے کی طرف ساڑھی کا پلو تھوڑا سا جسم چھپانے کا فرض ادا کر رہا تھا۔ مگر پچھلی طرف گوری پیٹھ پر بکھرے ہوئے کالے تل وغیرہ خوب جگمگا رہے تھے۔

وہ دھیمے انداز میں کمرے میں آئی اور خاموش کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگی۔ مگر قیدی کو عرصہ بعد نسوانی جلوہ آرائی دیکھنے سے یوں لگا جیسے اس لڑکی کا رواں رواں چھپا رہا ہو اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

آج تین چار گھنٹے بیٹھنے کے دوران میں اُس نے نیا فلسفہ گھڑا تھا۔ ادھر سے مریض عورتیں یا نرسیں وغیرہ گزرتی تھیں تو پہلے وہ سنتری کی وجہ سے اور خود ننگا ہوں کا مرکز ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھنے سے گریز کرتا رہا۔ مگر تھوڑی دیر بعد اس نے سوچا کہ یہ دشمن کا ملک ہے اور دشمن بھی ایسا جس نے بالکل غیر قانونی اور غیر اخلاقی طور پر ہمیں قید کر کے اپنے بیوی بچوں سے جدا کیا ہوا ہے تو ہم ان کی عورتوں کو دیکھنے سے کیوں شرمائیں۔ اگر انہیں غصہ آتا ہے تو ہمیں واپس بھجوا دیں۔ چنانچہ اس فلسفے کے ارتقاء کے بعد اب وہ جی بھر کر اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اور خاوند کی موجودگی سے بالکل بے پروا تھا۔

دیکھنا تو اس کا شعوری عمل تھا مگر جس انداز میں وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا اسے خود بھی احساس نہ تھا۔ کیونکہ غیر شعوری طور پر اس کی جنسی بھوک اس کے پورے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ ڈیڑھ برس سے تو وہ قید میں تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے کئی ماہ وہ مشرقی پاکستان میں رہا تھا اور اس تمام عرصے کی محرومی اس کی بھوکی نظر سے چھلک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی تیز نظروں سے اس کا مختصر بلاؤز ہی پھاڑ دینا چاہتا ہے۔

اتنے میں لڑکا اپنی جگہ سے ہلا اور دانستہ یا نادانستہ طور پر لڑکی اور قیدی کے درمیان آ گیا۔ چنانچہ قیدی نے نظریں ہٹالیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

معاً اس کی نظر اس بنچ والی عورت پر پڑی۔ جو اب غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ قیدی کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس عورت نے اسے لڑکی کو گھورتے ہوئے دیکھ لیا ہے کیوں کہ اب عورت کی آنکھوں میں پہلی دفعہ ایک واضح تاثر تھا۔ یہ فہم کی ایک جھلک تھی جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ میں تمہاری طلب کو خوب سمجھتی ہوں۔ مگر اس جھلک

زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

اس کی یہ نظر دیکھ کر قیدی از خود شرمندہ ہو گیا اور جلدی سے منہ موڑ لیا۔

لیکن مرد بھی کبھی اپنی آنکھوں کو عورت کو دیکھنے سے روک سکا ہے؟ چنانچہ جیسے ہی لڑکی ذرا سی نظر آنے لگی قیدی پھر ویسے ہی للچائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

اب کمرے میں دو تین مریض رہ گئے تھے۔ مگر وہ اس طرح اوٹ میں تھے کہ بنچ والی عورت کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ سنتری بھی دروازے کے باہر تھا۔ بنچ پر بیٹھی ہوئی سب مریض عورتیں فارغ ہو کر جا چکی تھیں اور اب وہ عورت اکیلی بیٹھی تھی اور گود میں بچے کو لے اُسے دودھ پلا رہی تھی۔ آگے اس نے ساڑھی کا پلّو پھیلایا ہوا تھا۔

لڑکا اور لڑکی ڈاکٹر کے دروازے کی طرف چلے تو بھی قیدی لڑکی کو دیکھتا رہا اور جب وہ دروازے میں غائب ہو گئی تو کافی دیر دروازے میں ہی کھویا رہا۔

چند لمحوں بعد اس کی نظر اس عورت پر پڑی تو وہ حسب سابق سیدھی سپاٹ اور گونگی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر پہلے کی طرح غیر جذباتی تھی۔ مگر ایک دم اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ساڑھی کا پلّو سامنے سے ہٹا دیا۔ اور دھیرے سے بچے کا سر چھاتی سے نیچے سرکا لیا۔

وہ حیران ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ مگر عورت نے چھپانے کی کوشش نہ کی۔

قدرے اور حیران ہو کر اس نے عورت کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ اسی انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

قیدی کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں اور اس نے اس عورت کی نظر پڑھنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ نہ تھا۔

اس نظر میں دعوت نہ تھی شہوت نہ تھی، لگاوٹ نہ تھی، پیار نہ تھا۔ البتہ ہمدردی کا رنگ کچھ جھلک رہا تھا۔ صرف ہمدردی۔

اتنے میں سنتری کے مڑنے کی آہٹ ہوئی تو اس نے بچے کو چھاتی کے ساتھ لگا لیا اور ساڑھی کے پلو سے ڈھک دیا۔

اگلے ہی لمحے نرسنگ اردلی نے عورت کا نمبر پکارا اور وہ اُٹھ کر ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئی۔

قیدی اپنی جگہ بیٹھا حیران ہوتا رہا۔ ــــ

حمید سہروردی

ایک بے کیف لمحہ کی خالص نظم

دائرہ = حیات = اور خدا
صبح ÷ دوپہر ÷ شام اور رات
رات ÷ صبح + دوپہر اور شام
صبح × میں
دوپہر × میں
شام × وہ
رات × میں
رات کا
ایک
ٹوٹتا پہر
اور
ہم
میں — وہ — اور ہم
رات
صبح میں مدغم

صبح
دوپہر میں ضم
صبح کا سلسلہ
دوپہر + شام اور رات
میں :
وہ اور ہم کی
ایک زنجیر
ز
ز ن د گی
د
گی
دائرہ بن گیا / گئی
دائرہ میں میں
دائرہ میں وہ
دائرہ میں ہم
ہ وا ے رہ

ز
ند
گی
دائرہ ... زندگی
مَیں ... دائرہ
وہ ... دائرہ
ہم ... دائرہ
آدمی صبح تک
آدمی شام تک
آدمی رات تک
آدمی
آدمی
چاروں طرف
آدمی
آدمی / میں
آدمی / وہ
آدمی / ہم
سورج، چاند ستارے اور سیارے
غار، پہاڑ، زمیں اور پاتال
آدمی ہر طرف
آسماں آسماں
آسماں آسماں

آسماں آسماں
آسماں میں خدا
مَیں میں خدا
"وہ" میں خدا
ہم میں خدا
زندگی / زندگی / زندگی
دائرہ کے باہر خدا
دائرہ کے اندر خدا
خدا صبح میں
خدا دوپہر میں
خدا شام میں
خدا رات میں
ہر گھڑی ہے خدا!
زمین
پر
خدا
آسماں
پر
خدا
سورج
پر

خدا
سمندر
پر
خدا

چاند م خدا
ستارے ے خدا
سیارے ں خدا
صحرا میں خدا
اور پھر
غار، پاتال اور کھنڈرات میں بھی خدا!!
ہر جگہ
ہر طرف ہے خدا
نیند آنکھوں میں
چبھنے لگی
کاش
اب تو ملے
مجھ کو میرا خدا ---

موم بتی اور قندیل

شاہدہ امام

آؤ گری بہت ہے۔ پائن ایپل کھائیں۔
ایک قاش بدھو کو بھی۔ ٹھہرو وہ اتنی محنت سے باغ سے چُرا کر لایا ہے۔

ورنہ مال بابا۔ ارے باپ رے۔ دیوزادکہیں کا ٹھہرو۔ چپلین کی طرح کیوں کر رہے ہو؟ —— تمہاری ٹھوکر سے بید کی وہ ہلکی سی کرسی اُلٹ گئی۔

لو بھئی۔ ایک قاش تو اپنے لئے لیتے جاؤ۔

اللہ ——

ویسے کل ماموں جان نے برف کی قلفی جمولنے کو کہا ہے۔ اندر پتے اور بادام کٹ رہے ہیں اور آسمان آپا تانبے کی دیگ میں دس سیر گائے کا دودھ اونٹ رہی ہیں۔ ہاں میں ابھی ابھی دیکھ کر آئی ہوں اور بہت خوشامد سے طشتری میں تھوڑی سی بالائی کھا کر بھی —— کیسی مزے دار ابا —— دودھ کی سوندھی سوندھی خوشبو یہاں تک آرہی ہے۔ ہمت ہے تو تم بھی مانگ لو جاکے۔ جب پڑیں گے دو چار دھپ تو میں یہاں پر بیٹھی منکی کلیپ بجاؤں گی اچھا ...... اور اس کے بدلے میں تمہیں لالہ رشیدن سے کہہ کر موم سے کن اینٹھی اور جیبیں دفعوا کھا بیٹھی ——

ہاں وہی والی بات کہ نہ ہوئی تزدلی ورنہ یہیں پھڑکتے نظر آتے۔

"ہم کوئی میاں خوجی نہیں ہیں تنکے پہلوان ——
ارے ہم تو طیش میں آئیں تو گاما اور بھولو کو بھی چت کر دیں ——"

"پرنام —" لولو آپیلا سر جھٹک کر ہنسی اور ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ہے دیا لو رام —— جا بھاگ یہاں سے اور ہم سب کے لئے ایک ایک طشتری بالائی۔ ورنہ ہو جائے گا خوت خراب ——"

"نوہ —— چوٹے چوڑے یہ سے بھئی نکمر بھائیاں —" لولو آپیلا گھورتی ہوئی اٹھی اور چپل گھسیٹتی ہوئی اندر چلی گئی ——

"یہ بھانکڑ بھائیاں کیا ہوتا ہے؟" وہ سب پاگلوں کی طرح بے تحاشا ہنسے۔ خیر دار جو میرے بغیر دوسرا گیم شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں بالائی کی چھ عدد طشتریوں کی بجائے چنے کے حلوے کی قتلیاں تھیں۔

بالائی سے بھی اچھی چیز۔ لو کھاؤ نزیدو۔ ناطقہ بند کر دیا۔ ماموں جان کے سرہانے سے چابی لے کر کس طرح چوری کر کے لائی ہوں۔ آدھا خون سوکھ گیا۔ تف ہے ایسے کھانے پر اور تف ہے ایسے بھائیوں پر۔ چھی —— وہ روٹھ کر بیٹھ گئی ——

چلو بھئی۔ تم روٹھے، ہم چھوٹے۔ آؤ دوسرا گیم شروع کر دیں۔ گڈ گاڈ ——

اوہ نو —— وہ چابی والی گڑیا کی طرح ایک دم گھومی

بھری دوپہر میں موم کے قرآن پاک پڑھنے کی آواز
دور سے آتی رہی۔ پھر سناٹے میں ماموں جان کے خراٹے۔
اوہ مائی سویٹ بیلوڈ (BELOVED) ماموں جان
کو کئی دس سیر دودھ کی قلفی جموا رہے ہیں۔ اور اس کے
لئے ابھی سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کل اس وقت ہم مٹی
کے سوندھے سوندھے مٹکوں میں قلفیوں کو SHHKE
کر رہے ہوں گے اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اسے مزے
لے لے کر کھا رہے ہوں گے۔
گڈ گاڈ ـــــ واٹ اے پریٹی آئیڈیا ـــــ
WE WILL ENJOY TOMOR...
ماروڈ گی۔ رنگی۔ چوا۔ پنجہ۔ چھکا۔ ستا
تھا...... نہلا...... نہلے پر دہلا۔ اور یہ رہا اکا
ب بولو ـــــ
بیچارے راجہ راؤ منہ دیکھتے رہ گئے اور جیت
گئے الیگزنڈر دی گریٹ ـــــ
پھر وہی الیگزینڈر دی گریٹ ـــــ
ہاں بھئی۔ بعض نام اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ
جی چاہتا ہے طوطے کی طرح رٹتے رہیں۔ الیگزینڈر
الیگزینڈر ـــــ الیگزینڈر دی گریٹ یعنی مسٹر ریحان
کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے تمہیں LUCY GRAY
کر پکاروں۔ کیونکہ تمہارے بال بھی اسی کی طرح سنہرے
ہیں...... سورج کی کرن۔ یورپ سے امپورٹیڈ
لگ سکتے ہو ـــــ

یہ تمہارا نام خیر النساء کس نے رکھ دیا ـــــ ؟
مت بولو الیگزینڈر۔ یہ بیچر جیسا نام۔ معلوم
ہے چھینٹ کے کپڑوں میں لپٹی لپٹائی ناک میں بلاق
جیسر پہنے کوئی نیستن بواچلی آ رہی ہیں۔
ہم یہاں خود کو کس قدر ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں

جیسے ہوا میں اُڑ رہے ہوں۔ آزادی اور خوشی بھی کیا اچھی شے
ہے ـــــ
مگر صرف اس برآمدے کی حد تک ـــ بس اسی برآمدے
کی حد تک جس کے ٹھنڈے چمک دار فرش پر بیٹھ کر کبھی ریڈیو
اور کبھی ہم لوگ باری باری پنکھے کی رسی کھینچا کرتے ہیں اور
بھری دوپہر میں مالی کی آنکھ بچا کر ہری ہری میٹھی شہتوتیں
اور کبھی کچی مونگ پھلیاں توڑ کر کھایا کرتے ہیں۔ گوریاں
ہمارے سروں پر چہچہاتی رہتی ہیں اور پنجرے کے اندر
پھدکنے والی لال منیاں اپنی میٹھی میٹھی آوازوں میں ننھا
منا شور مچاتی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد یہاں پر سرخ
کلغی والی بلبل بھی آئے گی اور ہم سب مبہوت سے ہو کر
احاطے کی ہری ہری گھاس پر اس کے دانے چگنے کا تماشا
دیکھیں گے۔ میں چاہوں گی کہ وہ میرے قریب آئے ....
اور قریب ...... اور قریب یہاں تک کہ میری ہتھیلی پر
بیٹھ جائے مگر وہ اتنا قریب نہیں آئے گی اور پھر سے اُڑ
جائے گی۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ میرے دل میں اس کے لئے
کتنی محبت اور خلوص ہے ـــ وہ تو مجھے بھی اس دنیا کی طرح
ظالم سمجھتی ہوگی۔ ظاہر ہے ننھی سی چڑیا ہے۔ نادان نا سمجھ!
ـــــ اب اس میں کون سی افسردہ ہونے اور
آنکھیں نم ہو جانے والی بات تھی کہ جب ایک عرصہ بعد آج
سیلون لگایا تو وہاں سے " انوکھے بول " ہو رہے تھے
اے بیلے لا لا ...... ماشو شو ما فیری ......
پر کون سے تاسف کی بات تھی ـــ یہ انوکھے بول تو ہوتے
ہی اس لئے ہیں کہ ان پر قہقہے لگائے ...... نہیں معلوم ان
ہنسی کے بولوں میں درد کا کون سا پہلو نکل آیا ـــ شاید
سارا آسماں آپا میں ایک ہی انداز میں سوچا کرتی ہیں ـــ
الیگزینڈر دی گریٹ اس قدر ہنسا کہ آنکھوں میں آنسو
آ گئے۔ میں اس قدر متاسف ہوئی کہ بالآخر مسکرانا پڑا ـــــ

بات ایک ہی ہے۔ بس تھوڑا سا فرق ہے۔ ہاں ہاں •
سونگ کو تھم، بوتل بن، شیت ہین اور بب کاک اب
تک سرہانے کے ہنس رہے ہیں اور بہت خوش ہو ہو کر گا
رہے ہیں .....

"TIME IS SHORT BUT THE
JOURNEY IS LONG,
SO COME AND LAUGH, ENJOY
THE LIFE ENJOY ENJOY"

اندر اسپرنگ دار دو فٹ اوپر اچھال دینے اور دو فٹ
اندر غوطہ لگا دینے والے بستر سے ہم سب کے ماموں
جان اٹھ کر بیٹھ گئے اور تالی بجا بجا کر خود بھی گانے
لگے ــــــ

کہاں ہو میری کچی بچھو، مائی سویٹ ہارٹ
...... سب بھرا مار کر کمرے میں جا گھسے ......
وہ دیکھو ...... وہ دیکھو ...... وہ دیکھو .....
سندلعل چھیڑ کرت بھرن نہیں آج ...... ہائے کیسی
پیاری آواز ہے ماموں کی۔ بلدیو اب تک پنکھے کی رسی
کھینچ رہا ہے۔ ماموں جان ہارمونیم لے کر بیٹھ گئے ــــ
سا ...... رے ...... گا ...... ما ...... پا ...... دھا
نی ...... سا ......

جب دل کو ستائے غم ...... تو چھیڑ سکھی سرگم
میرا بس نہیں چلتا ورنہ سرگم کے سات سروں کا ایک سُر
بن جاؤں ــــ لوبولیلا کی آنکھوں میں مارے
خوشی کے آنسو آ گئے ــــ اس نے کتنی بار آزمایا
ہے کہ جب بھی وہ اپنے کنٹھ سے کوئی میٹھی سی دھن نکالتی
ہے اور ماموں کہتے ہیں تو لتا کو بھی مات کرے گی تو اس کی
آنکھوں میں ایسے ہی آنسو آجاتے ہیں۔ بڑا زور ہے سات
سروں میں ...... بہتے آنسو جاتے ہیں تھم ..... یہ آنسو میرے

تو الحمد شریف پڑھنے سے بھی نہیں تھکتے۔ اور لالا رشیدن
کی دن رات کی نکتہ چینیوں سے بھی چڑ ہے اور آسمان آپا
جو ملانیوں کی طرح دوپٹہ سر سے گھونگٹ ہم سب سے
الگ تھلگ نظر آتی ہیں۔ ان پر ہمیں رحم کم اور غصہ
زیادہ آتا ہے کیونکہ ہم انہیں اپنے ہی جیسا کوئی اچھوتا
سا نام نہ دے سکے ...... میں نے تو کئی دفعہ کہا کہ کوئی
چلبلا سا نام رکھ چھوڑو مثلاً تھنڈرگ، او کار ڈین وغیرہ
مگر ان سب نے لوبولیلا پر قناعت کر لی ہے اور یہ
سب ماموں جان کی وجہ سے ہے۔ ہم سب اکثر کورس
کے انداز میں کہتے ہیں ـــــــ

LONG LIVE MAMOONJAN

ایک اور نئی چیز ...... نئی خوشی ...... کہ اس روز جب
ہم کھانے سے فارغ ہو کر کوٹھری کے پکے فرش پر آرام
کے لئے لیٹے تھے اور دھوپ سے بچنے کے لئے ساری
کھڑکیاں اور دروازے بند کر دئے تھے تو لولا نے ایک
عجیب و غریب چیز پر غور کیا۔ روشن دان سے چھن کر
جو روشنی دیوار پر منعکس ہو رہی تھی وہ اپنے ساتھ
سڑکوں پر چلنے والی بیل گاڑیوں، تانگوں، کاروں، پیدل
چلتے ہوئے مرد، عورتوں، بچوں اور خوانچے والوں
کی چلتی پھرتی الٹی تصویریں چھوڑ رہی تھی۔ کتنی تالیاں ہم
سب نے بجائیں اور کتنے خوش ہوئے اندر سے ـــ
سارے گھر میں ڈھنڈورا کیا کہ ہم نے مفت کا بائیسکوپ
ایجاد کر دیا۔ آسمان آپا کبھی ہماری خوشی سے خوش نہیں ہوتیں
میرا خیال ہے کہ ساری آسمان آپائیں ایک جیسی ہوتی ہیں اور
ساری لوبولیلائیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔

وہ تھرڈ کی جیپ ...... ہم سب کی بوڑھیا ــــ
جب ہم اسے بوڑھیا کہتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ
کوئی شفیق ہستی ہو۔ یا کل اپنی دادی اماں یا نانی اماں

کے جیسی ——

ماموں جان نے آکر خوشخبری دی کہ تیاری شروع کر دو۔ کل پرندوں کے شکار کو جانا ہے۔ بڑھیا کا دماغ خراب تھا۔ مگر الیگزینڈر دی گریٹ نے شام سے لگے لگے اس کا دماغ درست کر دیا۔ مارے مستی کے میں نے صبح سویرے ہی سویرے ریڈیو کا بٹن آن کر دیا۔ سیلون سے بھجنوں کا پروگرام ہو رہا تھا۔ اُف یہ ہندی زبان —— کیسی مٹھاس ہوتی ہے اس میں ہندو کے بھجنوں میں بھی وہی تقدس ہے جو اذان کی صدا میں

رگھوپتی راگھو راجہ رام، پتت پاون سیتارام ....

ادھر ہری اودھر ...... رام دھن لاگی۔ گوپال دھن لاگی

من تڑپت ہری درشن کو آج ..... میرا کے پربھو گردھر ناگر ..... لاحول ولاقوۃ الاباللہ .... توبہ استغفار پڑھتی ہوئی لالہ رشیدن سیڑھیوں پر گرتی پڑتی آئیں اور ریڈیو بند کر دیا۔ صبح صبح اللہ کا نام لینے کی بجائے تم سب —— ٹھہرو میں ایک ایک کی شکایت کروں گی ابا سے

آسمان آپا مارے غصے کے ..... رہی تھیں اور ہم سب کی دیری کا ..... کرسیوں پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھیں .... تو نہیں کیا۔

...... یہ آسمان آپا پاپا ڈیڈی کو ابا کہنا نہیں چھوڑیں گی۔

خیر بچے کیا .... لولو لیلا نے گنگنانا شروع کر دیا۔

وجد کا عالم ہے —— تال تلیا دنیا مانے —— من کا ساگر کوئی نہ جانے ...... میں جانوں یا میرا یار رے

اگلی صبح ہم سب شکار کو جا رہے تھے۔ انجن تو ٹھیک ہی چل رہا تھا مگر سیٹ کی گدیاں ویسے ہی چچ چچ کر رہی تھیں۔ مونگ مونگ نے پٹرول کا نیا کنستر انجن میں بھرا کھانے پینے کے سامانوں، بندوقوں اور کارتوس کے بکسوں سے جگہ کافی گھر چکی تھی۔ اس لئے الیگزینڈر دی گریٹ مڈگاڈ پر بیٹھ گیا اور وہ جو ہمیشہ انوکھے انداز کو پسند کرتی تھی الیگزینڈر کے ساتھ مڈگاڈ پر بیٹھ گئی ——

مست خرام چکنی سڑک پر وفاداری سے دوڑتی رہی۔ بہت جلد گھنے جنگلات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جنگلی پھولوں سے لدے ہوئے درخت عجیب سا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ کہیں سرسبز ایک دوسرے میں گتھے ہوئے پیڑوں کا سلسلہ تو دوسری طرف جنگلی پھولوں کی باڑھ ...... راستے میں جگہ جگہ ٹھہرتے ہوئے پانی کے گڑھے تھے جن میں مینڈک ٹرا رہے تھے —— الیگزینڈر نے مینڈکوں کو دیکھ کر لمبی تان لگائی

بی بی مینڈکی ری، تو تو پانی میں کی رانی ....

ماموں جان نے شہ دیا ..... کوا تیرا بھائی بھتیجا چیل تری دیورانی ... —— پھر تو سب ہی لہک لہک کر گانے لگے ..... چیل تری دیورانی، او بھئی چیل تری دیورانی ......

یہ سڑک سبزے کو چیر کر نکلی تھی۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ اجالا پھیلنے ہی کو تھا اور سڑک کے دونوں اطراف گھنے پھولدار درختوں کی جھکی ہوئی ڈالیاں جب بڑھیا کے جسم سے ٹکرا کر سرسرانے لگیں تو ان سے جھڑتی ہوئی شبنم کی پھواریں لولو لیلا کا پورا چہرہ بھگو گئیں۔ پائیدان سے بس ذرا ہی سا نیچے جو لمبی گھانسوں کی قطار تھی اور ان کے درمیان جو تھالیوں اور کٹوروں جیسے پتے پھیلے تھے ان میں شبنم موتیوں کی طرح رول رہی تھی —— دور میدان نظر آ رہا تھا جس کے انتہائی کنارے پر کچے گھروندوں جیسے اکا دکا گھر دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں سے چھنتی ہوئی سورج کی سنہری ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے بال سونے کی طرح چمکنے لگے اور وہ سارے وقت اس کے ساتھ بیٹھا ریشم کی [illegible] سے چھوتا رہا۔

رو گئے رو گئے۔ مونگ مونگ نے ایک گانا گایا اور بڑھیا کو اپنی رفتار کم کرنی پڑی۔ [illegible]

بڑی کمال سے جتنی بہت آگے چل کر جا نگل بلبلیں اور بگلے بھی ملیں گے، پھر تو وہ مزہ آیا — ماموں جان نے ایک دو نالی والی بندوق سے یک وقت دو جانگلوں کا شکار کیا۔ تیمو میں نے آٹھ فاختائیں مار گرائیں۔ مونگ مونگ نے چار تیتر مارے۔ بب کاک نے چھ بٹیر اور بون بون نے دو مینائیں ماریں۔ انیگز نڈر نے دس بطخوں کو اپنی گن کا نشانہ بنایا اور ضد کر کے اس بیچاری سے بھی تین بگلے شکار کرا لئے۔ جب کوئی شکار تڑپ کر نیچے گرتا تو سورج کی کرنوں میں چمکنے والے سنہرے کھیتوں میں دور تک دوڑنے اور جلد سے جلد انہیں حلال کرنے کی فکر...... کھیتوں سے آ اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو — اُڑتے بادل جھومتی ہوائیں — ہماری نوجوانی اور ہم سب کے "سو گریٹ" ماموں جان —

"ہاں تو بچو! اسے کہتے ہیں زندگی......

وہ زندگی جو اک قندیل ہے۔ ایسی زندگی سے کیا حاصل جو موم بتی کی طرح پگھل پگھل کر ختم ہو جائے.... چمکو چمکو..... دور تک چمکو میرے بچو — ہم نے تمہیں نشانہ بازی سکھا دی..... کل مچھلی کے شکار کو چلیں گے.... بنسی اور چارہ اکٹھا کر لینا — اگلے اتوار کو چوپایوں کا شکار ہوگا.... اس سے اگلے ہفتے رائیڈنگ کریں گے..... اسکیٹنگ بھی سکھا دیں گے.... فلمیں کتنی دیکھ لیں تم لوگوں نے؟..... بازی۔ آن۔ ہم لوگ۔ نو باورا۔ جھانسی کی رانی۔ روپ متی باز بہادر — سنڈباد جہازی۔ انار کلی.... اور..... اور.....

انیگز نڈر نے گانا شروع کر دیا.... آنا ہری جان سنڈے کے سنڈے..... اور — YOU CAN KISS ME ON MONDAY, MONDAY...... — MONDAY کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ سب لہک لہک کر گانے لگے..... ہم سب کے ماموں جان مسکرانے لگے۔

گھر پہنچتے ہی لالہ رشیدن بگڑ گئیں کہ ایسے معصوم معصوم پرندوں کو بے قصور مارا ہے تم سب نے، اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ موم ایسے موقعوں پر کرسیوں پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی ہیں اور آسمان آپا پرندوں کے لذیذ بھنے ہوئے گوشت تیار کر کے سب کو کھلانا تو جانتی ہیں مگر خود نہیں کھاتیں۔ فرصت کے اوقات وہ بس آپا کو خطوط پر خطوط لکھے جاتی ہیں اور چپکے چپکے روتی ہیں۔ ہماری سمجھ میں ان کے روئے جانے کی وجہ ہی نہیں سماتی۔ چیتے کی چکنی گرم کھال ماموں جان کی آرام کرسی پر بچھی ہے اور بارہ سنگھے کا پورا منہ اپنے خوب صورت سینگوں کے ساتھ ان کے کمرے کی دیوار پر آویزاں ہے۔ سب سے اوپر گرینڈاوور کی تصویر ٹنگی ہوئی ہے جس پر مکڑی نے جالا تن دیا ہے۔ اس خوب صورت جال کو صاف نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ سجاوٹ کا ایک جدید نظریہ ہے۔ یہ مرتی دنیا سے ابھرتی دنیا کا فلسفہ پیش کرتا ہے۔

میں نے چپ چاپ چھت سے دو فٹ نیچے لٹکے ہوئے خوب صورت فانوس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ آرام کرسی کے عقب میں مور کے پنکھ کو بار بار انگلیوں سے مس کرتے ہوئے وہ سب کھڑے ہیں پھر انہوں نے ماموں کو چکور کی طرح اپنے گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"بچو۔ تم سب اگر ہمیشہ کے لئے میرے پاس رہ جاؤ تو میں تم سب کو سینٹ جوزف اور سینٹ پال میں داخل کرا دوں گا اور اپنی چاند کی ٹکڑا نونیلا کو سینٹ میری میں۔ پھر اسی طرح تم چاہو تو چین جاؤ..... یا نئی دنیا اور ایک بڑے مفکر کا مقولہ ہمیشہ یاد رکھو کہ میرے لئے زندگی موم بتی نہیں، ایک بہت بڑی قندیل ہے جو لمحہ بھر کو میرے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

لو کیا سمجھے؟۔ اور اس مقولے کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ کبھی تم سب کا ماموں جان کہا کرتا تھا ...... اس روز وہ اس مقولے کو سبق کی طرح یاد کرتی رہی۔ پوجا کے دن اور دیوالی کے روز بھی اس نے اتنی ہی خوشی منائی جتنی عید اور بقرعید میں۔

کالی مائی کی پوجا تھی جب گھونگھٹ کاڑھے کاڑھے ہندو عورتیں پیتل کا جھلملاتا تھال لیے اور کچھ ننھی منی ٹوکریاں لے کر کوٹھی کے پھاٹک پر کھڑی ہو کر پوچھ رہی تھیں کہ پھول لے لوں۔ اور اس نے بڑے چاؤ سے جا کر گیٹ کھول دیا تھا۔

"میرے ماما نے کہا ہے جتنا جی چاہے لے لو مگر موتیا اور موگرے کو ہاتھ نہ لگانا۔ یہ ہماری موم کے پھول ہیں۔ وہ سچ مچ مسلمان ہیں نا۔ وہ ان پھولوں کو سونگھتی ہیں اور اپنے تکیہ کے پاس رکھتی ہیں۔ وہ اس کی باتیں سن کر ہنس دی تھیں۔

"تو کیا تم مسلمان نہیں ہو؟"

"کون میں؟۔ مجھے تو یہ پتہ ہی نہیں کہ دین دھرم ہوتا کیا ہے!"

وہ سبز دھانی اور پیلی کور دار ساڑیاں پہنے، ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں صندل بھرے پھول توڑنے میں جت گئیں اور ان عورتوں کے ساتھ وہ خود بھی پھول توڑنے لگ گئی تھی۔

پھر ایک روز ایک دم سے کیا ہوا کہ چھت پر رنگی برنگی روشنیاں بکھیرتا ہوا فانوس جیسے اچانک ٹوٹ پھوٹ کر میری آنکھوں میں گر گیا۔ موم کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے سب کو اپنے پاس بلا کر اعلان کیا۔ بس اب بوریا بستر گول کرو یہاں سے۔ تمہارے ابا کی نوکری ہو گئی ہے لیکن موم ......

خبردار جو موم کہا۔ ماما کہو ......

ماموں جان کہتے ہیں کہ زندگی ...... موم بتی ......

قندیل ......

چلو چلو ...... دیر نہ کرو ...... کہاں ہو سب گئے

بیٹو، کلو، منن، چمن، خیرالنساء ......

شکر ہے میرے اللہ ۔۔ موم سجدے میں گر گئیں اور لوبو لیلا نے سوچا۔ ہائے وہ اپنا الیگزینڈر دی گریٹ۔ اپنے کلرک ابا کے چھوٹے سے مکان کے اندر موم بتی کی مدھم روشنی میں وہ زار و قطار روتے ہوئے دعا کر رہی تھی۔

" اے آسمانی باپ! ۔۔ ہمارے ابا کو نوکری سے برطرف کر دے ۔۔!!! "

دو مختصر نظمیں

احمد وصی

لمحوں کی بددعا

تجھے ہم ایک صدی کا آج سے بن باس دیتے ہیں
پلٹ کے جب تو آئے گا تو تیرا حال پوچھیں گے
کہیں ایسا نہ ہو جن جنگلوں میں تیرا جانا ہو
وہاں ویرانی اور سنسان رستے نہ نظر آئیں
ہمارے شہر کی فصلیں اُگ آئیں، ہوں تیری راہوں میں
تیرا یہ حال ہو بن باس کا جانا بھی مشکل ہو
تو اپنے وقت کے کٹنے سے پہلے ہی پلٹ آئے

مٹی مٹی تحریریں

کوئی اس کے ہاتھ سے لے لے قلم اور یہ کہے
"دیکھ بیٹا یہ لکیریں رائگاں ہو جائیں گی"
میں خود اپنے ہاتھ سے یہ کام کر سکتا نہیں
کیونکہ میرے ہاتھ میں بھی ہے قلم
مجبور ہوں

صفدر

تین نظمیں

آگہی

بادلوں کو اپنے کھیتوں پر سے اُڑتا دیکھ کر
اک سمے کہتا تھا میں
بھورے بادل پانی پینے جا رہے ہیں

بادلوں کو اپنے کھیتوں پر سے اُڑتا دیکھ کر
اِس سمے
لفظ کوئی [illegible] میں اُگتا نہیں
پھول کوئی ہونٹ پہ کھلتا نہیں !!

رات

گھنے جنگل کی وسعت میں
درندوں کی پکاریں گونجتی ہیں
نشے میں خوف کے مسرور
اندھے غار میں ہم جھومتے ہیں

شام

اک اچھا شوہر، اک مشفق باپ
فائلوں کی سطروں سے کھنچ رہی ہے
میں
اپنے نام کے پیالے میں
امرت رس بن کر
قطرہ
قطرہ
اتر رہا ہوں

محمد منشا یاد

بارھیں برسیں

بارہ برس بعد ـــــــ

ایک روز میں اس کے گھر کے دروازے پر دستک دیتا ہوں تو وہ اندر سے جھٹ کر کہتی ہے۔

" دروازہ کھلا ہے ڈرائنگ روم میں چلے جائیے۔"

میں دروازہ ٹٹولتا ہوں۔ واقعی ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند نہیں ہے۔ میں دروازہ کھول کر اندر آجاتا ہوں۔ تپائی پر چائے کے برتن رکھے ہیں۔ چائے دانی سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی ہے۔ پلیٹوں میں مختلف قسم کے پھل اور کھانے کی چیزیں قرینے سے سجی ہوئی ہیں۔ میں گردن گھما کر دیکھتا ہوں۔ قدموں کی چاپ سے پتہ چلتا ہے وہ ساتھ والے کمرے کے دروازے پر آ گئی ہے۔ درمیان میں ہلکے گلابی رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا اس کی آواز سن سکتا ہوں۔ وہ کہہ رہی ہے۔

" مجھے معلوم تھا تم آنے والے ہو ـــــ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ تم میرے خواب والے وعدے پر بارہ برس بعد عمل کرو گے تم نے مجھے بارہ برس تک راہ دکھائی ہے۔ اب بارہ برس تک تمہیں اکیلے بیٹھ کر چائے پینا ہو گی اور تیرھویں برس کا انتظار کرنا ہو گا۔ "

میں چائے کی دو پیالیاں بنا کر رکھ دیتا ہوں اور کہتا ہوں ـ

جب تک تم میرے پاس نہیں بیٹھو گی میں چائے نہیں پیوں گا۔ تم نے کم از کم ایک پیالی چائے میرے ساتھ پینے کا وعدہ کیا تھا۔

وہ کہتی ہے :

" جب تم اپنے وعدے پر پورے نہیں اترے تو میں بھی اس کی پابند نہیں ہوں۔ تم نے بارہ برس تک مجھے انتظار کی آگ میں جلایا ہے اب تمہیں بارہ برس تک انتظار کرنا ہو گا۔ "

" اور تم ؟ " میں پوچھتا ہوں۔

" میں۔ " وہ کہتی ہے :

" تم سے باتیں کروں گی۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں اور پھر اس طرح تمہارے انتظار کے بارہ برس آسانی سے کٹ جائیں گے۔ "

میری آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں لیکن گرنے سے پہلے جم جاتے ہیں۔ میں انہیں خالی پلیٹ میں چن دیتا ہوں۔ وہ بولتی رہتی ہے۔

" جب تم گھر سے چلے تھے تمہارا یہاں آنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی اب تمہیں آنا ہی پڑے گا تم کہیں اور نہیں جا سکتے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو میں سب کچھ جانتی ہوں۔ مجھے ہر بات کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ بات میں نے تمہیں پہلے خواب میں بھی بتائی تھی۔

" پہلا خواب ؟ نہیں ـــ وہ تو شاید دوسرا خواب تھا" ـ میں جواب دیتا ہوں۔

" نہیں وہ پہلا خواب تھا " وہ کہتی ہے۔ " مجھے تو ذرا ذرا سی بات یاد ہے۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے

کسی نے دیکھا تھا اس لئے جب ہر صبح مجھے پانچ پھول لے لایا جاتا تو میرا وزن کبھی کم یا زیادہ نہیں ہوتا تھا سارا شہر بجلی کی روشنی سے منور تھا۔ لوگ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلاتے تھے جلا نہیں سکتے تھے مگر میرا دل اداس رہتا تھا مجھے بجلی سے وحشت ہوتی تھی اور میں پہروں چپ چاپ بیٹھی سوچوں میں کھوئی رہتی تھی اور پتہ ہے تم ......

میں اس کی باتیں توجہ سے سنتا ہوں ــــ ایک ــ دو ــ تین برس گزر جاتے ہیں۔ میں اس کی باتوں سے اکتا جاتا ہوں۔ اسے پردے کے پیچھے کھڑے باتیں کرتے چھوڑ کر میں تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل جاتا ہوں اور وہ ــ جو سب کچھ جانتی ہے۔ نہیں جان سکتی کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

میں گلی سے نکل کر سڑک پر آتا ہوں۔ سڑک پہلے سے زیادہ چوڑی کر دی گئی ہے۔ لیکن ٹریفک کے تناسب سے اب بھی ناکافی ہے۔ فٹ پاتھ پر کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ہر طرف شور و غل ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ میں چوک پر پہنچ کر تازہ اخبار خریدتا ہوں۔ اس میں میرے لئے بہت سی خبریں دلچسپ، نئی اور عجیب ہیں۔ نئے نئے ناموں کے وزیر ــ نئے منصوبے ــ ایک نیا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا ہے۔ ملک میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ میں اخبار پڑھتا اور لوگوں سے ٹکراتا جاتا ہوں کہ اچانک میری نظر اپنی تصویر پر پڑتی ہے۔ میرے چچا نے ان تمام احباب اور رشتہ داروں کا بذریعہ اخبار شکریہ ادا کیا ہے۔ جنھوں نے میری بے وقت موت پر انہیں تعزیتی پیغامات اور تار بھیجے ہیں اور جنھیں وہ فرداً فرداً جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اپنی بے وقت موت کی خبر پڑھ کر میرا جی بھر آتا ہے۔ اور میں دیر تک آنسو بہاتا رہتا ہوں۔ پھر مجھے اپنے چچا کا غم سے نڈھال چہرہ یاد آتا ہے۔ میں اخبار سے آنسو خشک کر کے جلدی جلدی گھر پہنچ جاتا ہوں اور چچا سے اظہار ہمدردی کرتا ہوں ۔ چچی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی ہیں میں انھیں تسلی دیتا ہوں ــ قتل ہو چکا ہے ــ اپنے گیارھویں اور چالیسویں کے پروگرام مرتب کرنے میں چچا کا ہاتھ بٹاتا ہوں اپنے حصے کی جائداد کا حساب کتاب چچا اور اس کے منشیوں کو سمجھاتا ہوں۔ جائداد فروخت کر کے فیکٹری یا کارخانہ لگانے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اپنی نگرانی میں اپنی قبر کو پختہ کراتا ہوں اور اس پر کتبہ لگواتا ہوں۔

جب میں لوٹتا ہوں وہ دوسرے خواب کا حال بیان کر رہی ہوتی ہے۔ چائے ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ میں چپ چاپ آ کر صوفے میں بیٹھ جاتا ہوں کبھی کبھی دروازے کے کھلے پٹ سے ہوا کا نازک سا جھونکا اندر آتا ہے تو میری نظریں اسے ہلکے گلابی رنگ کے پردے تک چھوڑنے جاتی ہیں۔ وہ مجھے نظر نہیں آتی لیکن اس کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے وہ کہہ رہی ہے:

اگرچہ میں وہاں کبھی نہ جا سکی لیکن تمہارے جسم کی خوشبو مجھ تک ہر لمحہ پہنچتی تھی ۔ میں ہر شام خس کی چھت پر کھڑے ہو کر ہوا میں تمہارے جسم کی خوشبو محسوس کرتی اور سمت کا تعین کرتی تھی۔ پھر جس روز تم کنویں کی قید سے رہا ہوئے اس روز صبح سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی اور خوشبو کی کثرت سے مجھے سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔ اور مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اب تم تیسرے خواب کے سفر پر روانہ ہو گے۔"

اس کی باتیں سنتے سنتے تین برس اور بیت جاتے ہیں۔ میں اس کی باتوں سے اکتا جاتا ہوں اور چھٹے برس اس کی آنکھ بچا کر پھر باہر نکل جاتا ہوں اور وہ جو سب کچھ جان لیتی ہے نہیں جان سکتی کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

گلی کی نکڑ پر مجھے ایک نہایت حسین عورت دکھائی

دیتی ہے۔ اسے دیکھ کر میں ٹھٹھک جاتا ہوں پھر اس کے اشاروں پر ناچنے لگتا ہوں۔ جب ناچتے ناچتے تھک جاتا ہوں وہ مجھے اپنے گھر لے جاتی ہے جب میں اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ دروازہ اپنے آپ کھٹاک سے بند ہو جاتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں ایک ایسے گڑھے میں گر جاتا ہوں جس میں لوہے کی بڑی بڑی نوکیلی سلاخیں عموداً گڑی ہوتی ہیں۔ میرا جسم چھلنی ہو جاتا ہے اور میرے جسم سے خون کے فوارے نکلنے لگتے ہیں۔ خوب صورت عورت چہرے سے خوب صورتی کا ماسک اتارتی ہے۔ اس کے لمبے لمبے دانت اور مکروہ عورت دیکھ کر میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ جب مجھے ہوش آتا ہے میری ہڈیاں ننگی ہوتی ہیں۔ انسانی گوشت بھننے کی بو چاروں طرف پھیلی ہوتی ہے۔ قریب ہی میری کھال رکھی ہوتی ہے جس میں جا بجا سوراخ ہیں میں اپنی کھال اٹھا کر اوڑھ لیتا ہوں اور بھاگتا ہوا واپس آجاتا ہوں۔

اسے بالکل پتہ نہیں چلتا وہ اپنے تیسرے خواب کی تفصیل سنا رہی ہوتی ہے۔ میں چائے کی پیالیاں ٹٹولتا ہوں چائے ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ وہ کہتی ہے:

یادداشت میں میرے بدن کا نور جاتا رہا اور میں بھوروں [illegible] ے پونڈوں سیروں میں تلنے لگی۔ پھر بھی میں خوش تھی میرا اندر آباد تھا۔ مجھے تنہائی اور ویرانی سے نجات ملی تھی اور شاید میں ہمیشہ خوش اور مطمئن رہتی اگر مجھے تمہارے بارے میں پتہ نہ ہوتا کہ تم کہاں ہو اور کیا کرتے ہو۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ تم بارہ برس کی قید با مشقت کاٹ رہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں تمہیں بارہ برس کا بن باس ملا تھا اور کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ تم کسی اندھے کنویں میں الٹے لٹک کر بارہ برس سے چلہ کشی کر رہے ہو لیکن میں جانتی تھی مجھے سب کچھ معلوم تھا کہ تم کس طرح دن رات دولت جمع کرنے میں مصروف ہو۔ کاش تم مجھ سے پوچھ لیتے۔ کاش اُس خواب میں میں نے تمہیں بتا دیا ہوتا کہ وہ دولت تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔"

میں اس کی باتیں سنتا رہتا ہوں یہاں تک کہ تین سال اور بیت جاتے ہیں۔ نویں سال میں اکتا کر باہر نکل جاتا ہوں اور وہ سب کچھ جان لیتی ہے نہیں جان سکتی کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

گلی سنسان پڑی ہے۔

کسی گھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے نہ کسی کھڑکی سے کوئی عورت جھانکتی ہے۔ ساری گلی ویران اور خاموش ہے۔ میں سڑک پر آتا ہوں۔ سڑک پر کہیں بھی کوئی نہیں ہے۔ آدمی نہ حیوان، پرندہ نہ چرند۔ ہر طرف مکمل خاموشی ہے۔ موت کا سا سناٹا ہے۔ ہو کا سا عالم ہے۔ دکانیں کھلی ہیں مگر دکاندار اور خریدار نہیں ہیں۔ تانگے اور رکشے سڑک کے ایک طرف یا درمیان میں کھڑے ہیں مگر ان میں کوئی سواری ہے نہ کوئی جانور جتا ہوا ہے۔ مٹھائی کی دکان سجی ہوئی ہے۔ مگر ایک مکھی تک بھنبھناتی نظر نہیں آتی۔ مکان، دکانیں، ہوٹل، بازار، سڑک، گلیاں، چوک کہیں بھی کوئی نہیں ہے۔ کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا نظر نہیں آتا۔ کوئی ذی روح بولتا سنائی نہیں دیتا۔ کاش کہیں کوئی کتا ہی بھونکتا سنائی دے۔ میں خوف سے کانپنے لگتا ہوں۔ اور اس قدر گھمبیر سکوت سے مجھے ہول آنے لگتا ہے۔ میں بھاگ کر ریڈیو کی ایک بڑی دکان میں گھس جاتا ہوں۔ اور باری باری ہر چھوٹے بڑے ریڈیو کی سوئی گھماتا ہوں۔ کسی بینڈ پر کوئی اسٹیشن سنائی نہیں دیتا۔ خوف کے مارے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ اسی لمحے میری نظر قریب پڑے ٹیپ ریکارڈر پر پڑتی ہے۔ میری ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ میں ٹیپ ریکارڈر سے دیر تک انسانی آوازیں سن کر اپنا حوصلہ

بڑھتا جا رہا ہوں۔

اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کا میں تنہا مالک ہوں۔ اور دکانوں، مکانوں، گلیوں، کوچوں اناج اور دولت پر میں اکیلا قابض ہوں اور وہ سب کسی انجانے خوف کی وجہ سے شہروں کے شہر میرے لئے خالی کر کے بھاگ گئے ہیں۔ میں خوشی اور مسرت کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہوں۔

لیکن یہ خدشہ کہ کہیں کوئی اور بھی میری طرح موجود نہ ہو مجھے اچانک فکرمند کر دیتا ہے۔ میں اسلحہ کی دکان سے بندوق اور گولیاں لے کر اس کی تلاش میں نکلتا ہوں، جس کے موجود ہونے کا امکان ہے۔ میں اسے پہلے آہستہ آہستہ بلاتا ہوں۔ پھر بلند آواز میں پکارتا، گالیاں دیتا اور للکارتا ہوں، بزدلی کے طعنے دیتا ہوں لیکن، وہ سامنے نہیں آتا۔ میں اس کی تلاش میں شہر کا چپہ چپہ چھانتا ہوں، لیکن وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ جب مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ کہیں نہیں ہے۔ تو میں ہوائی فائرنگ کر کے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔

اچانک مجھے اس کا خیال آتا ہے۔ میں بھاگتا ہوا واپس آتا ہوں تاکہ اسے خوش خبری سنا سکوں کہ اب دنیا میں صرف میں اور وہ باقی ہیں اور پوری دنیا پر ہماری آنے والی نسلوں کی حکمرانی ہوگی۔

میں چپکے سے آ کر صوفے میں دھنس جاتا ہوں۔ وہ کہتی ہے:

" مجھے سب پتہ ہے تم نے باہر جا کر جو کچھ دیکھا ہے اور جو کچھ سوچا ہے مجھے اس کا بھی علم ہے اور جانتے ہو مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری باتوں کے دوران تم ہر تین سال بعد چپکے سے اٹھ کر باہر چلے جاتے رہے ہو۔ تم میری باتیں سن سن کر اکتا جاتے تھے اس لئے اب میں کچھ نہیں بولوں گی۔ ابھی تین برس باقی ہیں یہ تین برس تمہیں تنہائی اور خاموشی سے اکیلے بیٹھ کر گزارنا ہوں گے۔ ! "

وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو، ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ جو گرنے سے پہلے جم جاتے ہیں۔ میں انہیں اٹھا کر پلیٹ میں چن دیتا ہوں۔ ایک ——— دو ——— تین برس گزر جاتے ہیں۔

تیرھواں برس شروع ہوتا ہے۔ میں اسے پکارتا ہوں۔ چائے ابھی تک گرم ہے۔ میں پردے کی طرف دیکھتا ہوں۔ لیکن وہ سامنے نہیں آتی۔ جواب بھی نہیں دیتی میں اٹھ کر پردہ ہٹاتا ہوں۔ وہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

اسی لمحے انسانی آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ شاید شہر سے بھاگے ہوئے لوگ اپنے گھروں میں واپس آ رہے ہیں۔

——— —

مخمور سعیدی

غزلیں

خوابیدہ چٹانوں کی نیندیں تو اُڑا لائی
ٹکرا کے پہاڑوں سے جب میری صدا آئی

اب گھر کی فضا میں بھی ٹھنڈک ہے نہ سایہ ہے
جلتے ہوئے باہر سے وہ گرم ہوا آئی

تھی دل میں ابھی ہلچل، اب روح بھی ساکت ہے
وہ کس نے پکارا تھا، یہ کس کی صدا آئی؟

مجروح انا آخر کیا اِس کے سوا کرتی؟
احساس کے مقتل میں خوں اپنا بہا آئی

بے چہرہ صداؤں کی اس بھیڑ سے کیا ملتا
آواز مری، اپنا چہرہ بھی گنوا آئی

آغاز سفر ہی سے تنہا تو ہوں میں لیکن
تا دور، مرے ساتھ اک پرچھائیں سی کیا آئی

اُس بزم میں ہر لب پر اب میرے ہی چرچے ہیں
گویا مری خاموشی ہنگامہ اُٹھا آئی

یہ وہم مجھے کیوں ہے، بے خواب نظر میری
جیسے تری پلکوں پر کچھ خواب سجا آئی

کیا سہل، مگر کتنی دشوار وہ راتیں تھیں
جب یاد تری بن کر خود راہ نما آئی

ہر شخص خود اپنے ہی سائے سے گریزاں ہے
مخمور! یہ کیا آفت دنیا پہ بھلا آئی؟

آج اور کل میں جو تھا ربطِ باہم ٹوٹے گا
ایسا لگتا ہے کہ اب یہ بھی بھرم ٹوٹے گا

دے رہا ہے یہ ندا کون فصیلِ شب سے؟
صبح ہوگی، یہ طلسمِ شبِ غم ٹوٹے گا

اتنی آساں بھی نہیں مرگِ تمنا یارو!
ٹوٹتے ٹوٹتے اُمید کا دم ٹوٹے گا

ہم اسے سنگِ حوادث سے بچا لائے ہیں
آئینہ دل کا ترے زیرِ قدم ٹوٹے گا

یہ نہ سوچا تھا کبھی تیری طرف سے ہم نے
دفعتاً سلسلۂ حسنِ کرم ٹوٹے گا

یاد آ جائیں گی کچھ روز پرانی باتیں
روز اس دل پہ کوئی تازہ ستم ٹوٹے گا

کیا بس اتنی سی خطا پر کہ ہنسے تھے کچھ دیر
عمر بھر ہم پہ یونہی قہرِ الم ٹوٹے گا؟

فوج سے کیسے لڑے ایک سپاہی تنہا،
کٹ کے گر جائے گی تلوار، عَلم ٹوٹے گا

منصفِ وقت کے ہاتھوں پہ نظر رکھ مخمور!
فیصلہ جب وہ لکھے گا تو قلم ٹوٹے گا

حامد اکمل

گم شدہ خاتمے

بدلتے ہوئے موسموں کی بُو سے نا آشنا، مائل بہ انحطاط زوال آمادہ انگڑائیوں کے ٹوٹتے ہوئے ہالے، طلب میں دراز ہاتھوں کے خالی کشکول، چبھتے ہوئے سوالوں سے رستے ہوئے آنسوؤں کی آماج گاہ، آنکھیں۔ رات کے پچھلے پہر کسی خواب سے آسودہ ہونے کی بے مطلب طلب تنہا پسند ہو کر لذیذ ہوتی ہوئی مکمل جاتی ہیں (کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں یہ ذہنیت پسند ہے) میز کی دراز میں آدھ جلا، کب کا بجھا سگریٹ سلگ کر انجام کو پہنچنے کا عمل تسلسل پاتے ہی، انجام سے باخبر ہوتے ہوئے وہ خود کو بہت کم مقدار میں بچا پاتا ہے۔

دیوار و در، رات بانہیں پھیلا کر چپ چاپ سناٹے کے حوالہ ہو جاتی ہے۔ ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ سے جھنجھلا کر زنجیر بڑبڑانے کا عمل شروع کر دیتی ہے۔ مٹی کے بھورے کٹورے میں بھرا پانی پاس ہی دھرا تھا، یہ پانی جاگنے سے پہلے کسی نے پی لیا ہے۔ دروازہ اندر سے مقفل۔ کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال کے پیدا ہونے کا عمل بھی وقفہ چاہتا ہوگا۔ مجھے دروازے کے ساتھ رات بھر منتظر رہا جائے، کبھی تو ــ کسی کے لیے یہ دروازہ بند ہی ہوگا۔

دور کسی دروازے پر دستک دینے کے لیے مجھ سے میرے ہاتھ الگ ہو جاتے ہیں۔ کسی ان دیکھے چہرے کی مخصوص پہچان لیے ملنے کی امید میں دوسری طرف پاؤں بڑھاو کر دیتے ہیں۔ آنکھیں دروازے اور کھڑکی پہ چپک جاتی ہیں بقیہ جسم، یخ بستہ فضا سے بستر میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر گامزن اعضا کو پکارتا، بے بسی کی آخری منزل پہ پہنچا ہی چاہتا ہے کہ ...... کسی دوسرے دروازے پر دستک پتھریلی سڑک پر لڑکھڑاتے قدموں کو روک دینے کا عمل کرتی ہے۔ دستک کے لیے اب کونسا دروازہ بچا ہوگا ـ ؟

جگنوؤں اور چمگادڑوں سے ڈری ہوئی آنکھیں اپنے آپ پر ہاتھوں کو پھیلانے کا عمل دہرائے جانے کی منتظر، دو قدموں کے بیچ کا فاصلہ، ایک سرکٹ کا کام کرنا چاہتا ہے۔ سڑک کے کنارے ٹھہرتے ہوئے گندے نالے پر مچھروں کی شہنائیاں، مینڈک کے ہمراز ہونے کے زعم کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ شاید مچھر یہ نہیں جانتے کہ پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے مینڈک کے اچانک حملے سے بچنا کس قدر مشکل ہے۔

ناآسودگی کا بے ہنگم رقص، لحظہ لحظہ اختتام پانے کے لیے بے چین ـــ اور ـــ گھوڑے کی ٹاپوں سے فضا میں پیدا شدہ ارتعاش خود گھوڑے کو مسحور کر دیتا ہے۔ تانگہ والا، بری طرح گالیاں بکنا شروع کر دیتا ہے کہ تھوڑے ہی دیر بعد رات سناٹے کے ساتھ اس سے پہلے کہ یہ سب کچھ ہو۔ ان کا سواریوں کو پہنچانا بے حد ضروری ہے ورنہ اس کا پیٹ کچھ اچھے چنوں کا محتاج ہو جائے گا۔

مونچھوں والا، اس کا زرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے سوچتا ہے، زہر تو نیلا کر دیتا ہے مگر —— یہ زردی۔؟ زندگی میں زرد اور موت کے بعد نیلا کر دینا ہی زہر کے اچھے کوالٹی کا ثبوت ہیں، شاید —— نہیں —— اور....

......اب اس مقام تک پہنچنے کا فاصلہ گھوڑے کی رفتار کے لحاظ سے بالکل کم رہ گیا ہوگا۔ اپنے خیال کو مزید تقویت دینے کے لئے اس کا تانگہ والے سے لفظی تبادلہ ضروری تھا۔

نیم کے چھتنار درخت کے نیچے بابا جذب کے عالم میں ٹہل رہے ہیں۔ گھاس پوس کی بنی کٹیا۔ مونچھوں والا تانگے سے اترتا ہے۔ دوڑ کر پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ "ٹپ" کی آواز کے ساتھ ایک نیم بولی اس کے کندھے پر پڑتی ہے۔

"بابا —— بابا" وہ بڑبڑانے کے انداز میں کہتا ہے: سردجاڑے کی صبح آنکھوں کو پسینہ آنا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ عقیدت کی مجبوری ہے۔

شاید ——————

تانگہ والا بیڑی سلگا کے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرنا شروع کرتا ہے۔

رُکے ہوئے لمحہ کی زنبیل میں سوائے ناکامی کے اور کیا ہوگا۔ مداوائے حسرت۔

"بابا..... کچھ تو بولو، بابا....." مونچھوں والے کی قمیص کا کالر پکڑ کر بابا اسے اوپر اٹھاتے ہیں۔ بابا کی آنکھیں انگاروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ انگارے دہکتے ہوئے انگارے۔ ان انگاروں نے خفتہ رگوں کو چھیڑنے کے عمل میں ناکام ہونا سیکھا ہی نہیں ہے۔

آنکھیں۔ انگارے، دہکتے ہوئے انگارے۔

—— "نہیں بابا۔"

زمین پر بکھری نمولیاں چن کر بابا، مونچھوں والے کا دامن بھر دیتے ہیں، وہ گٹھری بنی بابا کے قدموں پر جھکی ہوئی ہے۔ بابا شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ ایک چٹکی مٹی سے بابا اس کی مانگ بھر دیتے ہیں۔ وہ اٹھ کر ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔

"تم معصوم نہیں ہو"۔ وہ معصوم ہے۔

مونچھوں والے کے تھکے ہوئے دامن میں گرتا ہوا آنسو ٹھہر جاتا ہے (کچھ بھی تو کسی کے بس میں نہیں!)

جسموں کے مطالبہ کا دبا دبا شعلہ، خود اس کے وجود میں دھیما دھیما سلگ کر تہلکہ مچا دیتا ہے۔ ان تینوں کو آتے ہوئے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے گندے ہاتھ میں ایک سفید چمکتا ہوا کشکول ہے، جس میں کئی زمانے کے سکے تاریخ کے مسخ شدہ ہونے کا اعلان لگتے ہیں۔ نیا سکہ ڈالنے سے پہلے مونچھوں والا پرانے سکے دیکھنا چاہتا ہے۔

—————— "کیا دیکھو گے؟ مجھے دیکھو۔ بابا کو تم نے دیکھ لیا ہے۔ تانگے والے کو دیکھو۔ مجھے دیکھنے کے بعد تانگے میں جتے گھوڑے کو دیکھو۔ تمہیں تاریخ کے مسخ شدہ ہونے کا پتہ خود بخود لگ جائے گا۔"

....

"بابا کا کہا ہوا فاصلہ پیدل طے ہو چکا ہے۔
تانگے میں بیٹھ جائیے صاب"

....

"ہاں، کیوں نہیں؟ سوار ہو جاؤ" تانگہ بان اور گھوڑے کے ذہن پر۔ بھوکے ہوتے ہوئے بھوک سے ناآشنا ہو مجھے دیکھو میں بھوک سے آشنا ہوتے ہوئے بھی بھوکا نہیں ہوں۔

[illegible] وجود ۔ میرے کاسہ میں ہے ۔ میرا
[illegible] ......

بابا نے نیمولیوں سے دامن کیوں بھرا ہے ؟ کڑوا پن
(بعض زہر میٹھے بھی تو ہوتے ہیں !)
گھوڑا دم ہلا ہلا کر نیند کو بھگا چکا ہے ۔ دوسرے راستے
سے تانگہ تیزی سے بھاگا جا رہا ہے (ایک راستے سے آنے کے
بعد اسی راستے واپس ہونا تانگہ والے کے عقیدے کے
خلاف ہے)
بچکولے ، ایک دوسرے کے ٹکرانے سے پیدا شدہ
لذت کو لافانی بنانے کے لئے کوشاں ہیں ۔ مونچھوں والے
نے دیکھا ۔ 'اس' کے چہرے سے زردی غائب ہوتی جا رہی
ہے ۔ وہ اب سرخ ہو گیا ہے ۔ سیب ایسا سرخ ۔
ہوا ، تانگے سے باتیں کرتے کرتے تھک گئی ہے ۔
ــــ بابا مریں تو ان کے جسم کو چیونٹیاں نہیں لگیں گی ۔
(اس نے سن رکھا ہے کہ بابا سوائے نیمولیوں کے اور کچھ نہیں
کھاتے)
ــــ بابا نے کتنوں کا بھلا کیا ہوگا ؟ وہ کتنے
مہاپرش ہیں ۔ بابا ۔ بابا ۔ " وہ آب دیدہ ہو جاتا ہے
ــــ " تانگے والے یہ تم نے تانگہ کہاں روکا ہے ؟
(نئی منزل کا راہی سوچ میں گم ہے)
" ــــ گھر آ گیا ہے صاب ۔ "
کھلے ہوئے شگوفے ۔ شگوفے ، شبنم میں نہائے ہوئے
شگوفے ۔ پتیاں عرق آلود ، جبینوں والی سبز پتیاں ، پرند
حلاوت کے نغمے الاپتے ہوئے پرندے
" ارے یہ کیا ــــ ؟ " (گڑیا شاید کسی "شریر بچہ" نے
[illegible] لی ہے ؟)
ــــ میں نے بابا کی موت کے متعلق کیوں سوچا تھا ؟
ــــ ! ــــ ؟) نئی صبح نحوست کا داغ
دامن میں چھپائے طلوع ہوئی ہے ۔ ــــــــ
" ــــ اب کڑاہ ملنے سے رہا بیٹا ، بھوکے مرو ۔ "

" دودھ لے لو صاحب ، دودھ ۔ " جاگی ہوئی آنکھیں
گوالن کی آواز سن کر دروازے کی طرف دیکھتی ہیں ۔ میں
دروازہ کھول کر گلاس اس کی جانب بڑھا رہا ہوں ۔
ناپ میں دودھ لئے وہ میری طرف ایسے دیکھتی ہے
گویا کسی بہت بڑی الجھن میں گرفتار ہو ۔
ــــ " صاحب ' سیٹھ لکشمن داس کی بیوی بھاگ
گئی ۔ "
" ہوں ! " میں ایسے کہتا ہوں جیسے مجھے سب کچھ
معلوم ہو گیا ہو ۔
ــــ پتہ نہیں ۔ کیوں ۔ کون سا ایسا سکھ تھا جو
...... " گوالن کہتے کہتے رک جاتی ہے ۔
" تم ہی کہو نا ، مالتی ... "
" ارے سنا ہے صاحب ، نیم کے پیڑ والے بابا نے بھی
پھانسی لی ہے ۔ "
" کب ــ ؟ " میرے ہاتھ سے دودھ کا گلاس
چھوٹ جاتا ہے ۔
کرچیاں اور گاڑھا دودھ فرش پر پھیل جاتا ہے
میرا تجسس ٹکڑوں میں بکھر چکا ہے
" ــــــ صبح ہی صبح ..... شور ہے
صاحب ..... صبح ہی صبح ..... "
گوالن بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے ۔ ــــ

جوابی امور کے لئے [illegible] مناسب [illegible]
روانہ فرمائیں ۔ (ادارہ)

نازش انصاری

غزلیں

مری آنکھوں میں اب تو کانپتے ہیں
[illegible]

میں ان شہروں کے قصّے بیچتا ہوں
جو قبرستان بنتے جا رہے ہیں

مرے درد آشنا میں اب بھی تنہا
ترے آنسو فرشتے پونچھتے ہیں

یہ راتیں جنگلوں کی آگ جیسی
یہ بے آباد رہنے کے صلے ہیں

وہ دروازے سے لگ کر سو چکی ہے
جسے بازار میں ہم ڈھونڈتے ہیں

سیپ کا درد لئے جب بھی سمندر آیا
اک حباب آنکھ کے ساحل پہ اُبھر کر آیا

گرتے اور گر کے بکھرتے ہیں نصیبوں والے
میری آنکھوں میں کبھی آیا تو پتھّر آیا

ایک افواہ پہ رکھی گئی بُنیادِ سفر
خاک ہو جائے گا جو کوئی برابر آیا

میرے اعزاز کا اندازہ لگایا جائے
مجھ سے ملنے وہ زمینوں سے اُتر کر آیا

وقت دل کھول کے دُہراتا رہا ہے مجھ کو
دشت جب ختم ہوا شہرِ ستم گر آیا

غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

کڑی ایک میں، دوسرا ایک ہے
کہ زنجیر کا سلسلہ ایک ہے

جہاں تک نظر، منزلیں مختلف
جہاں تک قدم، راستہ ایک ہے

چلا آیا میں سب کی سنتا ہوا
یہاں تک کہ اب ہر صدا ایک ہے

حقیقت کسی کی بدلتی نہیں
کہ چاروں طرف آئینہ ایک ہے

کتابیں، پیمبر، مذاہب بہت
خدا ایک تھا اور خدا ایک ہے

روئے افق سے نورِ سحر کون لے گیا
اِس اوج تک کمندِ نظر کون لے گیا

اشجار ہیں کہ نیزے گڑے ہیں زمین میں
وہ برگ و گل، وہ شاخ و ثمر کون لے گیا

نزدیک آتے آتے نگاہوں سے چھپ گئی
منزل پہ میری گردِ سفر کون لے گیا

اِس اوج پر کسے تھاری ذات کا شعور
اتنی تہوں میں آکے گہر کون لے گیا

پہنچے دلوں کو چوٹ تو کوئی پتہ لگائے
ان پتھروں سے چوٹے شرر کون لے گیا

دھیان پرت پرت

احمد منور

منجمد احساس شعلوں کی تپش سے پگھل پگھل کر آنکھوں
[illegible] پلکوں پر تیرنے لگا۔
[illegible] کوئی گیا ہے کیا؟
[illegible] شانت سب کچھ
[illegible] شانت۔

جھیل میں آخری پتھر پھینک کر اس نے گیروے
[illegible] کی چادر سر سے پیر تک تان لی۔
"ہم پرتوں سے نکل کر سیدھے تمہارے پاس آئے
[illegible] کہ ایک آواز قدموں کے نزدیک سرکتی ہوئی محسوس
[illegible] اور دھیان کا عمل جاری تھا۔ جنگلی ہوائیں
[illegible] ہیں۔ اٹھو
بابا! اٹھو بابا!!

مگر جھیل میں پھینکا ہوا پتھر تہہ میں اتر کر خاموش
ہو چکا تھا۔

ہواؤں میں صرف انگلیاں مارنے سے کوئی تصویر
نہیں ابھرتی۔ اندر خوب اندر آنکھیں دھنستی رہیں، اور
گیروے رنگ کی لیپ دھیان کے دائروں پر چڑھتی رہی۔
پھر بات سننے اور بات کہنے میں کتنا فاصلہ ہے۔ کہنے کے
بعد بھول جانے کا عمل راحت بخشتا ہے اور سننے کے بعد
بوجھ اٹھانے کا سلسلہ۔ زندگی کی ہانپتی پیشانی سے
پھولی پھولی نہیں بھاپ بن کر اڑ جاتیں تو نہ سننے کا عمل
ہو سکے گا اور نہ کہنے کا۔

پرتوں میں داخل ہونے کا سلسلہ یوں شروع
ہوا کہ ایک بار بارش میں گھوم گھوم کر لوگوں کو اکٹھا کرنے
کی ہوس میں ہر دروازے پر خود کو تھوڑا تھوڑا چھوڑ آیا
تھا اور گدلے پانیوں کا بہاؤ میرے بچے ہوئے اعضا کو
گلیوں گلیوں لئے پھر رہا تھا۔ اسی بہاؤ میں میرا مخدوش
مکان بھی تیر رہا تھا اور میری بیوی بھی اور میرا دو سالہ بچہ بھی
اور وہ کہتا ....

اور تب یکایک ایک نالی میں مجھے اپنے بچے کی
جانگھیا تیرتی ہوئی نظر آئی تھی اور ایک نالی میں بیوی کی
چھاتی ....

اور اسی طرح ایک دن چلچلاتی دھوپ میں جبکہ
دفتر کی ساری کھڑکیاں ہواؤں کی تپش سے پگھلنے لگی
تھیں میں نے اپنے باس کے جسم سے ایک ایک کپڑے کو
اترتے دیکھا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نالیوں میں تیرتی
اپنے بچے کی جانگھیا تھی اور بیوی کی چھاتی۔
باس بالکل برہنہ تھیں اور فائلوں کے کبوتر پھڑپھڑا کر
فضا میں پرواز کرنے لگے تھے۔

گدھوں کی طرح کوئی پرانی بات ذہن میں آئی تو
نئے موضوع کا جسم زہریلا ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ اور اگر نیا
موضوع خود ہی زہریلا نکلا تو پرانی بات آپ ہی آپ مر جاتی
ہے۔ تو بات جب شروع ہوئی تو وسوسوں میرے اپنے قصبے سے

پہلے پہل ہوتی اچھی رہتی کی طرح (ویسے وشواس نہ جانے کس طرح کلرک بنا ہوتا یا پھر ضلع میونسپل کمشنر یا۔)

شناسائی کا سلسلہ شروع ہوا تو میں وشواس کے قریب ہوتا ہوا اس کی بیوی تک جا پہنچا۔ وہ بھی عجیب نکلا پکّا نکلا۔ دھرتی کے پتھر جیسے سپاٹ سینے سے پروانہ اپجے تو کیسے پتہ چلے کہ اس کی کوکھ میں اینٹھتا بیج ہے۔ انگلیاں تبھی اٹھتی ہیں جب پودا نکلتا ہے۔

عقیدوں کا فرق جوڑ جوڑ توڑ دیتا ہے۔ کہنے کو تو جسم سے صرف جسم ہی سٹتا ہے مگر خود کو دوسرا سمجھنے کی بدبو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مساموں میں بس جاتی ہے۔ بس خوف تھا جو میں ایسا نہ کر سکا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ وشواس کی بیوی ایک روز مجھے خود کو آفر کرتے کرتے بچ گئی تھی یا دوسرے لفظوں میں میں خود کو باس کے سامنے آفر کرتے کرتے بچ گیا تھا۔

اندر خوب اندر آنکھیں جھنتی رہیں اور گیروئے رنگ کی لیپ دھیان کے دائروں پر چڑھتی رہی۔

تو جس دن بارش ہوئی تھی اور میرا روم روم بھیگا ہوا تھا۔ سامنے بنارس بینک چوک پر انسانی جسموں کے گوشت نوچے گئے تھے اور پٹرول کی قیمت بڑھتے ہی اناجوں کے گودام بھائیں بھائیں کرنے لگے تھے آتما سے خالی جسموں کی طرح! ـــــ اور جب اس حادثے کا سرخ سرخ خون سیاہی میں تبدیل ہونے لگا تو وشواس نے میرے بازو پر ایک تھیلا لٹکا دیا جس کا استعمال یوں ہوا کہ بارش میں بہتے ہوئے مختلف شکلوں کی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر میں تھیلے میں ڈالنے لگا۔ جس طرح کوئلہ چننے والیاں، جلے ہوئے کوئلے اکٹھا کیا کرتی ہیں۔ مگر جیسے ہی میں اس گلی سے بائیں مڑا لوگوں کا ہجوم تھیلے پر ٹوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ نہ کچھ اٹھا کر وہ سب بھاگنے لگے۔ کسی نے تو تلی زبان اور کسی نے اپنی کھوپڑی۔ اور تب بارش کی تیز ابی بوندیں مجھے اندھا بنانے لگیں۔ میں لگاتار پکارتا رہا آواز دیتا رہا مگر خاموشی کی لیپ دروازے اور کھڑکیوں پر چڑھ چکی تھی۔ بس سڑکوں پر گدلا پانی بہہ رہا تھا۔

مندر کا پجاری سنکھ بجا بجا کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگا کہ مندر کی سیڑھیوں پر پانی دھیرے دھیرے چڑھنے لگا ہے اور یہ بھی کہ تیسری سیڑھی پر بیٹھا وہ اپاہج فقیر غلاظتوں کے ساتھ کہیں بہہ گیا ہے۔

جب دروازے اور کھڑکیاں کافی دستکوں کے بعد بھی بند رہے تو مجبوراً باتھ روم کی پچھلی نالی کے پائپ کا سہارا لینا پڑا اور جب روشندان سے کود کر اندر داخل ہوا تو سارا سماں شکستگی کی پرتوں میں لپٹا ہوا تھا۔ بیوی اور بچے ٹکڑوں میں بٹے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ اور اس گھر کے سارے افراد خوشیوں سے بھرے تالیاں پیٹ رہے تھے اور رقص میں مشغول تھے۔ تالیاں پیٹتے پیٹتے جب ان پر غشی سی طاری ہونے لگی تو میں نے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو تھیلے میں رکھا اور دروازہ کھول کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور جب اس طرح سڑکوں پر دیوانہ وار بھاگتے بھاگتے ایک مقام پر رکا تو قریب ہی کے کسی مکان سے ایک بدبودار قہقہے کی آواز سنائی دی۔ تب میں تھیلا اٹھائے اس مکان کی جانب بڑھا۔

لاکھ کھٹکھٹانے کے باوجود جب دروازہ نہ کھلا تو پھر وہی باتھ روم کی پچھلی نالی کے پائپ کا سہارا لینا پڑا۔ روشن دان سے کود کر اندر پہنچنے پر پھر وہی ہولناک منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ وشواس کی بیوی، بچے ٹکڑوں میں بٹے فرش پر بکھرے پڑے تھے اور ہیبت ناک رقص کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے وہاں سے بھی ان ٹکڑوں کو تھیلے میں رکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل پڑا۔ محلے کی ساری گلیاں ویران تھیں۔ صرف خطوں کا گٹھر اٹھائے ڈاکیہ لوگوں کا پتہ پوچھتا چل رہا تھا۔ میں بھی ڈاکیہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور جب ایک جھونپڑی

ویک رک کر ڈاکیہ نے اشتیاق احمد کا نام پکارا تو وہ چیخ پڑا ــــــــــــــ
"میری کوئی چٹھی نہیں آنے کو۔ میں کئی برسوں سے خود کو چٹھی لکھ لکھ کے ہار چکا ہوں۔ تھک کر جواب کا انتظار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ سب مردہ ہو چکے ہیں مردہ! چلے جاؤ! چلے جاؤ! ہا...... ہا...... ہا۔"

تب ڈاکیہ اس کی چٹھی بائیں والے تھیلے میں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ دشوموہن کا دروازہ کھٹکھٹانے پر اس کی بوڑھی ماں سسکیاں بھرنے لگی۔ "میرا بیٹا گیان مارگ کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے کہیں گم ہو گیا اس کی بیوی نے ایک بچہ جنا ہے۔ ہو سکے تو اس کے لئے کچھ پھل دے جاؤ اور چٹھی کو ہوا میں اچھال دو!"

تو دشوموہن کی چٹھی بھی اس نے بائیں والے تھیلے میں ڈال دی۔ تیسرے دروازے پر جیون نے اپنی جانب سے ایک چٹھی اس کے تھیلے میں ڈال دی کہ آخری وقت میں رابطہ قائم کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں۔ اور تب چوتھا دروازہ اور پانچواں اور چھٹا۔ پھر جب دائیں تھیلے کی ساری چٹھیاں بائیں تھیلے میں بھر گئیں تو ڈاکیہ گھبرا کے محلے سے باہر چلا گیا۔

بلڈ پریشر کا اثر ساری قوت پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

ــــــــــــــ اور دشواس کے ادریتر بچے، بیوی اپنی صحیح شکل میں آنے کے لئے بے چین تھے۔ لیکن ادھر سے گزرتے ہوئے سادھوؤں کی ٹولی نے راشی پھل سامنے رکھ دیا کہ دھیان میں ڈوبے بنا نہیں اس کرب سے نجات نہیں مل سکتی اور یہ بھی کہ دھیان میں ڈوبے رہنے کے دوران ایک آواز قدموں کے نزدیک گر پڑے گی۔ اور آواز کے گرتے ہی بیوی بچے سینے سے آلگیں۔

اور وہ راستہ جس کے سینے پر "راستہ بند ہے" کا بورڈ لگا ہے۔ آپ ہی آپ ہٹ جائے گا کہ سارا عمل رکنے سے ہٹ جانے کے کارن ہے۔

لیکن کئی موسموں کی خشکی سہہ لینے کے بعد بھی دھیان کی کئی سیڑھیاں چڑھنا باقی ہے اور ہر ایک سیڑھی چڑھتے ہی رشتوں کی چاپ قریب ہی سرکتی محسوس ہوتی ہے اور دھیان کا سارا عمل موہ کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور اسی طرح نامکمل دھیان کے گرد طواف کرتے ہوئے پرتوں میں داخل ہونے کا سلسلہ جاری ہے اور آواز کی گونج ــــــــــــــ

"بابا! اس راستے پر کوئی گیا ہے کیا؟"
"نہیں راستہ بند ہے ــــــــــــــ شانت سب کچھ شانت!"
ــــ ــــ

عبدالرحیم نشتر

خلیق تنویر

غزلیں

(عابد ادیب کے نام)

چہکتا بولتا زندہ لہو رگوں میں تھا
عجیب شور سمندر کہیں دلوں میں تھا

وہیں تو سخت ارادوں کی نبض ڈوب گئی
اک انتشار کا منظر جدھر صفوں میں تھا

سفر کی رات تھی صحرا میں گھر کی یاد آئی
وہ اک پناہ کا احساس بھی گھروں میں تھا

بس ایک نیند کی آہٹ بچھڑ گئے کہیں بدن
فشارِ جاں کا آزار بھی شبوں میں تھا

عجب گھڑی تھی گھٹی چپ بیان کر نہ سکے
نہ جانے کون سا غم درد کی تہوں میں تھا

خاکِ طلب اُڑانے لگی آنکھ میں دھواں
چلتے رہو تو ساتھ چلے گا یہ آسماں
آکاش بان چھوڑ دیا کس نے خاک سے
بارود پھینکنے لگا دھرتی پہ آسماں
خوشبو اُڑی تو اس کے تعاقب میں چل پڑیں
آنکھوں میں گنگناتی ہوئی شوخ تتلیاں
بچوں کے شور و غل میں کہیں کھو گیا ہوں میں
اُتری ہیں آسماں سے فرشتوں کی ٹولیاں
بارش کی بوند بوند میں گرتا ہوا خُ[illegible]
سیلاب بن کے پھیل گیا ہے [illegible]
ہوتی رہیں سروں پہ ہواؤں کی [illegible]
چاروں طرف اڑاتی پھریں برگِ جسم و جاں
آنکھوں نے یہ بھی آخری احسان اُٹھالیا
خاکِ زوال سے بھی منور ہیں پتلیاں

بیٹھا۔ [illegible] ترملا بیٹھی تھی۔ ان کی سانس تیز ہوگئی۔ وہ چل قدموں سے [illegible] کے قریب پہونچے اور بڑی نرمی سے پوچھا "ادھر کدھر ..... یہاں کیا کر رہی ہو۔ تم سینما گئی تھیں نا۔؟"

"نہیں" ترملا نے انکار کر دیا۔

"کیا ۔؟ کیا تم سینما نہیں گئیں۔"

"ٹکٹ نہیں ملا، بہت لمبا کیو تھا اور ٹکٹ بہت پہلے ختم ہوگیا تھا۔"

"پھر گھر واپس آجانا چاہئے تھا۔ پانی میں کتنی بھیگ رہی ہو۔ گھر آنے میں کیا حرج تھا ...... ؟"

"اب جا رہی ہوں۔"

اس نے دھیمی آواز میں کہا اور سر جھکائے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ جیسے سینما ختم ہوگیا ہو۔ بنیا بابو کو ایسا محسوس ہوا ترملا کی چال میں سپردگی ہے اور آنکھوں میں وہی خاموش خاموش ہلکی ہلکی نراز کی کیفیت جو چند سال قبل انہوں نے نوری بالا کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ —— ——

غزلیں

شفاعت ترنم

یوں تمہاری بے رخی سے ڈر لگا
زندگی بھر زندگی سے ڈر لگا

اس قدر دشمن رہے ہیں دوست
دوستوں کی دوستی سے ڈر لگا

.تذکرے کا ہوا عادی مزاج
کھڑکیوں کی روشنی سے ڈر لگا

ہوش میں جب آگئے میکش تمام
میکدے کی خامشی سے ڈر لگا

جس سے بڑھ جاتی ہے دل کی دھڑکنیں
اُس شعورِ آگہی سے ڈر لگا

جب کبھی دیکھا ہے خود کو غور سے
حالتِ بے چارگی سے ڈر لگا

اے ترنم حالِ دل کہتے ہوئے
صرف اپنی سادگی سے ڈر لگا

صلاح الدین [illegible]

میں یہ کب کہتا ہوں اتنا بھی ستم کوش ہو
آدمی کچھ سہی احسان فراموش نہ ہو

کتنے لمحوں کو سمیٹے ہوئے آئی ہے بہار !
یہ بھی رُت پھولوں کی ڈرتا ہوں کفن پوش نہ ہو

میرے حالات بڑے شوق سے لکھو لیکن
کوئی لمحہ مرے ماضی کا فراموش نہ ہو

میرے ساغر میں ہے ساقی کی نگاہوں کا بھرم
شمعِ احساس سے کہہ دو ابھی خاموش نہ ہو

زہرِ خاموشیٔ غم اور پلاؤ یارو !
خود کو پہچان لوں اتنا بھی مجھے ہوش نہ ہو

حُسنِ سادہ کو ترستی ہیں نگاہیں نیّر !
پسِ پردہ ہی سہی ہم سے وہ روپوش نہ ہو

الوزسدید

نئی نظم کا مطالعہ

نظم / شمس الرحمان فاروقی

اس سال میرے باغ پہ بارش نہیں ہوئی

اس سال
میں نہ شہر میں آوارہ ہی پھرا
اینٹوں کی باڑ کا نہ مجھے زخم سا لگا
سرپٹ دھواں، نہ گرد مری آنکھ میں بھری
لوگوں کی بھیڑ، ان کی بغل بند بو، گھٹن
یہ مجھ کو موجِ موجۂ طوفاں سے کم نہ تھے

مکتب کھلے تو گلیوں کی شاخوں پہ جا بہ جا
کھلتے لبوں، کھنکتے گلوں کے چمن کھلے
لیکن مجھے تو دھوپ کی سرخی حرام تھی
میں طاقِ فکر و خواب کا تنہا چراغ تھا

اس سال
میرے باغ پہ بارش نہیں ہوئی
وحشی ہوا کے بوسے کو شاخیں ترس گئیں
مٹی کی گرم خوشبوئے پیکر لباس میں
چٹیل ورق زمین کی تہ میں ٹھٹھر گئی
ایسا پہاڑ باغ
نپٹ بانجھ ہو گیا

یہ ایک عجیب نظم ہے۔ میں اس سے پہلی ملاقات میں ہی مانوس ہو گیا ہوں لیکن اس نے ابھی تک میری طرف

موالفت کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ نہ مصافحہ نہ معانقہ۔ پھر بھی نظم کو پڑھ کر میں اس کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنا چاہتا
نظم اتنی کشور ہے کہ پہلی قرأت میں اپنا مفہوم آشکار ہی نہیں کرتا۔ میں نے اس کے بکھرے ہوئے تراشیدہ لفظوں اور
ترکیبوں سے مربوط کہانی مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ (میراجی ہر نظم کے ساتھ ابتدائی طور پر یہی عمل کیا کرتے تھے) میں
صوتی ہیولوں کے ساتھ بہتا رہا۔ علامت کی کلید تلاش کرنے کے لئے بارش، باغ اور بانجھ پن کے انسلاکات سے
سالی کا مفہوم اخذ کرنے کی سعی کی۔ پھر عنوان کی طرف نظر دوڑائی۔ چونکہ نظم بے عنوان ہے اس لئے یہاں بھی گرہ کشائی نہ
ہو سکی۔ اس سب کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے داخل میں کوئی نداکا بلاوا ضرور موجود ہے جو مجھے پیچھے مڑ کر
دیکھنے کے بجائے آگے لپکنے کی دعوت دے رہا ہے۔ شاید جادو کا یہی لفظ مجھے نظم دوبارہ پڑھنے اور اس کے معنی تلاش کرنے
پر مسلسل آمادہ کر رہا ہے۔ میرے خیال میں اس نظم کی اولین خوبی یہی ہے کہ ابلاغ کی پیچیدگی کے باوجود قاری اس نظم کی ہئیت
سے مانوس ہونے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔

اب دوسری قرأت میں ایک کردار اُبھرنے لگا ہے۔ یہ شہروں شہروں، گلیوں گلیوں پھرنے والے کسی دیوانے کا کردار
ہے۔ جس کے پیچھے لڑکے بالے پتھر لے کر بھاگ رہے ہیں۔ اور اب اس کے ساتھ ہی غالب کا یہ شعر میرے ذہن میں تیرنے لگا ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

نظم کی پہلی سطر میں "باغ" اسی دیوانے کی ذات کی علامت ہے اور بارش سے مراد بارشِ سنگ ہے۔ اب کے یہ دیوانہ چونکہ
شہر میں آوارہ نہیں پھرا اس لئے وہ طفلانِ مکتب کی بارشِ سنگ سے محفوظ رہا ہے۔ طفلانِ مکتب کے خیال کو دوسرے بند کی
مندرجہ ذیل سطریں بھی واضح کرتی ہیں۔

مکتب کھلے تو گلیوں کی شاخوں پہ جا بجا
کھلتے لبوں، کھنکتے گلوں کے چمن کھلے

لیکن دیوانہ چونکہ اپنے تئیں" طاقِ فکر و خواب کا تنہا چراغ" بھی ہے اور اس نے اپنے اوپر" دھوپ کی سرخی" حرام
کر رکھی ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ خلوت کے بطنِ ماہی میں ڈوب کر عرفان کی کسی نئی منزل کو تلاش کرنے میں مصروف
ہے۔ چنانچہ وہ " گلیوں کی شاخوں پہ کھلتے لبوں اور کھنکتے گلوں " کی گل باری کا معمول نہیں بنا۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ پتھر کھانا اب اس دیوانے کی عادت بن چکی ہے اور خلوت کا کنج تنہائی اسے راس نہیں آرہا۔ یہی وجہ ہے کہ کھنکتے گلوں
کی بارش نہ ہونے سے اس کے دل میں ایک جانکاہ حسرت نے جنم لیا ہے اور انتہا یہ ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو یکسر بانجھ تصور
کرنے لگا ہے۔ آخری بند کی یہ سطریں:

وحشی ہوا کے بوسے کو آنکھیں ترس گئیں
مٹی کی گرم خوشبوئے پیکر لباس بھی
چٹیل ورق زمین کی تہہ میں ٹھٹھر گئی

حسرت اور بانجھ پن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

[illegible] کی اجنبیت ختم ہو رہی ہے۔ اور وہ میری طرف محبت کا ہاتھ بڑھا رہی ہے۔ میری قرأت میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نظم میں معنوی طور پر تخلیقی برانگیختگی کے لئے خارجی تحریک کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ طاقِ فکر و خواب کا تنہا چراغ وہ شاعر ہے جو اپنے من کے غارِ حرا میں تنہا جلتا ہے لیکن وہ عامۃ الناس سے کٹا ہوا نہیں۔ عوام سے اس شاعر کو جو والہانہ محبت ہے، وہ ان دو سطروں سے عیاں ہوتی ہے۔

لوگوں کی بھیڑ، ان کی بغل بند بو، گھٹن
یہ مجھ کو موجِ موجۂ طوفاں سے کم نہ تھے

اور اب مجھ پر نظم کی یہ گتھی بھی کھلتی ہے کہ فن کی تخلیق داخل اور خارج کی آویزش کا نام نہیں بلکہ ان دونوں کے ربط باہم کا عمل ہے۔ یہ باہمی ربط اگر ظہور میں نہ آئے تو بہار ایسا باغ بھی بانجھ ہو جاتا ہے اور زندگی کا ارتقا رک جاتا ہے۔ یہ مفہوم جو اب مجھ پر منکشف ہوا ہے نظم کے ظاہری پیرہن میں شاید موجود نظر نہیں آتا لیکن مجھے جیسے یقین آرہا ہے کہ شاعر نے لاشعوری طور پر اسی موضوع کو بالواسطہ طور پر بیان کرنے کے لئے نظم کہی ہے اور وہ اس میں کتنا کامیاب ہے۔

نظم کی مجموعی فضا حزنیہ ہے۔ اسے پڑھ کر ایک خاص قسم کی جراحت طبیعت پر ابھارتی ہے۔ اور اس سے محرومی کا احساس حزنیہ فضا کو اور بھی دبیز کر دیتا ہے۔ شاعر نے پہلی سطر میں "باغ میں بارش نہ ہوتے" اور آخری سطر میں "باغ کے پیٹ بانجھ ہو جانے کا تذکرہ کرکے اظہار کا دائرہ مکمل کر دیا ہے۔ پھر بھی یہ نظم کسی واضح اور مربوط تصور کو جنم نہیں دیتی۔ بلکہ اس تصور کی تلاش کے لئے قاری کی سوچ کو مہمیز لگاتی ہے۔ نظم کی اس خوبی کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ —— ——

تبصرہ

نام کتاب : اپنے آپ کا قیدی
مصنف : احمد عثمانی
صفحات : ۱۱۲
قیمت : چار روپے
ناشر : سلطان سبحانی، انجمن ترقی پسند مصنفین، مالیگاؤں

مبصر : عشرت ظہیر

اردو افسانہ ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ لیکن اب بھی بعض پچھلے لوازم ایسے ہیں جنھیں وہ دوبارہ گلے لگانے پر آمادہ ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے بعد اکثر فن کار اپنی کتابوں یا مجموعے میں پیش لفظ کو شامل کرنا، پڑھنے والوں پر ناجائز دباؤ تصور کرتے تھے۔ لیکن اب پھر دعوائے تکمیل فن کے باوجود نہ معلوم کیا کمی رہ گئی ہے کہ ان دنوں بیشتر فن کار اپنے مجموعے میں کسی بڑے ادیب سے پیش لفظ لکھواتے ہیں یا کسی بڑی شخصیت کے نام اپنی کتاب معنون کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر صورتوں میں دونوں حربے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

جناب احمد عثمانی کے افسانوں کا مجموعہ "اپنے آپ کا قیدی" میں بھی یہ سب موجود ہے۔ کتاب کے شروع میں جناب راجندر سنگھ بیدی نے 'پیش لفظ' تحریر کیا ہے۔ اور آخری حصے میں جناب سلطان سبحانی نے تعارف تحریر فرمایا ہے۔ اور یوں پڑھنے والا ان دونوں "پیش لفظ" کے بیچ میں سینڈوچ بن کر رہ جاتا ہے۔

احمد عثمانی نے اپنے متعلق لکھتے ہوئے ایک فن کار کے لئے جو شرط لگائی ہے، وہ زندگی کی ترجمانی ہے۔ جبکہ زندگی کوئی سادہ عمل نہیں ہے۔ بلکہ ایک مرکب عمل ہے۔ اس میں اُتار بھی ہے اور چڑھاؤ بھی، اس کے دامن میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ لیکن جناب راجندر سنگھ بیدی جناب احمد عثمانی کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں :

> "احمد عثمانی ان معنوں کے افسانہ نگار نہیں ہیں جن معنوں میں افسانے کو بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کہ شروع میں سلسلہ وار پیچ رومان یا پُر پیچ کردار نگاری اور ہمت بالخیر، ان کے افسانوں کا شروع بھی وہی ہے جو آخر ہے۔"

فن کار جب حالات کی بھٹی میں تپتا ہے، تب اس کے جذبات میں شدت آتی ہے، جس کی موجودگی، فن پاروں میں وحدت اثر کی دلیل ہوتی ہے۔ احمد عثمانی کے افسانے ان کے حالات میں تپنے اور ان کے جذبات

[illegible] کھل کر ظاہر ہیں۔ یوں تو ان کے تمام افسانے مختصر ہیں لیکن مختصر تر افسانے میں وحدت اثر کا تاثر [illegible] (پھیلے ہوئے) افسانوں سے کہیں زیادہ گہرا اور شدید ہے۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ "پناہ" مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

جب فساد کی آگ بھڑکتی ہے، تو اپنے کمرے میں محبوس شخص دروازہ پر دی گئی دستک کو اپنی موت کا پرکارہ تصور کرتا ہے اور اس خیال سے کانپ جاتا ہے کہ اب وہ قتل کر دیا جائے گا۔ حالانکہ یہ دستک فساد زدہ شخص کی فریاد تھی جو پناہ کا متلاشی تھا۔ لیکن کمرے میں مقید انسان حالات کے بہاؤ کے زیر اثر ایسا سوچنے پر مجبور ہے۔ دراصل انسان کی تمام مصیبتیں اس کی خود ساختہ ہیں۔ افسانہ نگار کا احاطۂ تفکر سیاسی بھی ہے اور نفسیاتی بھی۔ کسی نقطۂ نظر سے افسانہ کو پڑھئے، پرکھئے یہ افسانہ صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں تعاون کرے گا۔

افسانہ "نیا پیغمبر" اپنے موضوع کے اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ یہ افسانہ احمد عثمانی کے مختصر تر افسانے کے لحاظ سے اپنے کینوس میں خاصا پھیلا ہوا ہے۔ اور اس پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احمد عثمانی کو لاشعوری طور پر اپنے افسانے کے چھوٹے ہونے کا شدید احساس ہے، شاید اس احساس کی چبھن سے نجات کی خاطر "نیا پیغمبر" کو غیر ضروری طوالت دینے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں افسانہ اپنا حسن اور تاثر کھو دیتا ہے۔ یہ افسانہ سات صفحات پر مشتمل ہے۔ جبکہ وہ اپنے مخصوص مختصر تر افسانے کی طرح اسے بھی ابتدائی (صرف) سات سطروں میں ختم کر سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو یہ سات سطریں،

"پہاڑی پر کھڑے ہو کر میں نے دیکھا۔
ایک آدمی پتھر کو اٹھا رہا ہے، غور سے دیکھ رہا ہے پھر انہیں لاپرواہی سے پھینک رہا ہے۔
میں دھیرے دھیرے اس کے قریب چلا گیا۔ میرے وجود سے لاپرواہ وہ مسلسل اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھا۔ میں کھنکارا۔ لیکن اس پر جیسے اثر ہی نہیں ہوا۔ میں سمجھا شاید اس کی سماعت خراب ہے اس لئے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔
"آپ یہ کیا کر رہے ہیں جناب؟"
"آدمی کی تلاش!" مختصر سا جواب ملا ــــــــــــــ"

"نیا پیغمبر" کے ابتدائی یہ سات لائن ہیں، درحقیقت پورا افسانہ یہی ہے، جسے کھینچ تان کر، توضیح اور تاویل کے سہارے سات صفحات سیاہ کئے گئے ہیں۔

افسانہ "عکس نما" کے سلسلے میں جناب سلطان سبحانی تحریر فرماتے ہیں:۔
"عکس نما ایک نئے جہان کی دریافت سے کم نہیں۔ یہ افسانہ خود کو مکمل طور پر آزاد رکھے ہوئے ہے۔ ایسے میں تکنیک کا کامیاب تجربہ سمجھتا ہوں۔"

"عکس نما" اپنی نوعیت کے لحاظ سے شعور کی رو سے ملتا جلتا افسانہ ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہاں ہر جملہ نفسیات کی ایک گتھی ہوتا ہے اور یہاں ہر جملہ سیاسی پہلو کا ترجمان ہے۔ مثلاً،

"آج کل بچے بہت کم پیدا ہو رہے ہیں۔" (فیملی پلاننگ)

"حجاموں کی دکانیں بند ہو گئی ہیں ننگے سر پر لوگوں نے بالوں کا سایہ کر لیا ہے۔" (ہپی ازم)

"امریکہ امن کے لئے جنگ کرتا ہے سنا تم نے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے" (ویت نام کی جنگ)

بہر حال یہ افسانہ INTELLIGENCE TEST کا QUESTION تو ہو سکتا ہے لیکن افسانوی ادب میں نہ کوئی نیا تجربہ نہ نئے جہان کی دریافت ـــ !

تاہم احمد عثمانی بنیادی طور پر ایک فن کار ہیں وہ کسی چیز کو صرف دیکھتے ہی نہیں بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مختلف موضوع سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں صوفی کی ذاتی پرواز بھی ہے اور عہد حاضر کے سیاسی منظر و پس منظر کی تفسیر بھی ہے۔

"اپنے آپ کا قیدی" کے مصنف نے خود کو رومانیت اور خوش اعتقادی کے پُر فریب جال سے بچایا ہے اور اپنے افسانوں میں حقیقی زندگی کی فضا پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد عثمانی کے افسانوں میں انتشار، بے چینی، بیزاری اور اُلجھن کا احساس گہرا اور شدید ہے۔
زیر نظر مجموعہ کے مطالعہ سے مایوسی نہیں ہوتی۔

[illegible] ریڈ ہاؤس ، بیگ جوان روڈ ، گیا
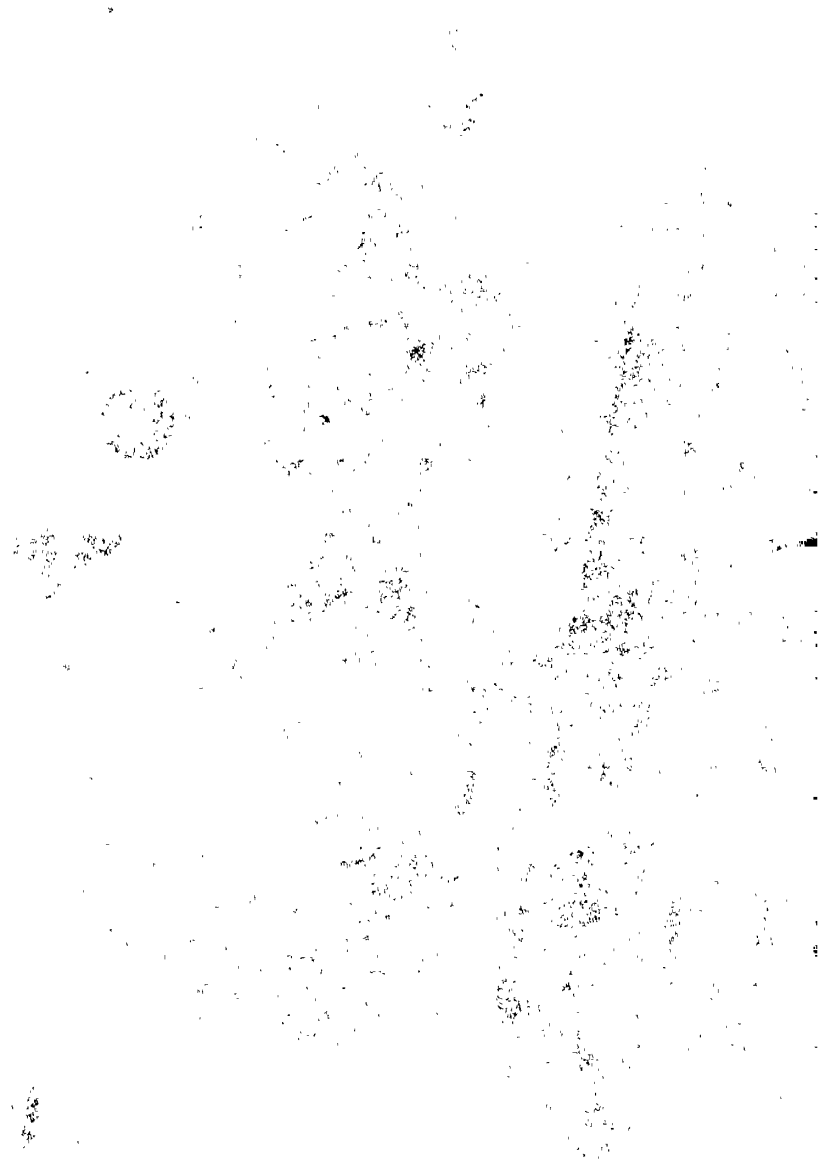
مئی ۱۹۷۵ء
شمارہ ۵۹

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

فی شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

۵۳
۴۳۲

قمر نظامی

پریس کلو گنج گیا

مدیر

کلام حیدری

محتویات

مضامین

افسانے

ڈرامہ

نظمیں

غزلیں

تبصرے

نئی نظم کا مطالعہ

ظہیر صدیقی

ہمیں سوچنا ہے

[نظم ہو گئی تو محسوس ہوا کہ دورانِ تخلیق، میرے ذہن پر (لاشعوری طور پر ہی سہی) آہنگ کے اداریوں نے ضرب کاری کی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ نظم ہے ۔ لہٰذا آہنگ کی نذر ہے —— میں اس نظم کو آہنگ کے اداریہ کے تئیں معنون کرتا ہوں ۔ ظہیر صدیقی]

زباں
آڑی ترچھی لکیریں
یہ نقطے ۔ یہ قوسین
بے مشکل شکلیں
دھواں دھار خطبے
نفع بخش گندہ سیاست
کتابوں پہ انعام کے نام پر چار پیسے
فقط چند بازاری ناول
پھڑکتی پھدکتی چند غزلیں
جنہیں بزم میں
کوئی شاعر ۔ طوائف ۔ گویّا الاپے
تو ہم جھوم کر داد دیں
اور بس —— !

یہ شہادت کی انگلی
جسے پیار سے تھام کر
ماں نے پہلے پہل
آڑی ترچھی لکیروں پہ رکھا
قلم ہو بھی جائے تو کیا
ماں کی شفقت کے صدقے
ہمارے دل و ذہن کے ریشے ریشے میں پنہاں
مہذب صداؤں کی جھنکار
نقطوں کے جھومر
زیر زبر کے پیچ و خم

آج بھی
اپنی تہذیب کے اس سفر میں
معاون ہیں ۔ زاد سفر ہیں
ہمارے لئے یہ زباں
دین و مذہب ہے
تہذیب و تاریخ بھی ہے
فقط چند جذبوں کے اظہار کا
اضطراری وسیلہ نہیں ہے
ہمیں فکر اپنی نہیں
نصف سے کچھ زیادہ ہی
ہم عمر کی راہ پر چل چکے ہیں
ہمارے لہو میں ــــــــ
دل و ذہن میں ماں کی بخشی ہوئی زندگی
کی حرارت ہے

ــــــــ ہاں
آنے والے زمانے کی خاطر ہمیں سوچنا ہے
کہ نو عمر بچوں کی توتلی صداؤں کو
مفہوم کی نغمگی کون دے گا
مُ نہیں
یوں تو اظہار کے سو وسیلے ملیں گے

مگر وہ وسیلہ
جو آغوشِ مادر میں پلتا ہے
تہذیب و تاریخ و مذہب کی تزئین کرتا ہے
نو عمر بچوں کو بھی مل سکے گا

ہمیں فکر اپنی نہیں
شاخ گل کٹ بھی جائے تو کیا
نسلِ گل ختم ہوتی نہیں ہے
رگوں میں مچلتی ہوئی موجِ نکہت
دبانے سے گلشن میں گھٹتی نہیں ہے
مگر تخمِ گل کی حفاظت ؟
سبھی شیر خواروں کو
آغوش مادر کی حاجت ؟ ؟
ہمیں سوچنا ہے
ــــــــ ابھی سوچنا ہے !

سید مجیب الرحمن

تلسی داس کے آس پاس

غالب خوش نصیب تھے کہ کم از کم مرنے کے ایک سو سال بعد تو زندہ کہلا سکے۔ مگر تلسی داس بیچارے تقریباً چار سو سالوں سے "رام چرت مانس" میں گم ہیں۔ اور ہم انھیں یاد تک نہیں کرتے۔

تلسی داس کی بڑائی صرف اس لئے نہیں ہے کہ انہوں نے کویتا ولی، گیتا ولی، ونے پتریکا اور رام چرت مانس لکھا۔ وہ اس لئے عظیم ہیں کہ وہ ہر بڑی تہذیب اور ہر بڑی تاریخ کی طرح ایک قول محال ہیں۔ ویسے یہ تعریف اتنی وسیع ہے کہ ہر بڑے آدمی پر صادق آتی ہے۔ گویا بڑا شاعر وہی ہے جو تلسی داس بنے۔ غالباً اسی لئے سید علی ظفر نے یہ شعر کہا تھا:

پل پل کایا چولا بدلے اور گھومے آکاس
سید زادہ بن گیا تلسی داس

جس برصغیر میں تلسی داس پیدا ہوئے وہ ایک اکائی بھی ہے اور تنوع کا بہار بھی اور اسی کیفیت کو اقبال مرحوم اس طرح پیش کرتے ہیں:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا	نانک نے جس زمیں میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا	جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

تلسی داس ایک عظیم فن کار کی طرح سری رام چندر جی کے آدرش کو اپنا مرکز بناتے ہوئے روایت کا خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں اور تہذیب کی ساری جدلی قدروں کو اپنے گھیرے میں اس طرح سمو لیتے ہیں کہ اب یہ پتہ تک نہیں چلتا کہ یہ ادبی تخلیقات ویدوں کی مخالفت کرنے والے بدھ مذہب کے مہایانی فرقے کے تصورات سے متاثر ہیں کہ مذہب ایک ایسا وشال رتھ ہو جس میں بیچ اونچ چھوٹے اور بڑے سبھی کو بٹھا کر نروان تک پہنچایا جا سکے۔ ان میں سکھوں کے ایک قبیلے آبیروں کے پرمارک گیتوں کا رس ہے۔ ان میں سن عیسوی کے بعد کے سنسکرت ادب سے انحراف کی علامتیں ملتی ہیں۔ ان میں دسویں صدی عیسوی کی اس لوک بھاشا کا تصور ملتا ہے جسے راجہ بھوج نے سنسکرت کے بجائے اپ بھرنش بھاشا میں کوی سمیلن چلانے کی غرض سے شروع کیا تھا۔ اس میں ہندو دھرم کی ذات پات کی راما نندی روایت کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش ملتی ہے کہ کم از کم عبادت کی جگہ تو سب کو ایک جیسا سمجھو۔

تلسی داس اسی را مانند کی دین ہیں۔ جس کے شیشوں میں براہمن سے چمار تک بھی ذات پات کے لوگ ... رامانند کے شیشوں میں بارہ[12] سنت کوی ہوئے ہیں۔ جن میں چمار، جلاہے، جاٹ اور نائی سبھی تھے۔ ... داس اور کبیرداس بہت مشہور ہوئے ہیں۔

سنسکرت کتابوں کے لکھنے والے زیادہ تر اونچی ذات کے لوگ ہوتے تھے اس لئے اس امتیاز سے منہ موڑنے میں کبیرداس بھی آگے آگے تھے۔ انہوں نے کہا تھا:

"سنسکرت کوپ جل کبیرا بھاشا بہتا نیر"

تلسی داس نے بھی اسی بات کو طنزیہ انداز میں یوں کہا ہے کہ وہ گنوار بھاشا میں ہی "رام چرت مانس" لکھنا چاہتے ہیں۔

جس طرح بھگتی تحریک کے عوامی شاعروں نے سنسکرت کی جگہ اپ بھرنش کو قبول کیا تھا اسی طرح صوفی شاعروں نے بھی فارسی اور عربی کے خلاف بغاوت کی تھی۔ یہ صوفی خالق عالم کی وحدانیت کو مانتے ہوئے بھی ویدانتیوں کی طرح اضافی حقائق کو مطلق حقیقت کا پھیلاؤ سمجھتے تھے۔

یہ لوگ عقاید میں کٹر نہیں ہوتے تھے۔ جبھی تو ہندوستانی عوام نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حضرت معین الدینؒ (۱۱۴۲ء) حضرت قطب الدین کاکیؒ، حضرت فرید شکر گنجؒ (۱۲۰۰ء) حضرت نظام الدین اولیاؒ (۱۲۳۶ء) حضرت خواجہ بندہ نوازؒ (۱۵۰۰ء) حضرت سلیم چشتیؒ (۱۵۱۴ء) اور حضرت مبارک ناگوریؒ (۱۵۱۰ء) وغیرہ اتنے مقبول ہوئے کہ ان کے ماننے والوں میں مسلمانوں کی طرح دوسرے مذاہب کے لوگ بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ان صوفیوں نے اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لئے عام پسند کہانیوں کا سہارا لیا۔ قطبن شیخ نے سولہویں صدی میں "مرگاوتی" کی منظوم کہانی لکھی۔ جس میں دوہوں اور چوپائیوں کا استعمال کیا گیا۔ ملک محمد جائسی نے ۱۵۲۱ تا ۱۵۴۱ میں "پدماوت" لکھی۔ اسی طرح عثمان نے "چترا ولی" (۱۶۱۳ء میں) نور محمد نے "اندراوتی" (۱۶۴۴ء میں) اور فاضل شاہ نے "پریم رتن" کو ۱۶۴۸ء میں منظوم کیا۔ یہ شعرا باشرع صوفی کہلاتے تھے۔ ان کی زبان اودھی تھی۔

اسی طرح دکن میں، بیجاپور اور گولکنڈہ میں شروع شروع فارسی ادیبوں کا ہی بول بالا تھا۔ جس کی وجہ سے ملکی لوگ باہر سے آئے ہوئے فارسی والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ تب مقامی شاعروں نے عوام کی بول چال کی زبان استعمال کرنی شروع کی، جسے ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ "سب رس" اس داستان ادب کی ایک موہنی تصویر ہے۔ یہی دکھنی ادب آگے چل کر اردو اور ہندی ادب کا مشترک سرمایہ کہلانے لگا۔ ۱۷ ویں صدی عیسوی میں ریختی کا موجد ہاشمی (وفات ۱۶۹۶ء) گزرا ہے۔ جس کی غزلیں دراصل ہندی شاعری کی صدائے بازگشت ہیں۔ اور جس کی تقلید میں اس نے عورت کو عاشق مان کر مرد محبوب سے خطاب کیا ہے۔ جیسے:

سجن آدیں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کرکے موتیاں کا پرد تی ہار بیٹھوں گی

اُنوں یاں آدیں گے تو پھر کہوں گی کام کرتی ہوں
اٹھلتی اور مٹھلتی جب گھڑی دو چار بیٹھوں گی

تلسی داس اسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ جبکہ دکن میں دکھنی یا ہندوی زبان ادبی روپ دھار رہی تھی، اور

[illegible] رہی تھی۔ تلسی داس نے جس زبان میں شاعری کی اس کا مزاج بھی سنسکرت سے انحراف کرنے کا تھا۔ ۱۲ ویں صدی عیسوی میں تلسی داس سے تقریباً چار سو سال پہلے ایک ملا ہے اپ بھرنش کے شاعر عبدالرحمٰن نے "سندیش راسک" نام کی کتاب لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ زندگی سے بیزار ہو کر جوگی بنے گھومتے پھرتے تھے۔ تلسی داس نے بھی گھر بار چھوڑ دیا تھا۔ "رام چرت مانس" کا جائزہ لینے سے پہلے تلسی داس کے اس پورے ماحول سے واقفیت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے:

ماتُ پِتا جَگ جائی تجیو دِدھی ہو نہ لکھی کچھو بھال بھلائی
نیچ نرادر بھاجن کادر کوکر ٹوکن لاگی لگائی

ماں باپ کی محبت سے ناآشنا گھر گھر بھٹکتے پھرنے والا تلسی داس کو جب رتنا ولی جیسی بیوی ملی تو وہ اسے ساری محرومیوں کا حاصل سمجھنے لگے۔ جس پر ایک بار ان کی بیوی نے انھیں پھٹکارا کہ وہ کیوں اسے چھوڑ کر نہیں رہ سکتے۔ وہ مہنے کے بعد میکے گئیں تو انہوں نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اسی کو تلسی داس یوں کہتے ہیں۔

لاج نہ آئے آپ کو دَوڑے آئے ہو ساتھ
دھک دھک ایسے پریم کو کہا کہوں میں ناتھ

تلسی داس نے محسوس کیا کہ یہ سارے سہارے بیکار ہیں۔ دنیا میں بھلا اور بُرا جو کچھ بھی ہوتا ہے یہ سب برہما کی کا استھان یہاں بچا ہیں۔ اور یہ کہ جب جب انسانوں پر آفت آتی ہے تو کائنات کا خالق آدمی کی شکل میں اوتار لے کر یہاں آتا ہے اور ہماری مدد کرتا ہے۔ رام بھی ایک ایسے ہی اوتار تھے جو اوپر سے ہمارا مانس رکھتے ہوئے اندر سے خالق کا پیکر تھے۔ جب خالق کائنات اضافی پیکر اپناتا ہے تو اس میں دوئی آجاتی ہے۔ روح اور جسم کے یکجا ہونے سے اضافی قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ اضافی قدر تھی جس نے رام چندر جی کو بیوی کے فراق کا شکار بنایا تھا۔ دونوں کے اندر کا مطلق وجود ساری کائنات پر حاوی تھا۔ اس طرح رام چندر جی گن والے بھی تھے اور نرگن بھی۔ وہ محدود بھی تھے اور غیر محدود بھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ تلسی داس وجود کے چکّر سے آزاد ہو کر نجات پانے کی ہندو روایت کے برخلاف زندہ رہتے ہوئے بھگوان کے سیوک کی طرح رہنا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ ویدانت کو ماننے والے ہوتے ہوئے وہ خود بھگوان کا ہی روپ تھے۔ انھیں سیوک بننے کی کیوں سوجھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ عیسائی دھرم اور اسلام کا اثر ہو۔ گو بہت سے لوگ اس سے منکر ہیں۔

تلسی داس کے دور کے ناتھ پنتھی اور سہج یان کے ماننے والے جوگیوں کی روایت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی اس دور کی سماجی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے ہندو حکمرانوں کی حالت ایسی تھی کہ وہ آپس میں جھگڑتے تھے اور عوام کی خوش حالی کے لئے جدوجہد کرنے کی بجائے خود عیش و آرام کی زندگی گزارنے میں مست تھے۔ جب مسلمان یہاں حکمراں بنے تو انہوں نے بھی یہی کیا۔ تقریباً تلسی داس کے ہی زمانے میں ایسٹ انڈیا

کمپنی کی طرف سے ولیم ہاکنس کو کمپنی کا پہلا ملازم بنا کر انگلستان سے بھیجا گیا تھا۔ ۱۶۰۹ء میں اس نے جو [illegible] کی ہے وہ بڑی دردناک ہے۔

حکومتی بد عنوانیاں اور سازشیں عروج پر تھیں۔ مغل بادشاہ غریب ہندوستانیوں سے مال گذاری وصول کرنے میں ایسے بے درد اور ظالم تھے کہ انھیں مال گزاری وصول کرنے کے لئے ضروری نظم و نسق قائم کرنے کی تکلیف [illegible] نہیں تھا۔ چنانچہ ہاکنس کو مال گزاری وصول کرنے کے عوض سالانہ تین ہزار پونڈ کی تنخواہ ملتی تھی جو انگریز وائسرائے کی تنخواہ سے پانچ گنا زیادہ تھی۔ شیر شاہ سوری جو مال گزاری اور بندوبست کے نظم و نسق کا ماہر سمجھا جاتا ہے عوام کے لئے اتنا ظالم تھا کہ مال گزاری نہ دینے والے کسان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا تھا جیسا کہ ایک باغی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اکبر کے عہد میں اتنی زیادہ مال گزاری وصول کی جاتی تھی کہ وہ ملکہ الزبیتھ اول کے انگلستان کی مال گزاری سے کئی گنا زیادہ تھی۔ لیکن انگلستان کی حکومت تجارت پر ٹیکس لگا کر مالا مال ہو رہی تھی۔ جبکہ ہندوستان میں تجارت سے آنے والی [illegible] کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں کسان کے پاس ایک لنگوٹی کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان ننگے بھوکے کسانوں کو اپنے بچوں کو بھی بیچنا پڑتا تھا۔ مغلوں کی عوام دشمن حکومت سے نجات دلانے کے لئے مرہٹوں کی جو طاقت نمودار ہوئی وہ بھی لٹیری نکلی۔ مہاراشٹر سے پرے وہ بھی کسی نظم و نسق کی بوجھ کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ایسے محکوم علاقوں سے ایک چوتھائی مال وصول کرنے سے آگے عوام دوستی کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ ایسے مایوس کن ماحول میں لوگ گھر بار چھوڑ کر جوگی نہیں تو کیا بنیں گے۔ اس طرح جنت نشان ہندوستان دن بہ دن نکبت کی طرف جا رہا تھا۔

جس طرح اردو کے شاعر ملا، زاہد اور شیخ کے خلاف لکھ بول کر اپنا غم غلط کرتے ہیں اسی طرح کا مزاج تلسی داس کا بھی نظر آتا ہے۔ ۱۵۷۵ء میں رام چرت مانس کے مکمل ہونے پر جب ان کی قدر و منزلت بڑھنے لگی تو پنڈت لوگ ان کی برائی کرنے اور ان پر اتہام لگانے لگے۔ تب انہوں نے کہا کہ:

"مجھے دھوت کہو یا اَوَدھوت کہو، راجپوت کہو یا جلاہا، مجھے کون کسی کی بیٹی سے بیٹا بیاہنا ہے
میں تو رام کا غلام ہوں، مانگ کر کھا لیتا ہوں اور مسجد میں سو جاتا ہوں۔"

رام چرت مانس شروع سے آخر تک ایک حسین امتزاج کی دستاویز ہے۔ تلسی داس تشبیہوں اور مرقع نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ سنسکرت کے ساتھ کبھی کبھی بے ساختگی سے فارسی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کا ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ وہ صرف شاعر اور بھگت ہی نہیں تھے بلکہ ایک خوب صورت مستقبل کے دیکھنے والے بھی تھے۔ ان کی نظم کی بندش کافی چست ہوتی ہے۔ کئی کئی چوپائیوں کے بعد دوہوں کی موسیقی کی تکرار ان کے کلام کو کافی متنوع اور دلچسپ بناتی ہے۔ ان کے کلام کی موسیقی اور قافیہ کی باقاعدگی کو دیکھ کر آج کی اردو نظم سے مشابہت صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً:

دُکھ سُکھ پاپ پُنیہ دن راتی سادھو اسادھو سُجاتی کجاتی
دانو دیو اُونچ اَرو نیچو امیہ سجیوَن ماہُر میچو

امرت جیو داتا مارنے والا زہر

پرنتیجہ کا قربت کرتلسی داس کے رام چرت مانس کے پڑھنے والوں نے تقریباً ایک سو سال بعد ایسا محسوس کیا کہ جس بھگوان کے اوتار لینے کی بات انہوں نے پڑھی تھی وہ بھگوان اب پرگٹ ہو گئے تھے۔ ان کی گوری چمڑی، نیلی آنکھیں اور سنہرے بال تھے۔ سیاست کے کروکشیتر میں انہوں نے ہندوستانیوں کو ہرا دیا تھا۔ اور ماضی میں لا دسے گئے جو انتیا بکسوں کو غیر انسانی سمجھ کر فوراً ان میں بھاری کمی کر دیتے تھے۔ پھر بہت جلد انہوں نے ریلوں اور تاروں کا جال بچھا دیا۔ سارے ملک کو ایک متحدہ قوم کی طرح منسلک کرنے میں انہوں نے بڑی خدمت انجام دی۔ انہوں نے عصری علوم کے سارے دروازے سب کے لئے یکساں کھول دیئے۔ عصری ترقی کے منازل طے کر کے بھی ہندوستان بدحال ہی رہا۔ اس طرح تین سو سال بیت گئے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ باہر سے آئے ہوئے گورے سیاسی بھگوان سری رام نہیں ہیں۔ وہ تو ہندوستان کی قدرتی دولت کے امرت کو پار کرنے والے راکشش ہیں۔ اس لئے پھر ایک بار کروکشیتر میدان کارزار بنا۔ اپنے دیش کی پرتھوی کو بچانے کے لئے ایک اور نئی قوت اسی زمین سے ابھری۔ آج یہ قوت سماجی مسائل کے طوفانوں سے نبرد آزما ہے۔ ایسے میں تلسی داس کی یاد پھر آ رہی ہے۔ کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ ہر مصیبت کے وقت بھگوان ایک اوتار کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ ہندوستان اسی بھگوان کا منتظر ہے۔ ●●

محمد حسن

کچھ اور نثری نظمیں

ہم (فعل کے بغیر نظم)

قلم پہ دھول، دماغ دھندلے، پاؤں پہ برف، آنکھ کی جھیل پہ لوتی
چہروں پر جال، بے مرضی ہاتھ پاؤں، آئینوں میں جھانکتے بوڑھے
ننگے جسم، داغ، تمغے اور وردیوں سے ڈھکے،
زندگی، پت جھڑ کی ایک ٹہنی کے چٹخنے کی صدا،
ہمیں بھی زندگی جینے کی خاطر ایک لمحہ !!

— —

گلوب

یہ بچے بھی عجیب ہیں
کل ہی نیا گلوب خرید کر لایا تھا
اس کو فٹ بال بنا [illegible]
اور اس کے دونوں ٹکڑے الگ کر دیئے
اب جوڑتا ہوں تو چین کا سرا افریقہ سے جا ملتا ہے
انڈونیشیا کا چلی سے
بڑی محنت سے جوڑا بھی تو سرے سخت ہو گئے
ایک سرا دوسرے سے ملنے کو تیار ہی نہ ہوا
آخر تنگ آکر میں نے پھینک دیا

اب یہ دونوں ٹکڑے گویا بھیک کے پیالے ہیں
جو کسی ایسے کی راہ دیکھ رہے ہیں جو انھیں جوڑ دے

— —

جی ٹی ایس

دل میں ایک کانٹا ہے
جو کھٹکتا رہتا ہے
اور جو بھی
کانٹے کو
اپنے قابو میں کر لے
بس وہی فلاطوں ہے
بس وہی سکندر ہے

— —

خاموشی

میری میّا !
کیسے کیسے روندے گئے ہیں تجھ کو
کتنے جابر، کیسے کیسے ظالم
تیری ننگی پیٹھ پہ کوڑے برسا کر ہنستے والے
سینے پر انصاف کی پھانسی
فوجی سنگینیں
ٹینک کا بوجھ
علم کی سازش
بکنے والے دھرم ایمان
بینکوں کے بھاری بھرکم لاشے
خونوں میں نہائے شور مچاتے پہیے
تیرے سینے پر سے گزرے
تیری پسلی پسلی چٹخی
ہڈی ہڈی ٹوٹی، بوٹی بوٹی تڑپی
لیکن تو خاموش رہی
دھرتی میّا
آخر تو کب بولے گی !!

— —

روشنی کا مینار

دلکش اعظمی

زمیں پر اک بلند مینار روشنی کا چمک رہا ہے
وہیں سے برقی نظام جوڑا ہوا ہے ہر اک پہ زمیں کے
وہیں کے تاروں کا شہر در شہر سلسلہ ہے
وہیں پہ اک سبز اُجلے رنگ کا تمام عالم کا سائباں ہے
یہ سچ ہے رستے کی خاک اُس کے جہاں جہاں ہے
قسم خدا کی وہ آستانہ
زمیں کا بن کے آسماں ہے

جہاں فلک بوس اونچی اونچی
پہاڑوں کی چوٹیاں جھکی ہیں
نظامِ ارض و فلک ہیں جس کے غلام اب تک
جسے سویرے سنہرا سورج چمکتی کرنوں سے چومتا ہے
روپہلی قندیل اپنا آنچل اوڑھاتی ہے جس کے سر پہ ہر شب
جہاں برستے ہیں رس کے بادل
ہواؤں کی روح میں جہاں کی بسی ہوتی ہے ہزار خوشبو
جہاں زمیں کے تمام چشموں کا اک خزینہ ہے "بحرِ رحمت"
جہاں پہ ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی بارش مسرتوں کی

وہ ایک جادہ ہے ایک منزل
ہزار ہا داستوں کی محفل
تمام عالم کا ایک حاصل
وہیں کی دا[illegible] کا عکس صدیوں کے کارناموں کا بہا ہے
وہیں کی مٹی کی سوندھی خوشبو تمام عالم میں بھر دہی ہے
وہیں کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہارِ گلشن کے رازداں ہیں
وہیں کے میٹھے پھلوں کا خوشہ تمام عالم کا ہے تبرک
وہاں کا پانی ہے آبِ زمزم
اور آبِ زمزم ہے آبِ حیواں

وہ شہر ہے روشنی کا مرکز
وہ شہر ہے بندگی کا مرکز
وہ شہر ہے زندگی کا مرکز
وہ ایک صحرا ہے پھر بھی اُس میں گلاب کے باغ جابجا ہیں
کہیں کہیں پہ حصار باندھے گھنے درختوں کے سائباں ہیں
سفید رنگوں کا سبز مائل بصورت آئینہ جڑا ہوا ہے
وہیں پہ سب سے عظیم پختہ فصیلِ کردار کیمیا ہے
کھڑی ہے اب تک جو کتنی صدیوں سے اپنی سونت کھڑی رہے گی
یہاں تلک کہ زمین اپنی بکھر نہ جائے وہ سنی ہوئی روح کی [illegible]

جمیل ظہیر

سلام مچھلی شہری کی نظموں میں موت کا تصور

عرفان و آگہی انسان سے جتنا گریزاں رہتے ہیں انسان اتنا ہی عرفان و آگہی کا منزل بہ منزل متلاشی رہتا ہے۔ عرفان و آگہی کے تین وسائل ہیں۔ تجزیۂ احساس، منطقی استدلال اور الہام یا القا۔ اول الذکر کے لئے خارجی اشیا کے قوتِ لمس کی ضرورت ہوتی ہے۔ منطقی استدلال داخلی اور خارجی دونوں طرح کے علم کے حامل ہوتے ہیں۔ اور اس کے خاص لوازم SYMBOLS اور CONCEPT ہیں۔ لیکن الہام یا القا تو براہ راست علم و عرفان کا موجب ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر کارِ عظیم اسی کے زیرِ اثر بروئے کار آتا ہے۔ ادب کا کوئی شاہکار ہو یا اخلاق کا، غالب کے طبع فکر کا نتیجہ ہو، یا منصور کے سولی پر چڑھنے کا عمل، سب کے پیچھے وہ القا ہی کارفرما رہتا ہے۔ شاید کیٹس (KEATS) کا اشارہ اسی طرف تھا، جب انہوں نے کہا تھا،

"IF POETRY COMES NOT AS NATURALLY TO HIM AS THE LEAVES TO A TREE IT HAD BETTER NOT COME"

کیٹس کا یہ احساس صرف فنی لوازمات کے برتنے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ موضوعِ شاعری کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اردو شاعری میں شعر یا غزل کے لئے "کہنا" مستعمل ہے۔ "لکھنا" استعمال نہیں ہوتا ہے۔ اقبال اسی نظریہ کے علمبردار نظر آتے ہیں، وہ فرماتے ہیں ؎

حادثہ جو کہ ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اقبال کے یہاں تو اس نظریۂ فکر کا دعویٰ ضرور ملتا ہے۔ لیکن جس خلوص کے ساتھ سلام مچھلی شہری کا اپنی زندگی کے آخری دو تین سالوں کی نظموں اور غزلوں میں برتا ہے۔ وہ روش اقبال کے یہاں مفقود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی موت کی آمد کی آہٹ بہت پہلے سے سن لی تھی۔ جس کا اظہار انہوں نے آخری دو تین سالوں کی ہر نظم، غزل میں کیا ہے۔ یوں تو مومن نے بھی اپنی موت سے پہلے قطعۂ وفات کہا تھا، جو تاریخ اور وقت کے لحاظ سے بالکل صحیح ثابت ہوا لیکن

[illegible] جیش تھا۔ جوشاعرانہ عرفان و آگہی کا متحمل نہ تھا۔ بلکہ اس کا انحصار ان کے علم نجوم کی واقفیت پر تھا۔

سلام مچھلی شہری کی زندگی کے آخری دو تین سالوں کی نظمیں اور غزلیں بڑی اہم ہیں۔ کیونکہ ان کا موضوع موت ہے۔ ہر شاعر اور ادیب کا فن پارہ زندگی کے شاہد سے معمور ہے۔ زندگی کے نشاط و غم کا مشاہدہ ایک عام عمل ہے جو ہر انسان میں خواہ وہ فن کار ہو یا نہیں حسب انفرادیت موجود ہے۔ صرف مختلف افراد یا فن کار میں اس کے اپنے حالات اور انداز فکر کے تناسب سے فرق رہے گا۔ لیکن موت جتنی یقینی ہے اتنی ہی غیر واضح ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی کا اظہار بڑی اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن لکھتے ہیں:

"THE MYSTERY OF LIFE AS OF DEATH EACH HAS TO DISCOVER FOR HIMSELF, WE CAN SING AND TASTE WITH NO TONGUE BUT OUR OWN. THOUGH ARE HAS TO ATTAIN HIS OWN PURPOSE BY HIS SEPARATE ENCOUNTER, THE RESULT IS OF UNIVERSAL SIGNI-FICANCE."

موت کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے پہلے ہر انسان کا خیال بڑا اہم ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کئی لحاظ سے قابل توجہ ہوتی ہے اس آخری وقت کا خیال ہر انسان کی شخصیت کی تکمیل کے عمل کا نقطۂ عروج ہوتا ہے اور اپنے حجم میں عہد گزشتہ کی کیفیتوں کو تھوڑی دیر کے لئے واپس لے آتا ہے۔ اپنے آبا و اجداد کی خوبیوں کا اجمالی جائزہ ہوتا ہے اور آنے والی نسل کے لئے نشانِ راہ۔ جواہر لال نہرو کی موت کے بعد ان کے آفس میں پیڈ پر ان کی تحریر میں (ROBERT FROST) کی نظم کا مندرجہ ذیل ٹکڑا لکھا ہوا پایا گیا، جو انہوں نے انتقال سے دو چار روز قبل لکھ چھوڑا ہوگا، جو ان کی ساری زندگی اور اصولِ زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے:

"THE WOODS LOVELY DARK AND DEEP
BUT I HAVE PROMISES TO KEEP
AND MILES TO GO BEFORE I SLEEP
AND MILES TO GO BEFORE I SLEEP"

سلام مچھلی شہری زندہ دل اور زندگی پرست تھے۔ وہ خوشی سے لطف اندوزی کے لئے شراب و شعر میں ڈوبے رہے۔ لیکن جب انھیں احساس ہوا کہ شراب نے ان کے جگر کے فعل کو مجروح کر دیا ہے تو انہوں نے اپنی زندگی کو موت کی آہنی گرفت سے محفوظ رکھنے کے لئے اس "صہبا پرستی" کو بھی ترک کر دیا۔ جو اہل جام و مینا کی غیر متوقع روش ہے حالانکہ

"چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ ظالم لگی ہوئی"

لیکن زندگی کا سرور سلام مچھلی شہری کے لئے شراب کی مستی سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ یہ زندگی سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی

محبت کی دلیل ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ان کی زندگی سے محبت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کی یہ روش سقراط کے آخری الفاظ کی یاد دلاتی ہے:

"I KNOW NOT WHAT DEATH IS, IT MAY BE A GOOD THING I AM NOT AFRAID OF BUT I DO KNOW IT IS BAD THING TO DESERT ONE'S PAST"

سلام مچھلی شہری کی زندگی کی اس پرستش کے پردہ میں بیوی کی محبت تھی، بچوں کی محبت تھی اور احباب کا لگاؤ تھا۔ اور نہ جانے کتنی محبت کے سوتے اس بیکراں سمندر میں مل گئے تھے۔ اپنی نظم "اے مری جانی پہچانی ناگن" میں سلام مچھلی شہری لکھتے ہیں۔

اے مری جانی پہچانی ناگن
تجھے سوچا تھا
تجھے سوچا تھا
کہ بیمار شاعر ارادوں کا پکّا ہے
اور زندگی کی ضرورت ہے اس کو

(۲۸ جون ۷۳ء)

سلام مچھلی شہری کی آخری دو تین سالوں کی نظموں میں جو موت کا تصور ہے، وہ کئی مدارج سے گزرتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جہاں سلام کی نظر میں موت کا تصور ایک رد عمل کی صورت میں آتا ہے۔ یہ رد عمل کا رویہ کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ اردو شاعری میں کلاسیکل اہمیت کا حامل ہے۔ مومن نے بھی اس رویّہ کو اپنایا تھا ؎

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

لہٰذا جب سلام زندگی کی بے کیفی اور کرب و اضطراب سے بے چین ہو جاتے ہیں۔ تو اس عارضی کلفت سے نجات پانے کے لئے وہ زندگی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اپنی نظم "زرد کلی" میں کہتے ہیں،

اور پھر پہلے سے اک شور فغاں اٹھتا ہے
میرے خوشبو بھرے آنگن سے دھواں اٹھتا ہے
راس پھولوں کا بھی صد حیف نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

(اپریل ۷۲ء)

جب سلام مچھلی شہری کو اپنی موت کی آمد کی آہٹ کا غیر مشتبہ طور پر یقین ہو گیا تو ازراہِ نجات ان کا ذہن ابتدائی کلاسوں میں پڑھی تاریخ کی طرف مرکوز ہو جاتا ہے۔ جبکہ بابر نے اپنے بیمار بیٹے ہمایوں کی شفایابی کے لئے اس کے پلنگ کے

[illegible] گیا تھا۔ اور خدا سے دعا مانگی تھی کہ اس کے [illegible] اس کی قربانی قبول کرلی جائے اور بھائیوں کو شفایاب کیا جائے اور ایسا ہی ہوا۔ انسان جب اپنے آپ کو بے بس [illegible] پاتا ہے [illegible] کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا تو وہ توہم پرست ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سلام کو اپنی موت سے چھٹکارہ پانے کی امید کی جھلک نظر نہیں آتی ہے تو وہ اپنی نظم " مرا گاؤں " میں فرماتے ہیں ؎

مری صحت کی تو [illegible] لی ہے اک بھائی سے قربانی
الٰہی تو بھی رکھتا کاش احساساتِ انسانی

سلام مچھلی شہری کے حیات و مرگ کے تصور میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں وہ روح اور جسم کے اشتراک کو زندگی سمجھتے ہیں، جسم کو روح کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ زندگی کی لطف اندوزی کو اس کا مطلع حیات پر محمول کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو (۱) کی نظم " اتنی دوری اتنی قربت " :-

عناصر خمسہ کی یہ قربت
علاحدہ ان کو کر نہ پائی
ہم ان سے بے حد قریب تر ہیں اور یہ بھی ہم سے قریب تر ہیں
اگر یہ قربت نہ ہوتی ان میں
تو کیسے انسان زندہ رہتا
تمام چیزیں قریب تر ہیں
کہ ہم ہے [illegible] ساتُ قلزم

نظم کے مندرجہ بالا ٹکڑا میں حواس خمسہ کے اشتراک کو زندگی کے اسباب سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور اس بند کا آخری ٹکڑا " سات قلزم " ان کے حواس خمسہ اور دل و دماغ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے اندر تمام احساسات محیط ہیں۔ اسی اندازِ فکر سے عقیدۂ تناسخ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ جب جسم کو روح کی ضرورت سمجھ لیتے ہیں تو اسے (روح) اس کی (جسم) بار بار ضرورت ہوتی ہے جسے بالآخر وہ حاصل بھی کر لیتی ہے۔ اس سلسلہ میں سلام مچھلی شہری کی نظم " تسلسل " سے ذیل کا بند برائے تصدیق پیش ہے ؎

سنو انسان ہوں
اور روزِ ازل ہی سے
مری تخلیق اور تعمیر کے جلوے فروزاں ہیں
میں جب مرتا ہوں
تب اک زندگی آباد ہوتی ہے

(اپریل ۶۳ء)

سلام مچھلی شہری کے عقیدۂ تناسخ کے سلسلہ میں ان کی نظم " جشن میلاد النبی " کے آخری بند کو دُہرانا ضروری ہو جاتا ہے

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہیں۔ اور اُنہیں واپس اس دنیا میں دوبارہ بلانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ درس آگہی لینے کے لئے کسی دوسرے کو نہیں بلکہ اُنھیں ہی چاہتے ہیں :

دھرتی تمہیں آج پھر مانگتی ہے
ہم انسان پھر روشنی چاہتے ہیں
ہم انسان پھر روشنی مانگتے ہیں

اس عقیدۂ تناسخ کو کسی مذہب کا پابند نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرح کا خیال ادب میں عام ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا عیسائی ہو۔ بلکہ یہ عقیدۂ تناسخ شاعرانہ آگہی کے تحت ظہور میں آتا ہے۔ یہ شاعرانہ آگہی اسباب کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ تمام اسباب و علل کے آگے بھی دیکھ لیتا ہے۔ غالب نے کہا ہے :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

اردو کے ایک ہندو شاعر چکبست نے کہا ہے :

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

انگریزی کے ایک عیسائی شاعر JOHN MASEFIELD اپنی نظم "A CIAD" میں کہتے ہیں :

I HOLD THAT WHEN A PERSON DIES
HIS SOUL RETURNS AGAIN TO EARTH

اس دور کے مشہور شاعر علامہ جمیل مظہری کہتے ہیں :

پہنے گے نیا جو رختِ خاک کی معراج وہ ہو گی ارتقا کی

ان کی نظم "مرگِ گل" کے خاکے ان کے ذہن میں اُسی وقت غیر واضح طور پر اُبھر آئے تھے۔ جب انہوں نے آل انڈیا ریڈیو اردو سروس کی جانب سے منعقد کئے گئے مشاعرہ میں کیفی اعظمی کو بیماری کی حالت میں دوسرے کے سہارے اسٹیج پر آتے دیکھا تھا اور جناب عزیز اندوری سے کہا تھا :

"عزیز! میں کیفی کی بیماری کو دیکھ کر اپنی بیماری بھول گیا۔"

بظاہر یہ گفتگو جناب کیفی اعظمی کی بیماری سے ہمدردی تھی لیکن درپردہ اپنی بیماری کا انکشاف تھا۔ جسے وہ اپنی بے انتہا قوت ارادی سے اب تک ٹالے ہوئے تھے۔ لیکن موت کے نوائے راز کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ جب لنڈن نرسنگ ہوم میں حالات نے اُنہیں ایک ایسی مریضہ کا ہمسایہ بنا دیا، جو اُن سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئی تو ایک انجانے اندیشہ کی تحریک سے ان کی نظم "مرگِ گل" کی تخلیق ہوئی۔ اس نظم میں مریضہ کے اکثر اوصاف سلام مچھلی شہری کے اپنے اوصاف سے پوری طرح مماثلت رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں سلام مچھلی شہری کا یہ ILLUSION تھا یا قدرت کا ایک CONCIDENCE بالآخر انجام دونوں کا ایک ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر کا سفر دوسرے کے لئے درسِ عمل تھا۔ جسمانی تحریک کی طرح روحانی

[illegible] ہے۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے ،

مریضہ جس کا کمرہ میرے کمرے کے مقابل ہے
بہت بیمار ہے لیکن وہ پھر بھی صاحبِ دل ہے
اُمید و شوق کی ڈھالی ہوئی معلوم ہوتی ہے
مگر دیہات کی پالی ہوئی معلوم ہوتی ہے
کوئی نرس آجائے تو کچھ گھبرانے لگتی ہے
کوئی گر بھول کر بھی دیکھ لے شرمانے لگتی ہے
پئے تیمار داری ایک لڑکا ساتھ رہتا ہے
مریضہ کے دلِ نازک پر اس کا ہاتھ رہتا ہے
مریضہ چیختی ہے گھر چلو راحت نہیں مجھ کو
سدا بیمار رہنے کی یہاں فرصت نہیں مجھ کو

مریضہ کے اوصاف میں سے اولین صفت صاحب دل ہونا ہے۔ جس کے مستحق سلام مچھلی شہری کہیں زیادہ ہیں۔ یہ مریضہ اُمید و شوق کی پیکر ہے وہ دیہات کی رہنے والی ہے۔ سلام مچھلی شہری خود دیہات کے پروردہ تھے۔ ملاحظہ ہو ان کی نظم "ابو الحسام کی یاد میں" کا مندرجہ ذیل شعر:

مرا قصبے کا کچا اور شکستہ سا مکاں اب تک
اسی عالم میں ہے اک مرکزِ دردِ جہاں اب تک

نظم "مرگِ گل" کا آخری شعر خود سلام کی اپنی کیفیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ پہلی بار ولنگڈن نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے تو چند روز وہاں رہ کر اپنی بے پناہ قوتِ ارادی کے زور سے وہاں سے نکل آئے تھے۔ حالانکہ بیماری بدستور اپنا کام کر رہی تھی۔

سلام مچھلی شہری کے آخری دور کی نظموں میں "کلس برلا مندر کے" ان کی آخری نظم ہے۔ غزلیں اور اشعار انہوں نے اور بھی کہے ہیں۔ لیکن وہ امتیازی طور پر نظموں اور گیتوں کے شاعر تھے۔ یہ نظم موت سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ولنگڈن نرسنگ ہوم میں کہی تھی۔ جہاں کوئی ادبی تخلیق عام طور پر ممکن نہیں۔ سردار جعفری کا اپنا ذاتی تجربہ ملاحظہ ہو:۔

"اگر مکان کے گرد موت منڈلا رہی ہو تو لکھنے پڑھنے کا کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میں جس مکان کی پہلی منزل کے دو کمروں میں رہتا ہوں۔ وہ ایک اسپتال کی پشت پر ہے اور اسی ہسپتال کی ملکیت ہے۔ عین میرے کمرے کے نیچے کا کمرہ مردہ خانہ ہے۔ جہاں سے ہسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں ان کے عزیز و اقارب کو دی جاتی ہیں۔ ہسپتال بڑا ہے۔ کبھی دو تین مرنے والے ایک ہی دن کا انتخاب کر لیتے ہیں اور ان کے عزیز و اقارب جمع ہو جاتے ہیں، لاشیں کفنائی جاتی ہیں اور پھر ماتم کے ساتھ جنازہ اُٹھتا ہے اور یہ شورِ ماتم کبھی دن میں بلند ہوتا ہے کبھی رات میں، ایسی حالت میں کوئی اچھی تخلیق کیسے ممکن ہے۔"

[illegible] سلام مچھلی شہری نے یہ نظم لکھ کر سردار جعفری کے تجربے کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دراصل سلام کے یہاں جو [illegible] وہ سردار جعفری کے یہاں مفقود تھا۔ ان کی یہ نظم SWAN SONG کہی جانے کی مستحق ہے۔ حیات و موت کی کشمکش کے جس دور سے وہ گزر رہے تھے۔ اس کا جتنا منضبط اور واضح بیان اس نظم میں ہے۔ اس کا تحمل ان کی غزل کا کوئی شعر نہیں ہو سکتا۔

خدا کا تصور، موت کا خدشہ اور زندہ رہنے کی خواہشیں انہیں تینوں اجزا سے اس نظم کی تشکیل ہوئی ہے۔ حالانکہ خدا کا تصور ان کے یہاں ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل وہ اہل دل اور زندگی پرست تھے۔ خدا کے قائل نہ تھے، لیکن زندگی کے تار جب کسی انجانے ضرب سے جھنجھنا اٹھتے ہیں اور زندگی کو اس ضرب کاری سے بچانے کا کوئی چارہ نظر نہیں آتا ہے تو وہ اس قوت کی پرستش کرنے لگتے ہیں:

سحر کا دھندلکا
بلند اور گھنیرے درختوں کے نیچے
کلس برلا مندر کے یوں لگ رہے ہیں
کہ جیسے کئی دیوتا آسماں سے
سفید ابرپاروں پہ بیٹھے ہوئے
آسماں سے
زمیں کی طرف آ رہے ہیں

سلام مچھلی شہری کے خدا کا تصور نہ تو کوئی ذہنی اپج ہے اور نہ اخلاقی اصول کا ماخذ ہے۔ ان کے نزدیک خدا کا تصور منطقی استدلال کا مرہون منت بھی نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا گہرا مشاہدہ ہے جس کے ماخذ سارے اصول اور تصور ہوتے ہیں۔ زندگی کی نوعیت کا صحیح علم دراصل قادر المطلق سے اپنے واسطے کا ادراک ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں زندگی کی دشواریاں انسان کے علم کو فہم و فراست سے بدل دیتی ہیں۔

جسم انسانی کے ناگزیر خاتمہ پر عقیدہ کے باوجود زندگی کے اعلیٰ مقصد کو اس کا محرک سمجھتے ہیں۔ کوئی ایسی خواہش یا کوئی ایسا مقصد ضرور ہوتا ہے جو ہر انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہے:

ولنگڈن کے سینتیس[3] نمبر کے کمرے کا
یہ سبز پردہ اٹھا کر
میں کچھ دیر سے سوچتا ہوں
مرا آپریشن تو منگل کو ہوگا
مگر دیوتا برکتیں اپنی لے کر
مرے سات معصوم بچوں کی خاطر
ابھی سے مرے ہی لئے آ گئے ہیں

تو پھر اے اجل کوشش بزدل خیالو
حسینو! سے کیوں مجھکو گھیرے ہوئے ہو
مرے پردۂ ذہن سے اب ہٹو بھی
کہ مجھکو سحر کا یقیں ہو گیا ہے
یقیناً ابھی کام کرنا ہے مجھ کو
یقیناً ابھی اور زندہ رہوں گا — !

اپنے سات معصوم بچوں کی پرورش کی ذمہ داری تو انھیں موت سے چھٹکارہ نہ دے سکی لیکن ان کی زندگی کے اس مقصد نے کچھ مزید مہلت انہیں ضرور دی تھی۔ انہیں کی زبانی سنئے جب وہ موت سے مخاطب ہیں:
"حسینوں سے کیوں مجھ کو گھیرے ہوئے ہو"
جسم انسانی دراصل کسی کار عظیم کا ایک وسیلہ ہے، مقصد نہیں۔ اس کے پس پردہ کوئی بڑی طاقت یا مقصد ہوتا ہے۔ انفرادی شخصیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سلام مچھلی شہری لانگ فیلو کے ہمنوا نظر آتے ہیں:

LIFE IS REAL LIFE IS EARNEST
DEATH IS NOT ITS GOAL
DUST THOUGH ART DUST RETURNETH
WAS NOT SPOKEN OF THE SOUL

——

علقمہ شبلی

لوڈشیڈنگ

پیچ ٹائم پیس کی
صبح کے نو بج گئے
آخری سوئی بھی نکلی اس طرح
گرم پانی بھی نہیں
لوڈشیڈنگ — ہو بھلا
آج پھر بجلی گئی
شیو کرنے کی کوئی صورت نہیں
آئرن ہو کس طرح ؟
چائے ، کافی ، ناشتہ کچھ بھی نہیں

آج بھی ہیں ہم غلام ابن غلام
بند کمرہ
سانس روکے
کروٹیں ہر پل بدلتا ہی رہا
صبح کی ٹھنڈی ہوا دستک نہیں دیتی کبھی
میری پیشانی کو چومے مہر تازہ کی کرن
یہ مقدر میں کہاں ؟
بھاپ ،
بجلی
اور پلس
اب کتاب زندگی کے بس یہی عنوان ہیں
آدمی
آج بھی
دائرہ در دائرہ
سرگراں اور پابہ گِل

— —

رمز عظیم آبادی

تیس ۳۰ تاریخ کا کرب

خواب ان آنکھوں میں چبھ جاتے ہیں کانٹے بن کر
نیند اُڑ جاتی ہے خوشبو کی طرح
وقت کنجوس مہاجن جیسا
گن کے رکھ لیتا ہے اک اک لمحہ
سود ، رگ رگ سے نچوڑا ہوا خون
منہدم ہوتی ہوئی اپنی فصیل دل و جان
یعنی اب قید کی میعاد بہت تھوڑی ہے
تیس تاریخ کی یہ رات کا کرب
صبح آئے تو اجالا پھیلے
سرد چولھے میں جوانی کی حرارت دوڑے
کاغذی پیرہن زر کے طفیل
روح یخ بستہ سہی
جسم تو گرماتا ہے

— —

عبدالمتین نیاز

خواب اور حقیقت کے درمیان آخری سفر

زندگی مجھ کو رہائی دے کہ میں
آسمانوں کا پرندہ، وسعتوں کا ہم سفر
روشنی و رنگ کی ان جنتوں کو کھوج لوں
جو صحیفوں میں کہانی کی طرح مرقوم ہیں
جن کے بارے میں بزرگوں نے کہا تھا مجھ سے یہ
دائمی خوشیاں
یہ ساری جسم و جاں کی لذتیں
تم آخرت میں پاؤ گے
زندگانی تج کے جب مٹی تلے سو جاؤ گے
ایسی خوش آئند باتیں
سن رہا ہوں میں ہزاروں سال سے
زندگی مجھ کو رہائی دے کہ میں
ایسی سب باتوں کی سچائی سے واقف ہو سکوں
آنے والی ساری نسلوں پر یہ ظاہر کر سکوں
تو دکھوں کا خواب ہے تجھ کو نہ دیکھے اب کوئی
اور اگر یہ جھوٹ ثابت ہو تو پھر سے لوٹ آؤں
اپنی ہستی کو دکھوں میں بانٹ دوں
اور خوشیوں کی ہر اک امید سے منھ موڑ لوں

--

شاہد کلیم

ڈرائنگ روم کا منظر

راکھ سگرٹ کی
(پچھلے برس اک ملاقات میں)
جمع کر دی تھی میرے نئے ایش ٹرے میں
مرے دوست نے
مزبلہ پر اسے میں نے پھینکا نہیں تھا
اسے میں نے چاہا تھا محفوظ رکھنا
مگر یہ ہوا
رفتہ رفتہ
اسے لے گئی اپنے ہمراہ
جنگل کی جانب
جنونی ہوا
اور اب
ایش ٹرے میرا
ٹیبل پہ خالی پڑا ہے

--

احمد یوسف

۱

اُونچی اونچی عمارتیں

میرے ہاتھ میں ایک بھاری سا چرمی بیگ ہے، جس کے متعلق میرا دل کہتا ہے کہ یہ بیگ نہیں ہے، کئی ایک کیفیتوں کی قیام گاہ کئی ایک تہذیبوں کا وطن اور کئی ایک قبیلوں کا دیار ہے، جو آپس میں دست و گریباں ہیں۔

مثلاً یہ کہ فارم ہیں جو امیدوں کی لہلہاتی فصل کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرسبز و شاداب ہیں تمناؤں میں اُلجھے ہوئے خطوط ہیں۔ ایک بال پن ہے کہ جیب کے قلم کا کیا بھروسا، کہاں اس کا لہو خشک ہو جائے، کہاں وہ سرشتِ وفا کو یک قلم خیرباد کہہ کر کسی دوسرے کی جیب میں یا کھوسے سے کھوا اچھلتی ہوئی سڑک پر نظر آئے۔ ہرے رنگ کی ایک ٹیوب میں کریم ہے کہ یہاں اکثر ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں اور ناک خشک ہو جاتی ہے۔ پالیتھین کے ایک چھوٹے سے پیکٹ میں سر کے درد کی گولیاں ہیں۔ ایک چھوٹی تولیہ ہے۔ دو چار کھلے لفافے ہیں اور ایک لنچ بکس ہے۔ یہ کیفیتیں، یہ تہذیبیں اور یہ قبیلے میرے اپنے ہیں۔ اور میں تنہا فرد ہوں جو ان سے کما حقہ واقف ہوں۔

بسوں کا یہ عالم ہے کہ ان کے اندر داخل ہونے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیے اور پھر باہر نکلنے کے لئے بھی سر دھڑ کی بازی لگائیے، اور ہر بار ان کے اندر داخل ہونے اور ان سے باہر نکلنے پر اطمینان کی سانس کو زینہ بہ زینہ اپنے اندر اُتاریئے اور خدا کے حضور میں ان لبوں سے جو حمد کے خوگر ہیں، یہ شکوہ کیجئے کہ اس کی امانت جو جان عزیز کی صورت میں ہمارے پاس ہے، اُسے بچانے کے لئے کیا کیا نہ صدمے اُٹھانے پڑتے ہیں اور اگر اس کی امانت نہ ہوتی تو ہم کب کے یہ فیصلے کر چکے ہوتے کہ جائے تو جائے ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔

چنانچہ بس سے جان و دل صحیح و سالم نکال لانے کے بعد میں نے اردگرد کا ایک جائزہ لیا تو میرے سامنے ایک وسیع و عریض فٹ پاتھ تھا۔ جس پر ان گنت دنیائیں اور ان گنت دنیا کے جلوے آباد تھے۔

کتابوں کا تاجر ہے جس نے یہاں سے وہاں تک کتابیں سجا رکھی ہیں، یہ کتابیں وہ ہیں جو کئی کئی بار پڑھی جا چکی ہیں۔ جن کا آپس میں کوئی گہرا رشتہ نہیں ہے، عہد مختلف ہیں، مزاج مختلف ہیں مگر وہ یہاں بلا دیہیں رکھی گئی ہیں، کیونکہ اس بازار میں ان کے بھی رسیا مل جاتے ہیں۔ جو انہیں اپنے گھر لے جا کر، ایڈی کلون میں نہلا کر، نئے زمانے کے ملبوس پہنا کر، چہرے پر تازہ سرخی اور تازہ روغن لگا کر نئی کتابوں کے بازار میں لے آتے ہیں۔

آگے رومال اور نگوں کی جانگیہ پہنے والا چیخ چیخ کر اپنے سستے مال کی تشہیر کرتا جا رہا ہے۔

وہیں بیٹھے ایک صاحب ہتھیلیوں کا نقش لئے بیٹھے ہیں۔ آنے والے کو بے کم و کاست سارا حال بتا دیتے ہیں اور مستقبل میں روشنی کا یوں ذکر کرتے ہیں کہ گاہک جھوم اٹھتا ہے اور حساب چکتا کر کے خوش خوش چل دیتا ہے۔

آگے کوئی طشتریوں میں چھلی ہوئی گاجر اور ٹماٹر کا سلاد بیچ رہا ہے۔ چار آنے کی ایک طشتری اور دھوپ چونکہ سخت ہے اور ہر چیز آن کی آن میں سوکھ جاتی ہے۔ اس ونڈر نے ایک بالٹی پانی بھی وہیں رکھ چھوڑا ہے۔ ادھر سلاد خشک ہوا اور اُدھر اُس نے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا۔

کیلوں کی ایک ٹوکری میں کیلے بھرے ہیں۔ پچیس پیسے میں ایک تیز چھری کیلے کے تن کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان میں پسی ہوئی سیاہ مرچ چھڑک دیتی ہے۔

وہیں پر ایک موچی بھی بیٹھا ہے۔ موچی جانتا ہے کہ جوتا کھلنے، تلا سے گھسنے، لیس ٹوٹنے اور جوتے کے بدرنگ ہونے کا مرض اس شہر میں عام ہے۔ اس لئے آپ نے فقط ایک لفظ 'ہیل' کہا اس نے اُجرت بتائی اور سب کچھ فٹافٹ۔ فٹافٹ دراصل ایک منتر ہے، جس کے پڑھتے ہی گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔

پاس میں ایک ٹھیلے والا گنے کا رس بیچ رہا ہے۔ ایک طرف چھلے چھلائے گنے ڈالے جاتے ہیں اور دوسری طرف اُن کا رس نکلتا ہے۔ گلاس کے دو سائز ہیں۔ حسب فرمائش گلاس بھر کر برف ڈالتا ہے اور پھر دوسرے گاہک سے رجوع کرتا ہے۔

ایک اور بھی کنارے کھڑا ہے جو مشین کا ٹھنڈا پانی پانچ پیسے گلاس بیچتا ہے۔ سکہ پھینکا گیا۔ اُس نے اُسے اُٹھایا اور دوسری ساعت شوں شوں کرتا ہوا پانی گلاس میں آ گیا۔

یہ الگ الگ مسائل، الگ الگ رنج و غم والے افراد ہیں جو خدا کی اس بستی میں رزق حاصل کر رہے ہیں کہ یہاں رزق کسی کو فرش پر ملتا ہے اور کسی کو عرش پر۔

یہ کارخانہ گرم ہے، میں دیکھتا بھالتا ہوا، دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس انداز سے کہ گمان ہو کہ یہ شخص چل نہیں رہا ہے مشاہدہ کر رہا، اس عمارت کی طرف بڑھتا ہوں جہاں ساتویں منزل پر مجھے ایک کام ہے۔ ویسے آپ سے کیا پردہ، مجھے کوئی کام وام نہیں ہے، کیونکہ جن صاحب سے مجھے ملنا ہے وہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہیں، جن سے میں وقتاً فوقتاً ملتا رہتا ہوں۔ اسی طرح کی اونچی عمارتوں میں بسنے والے لوگ۔ اور جواب ہر جگہ ایک ہی ملتا ہے۔ 'ابھی کچھ اور انتظار کرو'۔

اس انتظار میں بہت سے دن، بہت سے ہفتے، بہت سے مہینے نکل گئے۔ سچ پوچھئے تو وقت گزرنے کا مجھے کوئی غم نہیں، کیونکہ وقت تو آتا ہی ہے گزر جانے کے لئے۔ وہ اگر میرے پاس رہ بھی جاتا تو میرا کیا بھلا ہوتا۔ پر یہ کہ وہ اپنے ساتھ میری کچھ رقم بھی لے گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے اب اس رقم کے ضائع ہونے کا غم ہے، کیونکہ ان عمارتوں سے ملنے کے لئے، جو آسمان سے ہم کلام ہیں کچھ تو رقم ہونی ہی چاہئے ——— ورنہ یہ کہ کوڑی نہیں ہے پاس تو کوڑی کے تین ہو۔

ساتویں منزل تک جانے کے لئے مجھے لفٹ کی مدد لینی پڑتی ہے اور اگر لفٹ خراب ہی تو ساتویں منزل تک پہنچتے پہنچتے کئی قیامتیں گزر جاتی ہیں۔ اور منزل پر پہنچ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک اُن میں سے بری طرح ہانپ رہا ہے اور دوسرا کھڑا اُسے سخت پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا ہے اور آنکھوں ہی

[illegible] میں حرکت کرتا جا رہا ہے کہ اگر بولے تو پھیپھڑا پھٹ کر [illegible] کی طرح بکھر جائے گا۔ پھر وہ آنکھوں ہی آنکھوں [illegible] محسوس کرتا ہے۔ اور تب وہ مل کر سانس کی باگ کو [illegible] ہاتھوں میں لے لیتے ہیں، اور پھر ایک ہو کر چل کھڑے ہوتے ہیں۔

برآمدے سے راہداری۔ یہ راہداری ایک اور راہداری [illegible] کا رخ کرتی ہے جو ایک بڑے ہال پر ختم ہوتی ہے۔ جہاں مشین کے چھوٹے چھوٹے پرزے تیزی سے چل رہے ہیں، بڑی مشین کو حرکت میں لانے کے لئے۔ بڑی مشینوں کے کمرے کے اوپر تختیاں لگی ہیں۔ باہر ایک پاسبان بیٹھا ہے۔

"صاحب میٹنگ میں گئے ہیں تین بجے تک آئیں گے۔ اُدھر بیٹھ جاؤ۔"

میں ایک میز کے کنارے لگی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں یہ میز فائلوں سے لدی پھندی ہے۔

ابھی صرف دن کے گیارہ بجے ہیں۔

جس کی کرسی ہے وہ غائب ہے مگر اس کا چھوٹا سا تھیلا فائلوں کے اوپر رکھا ہے۔

اب بجز انتظار کے مجھے کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ اژدحام سے بچ کر نکل آئیں تو تنہائی اس سے بھی بڑا اژدحام کھینچ لاتی ہے۔

یہ مشین کی کھٹ کھٹ۔ دفتر کی بھنبھناہٹ کا ہیولیٰ۔ یہ فرش، یہ چھت، یہ پنکھے، یہ پھیلے ہوئے شیشے جن کے قدموں تلے شب و روز تماشا ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب مجھ سے محو کلام ہیں۔ اور یہ وہ باتیں ہیں جو ارضی ہونے کے باوصف ارضی نہیں ہیں کہ ان میں جھوٹ نہیں ہے ریا نہیں ہے، نفس نہیں ہے۔

تب ہی وہ صدر کی کرسی والا پہنچ جاتا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے اور میں اُسے دیکھتا ہوں، اور اس کے بعد ہم اس طرح نظریں پھیر لیتے ہیں جیسے ہمیں [illegible] ضرورت نہیں ہے۔ وہ فائلوں پر جھک کر کام کرنے کے باوجود ایک اضطرابی کیفیت میں بار بار پہلو [illegible] بار بار دزدیدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتا [illegible] اس کا یہ اضطراب بھانپ لیتا ہوں اور اُٹھ [illegible]

ابھی آفیسر کے آنے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔ انتظار تو جیسے میرا مقدر ہے۔

ایک لفٹ ہے جو ساتویں منزل سے چودھویں منزل کا سفر کرتی ہے۔ میں بیچ کی سبھی منزلوں کو چھوڑتا ہوا چودھویں منزل پر پہنچتا ہوں۔ وہیں ایک نقشہ جو نیچے کے دفتر کا ہے۔ کون سا دفتر ہے، اب کون یہ دیکھے اور کون چھان بین کرے۔

مجھے تو وقت کے خزانے کو بے دریغ لٹانا ہے۔

برآمدے میں یہاں سے وہاں تک شیشے کی دیوار کھڑی ہے۔ میں نے سوچا نیچے کا منظر دیکھوں۔ بلندیوں پہ پہنچ کر سب کچھ سبز رنگ میں مدغم ہو گیا تھا۔

کئی کمرے، باتھ اور لیورینل کا جہاں۔ ہر دو تین منزل کے بعد ایک کینٹین۔ بیوی ہوتی تو کہتی آپ کے شوق کی ساری چیزیں یہاں موجود ہیں۔

کمروں کے کئی چکر کاٹ کر پھر برآمدے میں اسی شیشے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اس میں ارادے کو کوئی دخل نہیں کہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ وقت کا بے پایاں سمندر، میرے سامنے ٹھاٹھیں مار رہا ہے، اور میں اُس میں سے چلّو بھر بھر کے پانی نکال رہا ہوں اور [illegible] سمت پھینک رہا ہوں۔ مقام حیرت یہ ہے کہ نہ سمندر کا پانی ایک بوند کم ہوتا ہے اور نہ میں ہی تھکتا ہوں۔

تب ہی میں نے سوچا کہ اس ایک منظر کو کہ یہاں سے وہاں تک سبزہ اُگا ہے اور ناکارہ گائیں گھاس چر رہی ہیں۔

درمیان [illegible] پانی کا نالا بہہ رہا ہے۔ پھر درختوں
کا ایک [illegible] ہے پھر فلک بوس عمارتوں کا سلسلہ
دور [illegible] ہوا ہے۔ اس سے نیچے والی منزل اور
اس سے نیچے والی منزل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

[illegible] ساعت مجھے یہ احساس ہوا کہ میں زینے
طے کرتا ہوا نیچے والی منزل پر جا رہا ہوں۔ بہت ہی آہستہ
آہستہ۔ [illegible] کے اس فرش پر ہزار رجا نہیں کیا خاک ہوں گی
لیکن میرا رویہ کچھ ایسا ہے کہ وقت کو روند بھی ڈالوں گا اور
وقت کی جان بھی بخش دوں گا۔

اچانک ایک عجیب سی کیفیت نے مجھے اپنے گھیرے
میں لے لیا۔ جلال و جمال کا پیکر بنا میں ایک ملکوتی شان
سے، ایک ایک صدی میں، ایک ایک زینے کو طے کرتا ہوا
نیچے کی منزل کی طرف جا رہا ہوں اور میرے مریدوں اور
عقیدت مندوں کا ایک جلوس میرے آگے الٹے قدموں سے
اترتا ہوا ہر ہر زینے پر طلائی مہریں بچھاتا جاتا ہے،
جنھیں میری پشت پر چلتا ہوا ایک مرید اپنی جھولی میں
سمیٹ لیتا ہے۔ اس طرح یہ سفر چودھویں منزل سے
شروع ہو کر بیسمنٹ پر ختم ہو جاتا ہے اور تب میرا مرید
مجھے خبر دیتا ہے کہ اس چہل خانہ گنج کے بوجھ سے اس کے
کاندھے ٹوٹ رہے ہیں۔ اور اب وہ اس سے آگے ان کا بوجھ
برداشت نہیں کر سکتا۔

لیکن میرے پاس تو صرف وقت کا خزانہ ہے، جسے
میں اس شہر میں (جہاں وقت کا کال پڑا ہے) بلا خوف
و خطر دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہوں۔

تیرھویں منزل کے زینے نے بارھویں منزل کو
پہنچایا۔ وہی سارے کمرے، وہی ہاتھ، وہی پورٹیل،
وہی ٹھیلے کی دیوار اور شیشے کی دیوار کے سائے میں وہی
ایک منظر۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کی چشم و ابرو واضح
اور واضح ہوتی جاتی تھیں۔

گیارھویں منزل، دسویں منزل کی راہ دکھاتی
تھی اور دسویں نویں کی۔ نیچے آتے ہوئے کبھی میں آگے کو
دیکھتا تھا جہاں مہریں نچھاور کرنے والے مرحبا اہلاً و سہلاً
کہتے چل رہے تھے اور کبھی پیچھے کی طرف دیکھ لیتا کہ اگر
مہریں سمیٹنے والے آ رہے تھے۔ اور خوش تھا کہ بیسمنٹ تک
پہنچتے پہنچتے ایک چہل خانہ گنج کی کلید میرے قبضے میں ہوگی۔

میں نے گھڑی دیکھی، ایک بے حد مصروف انسان
کے انداز میں۔ ابھی لنچ کو آدھ گھنٹے اور باقی ہیں۔ مجھے
پہلی منزل کی کینٹین میں لنچ لینا ہے اور ابھی میں ساتویں
منزل پر ہوں اور باری باری مجھے سبھی منزلیں طے کرنی ہیں
اور جب میں منزلیں طے کرنے کے متعلق سوچتا ہوں تو
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس عمارت کی منزلیں نہیں ہیں
بلکہ وقت کی منزلیں ہیں۔

ساتویں منزل پر شیشے کی دیوار پر کھڑے کھڑے
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا نیچے کی طرف چھلانگ لگا رہی
ہے۔ تب ہی میرے دل میں ایک خیال آیا کہ کاش وہ طلسمی قبا
میرے پاس ہوتی جسے زیب تن کرنے پر میں سب کو دیکھتا مگر
مجھے کوئی نہیں دیکھ پاتا اور پھر روئے زمین کے سارے خزانے
میری آنکھوں کو خیرہ کر دیتے اور تب وہ چہل خانہ گنج کی
کلید واقعی میرے قبضے میں ہوتی۔

لیکن ساتویں منزل پر تو ایک طلسمی آنکھ راج
سنگھاسن پر بیٹھی تھی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ جب
تک وہ پھول نہ برسائے نجات کی راہیں کسی طور سے
کھل ہی نہیں سکتی ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ہر عمارت کی کسی نہ کسی
منزل پر ایسی ہی کوئی آنکھ ضرور راج کرتی تھی۔

اب دس منٹ اور باقی تھے۔ بس کوئی دم میں

بیسمنٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ وہاں بیسن میں منہ ہاتھ دھو کر بیرے کو ایک کپ چائے کا آرڈر دوں گا، اور تب لنچ بکس کھول کر لنچ حلال کروں گا۔ اس نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کے سفر میں ہر لحظہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں نیچے اوپر روٹیاں حلال کر رہا ہوں۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ ساتویں منزل پر بسنے والی طلسمی آنکھ پھول برسائے یا نہ برسائے، کوئی کہاں تک اس کی فکر کرے کہ ہماری خود مختاری تو لعنتوں کے ہم پر محض ایک تہمت ہے۔

لنچ خشک ہو چکا ہے۔ بار بار یہ جی چاہتا ہے کہ روٹیوں کے لئے کوئی سبزی لے لی جائے۔ کئی بار میں چھپکے چھپکے بجٹ کی کتر بیونت کرتا ہوں لیکن سبزی کسی طرح اس میں فٹ ہی نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے بعد ایک چائے کا بھی مد تھا۔ دو روپئے کی چادر میں کوئی کہاں تک پاؤں پھیلا سکتا ہے۔ ویسے راز کی بات یہ ہے کہ آج پورا ایک روپیہ بچ رہا تھا، ایک خاص کام کے لئے۔

اب دو بجے ہیں۔ میں سوچتا ہوں ایک بار پھر ساتویں منزل تک کا سفر کیا جائے۔ بیسمنٹ میں پہنچ کر میں نے سوچا، لفٹ وہ استعمال کرے جس کے پاس وقت کی کمی ہو۔ میں تو دیر سے اس خزانے کو لٹا رہا ہوں، اور خزانہ ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا، ہر منزل پر رک کر نیچے کی ایک جھ[illegible] نظارہ کرتے ہوئے میں آدھ گھنٹے میں ساتو[illegible] [illegible]یتا ہوں۔

اب شاید وہ آ گئے ہوں جن کی میں راہ دیکھ رہا ہوں، حالانکہ کیا خاک میں ان کی راہ دیکھ رہا ہوں مجھے تو پانچ بجے تک اس دن کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔

صاحب نہیں آئے ہیں۔ میں نے اوپر کی کچھ اور منزلیں سر کر لیں۔

صاحب نہیں آئے ہیں۔ کہیں تم تو نہ گئے (قیامت تک نہ آئیں مجھے کیا، میرا بانچ کا وقت تو آ ہی جائے گا)

تیسری بار میں صاحب آ گئے۔

چہرے کی مسکراہٹ تو دراصل خباثت کا بہت بڑا روپ ہے۔

"جی میں ضرور انتظار کروں گا۔"

تب ہی میرے دل نے کہا۔ "تو بھی تو بڑا خبیث ہے، تجھے تو معلوم تھا کہ یہی جواب ملے گا۔"

میں نے اُسے کہا "اے بندۂ خدا اول تو دفتر کے کچھ اوقات ہوتے ہیں، عموماً دس سے پانچ تک۔ سو میں نے یہ اوقات دفتر میں گزارے۔ پھر ہمارا ایک محتسب ہوتا ہے جو ہمارے اندر ہی کہیں چھپ کر بیٹھا رہتا ہے۔ وہ حق، ناحق۔ حلال و حرام۔ عمل و بے عمل کی باتیں کرتا رہتا ہے، وہ بھی اس زینہ پیمائی سے مطمئن ہو جاتا ہے دیکھ مجھے دو تین وقت کی روٹیاں ایک جگہ سے مل جاتی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے لئے دو روپلیاں میں اپنی پونجی میں سے ہر روز نکال لیتا ہوں۔ میں نے چونکہ کوئی علت نہیں پالی ہے اس لئے ان دو روپیوں میں مزے میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ بس کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ نفس کافی کی دوڑ طرف پڑتا ہے یا کبھی سنترے کے بھرے گلاس کی طرف تکنے لگتا ہے۔ اور سوچئے کہ جس کی کل پونجی دو روپئے ہو وہ کیا کرے۔

لیکن آج سویرے سے میرا یہ جی چاہ رہا ہے کہ ایک لاکھ کا نقصان اٹھا لوں۔ یہی تو اس میں رمز ہے کہ پاس میں صرف ایک روپلی ہو اور اس پر آدمی ایک لاکھ کا نقصان اُٹھا لے۔

قصہ یہ ہے کہ میرا ایک دوست ہے جو پابندی سے

ماہ بماہ پردیاست کی لاٹری کی ٹکٹ خریدتا ہے اور ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں وہ چالیس پچاس لاکھ کا خسارہ اٹھانے کے غم میں ایک قیامت تقریباً بپا کرتا ہے۔ ایک لاکھ + ایک لاکھ + پانچ لاکھ ...... اس طرح یہ رقم چالیس پچاس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

ہم اس کے غم میں اس کا ساتھ دیتے ہیں، چائے پیتے ہیں، گرم گرم تکونے کھاتے ہیں اور پھر بھیگی ہوئی عینکوں کو صاف کرتے ہوئے اس سے رخصت ہو لیتے ہیں

سو میں نے بھی ایک لاکھ کے خسارے کی ٹھانی ہے۔ آج کا حساب تو برابر ہی ہو جائے گا۔

اب چار بج چکے ہیں۔

ابھی ایک گھنٹہ اور باقی ہے۔ میں فٹ پاتھ پر آکر نیچے سے اوپر تک اس عمارت کو دیکھتا ہوں اور دل کے صفحے پر جلدی جلدی ایک حساب کر لیتا ہوں۔ چودھویں منزل تک شاہانہ چال سے چلنا اور پھر اسی شاہانہ چال سے لوٹنا۔ یقینی یہ ایک گھنٹہ میں سر ہو جائے گا۔

چنانچہ بیسمنٹ سے میرا سفر شروع ہوا پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، تاآنکہ چودھویں منزل — باتھ روم میں آئینے لگے تھے۔ میں نے سوال کیا

اب چلا جائے؟

جواب ملا۔ اور کیا —

میں زینہ بہ زینہ اتر رہا ہوں۔ آگے آگے عقیدتیں طلائی مہریں بچھا رہی ہیں۔ پیچھے ایک مرید انھیں سمیٹ رہا ہے۔ بیسمنٹ ایک چہل خانہ گنج کی کلید میرے سپرد کر دے گا۔

یا شاید ان ہی زینوں پہ چپکے سے کوئی طلسمی قبا میرے حوالے کر دے گا اور پھر وہی چہل خانہ گنج۔ مگر بیسمنٹ تک پہنچ کر معلوم ہوا کہ جیب میں صرف ایک لاکھ کا خسارہ پڑا تھا۔

اگلی ساعت پانچ کی تھی۔

آج کی تو چھٹی ہوئی کل کیا ہوگا۔

مگر ان اونچی عمارتوں والے شہر میں تو یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے۔ اور ابھی تو میرے بیگ میں کتنے ہی نامۂ شوق اور بھی پڑے ہیں۔

— —

ت

تشنگی کے بدن میں کھلی چاندنی
آگ کے شہر میں گل مہکنے لگے
وحشتوں کو مِرا نقشِ پا مل گیا
منزلیں کھو گئیں مدعا مل گیا

دارِ رنج و محن
آپ کا بانکپن

زلف زنجیر ہے آنکھ شمشیر ہے
کم سخن ہم سہی، بے زباں تو نہیں
کیا سمندر میں بس جھاگ ہی جھاگ ہیں
ہم کو الزام دو شوقِ تعمیر ہے

طنز ہے لفظِ کہن
آپ کا بانکپن

--

انوار رضوی

اس کی شادی پر
(۱۹۶۹ کے نام)

چمک دکھا کر چھپی ہے بجلی
تو کالے بادل نے آن گھیرا
کہاں کی منزل
کہاں ہے رستہ
میں اندھے گونگوں کی بستیوں میں بھٹک رہا ہوں

چراغ لے کر پہاڑ آئے
تلاش کرتے ہو راکھ کے ڈھیر میں پتنگا
لہو میں لتھڑے شگفتہ لمحے
محبتوں کی کمین گاہوں سے سانپ نکلے
تمہارے دامن میں خار الجھے
نہ میں نے سمجھا
نہ تم نے جانا
روایتوں کے گلے میں گھنٹی بندھے گی کیسے

چڑھائیوں پر ہوا بہت ہے
بدن کے سوراخ بند کر لو
بخار ٹوٹے تو میں بھی چکھوں پھلوں کی لذت

اندھیرا چپ چاپ سن رہا ہے
اندھیرا اندر
اندھیرا باہر بدن کے اوپر لپٹ گیا ہے
اندھیرا تقدیر بن گیا ہے

--

غزل

مظفر حنفی

آگے آگے پھول بچھائے یاروں نے
پیچھے سے پتھر برسائے یاروں نے

جب تپتی راہوں میں دھول اڑاتا تھا
مجھ کو ڈھونڈھا سائے سائے یاروں نے

دیواروں کو ریت نہیں ٹکنے دیتی
منصوبے تو لاکھ بنائے یاروں نے

بنیادی اینٹیں کھسکا دیں نیچے سے
چوٹی پر جھنڈے لہرائے یاروں نے

غیروں کی غیروں سے کوئی لاگ نہیں
یاروں ہی سے دھوکے کھائے یاروں نے

بجلی کے کھمبوں نے آنکھیں چمکائیں
جلدی جلدی ہاتھ ملائے یاروں نے

زہریلے ماحول، مشینی محفل میں
چکنے چکنے شعر سنائے یاروں نے

غزل

فضا ابن فیضی

بہار میں نہیں پھر بھی خزاں کی زد میں ہوں
کوئی بتائے یہ کس امتحاں کی زد میں ہوں
نہ جل اٹھوں کہیں پورے وجود سے اک روز
کہ میں خود اپنے شعورِ تپاں کی زد میں ہوں
مجھے عزیز ہے سب کو سمیٹ کر چلنا
غلط کہ گردِ پسِ کارواں کی زد میں ہوں
جنوں کے معرکو! کچھ اور انتظار کرو
ابھی تو دانشِ عصرِ رواں کی زد میں ہوں
عجیب شخص ہوں، مقتول بھی ہوں، قاتل بھی
کہ اپنے دشنہ و تیر و کماں کی زد میں ہوں
کھڑا ہوں اپنی زمیں پر قدم جمائے ہوئے
نہیں یہ فکر، کسی آسماں کی زد میں ہوں
نہیں ہوں سنگ کہ ہو جاؤں ریزہ ریزہ تمام
ہزار تیشۂ سود و زیاں کی زد میں ہوں
کھلا بھی رکھو جو دروازہ کون آئے گا
کہ میں ابھی سفرِ رائگاں کی زد میں ہوں
کہاں یہ ہوش کہ اپنے بدن کے زخم گنوں
ہر ایک سانس پہ آشوبِ جاں کی زد میں ہوں
کوئی تو مجھ کو اب اس قید سے چھڑا لے جائے
میں کتنی صدیوں سے لفظ و بیاں کی زد میں ہوں
غزل طرازو! ابھی مجھ کو زیرِ لب رکھو
نوائے وقت ہوں لیکن فغاں کی زد میں ہوں
کہاں سجاؤں فضا اب دکانِ شیشہ و گل
یہاں سیاستِ آہنگراں کی زد میں ہوں

ڈاکٹر جاوید نہال

خوابوں کے شہر میں

کئی سوراتیں بیت گئیں، جیسے جگ بیت گیا —
خوابوں کے شہروں میں بھٹکتے بھٹکتے —— میری نیند
بھی غالب کی نیند بن گئی تھی، جس کے لئے موت کی طرح
کوئی دن معین کر دیا گیا ہو' —

"ایسا کیوں؟" آنکھوں کے سامنے، کچھ لمحوں کے لئے
تیرگی پھیل جاتی، پھر روشنی ...... روشنی مجھے زہریلے
ناگ کی طرح ڈسنے لگتی مگر سوچتا رہتا ہوں کہ ناگ مجھے کیوں
نہیں ڈستا؟ ایک بار نیند، کیوں نہیں آجاتی؟ — غالب
کی روح، مجھے اپنی قید سے آزاد کیوں نہیں کر دیتی؟
بہت سی تمناؤں، ہزاروں آرزؤں کو "سفید کفن"
اوڑھائے میں شہر شہر، خوابوں کے ویرانوں میں بھٹکتا رہا
میرا بدن آگہی و شعور کے کانٹوں سے چھلنی ہو کر رستا رہا،
میں کراہتا رہا، سپردگی کے احساس میں خود پر لعنت بھیجنے
لگتا۔ رستم کی طرح ہفت خواں میں کیوں سر نہ کر سکا اور
نہ ہی اوڈیسیس کی طرح آفات سے لڑ سکا۔
خوابوں کے شہروں میں بھٹکتے بھٹکتے، زندگی کبھی
بہت آگے نکل جاتی، کبھی بہت پیچھے چھوٹ جاتی،

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟
میری سوچ برف کی سِل میں ڈھل جاتی، میرا سر دو حصوں میں
بٹنے لگتا اور آنکھیں چنگاریوں سے بھر جاتیں، اور میرے
کمزور ہاتھ خود بخود گریباں سے گزر کر، سانس کی رگوں
کو دبانے لگتے۔ "نہیں نہیں — بزدل۔" خلاؤں میں
بھٹکتی ہوئی، چیخیں میرے شعور میں پگھلنے لگتیں۔ ہاتھ ڈھیلے
پڑ جاتے، آگہی نوکیلی سوئیاں بن جاتیں، میرا بدن لہو
لہان ہونے لگتا۔ میں ان سے بچنے کے لئے خوابوں کے شہر
شہر بھٹکنے لگتا، اور سوچ کی برف پگھلنے لگتی۔

راون، دیومالائی کردار — میں ہنسنے لگتا،
راون ہر دور میں جنم لیتا ہے۔ رام کیوں دھرتی پر نہیں اُترتے؟
سورگ میں کیوں چین کی نیند سو رہے ہیں؟ سیتا کا آج بھی
ہرن ہو رہا ہے! کیوں؟
خوابوں کے شہر شہر میں، کتنی کہانیاں، کتنی داستانیں
میری نظروں سے گزر گئیں۔ بند گلیوں میں راون آج بھی راج
کر رہے ہیں۔ مگر ان کے لنکا کو ڈھانے والا۔؟ سورگ کی
تصویر میری آنکھوں میں پھر جاتی، اور پھر میری فکر برف کی سِل
میں سما جاتی،

میں خوابوں کے شہروں میں کتنی بار ان بند گلیوں سے
گزرا، کتنے راون ملے، کتنی سیتائیں بے بس و لاچار،
رام کو دھرتی پر اترنے کی منتظر بیٹھی تھیں۔ مگر رام گویا کہیں

[illegible]، کہیں کھو گئے تھے۔

راون کی لنکا جل نہیں رہی تھی، چاروں طرف شراب کی نہریں بہہ رہی تھیں۔

"تم میری بادشاہت میں بلا اجازت کیوں آئے؟"
راون کی آنکھوں سے انگارے ٹپک رہے تھے، اور منہ زہرلب، میں بے حس پڑا تھا، اس کی باتیں سن کر مجھے خود بخود ہنسی آگئی۔

"ذلیل کُتّے —" راون بھونکا، "یہ لاکھوں برس پہلے کا اجودھیا نہیں، یا نذر ہیں کہ تم، میری لنکا ڈھانے کے لئے "پل" بنا لوگے۔ میں تمہیں بھی "رام" کے پاس بھیج دوں گا۔ کیونکہ تمہارے چہرے پر بھی رام کا چہرہ چپکا ہوا ہے —"

میں قہقہہ لگانے لگا، خوابوں کے اس شہر میں سڑکیں بند تھیں، گلیاں تہ خانہ تھیں اور فرار کی راہ مسدود، میں قہقہہ لگا رہا تھا، اور راون پیچ و تاب کھا رہا تھا، اور اس سے دور کھڑی معصوم سیتا سہمی ہوئی تھی، "رام نام ست ہے" کی مالا جپ رہی تھی۔

"حرام زادہ، کچھ دیر کے ہنس لے، کوئی احمق لگتا ہے"
میرا قہقہہ اور تیز ہوگیا، بند گلیوں کے باہر کا شہر سو بھی رہا تھا، اور جاگ بھی رہا تھا۔

"سالے کو ڈال دو گرد و غبار کے سمندر میں"
میں چاند پر آگیا ہوں — میری سوچ کی برف پھر پگھلنے لگی۔ گرد و غبار کا سمندر تو صرف چاند ہی میں ہے زمین پر تو آج لہو کا دریا بہتا ہے۔

میں خوابوں کے شہر شہر بھٹکتا۔ اس شہر میں بھٹک آیا تھا۔ غالب کی نیند کی جستجو میں، مگر راونوں کے بیچ یہاں بھی، مجھے میری محبوبہ نہیں ملی۔

گرد و غبار کے سمندر میں بے سُدھ پڑا رہا، ہاتھ اور پاؤں، دو بن گئے تھے، دو ختم ہوگئے تھے، نہ ہاتھ کو حرکت دے سکتا تھا، نہ چل سکتا تھا۔ خوابوں کے اس شہر کی دنیا سحر زدہ تھی، حاتم طائی کی جادوگرنیوں کی دنیا کی طرح ——

گرد و غبار کے سمندر کی چکنی چھاتی، میرے بدن میں سوئیاں چبھو رہی تھیں، لہو کے قطرے سے چھاتی رنگین ہو رہی تھی۔ دودھ اگلنے کے بجائے لہو اگل رہی تھی۔

چاند زمین پر اتر آیا، اور بند گلیوں میں فرحت بخش روشنی پھیل گئی۔ بند گلیوں سے باہر، چند گھنٹوں کے اندر سو گیا تھا، شہر کی چھاتیوں سے جیسے لہو رس رہا تھا، کیا ہوا دودھ کی نہر کیوں سوکھ گئی۔ خوابوں کے اس شہر میں ریگستان کہاں سے ابھر آیا۔ یہاں تو میں بھٹک کر اس امید پر آیا تھا کہ مجھے نیند مل جائے گی، کوئی غالب ملے گا، کوئی راون نہیں ملے گا۔ مگر یہاں تو سب راون ہیں، سب کے بہت سے سر ہیں۔ سب ہی بڑے گیانی ہیں ..... ہر فن مولا

سالے کے سامنے روٹی کی قاشیں ڈال دو، یہ رام نام ست ہے کی مالا جپ رہا ہے، چچا سام کے نام کی مالا نہیں جپتا۔ کورو کے آگے عقیدت سے سر نہیں جھکاتا۔ تڑپا تڑپا کر حرام زادے کو "نیند" بخشوں گا۔

روٹی کی ایک قاش میرے منہ میں چلی آئی، بھاپ سے پگھلتی میرے بدن میں دوڑنے لگی۔

تم مجھے کیوں نہیں مار سکو گے، راون بزدل تھا تم بھی بزدل ہو۔ سچائی تم سے بہت زیادہ طاقت ور ہے۔

"پاگل ہوتا جا رہا ہے۔ اسے چند دنوں کے بعد شہر کے ریگستان میں چھوڑ آؤں گا۔"

گرد و غبار کے سمندر میں تیرتا رہا۔ راون کے منہ سے نکلی ہوئی زہریلی لہریں، میرے بدن کو گلاتی جا رہی تھیں، مجھے "رام" کی جستجو میں بند گلیوں سے

[illegible] ور سہمی ہو [illegible] چند دنوں میں
[illegible] بن کر بک جائے گی۔
میری نظر کی برف پھر پگھل رہی تھی، اب مجھے خواب کی نیند کی بھی آرزو نہیں رہی تھی۔

میں گرد و غبار کے سمندر میں بیٹھ گیا۔ نجات کی ایک راہ تھی، میں نے منتر پڑھا، میرے دونوں ہاتھ گل کر اتر گئے، میں ہلکا محسوس کرنے لگا۔

اور سمندر پر پڑی چھوٹی قاشیں پھر سطح میں آگئیں اور پانی بن کر میری رگوں میں پیوست ہو گئیں۔ میں پیٹ کے بل کھسکتا، بند گلیوں کی دیوار کے پاس آ گیا۔ گلیاں ناچتے گاتے، ننگی ہوئی تھیں اور باہر خوابوں کا شہر سویا ہوا بھی تھا، اور جاگا ہوا بھی۔

میں سستانے لگا، اور پھر میری ذراسی حرکت سے دونوں پاؤں بھی مجھ سے جدا ہو گئے، اب میں اور بھی ہلکا ہو گیا تھا، اور بند گلیوں کے سوراخ کے اندر سکڑ کر سما گیا

گلیاں پیچھے چھوٹ گئیں، اب بھی تھکی تھکی سوئی ہوئی تھی اور خوابوں کے شہر میں، چوڑی سڑکوں پر رینگ رہا تھا سڑکیں سہمی ہوئی تھیں۔ فٹ پاتھ، شکستہ و نڈھال اور روشنیاں زرد زرد، ان زرد روشنیوں کے دریا میں، تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، شور و غل، ہنگامہ، لاش جا رہی تھی، یہ اچانک رک گئی۔

"تم لوگ چلے جاؤ۔ لاش بہائی جائے گی گنگا میں، جاؤ ورنہ ۔۔۔"

لاش سڑک پر سو گئی، ٹھوکریں کھا کر، دریا کی تہ میں سو گئی۔

میں دیوار سے چپکا تھا، رام کہیں نہیں ہیں، رام نام ستیہ ہے کی مالا جپنے لگا۔ مگر رام اب بھی سورگ میں سو رہے تھے، راون ہی راون تھے، یہ خوابوں کا شہر نہیں تھا۔ راون کا شہر تھا۔

شہر پھر سو گیا، بوجھ [illegible]
گیا تھا، نڈھال ہو گیا تھا، اور میں پھر [illegible]
ہو کر رینگنے لگا۔

"میرا سر چکرایا، آنکھوں میں پھر تاریکی چھا [illegible]
"بابا تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" [illegible] بوڑھا، مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا، راون کے شہر میں رام کہاں سے آگیا، کیا رام دھرتی پہ اتر آئے، رام نام ستیہ ہے کی مالا جپنے لگا۔

"نہیں بابا۔" میں نے کہا
"تمہارے ہاتھ، تمہارے پاؤں ....."
"بابا میں خوابوں کے شہر کی بند گلیوں میں چھوڑ آیا ہوں جہاں سیتا رام کا انتظار کر رہی ہے۔"

"تم رام کو ڈھونڈ رہے ہو، رام تم ہو، ہم بھی۔ مگر رام کی شکتی تم میں نہیں، ہم میں نہیں۔"
"بند گلیوں میں ہم واپس جا سکیں گے۔" میں نے پوچھا
"ضرور، ضرور۔"
"کیسے۔"

بابا نے سامنے تیرتی ہوئی دو لاٹھیاں دیں، ان لاٹھیوں کے سہارے تم واپس جا سکو گے۔ "تمہارے رام کا سایہ ہے۔"

بابا کہیں نہیں تھا۔ لاٹھیاں کہیں نہیں تھیں، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے کٹے ہوئے ہاتھ اور پاؤں مجھے واپس مل گئے، میں اٹھ کھڑا ہوا۔

خوابوں کا شہر جاگا ہوا تھا، رام نام ستیہ ہے کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ خوابوں کے شہر میں رام رام ہی تھے، راون بھاگ رہے تھے۔ بند گلیاں کھل گئی تھیں، سیتا سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ [بقیہ ص ۳۷ پر]

بمل کرشن اشک

غزل

کان ہوں بند تو دِکھائی نہ دے
آنکھ کھولوں تو کچھ سنائی نہ دے
راستوں کی طرح کھلا سا رہے
منزلوں کی طرح رسائی نہ دے
جوں اندھیرے سے روشنی میں آئے
دیر تک اذنِ آشنائی نہ دے
کچھ نہ دے تو بُرا نہ ہو نہ بھلا
گر بھلائی نہ دے بُرائی نہ دے
دیکھ اوروں کو بھی ہمارے ہوا
آشنائی کی یوں دُہائی نہ دے
یاد آ کام کے سمے بھی کبھی
دیر تک لمحۂ جدائی نہ دے
اپنی باہوں میں قید کر لے مجھے
اور پھر عمر بھر رہائی نہ دے
ایک ایسے بھنور گئے اکہ ہیں جو
دکھتا تو رہے دکھائی نہ دے
اشک اِس زندگی کو تحفہ سمجھ
ملزموں کی طرح رہائی نہ دے

غزل

ایک آنسو کہ بے کراں سا تھا
میری آنکھوں میں آسماں سا تھا
دوسرے لوگ ذمہ دار جو تھے
غمِ دل بھی غمِ جہاں سا تھا
اُس کی آواز بھی بجھی سی تھی
اُس کا انداز کامراں سا تھا
ایک بجلی کی طرح پھیل گیا
قہقہہ رات پر گراں سا تھا
ہم تو سرحد پھلانگ آئے تھے
اور کچھ تھا کہ نوجواں سا تھا
سوچتے تھے کسی کی نقل کریں
سانس لینا بھی امتحاں سا تھا
اشک جلتی تو تھی چتا غم کی
روشنی میں کہیں دھواں سا تھا

سلیم شہزاد

غزل

دَہر وا ایسا کہ چٹانوں سے روانی مانگے
دِل وہ پیاسا ہے کہ صحراؤں سے پانی مانگے

کہتی ہے ڈھلتی ہوئی رات کہ اب سو جاؤ
داستاں میری کوئی اور کہانی مانگے

پیکرِ شعر کو دینا ہے اسے روپ نیا
رنگ کچھ اور بھی تخئیل کا مانی مانگے

دیکھ کر نام کی تختی مرے دروازے پر
شہر کا شہر صداقت کی نشانی مانگے

اپنی ہستی کے صدف میں کہو اس سے جھانکے
وسعتیں اور جو اس عہد کا گیانی مانگے

ہو گیا شیشۂ آوازِ سخن چکنا چور
گنبدِ آرزو اب اک نئی بانی مانگے

پھر ٹپکنے لگے سورج کی نظر سے شعلے
پھر ہوس اس کی زمینوں کی جوانی مانگے

پھر لہو چیخ رہا ہے، مجھے آزادی دے
پھر مرا شوق کوئی دشمنِ جانی مانگے

پاس دریا ہو تو کیونکر نہ بڑھے پیاس سلیم
دل وہ پیاسا ہے کہ صحراؤں سے پانی مانگے

غزل

پتھر میں، گل میں، گیت میں ڈھلتا دکھائی دے
ہر پل وہ روپ رنگ بدلتا دکھائی دے

کیا اپنے جاگنے کا رہے پھر مجھے یقیں
دیکھوں جسے وہ خواب میں چلتا دکھائی دے

وہ اجنبی ہوا ابھی نہیں آشنا مگر
ہر شعر اس کے روپ میں ڈھلتا دکھائی دے

پاتے ہی قربِ قید سے گھبرائے اس قدر
وہ اپنے پیرہن سے نکلتا دکھائی دے

صحرا کی آرزو کہ برس جائے کوئی ابر
دریا بھی اپنی پیاس میں جلتا دکھائی دے

کیسے پتا مزاج کا اس کے ملے، کہ وہ
مورت سا چپ ہواؤں سا چلتا دکھائی دے

ملزم نہ اس کے واسطے ٹھہراؤ دھوپ کو
سائے میں رہ کے بھی جو پگھلتا دکھائی دے

آؤ کریں تلاش نئے رنگ و بو، سلیم!
موسم لباس اپنا بدلتا دکھائی دے

علی حیدر ملک

بینا نابینا

پہلا آدمی چھڑی سے ٹک ٹک کرتا مالابار ی ہوٹل میں داخل ہوا اور پنکھے کے نیچے پڑنے والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہوٹل کا بیرا فوراً اس کے پاس پہونچا اور سنگی میز کو گندی صافی سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"کیا کھاؤ گے؟"

چھڑی والے آدمی نے اپنی چھڑی کو اطمینان سے میز پر رکھ کر کہا۔ "پانی لاؤ۔"

بیرا اندر باورچی خانے کی طرف گیا اور پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس لاکر میز پر پٹختے ہوئے بولا۔

"اور کیا لاؤں؟"

چھڑی والے آدمی نے جگ اٹھایا اور گلاس میں پانی ڈھالنے لگا۔ کچھ پانی گلاس کی بجائے میز پر گر گیا۔ اس نے جگ کی پوزیشن بدلی اور گلاس بھر کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔ بیرا کھڑا انتظار کرتا رہا جب اس نے پورا گلاس ختم کرکے اسے میز پر رکھ دیا تو بیرے نے پوچھا۔

"اور کیا آرڈر ہے؟"

"ٹھہرو۔ ابھی ہمارا ایک اور آدمی آنے والا ہے۔"

بیرا منہ بناتا ہوا دوسری میز کی طرف چلا گیا۔ اتنے میں دوسرا آدمی سیاہ چشمہ لگائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا میز کے پاس آیا اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی سے میز کو تھپتھپانے لگا۔

"ہاں بیٹھو" ——— پہلا آدمی پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

دوسرے آدمی نے میز کے نیچے سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا ابھی وہ کوئی اور بات نہ کر پائے تھے کہ بیرا پھر آن پہنچا۔

"اب تو دوگے آرڈر۔ بتاؤ کیا لاؤں؟"

پہلے آدمی نے دوسرے آدمی کو مخاطب کرکے پوچھا

"چائے پیوگے؟"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کچھ کھاؤں گا۔"

دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

"اچھا تو پہلے دو روٹی اور ایک نہاری لے آؤ۔"

پہلے آدمی نے بیرے سے کہا۔

بیرا آرڈر لے کر چلا گیا تو دوسرے آدمی نے پہلے سے پوچھا ———

"تم بہت دیر سے انتظار کر رہے تھے کیا؟"

"نہیں، زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" پہلے نے کہا۔

"اور سب سناؤ۔ کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس۔"

"آج دھندا کیسا رہا؟"

"بہت اچھا ــــــــ"

بیرا روٹی اور نہاری لاکر رکھ گیا۔ دوسرے آدمی نے پہلے سے کہا ــــــ "آجاؤ تھوڑا سا تم بھی۔"

"نہیں۔ بالکل خواہش نہیں۔ میں پہلے ہی جم کر کھا چکا ہوں۔"

"اوہو۔ کیا بات ہے۔ کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا کیا؟"

"نہیں ــ قارون کا خزانہ تو نہیں ملا۔ ایک حاتم طائی مل گیا تھا آج۔"

"حاتم طائی؟"

"ہاں! ــــــــ"

"اپنا دھندا تو آج بالکل مندا تھا۔ صبح سے دوپہر تک اسٹیشن پر کھڑا رہا۔ لیکن بہنی بھی نہیں ہوئی۔"

دوسرے آدمی نے روٹی کا لقمہ نہاری میں بھگو کر منہ میں رکھا۔ــ "دوپہر کے بعد ٹاور کے پاس آگیا، مگر یہاں پر بھی کوئی خاص آمدنی نہیں ہوئی۔ دن بھر میں صرف پانچ روپئے ہوئے ہیں۔"

اتنے میں تیسرا آدمی ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر کی اور پھر کوئی میز خالی نہ پاکر اُسی میز پر آگیا جس پر پہلے اور دوسرے آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔

بیرا تیسرے آدمی کے پاس آیا۔ "کیا لاؤں صاب؟"

"چائے۔"

بیرے نے چائے کی پیالی لاکر اُس کے سامنے رکھ دی اور وہ آہستہ آہستہ چائے کی چسکی لینے لگا۔

"میں آج سپر مارکیٹ کے قریب تھا۔" پہلے آدمی نے کہنا شروع کیا۔ "وہاں پہ میری بھی کوئی خاص آمدنی نہ ہوئی بس دو تین روپے ہوئے ہوں گے۔ لیکن شام کے وقت مغرب سے ذرا پہلے چمکتی ہوئی نئی گاڑی میں ایک آدمی آیا۔ وہ کچھ دیر یوں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر میرے پاس آیا اور بولا۔ "بابا دعا کرو کہ میرا مال بخیر و خوبی پار ہو جائے۔" اُس نے پچاس روپے کا ایک نوٹ مجھے دیا اور پھر وہی بات دہرائی۔ "بس بابا دعا کرو۔"

"پچاس روپے اس مہنگائی کے زمانے میں؟ ــ" دوسرا آدمی حیرت سے بولا۔ "کون آدمی تھا وہ؟"

"بس حاتم طائی سمجھو۔"

تیسرا آدمی پہلے اور دوسرے آدمی کی گفتگو چپ چاپ غور سے سنتا رہا۔

"ایک حاتم طائی کی بچی تو مجھ سے بھی ٹکرائی تھی۔" دوسرے آدمی نے اپنی روداد شروع کی ــــــ "میٹنی شو کے بعد سنیما سے نکلی تھی۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے بالوں والا ایک چھوکرا بھی تھا۔ وہ دونوں میرا صدا سُن کر رک گئے اور میرے پاس آئے۔ عورت نے کہا۔ شاہ جی! مجھے ایک تعویذ دے دو تاکہ جلد سے جلد اُس بوڑھے خرانٹ سے نجات مل جائے۔"

میں اس کا مطلب نہیں سمجھا تو اُس نے وضاحت کی "میں اپنے شوہر سے طلاق چاہتی ہوں۔ وہ بڑا بدمعاش آدمی ہے۔"

میں نے ایک تعویذ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے اُسے حفاظت سے پرس میں رکھا اور مسکراتی ہوئی بولی۔

"طلاق کے بعد میں اپنے اس دوست سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

لڑکا بھی اس کی بات پر خوشی سے مسکرایا۔ "پھر اس نے پرس سے دو روپے نکال کر مجھے دئے اور بولی" فی الحال یہ رکھو شاہ جی۔ مراد پوری ہو جانے پر میں تمہیں خوش کر دوں گی" پرس بند کرنے کے بعد اُس نے اپنے نوجوان دوست کا ہاتھ پکڑا

اور ملک یوسف بھی اسی کو بڑھ گیا۔"

"تو اس حاتم طائی کی بچی نے مجھے آئندہ کے وعدے پر ٹال دیا ——"

"ہاں! —— میں سمجھا تھا کہ آج موئی آسامی پھنس ہے۔ وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مگر"

وہ ملتے جلتے دوسرا آدمی کچھ دیر کو رُکا۔ "مگر یار! جانے جو بھی ہو۔ چیز بڑی زبردست تھی۔"

"تو تجھے کیا؟ ——"

"مجھے اس لونڈے پر رشک آ رہا ہے۔ عیش کر رہا ہوگا بیٹا ——"

کچھ دیر کو دونوں خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا آدمی خیالوں کی دنیا سے واپس آتے ہوئے پھر بولا "واہ واہ کیا چیز تھی۔ طبیعت خوش ہوگئی۔"

تیسرے آدمی نے جوان دونوں کی گفتگو بہت غور سے سن رہا تھا اور اب تک خاموش تھا، ایک بار پھر ان کے چہروں کی طرف نظر کی اور حیرت سے بولا۔ لیکن تم لوگ دیکھتے کیسے ہو؟"

"تمہاری تو آنکھیں نہیں ہیں۔"

"کیا کہا؟ — ہماری آنکھیں نہیں ہیں؟" پہلے اور دوسرے آدمی نے بیک وقت چیخنے کے سے انداز میں کہا

"اور تم بڑے آنکھوں والے ہو؟ ——"

پھر دونوں ہلکورے لے لے کر زور زور سے قہقہہ لگانے لگے۔

تب وہ تیسرا آدمی جو اپنے چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں سجائے ہوئے تھا۔ اندھے قہقہے میں شرابور، تجل تجل سا ہوٹل سے نکلا اور بھیڑ میں منہ چھپا کر کہیں غائب ہوگیا۔

●●

بقیہ: خوابوں کے شہر میں

"رام تم آگئے۔" اس کے چہرے پر پھول کھل رہے تھے۔

"میں تنہا نہیں ہوں، بہت سے رام ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ مگر راون کے بیچ رہی ہو، اس لئے اگنی پریکشا سے گزرو۔ سیتا اگنی پریکشا سے گزری اور میں سیتا کے پیچھے، اپنے ہاتھ پاؤں کے بغیر، اپنی منزل کی طرف جا رہا ہوں میرے خوابوں کا شہر مجھے مل گیا ہے۔ اور سفید بالوں والا بابا دور کھڑا ہاتھ ہلا ہلا کر ہم سب کو سفر جاری رکھنے کا اشارہ کر رہا تھا

——

بقیہ: لولڈ کریم

میاں جی کے پاس تو کیا کر رہی تھی؟"

"اری تو اپنے کپڑے کیوں سمیٹ رہی ہے۔"

نسیمہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور تقریباً سسکتے ہوئے کہا۔

"میاں جی نے مجھے نکال دیا ہے وہ کہتے ہیں تو سمندر ہے۔"

ملکہ منہ پھاڑے حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور اس وقت تک گم سم کی تصویر بنی رہی جب تک کہ نسیمہ سرونٹ کوارٹر سے نکل کر اندھیرے میں ڈوب گئی۔

دوسری صبح جب ملکہ میاں جی کے کمرے میں جھاڑو دینے پہنچی تو اس نے دیکھا کو لڈ کریم کی شیشی اپنی جگہ جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔

——

عشرت ظفر

غزل

طلسم رنگِ کہن بے نقاب دیکھتا ہوں
تمام شہرِ فلک زیرِ آب دیکھتا ہوں

دیا نہ اُس نے مجھے کچھ بھی پتھروں کے سوا
مگر لہو میں ہزاروں گلاب دیکھتا ہوں

یہ کیسا دشت ہے جس کے ہر ایک ذرّے پر
رقم، فسانۂ نخل و سحاب دیکھتا ہوں

ہیں سنگریزوں کی مانند آسماں و زمیں
یہ شعبدہ ہے کوئی، یا کہ خواب دیکھتا ہوں

بسیط، بحرِ نفس پر میں دُور تک عشرت
قطار خیمۂ موج و حباب دیکھتا ہوں

غزل

برگ کی طرح نہ یوں دشتِ سفر میں ہوتا
میں اگر قید کسی سبز شجر میں ہوتا

نہ مجھے دیکھتا اک ذرۂ خورشید نگاہ
اور نہ میں حلقۂ گردابِ شرر میں ہوتا

باہر آیا نہ کبھی بطنِ صدف سے، ورنہ
قطرۂ آبِ نفس چشمِ گہر میں ہوتا

تا جہت تا بہ جہت کتنی فصیلوں کے حصار
کس طرح میں نہ ترے دامِ نظر میں ہوتا

عشرت آزاد ہواؤں کی گرفتاری پر
کیوں نہ اک شور سا ہر سمت کھنڈر میں ہوتا

عبداللہ کمال

غزل

وہ سچ تھا شاید، کہ میرے قدموں پہ چاند تارے جھکیں گے اک دن، کہ چاند تاروں کو سطحِ دریا پہ اپنے قدموں میں دیکھتا ہوں
پڑا ہوں بازارِ مصر میں اب کوئی زلیخا کسی کی شب کے خواب لے کر ادھر سے گزرے، میں حسنِ یوسف ہوں، بک رہا ہوں

نہ جانے کس نے گزرتے لمحوں کی کچی آنکھوں پہ عہدِ نو کا شکستہ عدسہ چڑھا دیا ہے، عجیب بے ربط سلسلہ ہے
کہ الف لیلیٰ کے اک پُراسرار شہر کی کچھ حسین دیواریں ڈھے رہی ہیں، طلسم رشتہ بھی ٹوٹتا سا میں دیکھتا ہوں

میں دشتِ امکاں کا اک مسافر، سرابِ صحرا کو آب کر کے، کئی سمندر کو پیاس کر کے رُکا ہوں اک پل، کہ شب تھی باقی
سنہرے پتوں کے سبز موسم کی نم صداؤ، (ابھی تو شبنم بھی سو رہی ہے بساطِ گُل پر) ذرا ٹھہرنا، میں آ رہا ہوں

دِشاؤں کا فلسفہ الگ ہے، تم اپنے جسموں کی ساخت بدلو کہ اِن نشیب و فراز راہوں پہ ہم سفر تم کو اپنا کر لوں
تمہاری رفتار تیز تر ہے، مگر ہو محصورِ وقت ابھی تم، میں عکسِ شیشہ، گزرتے لمحوں سے آگے ہر دم اُڑا کیا ہوں

وہ کون خوش فہم ہے نہ جانے، کھنڈر کی ساری شکستہ اینٹوں پہ رنگ و روغن چڑھا رہا ہے، مجھے ابھی تک بلا رہا ہے
کمالؔ ہے، میں تو عدم وجود اور وجود دونوں میں اپنی ضد ہوں، کہ جسم سے ایک قصرِ ریگ اور زباں سے سرچشمۂ صدا ہوں ––

ایوب جوہر

۱

کولڈ کریم

نسیمہ کی آمد پہ اتنا بڑا معجزہ ہرگز نہ ہوا تھا جتنا بڑا میاں جی کے سفید بالوں کی یکلخت سیاہی میں تبدیل ہو جانے پہ ہوا تھا۔

مانک لاج میں نسیمہ جیسی لڑکیاں اکثر آتی رہی ہیں اور مہینہ چھ مہینہ رہ کر اپنی اپنی راہ بھی پکڑتی رہی ہیں لیکن میاں جی کے سفید بال کبھی سیاہ نہ ہوئے۔ مگر اس ننھی سی چھوکری کی آمد نے کیا گل کھلایا کہ میاں جی کے نہ صرف سفید بال ہی یکلخت سیاہ اور چمک دار ہو گئے بلکہ وہ مونچھیں بھی جو کبھی باعث شان مردانگی تھیں چہرے سے پھر پھرا کر اڑ گئیں۔ اس حیرت انگیز تبدیلی پر مانک لاج کے ملازموں نے دلچسپی سے دیکھا تھا جبکہ ان کا یہ حق بھی تھا۔ کیونکہ جس کی عقل گھٹنوں تک ہوتی ہے وہ گھٹنوں تک ہی سوچتا یا دیکھتا ہے۔ حالانکہ سفید بالوں کو ایک ایک کر کے چنوانے سے کہیں بہتر ہے کہ اس پر سیاہی پوت دی جائے اور مونچھیں تو یوں بھی مکروہ ہوتی ہیں۔ نوالہ اٹھاؤ تو فوفو، پانی پیو تو شوشو۔ لہٰذا کانٹوں کو پالنے سے بہتر ہے کہ درخت ہی کاٹ دیا جائے۔

مگر اُن کا کیا کیجئے کہ کچھ لوگوں کو بات سے بات نکالنے کی ایسی لت پڑ جاتی ہے کہ وہ ایسا نہ کریں تو پیٹ کے مروڑ سے مارے جائیں، ایسے لوگوں میں ملکہ کا نام سب سے نمایاں تھا۔ جو مانک لاج کی سب سے پرانی خادمہ تھی۔ مانک لاج کے دوسرے نوکروں کا کہنا تھا کہ جب تک بیگم صاحبہ زندہ رہیں ملکہ مانک لاج کے نوکروں پر ملکہ کی طرح ہی حکومت کرتی رہی۔ لیکن بیگم صاحبہ کی آنکھیں کیا بند ہوئیں کہ وہ بجھ کر ہی رہ گئی۔ پر عادت تو عادت ہی ہے۔ جو ہزار بار دھونے پر بھی کم بخت نہیں چھٹتی۔ سو بیچاری ملکہ بھی اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ کیا مجال کسی کی چھینک آئی اور وہ تبصرے سے باز رہی۔

"اری اس نے برسات کے پانی میں نہا کر ایسی حالت کی ہے۔ خالی پیٹ ڈاب پینے، یا دہی کھانے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نہ کہتی ہوں کہ ننگی زمین پر چت چٹان مت سویا کرو اس سے سردی ہی نہیں نمونیا بھی ہو جاوے ہے۔"

یہ تو ملکہ کا سردی پر معمولی سا تبصرہ ہوتا۔ لیکن کسی کے بال یکلخت سفید سے سیاہ ہو جائیں۔ اور چہرے سے مونچھیں پھر پھرا کر اڑ جائیں اور وہ بھی میاں جی جیسے آدمی کا، جن کی بیگم کو انتقال ہوئے ابھی صرف چھ مہینے ہی گزرے ہیں ظاہر ہے اس پر تبصرہ کیسا ہوگا۔ لیکن مانک لاج کے دوسرے ملازموں نے اس عظیم [illegible] پر ملکہ کی زبان

جب ایک بیرہ سا شعر [illegible] سنا تو وہ حیرت زدہ بھی ہوئے [illegible]۔

"ارے! میاں جی اُس چھنال پر لٹو ہو گئے ہیں جب دیکھو نسیمہ، نسیمہ۔ اونہہ جیسے راجہ اندر کی پری ہے۔"

حالانکہ نسیمہ میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں تھی نہ ہی وہ راجہ اندر کی سبھا کی پری تھی اور نہ ہی کوئی ایسی نگوڑی چیز کہ جس پر آدمی تو آدمی فرشتے بھی لٹو ہو جائیں۔ وہ بارہ تیرہ سال کی لڑکی۔ معمولی شکل و شباہت، نہ آنکھوں میں نشہ، نہ زلف میں پیچ و خم اور نہ ہی چال میں لچک۔ لے دے کر ایک جسم ہی ایسا گول مٹول تھا جس پر ایک آدھ نظر پھسل ہی جاتی تھی یا سینے کے اس جانب جہاں دو عدد لٹو چپکے ہوئے تھے۔ حسن کا یہ معیار اگر میاں جی کے سفید بالوں یا کراری مونچھوں کا دشمن بنا تھا تو واقعی یہ حیرت انگیز بات تھی۔

لیکن بات کچھ تھی ضرور۔ مانک لاج کی دہلیز جو شام ہوتے ہی میاں جی کے دوستوں کے بلیے قہقہوں سے گنگنا اُٹھتی تھی، نہ جانے کیوں کچھ دنوں سے سنسانے لگی تھی۔ جیسے دہلیز نہ ہو کوئی بھوتوں کا اڈہ ہو جہاں شام ہوتے ہی "پُرخطر علاقے" کا بورڈ لگا دیا جائے رام پرشاد آئے تو میاں جی کی طبیعت خراب، کریم خاں آئے تو میاں جی سو رہے ہیں، عبداللہ جی آئے تو میاں جی گھر پر موجود نہیں۔ اب اس قسم کے جوابات کا کوئی کہاں تک متحمل ہو۔ غرض دوستوں نے بھی اپنے نئے اڈے ڈھونڈ لئے اور ادھر [illegible] ——— وہ بھی شاید بند کمرے میں [illegible]۔ کبھی اس دیوار، کبھی اس دیوار، کبھی [illegible] کے سامنے، کبھی میز، کرسیوں پر، کبھی ہر سے زیادہ گرم کتابوں کے اندھیرے میں، اور پھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتے تو چیخنے لگتے۔

"اری نسیمہ، او ———"

"جی آئی۔"

"ذرا دیکھو میری عینک کہاں گم ہو گئی۔"

"جی، وہ تو میز پر ہی پڑی ہوئی ہے۔"

"اوہو ———" میاں جی نسیمہ کے ہاتھ [illegible] عینک لے کر اپنی آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے اس [illegible] مطمئن ہو جاتے جیسے وہ عینک ہی ڈھونڈ رہے تھے نسیمہ جوں ہی آنکھوں سے اوجھل ہوتی پھر اُن کی کوئی چیز گم ہو جاتی۔

"نسیمہ، اری او [illegible]۔"

"جی آئی۔"

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ اُدھر ملکہ کی جھنجھناہٹ عروج پر ہوتی۔ اونہہ نسیمہ، نسیمہ، نسیمہ۔ بڑھاپے میں یہ چوچلا، اور وہ بھی چھٹانک بھر بچھوکری سے، ابھی بھی قیامت نہ آوے تو کیا آوے۔"

"کیا ہوا ملکہ رانی، کیوں جھنجھنا رہی ہو؟" کوئی ملازم دال میں پھوڑن لگاتا اور وہ گڑگڑانے لگتی۔

"ہوتا کیا، کان تو تمہارے بھی ہیں، سن نہیں رہے ہو نسیمہ، نسیمہ، جیسے اس کوٹھی میں صرف نسیمہ ہی ہے اور سب کاٹھ کے اُلو۔"

"ملکہ رانی، ہماری اس میں بھلائی ہے، میاں جی کو اس کھلونے سے کھیلنے دو، ورنہ ساری بک بک جھک جھک ہمارے سر آ جائے گی۔"

"ہے ہے، تو کیا ہم کام چور ہیں جو بک بک جھک جھک ہمیں سننا پڑے گی۔"

"یہ بات نہیں ملکہ رانی، میں تو سبھوں کی بھلائی کے لئے کہہ رہا ہوں ویسے تمہاری مرضی، مگر ایک بات یاد رکھو، میاں جی کی رائے تمہارے بارے میں اچھی نہیں۔"

اچھی نہ ہو میری جوتی سے، مجھے کیا نوکری کی کمی ہے جب چاہوں تب دوسری جگہ لگ سکتی ہوں۔"

لیکن اُس روز جب وہ میاں جی کے کمرے کے سامنے سے گذر رہی تھی اور نسیمہ کمرے کے اندر میاں جی کی کوئی گم شدہ شے ڈھونڈ رہی تھی کہ میاں جی نے اُسے دیکھتے ہی اس زور کی ڈانٹ پلائی کہ وہ ساری چوکڑی بھول گئی۔

"یہاں کیا کرنے آئی تو، خبردار جو میں نے کبھی تجھے اس طرف دیکھا۔ چُٹیا پکڑ کر نکال دوں گا۔ سمجھی!"

مانک لاج میں ملکہ پر یہ پہلا زبردست حملہ تھا جسے وہ سہارنے کی قوت نہ رکھتی تھی۔ لیکن مانک لاج اور کسی نئی جگہ کی نوکری میں جو اُسے طویل فاصلہ نظر آیا تو وہ بھیگی بلی بننے پر ہی مجبور ہو گئی۔

لیکن تو یہ ہے۔ یہ مجبوری بھی کوئی مجبوری ہے۔ اُس نے جسم سمیٹ لیا۔ چال سمیٹ لی۔ لیکن زبان کی قینچی کو سمیٹنے میں ناکام ہی رہی۔ میاں جی نے نسیمہ کو نئے جوڑے کیوں سلوا کر دیئے۔ اس کی تنخواہ دوگنی کیوں کر دی۔ میاں جی نے اُسے آج یہ دیا، میاں جی اُسے آج وہ دیا۔ ارے میاں جی اگر نسیمہ کو اپنی پوری دولت اُٹھا کر دے دیں تو اس میں ملکہ یا کسی اور کا کیا۔ لیکن ملکہ کی قینچی نما زبان کو کون تالے دیتا۔ اب یہ بھی کوئی اہم مسئلہ ہوا۔ میاں جی نے اگر کولڈ کریم کی ایک آدھ شیشی خریدی تو کیوں خریدی! لیکن ملکہ کے نزدیک یہ بڑا اہم مسئلہ تھا۔

"ارے سُنا تم نے، میاں جی نے وہ کیا ہوتے ہیں سنو کریم، اُس کی ایک ڈبیہ خریدی ہے۔"

"خریدی ہو گی۔"

"ارے اُس چھنال کو دینے کے لئے۔"

"تو دینے دو۔"

"تم سبھوں کی عقل ماری گئی ہے۔ ارے تم اتنی ذرا سی بات کیوں نہیں سمجھتے؟"

"میں سب سمجھتا ہوں، اب تم بھی سمجھا کرو۔"

"اونہہ، تم سب میاں جی کی طرح ہی ہو گئے ہو۔"

مخاطب کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رینگتی اور ملکہ کی بھنبھناہٹ میں بہت ساری مکھیاں لپٹ پڑتیں۔

ملکہ کی ساری توجہ کولڈ کریم کی شیشی کی طرف منتقل ہو گئی جسے وہ چوری چھپے دن بھر میں دو چار بار ضرور دیکھا کرتی تھی۔ لیکن ایک روز، دو روز، اور پورے چار دن گزر گئے۔ شیشی جہاں کی تہاں ہی پڑی رہی تو ملکہ کے ذہن میں کئی سوال یکلخت بھنبھنا اُٹھے۔

"آخر یہ شیشی اب تک وہیں کیوں پڑی ہوئی ہے؟"

"میاں جی اسے اب تک نسیمہ کے حوالے کیوں نہیں کیا۔؟"

"کیا میاں جی اپنے استعمال کے لئے لائے ہیں۔ لیکن شیشی کا ڈھکن بھی تو اب تک نہیں کھلا؟"

"کیوں؟"

لیکن کوئی جواب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

مگر ایک رات، پھر اس کی سرگوشیاں تیز ہو گئیں۔

نسیمہ اب تک سرونٹ کوارٹر میں نہیں آئی۔ شاید میاں جی اُسے دبوچ رکھا ہے۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں، اب انتظار فضول ہے سو جاؤ۔

لیکن ملکہ جو دوسروں کو سو جانے کی تلقین کر رہی تھی خود جاگتی رہی جبکہ دوسرے ملازم اپنے اپنے بستر میں خراٹے بھرنے لگے۔ یکایک گھڑیال نے ایک بجے کی ٹنک لگائی اور اس کی پلکیں آپس میں جُڑنے لگیں کہ کسی کے قدموں کی آہٹ نے اُسے چونکا دیا۔

"اری نسیمہ تو؟ مگر اتنی رات گئے تک (بقیہ [illegible] پر)

محمد وصی

غزل

نظر اٹھا کے کسی کو بھی دیکھتا ہی نہیں
کہ جیسے اس کے سوا کوئی دوسرا ہی نہیں

میں ہنس رہا ہوں مگر کتنی کھوکھلی سی ہنسی
تمام زندگی جیسے کبھی ہنسا ہی نہیں

مجھے خبر نہیں اپنی، نہ جانے کیسا ہوں
بہت دنوں سے خود اپنے سے میں ملا ہی نہیں

پرانا زخم نیا زخم دے کے جاتا ہے
جو ٹوٹ جائے کہیں یہ وہ سلسلہ ہی نہیں

میرے بدن کی تواضع کرو گے اب کیسے
کسی کے ہاتھ میں پتھر کوئی بچا ہی نہیں

غزل کے شعر ترستے ہیں داد پانے کو
کہ آج تک کوئی اہلِ زباں ملا ہی نہیں

رشید نثار

غزل

جنگل سی ایک رات ہے، تنہا سگوں میں ہوں
برفاب ہو گیا ہوں، لہو کی رگوں میں ہوں

نیلام کر گئی مجھے رات کی روشنی
میں بے لباس جسم کی رت جگوں میں ہوں

میرا بھی نام وقت کے پیغمبروں میں تھا
آؤں گا تیرے پاس بھی اب تو ٹھگوں میں ہوں

چہروں کا نور میرے لہو کا گلاب تھا
کس سے کہوں کہ درد کے اندھے جگوں میں ہوں

مٹی نے میرے جسم کو تھاما ہوا تو ہے
ورنہ میں دھنس رہا ہوں لرزتے ڈگوں میں ہوں

جاگا ہوں میں تو سارا جہاں پاس آ گیا
کہتی ہے آنکھ آج بھی جھوٹے نگوں میں ہوں

اسعد بدایونی

غزل

نظر اُٹھا کے جو دیکھا اِدھر کوئی بھی نہ تھا
سُلگتی دھوپ کی سرحد پہ گھر کوئی بھی نہ تھا

چمکتے دن میں تو سب لوگ ساتھ تھے لیکن
اداس شب میں مرا ہمسفر کوئی بھی نہ تھا

سبھی کو فنِ جراحت سے واقفیت تھی
ہماری طرح وہاں بے ہنر کوئی بھی نہ تھا

ہر ایک جسم تھا اک پوسٹر شعاعوں کا
سلگتے دشت میں ٹھنڈا شجر کوئی بھی نہ تھا

جو تلخ شام کے سایوں کا قتل کر دیتا
تمام شہر میں اتنا نڈر کوئی بھی نہ تھا

سب اپنے کمروں میں مستی کی نیند سوتے تھے
سیاہ شب میں سرِ رہگزر کوئی بھی نہ تھا

اک ایسے شہر سے یارو پلٹ کے آیا ہوں
سبھی تھے راہی جہاں راہبر کوئی بھی نہ تھا

ہر ایک شہر میں آسیب کا بسیرا ہے
جہاں سکون ہو ایسا نگر کوئی بھی نہ تھا

مرے زوال کی تھی سب کو آرزو اسعد
مرے کمال سے خوش دل مگر کوئی بھی نہ تھا

غزل

کرب لمحوں کا بڑھ گیا ہوگا
اُس نے جب میرا خط پڑھا ہوگا

ایک بچہ غلیل سے اپنی
پیڑ کے پھول توڑتا ہوگا

اجنبی شہر کے درختوں سے
آپ نے بھی تو کچھ کہا ہوگا

اونگھتی رات کے دریچوں سے
کوئی چہرہ تو جھانکتا ہوگا

ٹوٹ کر شب کی جھیل میں یارو
چاند کا جسم گر گیا ہوگا

جن کے الفاظ دھندلے دھندلے تھے
ان کتابوں میں کیا ملا ہوگا

صاف شیشوں کی کھڑکیوں پر برف
خاک کی طرح جم گیا ہوگا

رات کا ایک زخم خوردہ پرند
آسمانوں میں اڑ رہا ہوگا

آنے والے دنوں کا خواب اسعد
جانے کس کس کو دیکھنا ہوگا

ابراھیم یوسف

سکون

کردار

خدیجہ بیگم : اکثر جذباتی دوروں کا شکار رہتی ہیں
عظمت خالہ : ملازمہ، جس کی سب عزت کرتے ہیں
عالیہ : خدیجہ بیگم کی بہو جس نے اب دوسرا نکاح کر لیا
مُسلم : عالیہ کا شوہر

منظر :

مسلم اور عالیہ کی مشترکہ خواب گاہ۔ دو مسہریاں جن کے درمیان ایک چھوٹی میز رکھی ہے جس پر ایک ٹیبل لیمپ ہے۔ دائیں جانب کی مسہری کے پاس دیوار سے لگی ایک چھوٹی سی الماری ہے جس میں خوب صورت گرد پوش کی کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ بائیں جانب کی مسہری کے پاس دیوار سے لگی سنگھار میز ہے۔ جس پر سنگھار کا مختصر سامان ہے۔ اس میز سے تھوڑے ہٹ کر ایک دروازہ ہے جو ایک برآمدہ میں کھلتا ہے اس پر بھی ویسا ہی پردہ پڑا ہے۔

جنوبی دیوار کے پاس ایک صوفہ سیٹ اور اس کے سامنے چھوٹی میز رکھی ہے جس پر ایش ٹرے اور ماچس پڑی ہے۔ دیواروں کا رنگ پردوں کے رنگ کا ہے۔ کمرے میں دری کا فرش ہے۔ دیواروں پر دو چار تصاویر آویزاں ہیں۔ صوفہ سیٹ کے دائیں بائیں سائڈ ٹیبل پر گلدانوں میں تازہ پھول سجے ہیں۔ کمرے میں سامان اگرچہ مختصر ہے۔ مگر صفائی اور سلیقہ سے رکھا گیا ہے۔ صبح کا وقت اور سردی کا موسم ہے۔

عالیہ صوفے پر بیٹھی سوئٹر بن رہی ہے کہ خدیجہ بیگم کمرے میں آتی ہیں۔ ان کی چال اور چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھکی ہوئی ہیں۔ عالیہ کو ان کے آنے کا علم نہیں ہوتا۔ پہلے تو وہ اپنے کام میں مشغول رہتی ہے مگر جب خدیجہ بیگم بالکل ان کے قریب آجاتی ہیں تو نظریں اٹھا کر انہیں دیکھتی ہے۔ خدیجہ بیگم چند سیکنڈ خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر آہستہ سے ـــــــــــ

خدیجہ بیگم: تم نے امجد کی تصویر کہاں رکھ دی؟ میں صبح سے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں

عالیہ: امی! ان کی تو کوئی تصویر یہاں ہے ہی نہیں۔ آپ بلاوجہ ______

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) کیوں نہیں ہے۔ مسلم میاں نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ تصویر لا دیں گے۔

عالیہ: وہ شارق صاحب سے

خدیجہ بیگم: اس کا نام میرے سامنے نہ لو۔ اس نے عظمت خالہ کے روپئے ہضم کر لئے، مجھے گھر سے نکال دیا۔ وہ امجد کی تصویر کیوں دینے لگا۔ امجد کی تصویر تو مجھے اپنے پاس رکھنا چاہئے تھا۔

عالیہ: (سوئٹر اور اون صوفے پر ایک رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) مجھے امی! (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب میں رکھ کر کیا کرتی۔ (آہستہ آہستہ برآمدے کے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ خدیجہ بیگم سوئٹر اٹھا کر اسے غور سے دیکھنے لگتی ہیں عالیہ دروازے پر پڑا ہوا پردہ برابر کرتی ہے۔ پھر مڑ کر خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) شوہر مرنے کے بعد غیر ہو جاتا ہے۔

خدیجہ بیگم: بیٹا تو غیر نہیں ہو جاتا۔

عالیہ: (خدیجہ بیگم کی طرف آتے ہوئے) انہوں نے کہا تو ہے کہ وہ شارق صاحب سے تصویر حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

خدیجہ بیگم: مگر مسلم میاں خود تین دن سے غائب ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔

عالیہ: امی! وہ تو آپ کو ماں کی جگہ سمجھتے ہیں مگر آپ —

خدیجہ بیگم: ہاں بی بی۔ تم بھی مجھے بے سہارا سمجھ کر جو جی چاہے کہہ لو۔

عالیہ: امی۔ آپ تو

خدیجہ بیگم: اگر وہ مجھے ماں سمجھتے ہیں تو امجد کی تصویر کیوں نہیں لے آتے۔

عالیہ: واپسی پر وہ شارق صاحب سے ملتے ہوئے آئیں گے۔ اگر انہوں نے کوئی تصویر دے دی تو۔ تصویر خود ان کے پاس تو ہے نہیں۔

خدیجہ بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے کب آئیں گے۔ تم سمجھتی ہو کہ شارق تصویر دے دے گا۔

عالیہ: کیوں نہیں۔ تصویر ان کے کس کام کی ہو گی۔

خدیجہ بیگم: (دوسرے کمرے کے دروازے کی جانب جاتے ہوئے) اگر نہیں بھی ہو گی تو وہ ضرور بنا لیں گے۔

عالیہ: امی۔ یہ سوئٹر

خدیجہ بیگم: ہاں۔ (ٹھہر جاتی ہیں اور مڑ کر عالیہ کو دیکھ کر) یہ رنگ امجد کو بے حد پسند تھا۔ تو یہ سوئٹر کس کے لئے بن رہی ہے۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ خدیجہ بیگم بے حد جذباتی انداز میں) میں تجھے یہ سوئٹر نہیں بننے دوں گی۔

(خدیجہ بیگم سوئٹر اور اون لئے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ خاموش کمرے میں کھڑی رہ جاتی ہے۔ اس کے چہرے سے الجھن اور مایوسی کا اظہار ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد عظمت خالہ کمرے میں آتی ہیں ان کے ہاتھوں میں الجھا ہوا اون اور ادھورا ہوا سوئٹر ہے۔ اون اور سوئٹر کو عالیہ

عظمت خالہ : بہو بیگم تمہیں بار بار سمجھایا کہ چیزوں کو یوں اِدھر اُدھر نہ ڈال دیا کرو۔ دیکھو تو انھوں نے اس کی کیا گت بنادی۔
عالیہ : یہیں اِدھر اُدھر ہی ڈالا تھا عظمت خالہ۔ (شکست خوردہ لہجے میں) وہ یہیں سے اُٹھا کر لے گئی تھیں۔
عظمت خالہ : اور تم نے لے جانے دیا جانتے ہوئے کہ ان کا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ عظمت خالہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے) کیوں لے گئی تھیں۔
عالیہ : وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ سوئٹر بنا جائے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اور اب بار بار اس کی طرف سے بھیک مانگ رہی ہے
عظمت خالہ : (حیرت سے) کیوں۔ اس قدر چاؤ سے تو سلم میاں کے لئے بن رہی تھیں۔ اب کون سے کیڑے پڑ گئے۔
عالیہ : یہ اور اُون لے آؤں گی۔ کوئی دوسرا شیڈ۔ (حسرت سے اُلجھے ہوئے اون کو عظمت خالہ کے ہاتھ میں دیکھتے ہوئے) امی نہیں چاہتیں کہ اس شیڈ کا سوئٹر بنا جائے (عظمت خالہ سوالیہ نظروں سے عالیہ کو دیکھنے لگتی ہیں) عالیہ کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) یہ شیڈ امجد کو پسند تھا۔
عظمت خالہ : بہو بیگم۔ ان کے دماغ کو تو جانے کیا ہوگیا ہے۔ تم کہاں تک ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہوگی۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے) سلم میاں اس رنگ کو پسند کر چکے ہیں اور یہ بھی دیکھ چکے ہیں تم اسے ان کے لئے بنا رہی ہو۔ وہ کیا کہیں گے۔ (عالیہ اب بھی خاموش رہتی ہے۔ عظمت خالہ کچھ دیر خاموش رہ کر) سلم میاں کب تک آنے کا کہہ گئے تھے۔
عالیہ : آج آجائیں گے۔ واپسی میں شارق صاحب سے ملنا ہے۔ (عظمت خالہ سوالیہ نظروں سے عالیہ کو دیکھتی ہیں) امی نے کہا تھا کہ شارق صاحب سے ان کی تصویر لا دیں۔
عظمت خالہ : امجد میاں کی (عالیہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ عظمت خالہ سوچتے ہوئے) جب تک اللہ بخشے عاصم میاں زندہ رہے وہ امجد میاں کو بھول سی گئی تھیں مگر اب تو بات بات میں انہیں یاد کرتی ہیں اور پھر جیسے ان پر دورہ سا پڑجاتا ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) بہو بیگم اس رنگ کا تم اور اون لے آؤ۔ یہ تو انھوں نے برباد کر دیا۔
عالیہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) نہیں عظمت خالہ۔ اب میں اس شیڈ کا سوئٹر نہیں بنوں گی (کچھ دیر خاموش رہ کر) امی کیا کر رہی تھیں۔
عظمت خالہ : رونے کے علاوہ انہیں کام ہی کیا ہے۔
عالیہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) بیچاری امی کتنی دکھی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی تو ساری دنیا لٹ گئی۔
عظمت خالہ : بہو بیگم تم ان کے لئے بڑا سہارا ہو۔ نہیں تو۔

[خدیجہ بیگم پاگلوں کی طرح کمرے میں آتی ہیں۔ عظمت خالہ انہیں دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہیں۔ عظمت خالہ کے ہاتھ سے اون اور سوئٹر چھین کر ہذیانی انداز میں اسے اور اُلجھاتے ہوئے۔]

خدیجہ بیگم : نہیں۔ میں یہ سوئٹر نہیں بننے دوں گی۔
عظمت خالہ : دلہن بیگم تم۔
خدیجہ بیگم : (بات کاٹ کر) تم چپ رہو۔ میں تمہاری قرض دار نہیں ہوں۔ تمہاری امانت شارق میاں نے چھین لی تو میں

کیا کروں۔ خیر بی بی میں ہی قصور وار سہی۔

عظمت خالہ : دلہن بیگم تم بھی کہاں کا رونا لے بیٹھیں۔ خدا گواہ ہے کہ........

خدیجہ بیگم : (بات کاٹ کر) بس بس میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ شاید کچھ نیکیاں اپنی بات کے بدلے وہ ساری کی ساری لے لو مگر مجھے سکون سے مر جانے دو۔

عالیہ : مگر امی، عظمت خالہ تو ۔

خدیجہ بیگم : (عالیہ کی طرف مڑ کر بات کاٹتے ہوئے) ارے بس تم بھی چپ رہو۔ گھر میں گھستے ہی میرے بیٹے کو چٹ کر گئیں۔ (عالیہ چند سیکنڈ ان کے چہرے کو حیرت سے دیکھتی ہے اور پھر ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔) اب رونے کیا لگیں۔ سچ تو ہے۔ تمہاری امی ۔

عظمت خالہ : (غصہ سے) بس خاموش رہو۔ تمہیں تو ۔

[عالیہ ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے عظمت خالہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش کر دیتی ہے۔ خدیجہ بیگم پھر اُون اٹھا کر اسے اُلجھانے لگتی ہیں۔ پھر اُون اور سوئٹر صوفے پر پھینک کر عالیہ کو دیکھتی ہیں جو اپنے آنسو پونچھ رہی۔ چند سیکنڈ اسے گھورتی رہتی ہیں پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ عالیہ ان کے پاس جا کر ۔]

عالیہ : آپ بیٹھ جائیے امی۔ میں یہ سوئٹر نہیں بنوں گی۔ (خدیجہ بیگم اسی طرح روتی رہتی ہیں) امی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ (ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے) آئیے آپ آرام کیجئے۔

[عالیہ سہارا دے کر انہیں دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔ عظمت خالہ کمرے میں تنہا رہ جاتی ہیں۔ کچھ دیر خاموشی سے اُلجھے ہوئے اون کو دیکھتی رہتی ہیں۔ پھر کاندھے پر پڑے ہوئے کپڑے سے صوفوں کو صاف کرنے لگتی ہیں کہ باہر موٹر کا ہارن بجتا ہے پھر برآمدے میں قدموں کی آواز۔ عظمت خالہ دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکتی ہیں۔ پھر پردہ ہٹا دیتی ہیں۔ مسلم کمرے میں آتا ہے اور عظمت خالہ کو دیکھ کر]

مسلم : عالیہ کہاں ہے عظمت خالہ ۔

عظمت خالہ : دلہن بیگم کے پاس ۔ ان کی طبیعت۔

مسلم : کیوں خیریت تو ہے ۔

عظمت خالہ : ابھی ابھی ان پر دورہ پڑ گیا تھا (غیر اختیاری طور پر اُلجھے ہوئے اون کی طرف دیکھتی ہیں۔ مسلم کی نظریں بھی اس پر پڑتی ہیں مگر خاموش رہتا ہے۔ عظمت خالہ جیسے اس کا دھیان دوسری طرف ہٹانے کے انداز میں) بہو بیگم تو کہہ رہی تھیں آپ شام تک آئیں گے۔

مسلم : جی ہاں کہہ کر تو شام تک ہی کا گیا تھا۔ کام ہو گیا تو جلدی چلا آیا۔ امی کی طبیعت ۔

عظمت خالہ : اب تو ٹھیک ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) بیٹے اور شوہر کے غم کو تو کسی طرح برداشت کر لیا مگر شارق میاں

کمبخت نے ان کا دماغ بالکل الٹ دیا ہے (طنزیہ مسکرا کر) ابھی مجھ سے کہہ رہی تھیں اپنی امانت کے بدلے میری ساری نیکیاں لے لو۔

مسلم : (طنزیہ انداز میں) شارق صاحب جیسا لالچی اور کینہ پرور آدمی میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ (سوچتے ہوئے) امی کی اس حالت نے عالیہ کی نفسیات پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ کا کتنا روپیہ تھا جو شارق صاحب نے ہضم کر لیا۔

عظمت خالہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) گنتی حساب تو مجھے آتا نہیں۔ پر سو بیسی تھے۔

مسلم : سو بیسی! (عظمت خالہ خاموش رہتی ہیں مسلم سوچتے ہوئے مسکرا کر) یعنی دو ہزار۔

عظمت خالہ : ہزاروں کی بات تو میں نہیں جانتی۔ میں تو سو بیسی جانتی ہوں (پر اُمید لہجے میں) کیا آپ شارق میاں سے ملے تھے۔ (مسلم اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ عظمت خالہ مسلم کا چہرہ دیکھتے ہوئے) کیا روپے کے بارے میں ان سے بات ہوئی تھی۔

مسلم : نہیں عظمت خالہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان جیسے آدمی سے معقول بات کرنا اور معقول بات کی امید رکھنا ہی فضول ہے۔

[عظمت خالہ کے چہرے پر مایوسی چھا جاتی ہے مگر خاموش رہتی ہیں۔ مسلم ان کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہے پھر جیسے ان کی دلی کیفیات کا اندازہ کر کے بات ٹالنے کے انداز میں] ذرا عالیہ کو تو بلا دیجئے۔ (عظمت خالہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مسلم سگریٹ جلا کر آہستہ آہستہ اس کے کش لینے لگتا ہے۔ پھر اُلجھے ہوئے اون کو اُٹھا کر دیکھنے لگتا ہے کہ عالیہ کمرے میں آتی ہے۔ مسلم کے ہاتھ میں اون دیکھ کر پہلے تو ٹھٹھکتی ہے پھر مصنوعی مسکراہٹ چہرہ پر پیدا کر کے)

عالیہ : میں تو شام تک آپ کو ایکسپیکٹ کر رہی تھی۔

مسلم : (مسکرا کر) اور میں بلائے بے درماں کی طرح پہلے ہی نازل ہو گیا۔ (اون کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے) آپ نے یہ کوئی نیا نمونہ ایجاد فرمایا ہے۔

عالیہ : (مایوسی سے) میں نے نہیں۔ امی نے۔

مسلم : امی نے!

عالیہ : جی ہاں۔ (مسلم سوالیہ نظروں سے عالیہ کے چہرے کو دیکھنے لگتا ہے۔ عالیہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس جاتی ہے۔ اس میں اندر جھانکتی ہے۔ دروازے پر پردہ برابر کرتی ہے۔ پھر مسلم کے پاس آ کر) امی نہیں چاہتیں کہ یہ سوئٹر بُنا جائے۔

مسلم : کیوں، کیا ہوا!؟

عالیہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ شیڈ امجد کو پسند تھا۔ اب اور کسی کو اس کے استعمال کا حق نہیں۔ (مسلم کچھ دیر خاموش

دیتا ہے پھر گھونٹ ہو کر آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لیتا ہے اور کمرے میں ٹہلتا ہے۔ کچھ دیر بعد عالیہ) اس بار [illegible] پوچھ رہی تھیں۔ (مسلم سگریٹ کا گہرا کش لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور عالیہ کے چہرے کو دیکھنے لگتا ہے) آپ شارق صاحب سے ملے تھے؟

مسلم : اوہ، ہاں۔ (برآمدے والے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد واپس آ کر ایک فریم کی ہوئی تصویر عالیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے) انہوں نے یہ تصویر دے دی ہے۔

عالیہ : (تصویر پر نظر ڈال کر) نہیں۔ نہیں (جذباتی انداز میں) آپ یہ تصویر کیوں لائے۔ کیا اور کوئی تصویر نہیں تھی۔

مسلم : انہوں نے جو تصویر دی۔ میں لے آیا۔

عالیہ : کیا آپ پسند کریں گے کہ یہ تصویر آپ کے ڈرائنگ روم میں سجائی جائے؟

مسلم : عالیہ! میں جذباتی انسان نہیں ہوں۔ میں۔

عالیہ : (بات کاٹ کر) مگر میں تو جذباتی انسان ہوں۔ اس تصویر سے کتنی یادیں، کتنے رنگین لمحات وابستہ ہیں اس کی موجودگی

مسلم : عالیہ۔ یہ تمہاری شادی کی تصویر ہے اور جو کچھ تم نے کہا وہ بھی سچ ہے مگر نہ تو دوسری شادی کرنا جرم ہے اور نہ پہلے شوہر سے محبت کرنا گناہ۔

عالیہ : مگر۔

مسلم : (بات کاٹ کر) تمہاری اس والہانہ محبت سے اس کی روح کو سکون ملتا ہوگا (عالیہ مشکوک نظروں سے مسلم کو دیکھتی ہے۔ مسلم جیسے عالیہ کے جذبات کو محسوس کر کے) یقین کرو عالیہ مجھے اس سے کوئی رقابت نہیں ہے۔ مُردوں کو تو ہماری محبت اور دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ دشمنی اور رقابت کی۔

عالیہ : بہت زیادہ حقیقت پسندی انسانی فطرت کے خلاف ہوتی ہے۔

مسلم : (ہنس کر) فلسفہ بگھارتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے اپنی دادی اماں یاد آ جاتی ہیں (تصویر اس کے ہاتھ میں دے کر) جاؤ یہ تصویر ——

[خدیجہ بیگم کمرے میں آتی ہیں۔ مسلم انہیں دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے اور ادب سے جھک کر سلام کرتا ہے۔ خدیجہ بیگم اس کے سلام پر دھیان نہ دے کر۔]

خدیجہ بیگم : مسلم میاں بڑی راہ دکھلائی۔ کہاں رہ پڑے تھے؟

مسلم : (مسکرا کر) امی تیسرے ہی دن تو لوٹ آیا۔

خدیجہ بیگم : اور تین دن کیا کم ہوتے ہیں۔ (عالیہ کی طرف دیکھ کر) چائے لانا۔ تھکے ہارے آئے ہیں (عالیہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے) تین راتوں سے برابر تمہارے انتظار میں جاگ رہی ہوں۔

مسلم : (مسکرا کر) تین دن کا کہہ کر گیا تھا۔ تیسرے دن آ گیا۔ (پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آ جانے پر بلند آواز سے) عالیہ۔ ارے عالیہ۔ (عالیہ کمرے میں آتی ہے) تصویر کہاں ہے۔ (خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) امی! شارق صاحب سے تصویر لے آیا ہوں۔

خدیجہ : اچھا۔ میں تو سمجھتی تھی وہ نہیں دیں گے۔ (عالیہ کی طرف دیکھ کر) لا بیٹی مجھے تو دے کہاں ہے وہ تصویر۔

[عالیہ کے چہرے سے ہچکچاہٹ ظاہر ہوتی ہے۔ مسلم عالیہ کی طرف دیکھ کر]

مسلم : کہاں ہے تصویر۔ لے آؤ۔

[عالیہ پھر واپس دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ خدیجہ بیگم صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں کہ ان کی نظر الجھے ہوئے اون پر پڑتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہیں اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کچھ دیر خلا میں گھورتی رہتی ہیں پھر آنسو پونچھ کر۔]

خدیجہ بیگم : یہ رنگ امجد کو بے حد پسند تھا۔ (سوچتے ہوئے) جانے کیوں اب اس کی یاد مجھے بہت ستانے لگی ہے (مسلم خاموش رہتا ہے۔ خدیجہ بیگم شرمندگی کے لہجے میں) جانے مجھے کیا ہوجاتا ہے۔ (اس طرح مسکرا کر جیسے خود پر طنز کر رہی ہوں) میں بھی کیا پگلی ہوئی ہوں۔ کیا کسی کو دنیا میں یہ رنگ پسند کرنے کا حق نہیں۔ بلا وجہ نقصان کر دیا۔

مسلم : امی مجھے خود یہ شیڈ۔ (عالیہ کمرے میں آتی ہے۔ مسلم عالیہ کی طرف دیکھ کر) لے آئیں۔ (عالیہ کے ہاتھ سے تصویر لے کر خدیجہ بیگم کے پاس جاتا ہے۔ تصویر ان کی طرف بڑھا کر) یہ لیجئے۔

[خدیجہ بیگم تصویر مسلم کے ہاتھ سے لے لیتی ہیں۔ اسے بڑے پیار اور محبت سے دیکھنے لگتی ہیں۔ کھڑی ہوتی ہیں۔ دونوں مسہریوں کے درمیان رکھی میز پر ٹیبل لیمپ کے پاس اسے رکھ دیتی ہیں۔ مسلم اور عالیہ دونوں خاموشی سے انہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر یوں خاموش کھڑی رہتی ہیں جیسے پرانی یادوں میں کھوگئی ہوں۔ پھر مڑ کر ان دونوں کو دیکھتی ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر عالیہ سے۔]

خدیجہ بیگم : ارے میں تو سمجھی تھی تو چائے بنانے گئی ہے مگر تو تو یہیں کھڑی ہے۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اچھا تو ٹھہر جا۔ میں بنائے لاتی ہوں۔

مسلم : آپ رہنے دیجئے۔ میں ذرا لباس تبدیل کر لوں۔

[دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ خدیجہ بیگم کچھ دیر بعد سوچتے ہوئے]

خدیجہ بیگم : میں تو سمجھی تھی کہ شارق میاں تصویر نہیں دیں گے۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر عالیہ کی طرف دیکھتی ہیں جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں) ارے تو تو رونے لگی۔

عالیہ : امی۔ اس تصویر کو آپ اپنے کمرے میں رکھ لیجئے۔

[خدیجہ بیگم کچھ کہنا چاہتی ہیں کہ عظمت خالہ چائے لئے ہوئے کمرے میں آکر]

عظمت خالہ : مسلم میاں کہاں گئے۔ میں تو ان کے لئے چائے لے کر آئی تھی۔ (عالیہ کی طرف دیکھتی ہیں جو آنسو پونچھ رہی ہے) اب کیا ہوگیا۔ (عالیہ کی نظریں میز پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ عظمت خالہ بھی تصویر کی طرف دیکھتی ہیں۔ کشتی صوفے کے پاس میز پر رکھتی ہیں۔ تصویر کے پاس جا کر اسے دیکھتی ہیں

پھوڑ کر خدیجہ بیگم اور عالیہ کی طرف دیکھ کر) یہ تصویر دی ہے شارق میاں نے۔

خدیجہ بیگم: ارے جو بھی تھی دے دی۔ اب اس میں بھی کیڑے نکالنے لگیں۔

عظمت خالہ: اور یہ تصویر یہاں سجائی بھی جائے گی۔

خدیجہ بیگم: تو کون پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ تصویر سجانے کے لئے ہوتی ہے۔

عظمت خالہ: دلہن بیگم۔ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ تمہارے بیٹے کی تصویر ہے۔ اپنے کمرے میں لے جاکر سجالو مگر اس کمرے میں ـــ

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) اچھا بس اب چپ رہو۔ میں تم سے اب دبنے والی نہیں ہوں۔ میں نے تمہاری امانت کا بدلہ چکا دیا ہے (غصہ سے) یہ تصویر یہیں رہے گی اور ضرور رہے گی۔

عظمت خالہ: چاہے اس سے۔

عالیہ: (بات کاٹ کر) رہنے دیجئے عظمت خالہ۔ اگر امی بضد ہیں تو اسے یہیں رہنے دیجئے۔ (اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دھاڑیں مار کر رو دینا چاہتی ہے مگر ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر آنسو پونچھتی ہوئی تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) اب یہیں رہنے دیجئے عظمت خالہ، یہیں رہنے دیجئے

[دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر عظمت خالہ تصویر اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہیں۔]

خدیجہ بیگم: کہاں لے چلیں تصویر۔ (تصویر ان کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے) لاؤ تصویر مجھے دو۔

عظمت خالہ: میں تمہارے کمرے میں رکھنے جا رہی ہوں۔ (رک کر خدیجہ بیگم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے) دلہن بیگم۔ بچی نہ بنو۔ تم نے بہو بیگم کی دوسری شادی اس لئے نہیں کی ہے کہ وہ سہاگن ہوتے ہوئے رانڈاپا محسوس کرتی رہیں۔

خدیجہ بیگم: رانڈاپا کیوں محسوس کرنے لگی۔ خدا اس کا سہاگ قائم رکھے۔

عظمت خالہ: اور اس تصویر کو دیکھ کر نہال ہوتی رہیں گی۔ مسلم میاں آخر مرد ہیں۔ ایک نہ ایک دن۔

[عظمت خالہ خاموش ہو جاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم۔ یوں بے حس و حرکت ہو جاتی ہیں جیسے ان پر بجلی گر پڑی ہو۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہتی ہیں۔ خدیجہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد آنسو پونچھ کر]

خدیجہ بیگم: عظمت خالہ یہ تصویر مجھے دے دو۔ خدا کی قسم میں اسے سینے سے لگائے لگائے مر جاؤں گی مگر ـــ

[ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہیں۔ مسلم لباس تبدیل کر کے کمرے میں آتا ہے۔ خدیجہ بیگم کو یوں روتے دیکھ کر]

مسلم: کیا بات ہے امی (خدیجہ بیگم برابر روتی رہتی ہیں۔ مسلم عظمت خالہ کی طرف دیکھ کر) عظمت خالہ کیا بات ہے۔ (عظمت خالہ خاموشی سے تصویر اس کے سامنے کر دیتی ہیں) ارے یہ تصویر آپ نے میز سے

خدیجہ بیگم : یہ تصویر یہاں نہیں رہے گی (مسلم سوالیہ نظروں سے کبھی خدیجہ بیگم اور کبھی عظمت خالہ کو دیکھتا ہے)۔
عظمت خالہ : یہ تصویر مجھے دو۔ (بڑھ کر عظمت خالہ کے ہاتھ سے لے لیتی ہیں۔ کچھ دیر بڑی محبت سے اسے
دیکھتی رہتی ہیں پھر ایک دم جیسے ان پر دورہ پڑ گیا ہو) نہیں نہیں۔ یہ تصویر گھر میں بھی نہیں رہے گی۔
[پاگلوں کی طرح دروازے کے پاس جاتی ہیں۔ پردہ ہٹاتی ہیں اور تصویر کو برآمدے میں پھینک
دیتی ہیں۔ شیشے کے پھوٹنے کی آواز آتی ہے۔ پھر ہچکیوں سے رونے لگتی ہیں۔ مسلم آگے بڑھ کر انہیں

سہارا دیتے ہوئے۔]

مسلم : آئیے امی۔ آپ بیٹھ جائیے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ (انہیں لا کر صوفے پر بٹھا دیتا ہے اور عظمت
خالہ کی طرف دیکھ کر) عظمت خالہ وہ تصویر اٹھا لائیے۔ اس میں دوسرا فریم لگوا دیا جائے گا۔
خدیجہ بیگم : نہیں نہیں۔ (ایک دم پرسکون ہو کر خلا میں گھورتے ہوئے) میں دنیا سے خالی ہاتھ جانا چاہتی ہوں۔
(ٹھنڈی سانس بھر کر) اپنی نیکیاں میں نے پہلے ہی عظمت خالہ کو دے دی ہیں۔ میں دل میں کسی کا محبت
پیار بھی لے کر جانا نہیں چاہتی۔

مسلم : (عظمت خالہ کی طرف دیکھ کر) نیکیاں! کیسی نیکیاں دے ڈالیں۔
عظمت خالہ : یہ تو سٹھیا گئی ہیں (خدیجہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ چلو۔
[خدیجہ بیگم اس طرح کھڑی ہو جاتی ہیں جیسے ان کے جسم میں طاقت ہی نہ ہو۔ عظمت خالہ کا سہارا
لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مسلم خاموش کھڑا رہتا ہے۔ سگریٹ جلا کر اس کے دو چار
کش لیتا ہے۔ پھر میز پر رکھی ہوئی کیتلی کو دیکھ کر بلند آواز سے]
مسلم : عالیہ ارے عالیہ۔ (کچھ دیر بعد عالیہ کمرے میں آتی ہے۔ مسلم اسے دیکھ کر) ارے بھئی ایک پیالہ چائے تو
بنا دو۔ (عالیہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ نیکیاں
دینے کا کیا قصہ ہے (عالیہ نظریں اٹھا کر دیکھتی ہے) امی ابھی کچھ ایسی ہی بات کہہ رہی تھیں۔
عالیہ : (پھیکی اور غمگین مسکراہٹ سے) انہوں نے اپنی نیکیاں عظمت خالہ کی امانت کے بدلے انہیں دے
دی ہیں ——————
مسلم : (غمگین مسکراہٹ سے) اور اب انہوں نے تصویر بھی باہر پھینک دی ہے۔ (عالیہ نظریں اٹھا کر پھر مسلم کو
دیکھتی ہے۔ جس میں غم کی جھلک اور نمایاں ہو گئی ہے۔ مسلم ایک اچٹتی ہوئی نظر عالیہ پر ڈالتا ہے۔ عالیہ
نظریں جھکا لیتی ہے۔ مسلم آہستہ آہستہ برآمدے میں جاتا ہے اور کچھ دیر بعد پھوٹی ہوئی تصویر لے کر آتا ہے
عالیہ کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے جو چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتی ہے مگر نظریں جھکائے رکھتی ہے۔ پیالہ
عالیہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے) عالیہ۔ (عالیہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے۔ مسلم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
کیا تم کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے (عالیہ کھڑی ہو جاتی ہے) اپنے لئے بھی تو ایک پیالی بنا لو۔ (عالیہ خاموش رہتی

بخدا مجھے اس تصویر سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

عالیہ : (ایک دم ایسے لہجے میں جیسے اس کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا ہو) مگر مجھے تو ہے (جذباتی انداز میں) کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک روح ہمیشہ میرے گرد منڈلاتی رہے۔ کیا یہ روح ــــ

مسلم : (بات کاٹ کر) مگر عالیہ امی کا تو سوچو۔ جن کی زندگی میں کچھ نہیں رہا ہے۔ کسی کو اپنی نیکیاں دے دینا ناامیدی کی انتہا ہے۔

عالیہ : اور میری زندگی میں جو تھوڑا بہت رس ہے وہ اسے بھی نچوڑ لینا چاہتی ہیں۔ (صوفے پر پڑے اون کی طرف اشارہ کر کے) یہ کیا ہے۔ میری خوشیوں کا قبرستان اور۔ (تصویر کی طرف اشارہ کر کے) یہ میرے سلگتے ہوئے ارمانوں کا جنازہ۔ میں کب تک یوں جنازہ بردوش رہوں گی۔ مجھے بھی خوشیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے بھی مسکرانے کا ارمان ہے۔

مسلم : پھر ایک ناامید زندگی کا کیا ہوگا۔ (ایک دم خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ عالیہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگتی ہے۔ مسلم کچھ دیر بعد سوچتے ہوئے) امی پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے۔ عالیہ میرا خیال ہے کہ ان کے دماغ میں صرف ایک بات رہ گئی ہے کہ شارق صاحب نے عظمت خالہ کا روپیہ ہضم کر لیا ہے (دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) عظمت خالہ عظمت خالہ (عظمت خالہ کمرے میں آتی ہیں) امی کیا کر رہی ہیں۔

عظمت خالہ : انہیں کام ہی اور کیا ہے۔ بس رونا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) سچ سچ مسلم میاں انہوں نے تم دونوں کی خوشیاں چھین لی ہیں۔

مسلم : ارے نہیں عظمت خالہ۔ ایسی بات نہیں ہے۔

عظمت خالہ : (سوچتے ہوئے) سوچتی ہوں انہیں لے کر اپنے لڑکوں کے پاس جا پڑوں۔

مسلم : کیوں۔ (مسکرا کر) نہیں آپ دونوں یہیں رہیں گی۔

[مسلم کچھ سوچتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر عالیہ اور عظمت خالہ خاموش کھڑی رہتی ہیں۔ پھر عالیہ صوفے پر بیٹھ کر خلاء میں گھورتے ہوئے۔]

عالیہ : عظمت خالہ! میں سوچتی ہوں کہ اب کوئی نوکری کر لوں۔ (عظمت خالہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی ہیں) ہاں عظمت خالہ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک نہ ایک دن تو مجھے نوکری کرنا ہی ہے۔

عظمت خالہ : بہو بیگم کیوں پاگل ہوئی ہو۔ آخر تم پر ایسے کون سے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں کہ نوکری کرتی پھرو۔

عالیہ : امی کی دماغی کیفیت ہمیں چین نہیں لینے دے گی۔ اور ایک دن ــ خدا وہ دن نہ دکھائے ــ

عظمت خالہ : تمہارا بھی دماغ الٹ گیا ہے۔ ارے ان پر کچھ دورہ سا پڑتا ہے اور جب وہ پرسکون ہوتی ہیں تو کس قدر شرمندہ ہوتی ہیں (ہنس کر) اب تم ہی دیکھو اپنی نیکیاں مجھے دے رہی ہیں۔ کیا مسلم میاں ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔

عالیہ : (سوچتے ہوئے) ابھی تو سمجھتے ہیں اور اگر کبھی انہوں نے سمجھنا چھوڑ دیا پھر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے میں امی کو نہ چھوڑ سکوں گی اور مجھے یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔

عظمت خالہ : گھر چھوڑیں تمہارے دشمن۔ دلہن بیگم دل کی بری نہیں۔ مسلسل صدموں نے انہیں نڈھال کر دیا ہے۔

عالیہ : مگر عظمت خالہ۔

عظمت خالہ : (پُرعزم لہجے میں) جس دن ذرا بھی مسلم میاں کی نظر بدلی ہوئی دیکھوں گی انہیں لے کر چلی جاؤں گی۔

عالیہ : اور میں تمہیں انہیں لے جانے نہیں دوں گی۔ میں انہیں اس لئے تو اپنے ساتھ نہیں لائی ہوں کہ لاوارثوں کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دوں۔

عظمت خالہ : میں نے تمام زندگی ان کا نمک کھایا ہے۔ انہوں نے مجھے ماں کی طرح سمجھا ہے اور —

عالیہ : (لقمہ دیتے ہوئے) وہ تمہاری امانت کی حفاظت نہیں کر سکیں۔

عظمت خالہ : میں نے ان ہی کے گھر سے کمایا تھا ان ہی پر نچھاور کر دیا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے اس کی کوڑی برابر بھی پروا نہیں

عالیہ : مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کا دماغ اسی کی وجہ سے آؤٹ ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک دن وہ اسی غم میں اس دنیا سے سدھار جائیں گی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں نوکری کر کے تمہارا روپیہ ادا کر دوں گی۔ پھر ان کو سکون مل جائے گا۔

عظمت خالہ : بہو بیگم۔ مجھے اس روپے کی نہ اس دنیا میں ضرورت ہے اور نہ دوسری دنیا میں کسی کی نیکیوں کی۔ میں —

[مسلم خدیجہ بیگم کو سہارا دیئے ہوئے کمرے میں آتا ہے۔ خدیجہ بیگم کے ہاتھ میں روپوں کی گڈی ہے۔ اس وقت چہرے پر غیر معمولی سکون ہے۔ عظمت خالہ انہیں دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم عظمت خالہ کے پاس آ کر]

خدیجہ بیگم : میں کہتی تھی شارق میاں لاکھ بُرے سہی پھر بھی اتنے بُرے نہیں۔ انہوں نے تمہارا روپیہ لوٹا دیا ہے

عظمت خالہ : روپیہ لوٹا دیا ہے۔ (مسلم کی طرف دیکھ کر) آپ تو کہہ رہے تھے کہ ——

مسلم : اسے عظمت خالہ۔ انہوں نے روپیہ دیا میں لے آیا۔ (آنکھ سے عظمت خالہ کو اشارہ کرتا ہے کہ وہ روپیہ لے لیں) دو ہزار تھا نا۔

عظمت خالہ : مگر مسلم میاں ——

خدیجہ بیگم : (بات کاٹ کر) گن لو اپنا روپیہ۔ اور میری نیکیاں مجھے لوٹا دو۔ (روپیہ عظمت خالہ کے ہاتھ پر رکھ کر) اب میں سکون سے مر سکوں گی —— عالیہ حیرت سے دیکھتی ہے۔ خدیجہ بیگم صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں اب ان کے چہرے سے سکون ظاہر ہو رہا ہے۔ مسلم کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر) مسلم میاں یہ تصویر مجھے دے دو۔

مسلم : کل میں اس کا فریم بنوا دوں گا۔ پھر آپ —

خدیجہ بیگم : ارے اس کی کیا ضرورت ہے۔ (مسلم کے ہاتھ سے تصویر لے کر اس طرح اپنی گود میں رکھ لیتی ہیں جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو [illegible] گود میں لئے بیٹھی ہو۔ چہرے پر سکون اور تقدس اور گہرا ہو جاتا ہے۔)

(پردہ)

انور سدید

نئی نظم کا مطالعہ

میں جب میں سے باہر نکلا ——————— یوسف ظفر

میں جب میں سے باہر نکلا
میں نے پوچھا "کون ہے تو؟" خاموشی تھی
کوئی نہیں تھا ——————— ایک دھندلکا چھایا تھا
سورج بھی کرنوں کو سمیٹے تاریکی میں لیٹا تھا
آئینے پر راکھ جمی تھی ——— کہرے کی سی
راکھ کہ جس میں کوئی صورت
صاف نظر آتی ہی نہیں تھی
میری صورت میرے ذہن سے محو تھی، لیکن
آئینے پر راکھ جمی تھی

میں جب میں سے باہر نکلا
شہر میں سائے ہی سائے تھے، کوئی نہیں تھا
جیسے ہیروشیما میں ایٹم بم کا دھماکہ
کینچلی سب کے جسموں کی روحوں سے اتارے
ہر سو ایسے پھیل رہا تھا
جیسے اس نے وقت کو موت کے گھاٹ اتارا
شہر تھے۔ یا صحرا تھے جن میں بادل بن کر
نرم بگولے باہنوں میں باہنیں ڈالے یوں ناچ رہے تھے

جیسے شام و سحر کا چکر ٹوٹ گیا ہو
جیسے وہ آزاد ہوئے ہوں شام و سحر سے

مَیں جب مَیں سے باہر نکلا
وقت نے میرے ہاتھوں میں اک لمحہ رکھا
اور کہا "یہ لمحہ! تیرا ہے جانے جا"
یہ لمحہ جو نورِ ازل ہے
یہ لمحہ جو بحرِ ابد ہے
اس لمحے کی کوکھ میں جنت بھی ہے نارِ جہنم بھی
اس لمحے کو تو جیسا بھی چاہے گا، بن جائے گا
یہ لمحہ تیرا لمحہ ہے
اپنے جسم میں رکھ لے تو یہ اک دھڑکن ہے
اپنی آنکھ سے ٹپکائے تو اک آنسو ہے
ہوس کی مٹی میں بوئے گا، لمحوں کا انبار لگے گا
عشق کی آنچ دکھائے گا تو تیرا لمحہ
غارِ حرا میں طور کی جوت جگائے گا

اب میں اپنے آپ میں آکر سوچ رہا ہوں
اس لمحے کو بیچ کے دونوں وقت کی روٹی کھالوں میں
یا اس کو اک پھول بنا کر
تیری زلفوں میں رکھ دوں اور اپنا پیار جتالوں میں

یہ نظم ایک ایسے کردار کی کہانی بیان کرتی ہے جو ایک طویل عرصے تک خارج کی دنیا سے کٹ کر اپنے من کی دنیا میں طمانیت اور آسودگی کا سانس لیتا رہا ہے۔ نظم کی اولیں سطریں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ کردار اب ایک ہی جست میں لاشعور سے شعور کی دنیا میں آگیا ہے۔ لیکن یہ مراجعت اس پر مسرت کی کوئی کیفیت پیدا نہیں کرتی بلکہ الٹا اسے ایک عجیب تحیر میں مبتلا کر ڈالتی ہے۔ استعجاب کی انتہا یہ ہے کہ "میں" جب اپنے خارجی وجود کو سامنے پاتا ہے تو اسے پہچان بھی نہیں سکتا اور وہ اسی سے

دریافت کرتا ہے "کون ہے تو ؟" ۔ پہلے بند کے بقیہ تمام مصرعے خاموشی کے طلسم کو مزید پراسرار بناتے ہیں جس سے مرکزی کردار کی صورت اپنے ہی ذہن سے محو ہو جاتی ہے اور آئینہ بھی صداقت سے قاصر ہو جاتا ہے کہ اس پر دھند چھا چکی ہے اور اب وہ پورا انعکاس نہیں کر رہا۔

نظم کا دوسرا بند اس بسیط تبدیلی کو پیش کرتا ہے جو من کی دنیا میں کھو جانے اور پھر لوٹ آنے کے وقفے میں روئے زمین پر آ چکی ہے۔ اب شہروں میں زندگی کا سکہ بدل چکا ہے۔ (اور یہاں اصحابِ کہف کی تلمیح کی طرف بھی خیال جاتا ہے) ہنستے کھیلتے چہرے خاموش سائے بن چکے ہیں۔ روحیں پژمردہ ہو گئی ہیں اور انسانوں کی بستی پر مرگھٹ کا گمان ہونے لگا ہے۔ چنانچہ اب ہر طرف بگولے باہوں میں باہیں ڈالے ناچ رہے ہیں اور شام و سحر کا چکر ٹوٹ چکا ہے۔ پہلے بند میں شاعر نے ایک پراسرار فضا کی تخلیق کی تھی۔ دوسرے بند میں خارج کی یہ فضا ڈر اور خوف کی مظہر بن گئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے زمانے نے انسان سے روحانی مسرت چھین کر اس پر خوف مسلط کر دیا ہے۔ اور اب وہ سائنس کی مہلک ایجادات کے سامنے نہ صرف بے بس اور مجبور ہے بلکہ اس کے قوائے ذہنی بھی مفلوج ہو گئے ہیں۔ ہیروشیما کے بم کی طرف اشارہ اسی حقیقت کا اظہار نظر آتا ہے۔

نظم کا تیسرا بند وقت کی ٹوٹی ہوئی گھڑی میں سے لمحے کو تلاش کرتا ہے۔ لمحہ جو زندہ ہے۔ لمحہ جو نورِ ازل اور بحرِ ابد ہے۔ ابتدائی دو بندوں کے مقابلے میں اس بند کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں حیرت۔ استعجاب اور مایوسی کی دبیز فضا سے لمحۂ موجود پھلجھڑی بن کر سامنے آتا ہے اور پھر ساری کائنات کو منور کر ڈالتا ہے۔ اب وہ مایوس و مقہور انسان جس کی فطری تازگی کو ہیروشیما کے دھماکے نے غصب کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر زندگی کی مسرتوں کو حاصل کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ یہاں شاعر نے تسخیر کائنات کے لئے انسان کے ہاتھ میں چراغ الہ دین پکڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی داخلی توانائیوں کو استوار کرنے اور لمحے کو زیرِ نگیں کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اب یہ انسان کے اعمال و افعال پر موقوف ہے کہ وہ اس لمحے کو عشق کی آنچ دکھائے اور غارِ حرا میں طور کی جوت جگائے یا اسے ہوس کی مٹی میں بوئے اور خود بھی اس کے ساتھ ہی فنا ہو جائے کہ ہوس کی مٹی سے کوئی بیج نمو نہیں پاتا۔

نظم کا واحد متکلم اب اس مقام پر کھڑا ہے جہاں یہ دونوں صورتیں اس کے سامنے متصادم صورت میں اس کی سوچ کو مسلسل برانگیختہ کر رہی ہیں۔ نظم کی آخری چار سطریں اسی تلاطم کو پیش کرتی ہیں جسے لمحے کی بازیافت نے مرکزی کردار کے دل میں پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ اب پیٹ اور روح کے تقاضے آپس میں دست بگریباں ہیں اور اپنے ساتھ قاری کو بھی ایک گہری سوچ میں غلطاں کر ڈالتے ہیں۔

یہ کہانی جو میں نے نظم کے باطن سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے بظاہر نئی نہیں تاہم شاعر نے اسے جس پراسرار ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے اور پھر آخر میں جس خوب صورتی سے اسے ادھورا بلکہ لاینحل چھوڑ دیا ہے اس سے نظم پر شاعر کی مضبوط فنی گرفت کا پورا احساس ہوتا ہے۔ نظم میں تحیر، خوف اور پھر تکمیل آرزو کے امکانات پیدا کر کے شاعر نے قاری کو بیک وقت مختلف مراحل سے گزرنے کا موقع دیا ہے۔ ابتدائی سطور میں انسانی زندگی کا المیہ سر ابھارتا ہے۔ لیکن آخری بند میں انسان بے کراں قوت کا مظہر اور ذاتی فیصلے پر قادر نظر آتا ہے اور یہی وہ موڑ ہے جس تک لانے کے لئے شاعر نے بڑی چابکدستی سے

[illegible] نظمیں ہی پہلے تخلیق کی گئی ہیں۔ اور پھر ہی حقیقت کو فیر ہی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔
نظم کا یہی خیال اگرچہ پہلی قرأت میں ہی معنی کا موتی قاری کی جھولی میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن اس سے نظم کی خوبصورتی [illegible] کمی نہیں آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ نظم کے عنوان اور پہلی سطر "میں جب میں سے باہر نکلا" میں تحیر کا جو عنصر [illegible] قاری کو مائل کرتا ہے کہ وہ نظم کو پہلے توجہ اور یکسوئی سے اور پھر بار بار پڑھے۔ شاید یہی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

فنی طور پر اس نظم میں شاعر نے ایک ایسی بحر استعمال کی ہے، جس میں بہاؤ زیادہ ہے۔ شاعر نے اس بحر کی روانی کو مصرعوں کو چھوٹا بڑا کر کے مزید خوب صورتی عطا کی ہے اور یوں شبنم کی پھوار جیسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نظم کے معنوی سحر کے ساتھ ساتھ اس کی ہئیت کا جادو بھی قاری کو مغلوب کر لیتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ جس کسی نے بھی یہ نظم کہی ہے فطرت نے اسے تخلیق کے جادوئی عمل سے گزرنے کا وافر تجربہ ودیعت کیا ہے اور وہ نہ صرف اظہار و بیان پر قادر ہے بلکہ لفظوں کو زندگی اور گویائی اور تحریک بھی عطا کر سکتا ہے۔ ●●

تبصرے

نام کتاب: مثنوی مولانا روم (مترجم اردو)
مترجم: مولانا قاضی سجاد حسین
صفحات: ۳۰۸
قیمت: بیس روپے
ناشر: سب رنگ کتاب گھر۔ دہلی ۶

مثنوی مولانا روم علم تصوف کی بے نظیر کتاب ہے۔ جس زمانہ اور جس وقت یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ اس موقع پر اہل نظر نے " لم یکتحل عین الزمان بمثلہ " (آج تک اس جیسی کتاب زمانے کی نگاہ میں نہیں آئی) کہنا شروع کیا۔

انسان دنیا میں کس لئے بھیجا گیا؟ خالق سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ اسے کیونکر زندگی بسر کرنی چاہئے؟ یہ باتیں عمدہ اور اچھوتے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو انسان، انسان کامل بن سکتا ہے۔

قاضی سجاد حسین صاحب اُردو، فارسی اور عربی کے عالم ہیں، فارسی کتابوں کے تراجم و حواشی لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ مثنوی مولانا روم کا عام فہم اور سلیس اُردو میں ترجمہ کی ضرورت تھی جو محتاج شرح نہ ہو۔ قاضی سجاد حسین صاحب نے ایک ادبی ضرورت کو بڑی خوش اسلوبی اور ہنر مندی سے پورا کیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ حواشی بھی دئے ہیں۔ ایک تو ترجمہ ہی ایسا ہے کہ جو محتاج شرح نہیں، مزید حواشی نے اسے زیادہ مفید اور کارآمد بنا دیا ہے۔ نیز مقدمہ کی صورت میں مولانا روم پر مبسوط اور بھرپور مقالہ بھی سپرد قلم کیا گیا ہے۔

عمدہ، نفیس میپ لیتھو کاغذ پر فوٹو آفسیٹ کی روشن طباعت اور اسکرین پرنٹنگ سے مزین پلاسٹک کے خوب صورت گرد پوش نے "کتاب معنوی" کو ملکوتی صوری حسن عطا کر دیا ہے۔ ——— عشرت ظہیر

نام کتاب: جدید ہندوستان کے معمار ابوالکلام آزاد
مصنف: عرش ملسیانی
صفحات: ۱۸۰
قیمت: پانچ روپے
ناشر: پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند۔ پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

"جدید ہندوستان کے معمار — ابوالکلام آزاد۔ امام الہند مولانا آزاد کی سوانح حیات ہے۔ جسے

خوشگوار ترتیب دیا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ کہی سنی اور پڑھی ہوئی باتوں کی خوش کن بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عرش ملسیانی نے خود بھی لکھا ہے:

"مولانا کے باب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے مکمل سوانح اِدھر اُدھر کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ میرا کام انھیں یکجا کرنا اور حتی الامکان دیانت داری سے جمع کرنا تھا۔"

اس میں شبہ نہیں کہ عرش ملسیانی نے مولانا آزاد کی سوانح کو یکجا کرنے میں بڑی عرق ریزی اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔ اور ان کی زندگی کے منتشر شب و روز کی کمپوزنگ اور انہیں ایک دھاگے میں پرونے کی اس طرح کوشش کی ہے کہ پوری لائف کہیں سے ٹوٹنے اور بکھرنے نہ پائے —— میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت عرش ملسیانی اپنی کوششوں اور کاوشوں میں ناکام رہے ہیں۔ لیکن جہاں جہاں طویل اقتباسات کا سہارا لیا گیا ہے وہاں لہجے کے یکلخت بدل جانے سے کتاب کی فضا متاثر ہوتی ہے۔ مثلاً: کتاب کے شروع میں، مولانا کی بہن فاطمہ بیگم کا دو صفحات کا اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس اور اس کا لب و لہجہ اتنا حقیقی اور فطری ہے کہ ذہن پورے طور پر اس اقتباس میں کھو جاتا ہے۔ اقتباس کے اس آخری جملے کے بعد ——

"سچ تو یہ ہے کہ مولانا آزاد نے بچپن نہیں دیکھا۔ چھ سات برس کی عمر سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ ننھے ننھے کندھوں پر ایک سر ہے، جس میں ایک بڑا اونچا دماغ ہے۔"

ذہن کو ایک جھٹکا لگتا ہے، کیونکہ اب لب و لہجہ اور حسن بیان کے زاویے بدلتے ہیں۔ صفحہ ۱۵ پر مولانا کا اپنی والدہ ماجدہ کے باب میں اقتباس اور صفحہ ۱۹ پر انڈیا ونز فریڈم (INDIA WINS FREEDOM) سے مولانا کا ان کی شریک حیات سے متعلق اقتباس سے بھی قاری اسی طرح کے تاثر اور اُتار چڑھاؤ سے دوچار ہوتا ہے میں ہرگز یہ نہیں کہنا چاہتا کہ عرش ملسیانی کے لب و لہجہ اور حسن بیان میں کوئی کمی ہے یا متاثر کرنے والی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ دراصل یہ فرق اور اُتار چڑھاؤ اس لئے پیدا ہوا کہ طویل اقتباسات کا سہارا لیا گیا ہے اور اسی ضمن میں دوسری تاویل یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ عرش ملسیانی کے دل و دماغ پر مولانا آزاد اور ان کی شخصیت کا رعب اور ہیبت بُری طرح حاوی ہے۔ اور اس رعب و ہیبت سے وہ کہیں بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے ہیں۔ جس کے زیر اثر ان کے قلم کی زیادہ قوت رنگین بیانی پر صرف ہوئی ہے:

"عزم ہمالہ سے استوار، دل آب گنگ سے مصفا، طبیعت آسمان پرواز، لہجہ تمکنت آمیز، صورت وجاہت افروز، یہ ہے اس مردِ دانا کی ہلکی سی تصویر جس نے خطابت کو تسخیر قلوب کا نسخہ بنایا۔ سیاست پر حق و صداقت کی مُہر لگائی، فراست جس کے در کی کنیز تھی، علم و فن جس کے خدام تھے، صحافت نے جس سے زندگی پائی، ادب و تاریخ کو جس نے رنگ و

تازگی بخشی ۔" (ص ۱۲۱)

واخ صفحہ ۱۴۰ پر ختم ہے ۔ صفحہ ۱۴۱ سے ضمیمہ ہے جس کے تحت بہت ساری وضاحتیں ہیں۔ جن میں علم و فضل کا نکیں کے خیطے" مولانا آزاد کی اپنی اہلیہ زلیخا بیگم کے انتقال کے بعد قلعہ احمد نگر میں لکھا گیا فرض خط اور بٹوارہ کے بعد مولانا کی جامع مسجد دہلی کی معرکہ خیز تقریر وغیرہ شامل ہیں ۔
کتاب معیاری کتابت، فوٹو آفسیٹ کی عمدہ طباعت اور خوب صورت ٹائیٹل سے مزین، صوری و معنوی اعتبار سے لائق تحسین ہے۔ ——— عشرت ظہیر

رسالہ : اظہار
ترتیب : باقر مہدی ، فضیل جعفری
سائز : ڈیمائی ½
صفحات : ۱۸۴
قیمت : ۵ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، جے جے اسپتال بمبئی نمبر ۳-۴۰۰۰۰۳

ان دنوں ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کا قحط سا ہے ۔ اردو کے لئے واقعی برے دن آگئے ہیں۔ ایسے حالات میں "اظہار" اپنے ہئیت و مواد کے لحاظ سے حوصلہ شکن رجحان کی نفی کرتا ہے۔ یہ ادبی ذوق کی تسکین اور تقویت کا "امکان" بن سکتا ہے ، حالانکہ فضیل جعفری خود بھی اس کے دوسرے شمارے کے بارے میں تذبذب اور غیر یقینی انداز فکر کا اظہار کرتے ہیں :

"دوسرا پرچہ کب نکلے گا اور کیسے ؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں (فراقؔ) "

یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ ہم ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ اردو رسائل اپنی ابتدائی زندگی سے موت تک ہر لمحہ غیر یقینی حالت میں رہتے ہیں ۔
زیر نظر شمارہ کے مشتملات کی ترتیب میں خوش سلیقگی اور ہنر مندی کو بڑا دخل ہے ۔
راجندر سنگھ بیدی ، سریندر پرکاش اور جوگندر پال کے افسانے ان کے مخصوص لب و لہجہ اور منفرد انداز فکر کی

وارث علوی کا مضمون "نظر نظریے اور مسرت سے بصیرت" ——— محمود سرور کی تنقیدیں: خیالات کی بہت ساری گنجائشوں کے باوجود بھرپور اور عالمانہ ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مضمون "دسمبری سرفروش اور پشکن" روس کی اس تحریک کی تہہ میں اُترنے کی ایک کوشش ہے جسے "دسمبری" کہا جاتا ہے۔
"موجودہ ادبی صورت حال" یعقوب راہی نے اس رپورتاژ کے ذریعے جدید فکری رجحان اور ادب کی نظری و عملی بحثوں کو سمجھنے کی ایک سلجھی ہوئی واضح کوشش کی ہے۔ مضمون کا لب و لہجہ اور انداز بیان بے باکانہ اور کہیں کہیں طنزیہ ہے لیکن مضمون کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔
شعری حصے میں جاں نثار اختر، وزیر آغا، عزیز قیسی، ندا فاضلی، شمس الرحمٰن فاروقی، پرکاش فکری، قاضی سلیم، باقر مہدی، آل احمد سرور اور وحید اختر نے متاثر کیا۔
اردو ادب کے باذوق قاری کو "اظہار" کے دوسرے شمارے کا یقیناً انتظار رہے گا۔ (عشرت ظہیر)

نام رسالہ: **غبار خاطر** سہ ماہی
ناشر: مولانا آزاد ایجوکیشن سوسائٹی۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)
قیمت فی شمارہ: پانچ روپئے

اردو میں کیسے کیسے جیالے اور حوصلہ مند لوگ ہیں؟ اب یہی دیکھیے کہ مہاراشٹر سے ڈاکٹر رفیق ذکریا کے زیر سرپرستی نعیم احمد نے ایک ادبی سہ ماہی کا اجرا کر دیا۔ دو شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مگر دونوں کے درمیان وقفہ تین مہینے کا نہیں بلکہ سات مہینے کا ہے۔ وجہ؟ اچھے ادبی رسائل کا اردو میں وقت پر نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ وہ زبان ہے جسے ہر کوئی ستاتا ہے۔ غبار خاطر (۲) کے اداریے میں کہا گیا ہے کہ پریس کے مالک تین ماہ تک اورنگ آباد سے باہر رہے۔ یقین ہے کہ ان تین مہینوں میں تاج آفسیٹ پریس بند تو نہیں رہا ہوگا ——— پھر؟ ہزار پانچ سو کی تعداد میں اردو کے ادبی رسالے کے چھپنے کی کاروباری اہمیت کیا ہے؟ وہ بھی اتنے بڑے پریس کے لیے! غنیمت ہے پھر بھی کہ غبار خاطر کا دوسرا شمارہ سات ماہ کے بعد شائع تو ہوا۔ یہ اگر سال میں ایک بار بھی شائع ہو جائے تو ہمیں اپنی خوش نصیبی کا قائل ہونا چاہیے۔
"غبار خاطر" کے دونوں شمارے معیاری اور منفرد ہیں۔ اس کے دونوں شماروں میں اہم ادیبوں کی اہم تخلیقات شریک ہیں۔
نعیم احمد اسے زیادہ سے زیادہ دل چسپ فکر انگیز اور منفرد بنانے کے لیے نئی اسکیموں کو عمل میں لا رہے ہیں۔
——— کلام حیدری

ہماری مطبوعات اور دوسری کتابیں جنھیں ہم آپ کے لیے

ادب، تنقید، افسانے، ناول، شاعری

تحقیق، لغت وغیرہ

لائبریریوں، تعلیمی اداروں اور کتب فروشوں کو معقول رعایتیں اور سہولتیں دی جاتی ہیں

صنف	کتاب	مصنف	قیمت
افسانے	بے نام گلیاں	کلام حیدری	۵/-
"	صفر	"	۱۰/-
"	بابا لوگ	غیاث احمد گدی	۸/-
تنقید	زاویہ نگاہ	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۰/-
خود نوشت سوانح عمری	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	عام ایڈیشن ۳۰/-
		ڈی لکس ایڈیشن	۱۲۵/-
شاعری	لمحوں کا سفر	ڈاکٹر نرمدیشور پرشاد	۱۰/-
"	نوائے راز	مہجور شمسی	۵/-
"	درخشاں	حفیظ بنارسی	۵/-
خصوصی شمارہ	احتشام حسین نمبر	ماہنامہ آہنگ	۱۵/-
تنقیدی مضامین	معیار و مسائل	ڈاکٹر شاہ شکیل احمد	۳/۵۰
انتخاب مع تنقید	انتخاب کلام جمیل	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	۳/-
انتخاب نظم و نثر	مطالعہ اردو	کلام حیدری، محمد علی خاں	۳/۵۰

صنف	کتاب	مصنف	قیمت
افسانے	دیدۂ حیراں	مظفر حنفی	۴/-
غزلیں	تیکھی غزلیں	"	۴/-
ناول	گو نگا ہے بھگوان	کوثر چاندپوری	۲/۵۰
"	پتھر کا گلاب	"	۴/-
افسانے	آواز کی صلیب	"	۱۲/-
رپورتاژ	کارواں ہمارا	"	۳/۳۰
شعری مجموعہ	روشنی کے دریچے	سید احتشام حسین	۱۰/-
افسانے	کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	۵/۵۰
"	شہر ممنوع	واجدہ تبسم	۱۲/-
"	آیا بسنت سکھی	"	۱۸
"	چھوئی موئی	عصمت چغتائی	۵/۵۰
تنقید	مطالعۂ ممنون	منشاء الرحمٰن منشاء	۱۳/-

مینجر کلچرل اکیڈمی، ریتہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

دی کلچرل اکیڈمی ، دینہ ہاؤس ، جگ جیون روڈ ، گیا

آہنگ

جون ۱۹۷۵ء
شمارہ ۶۰

فون { ۵۳
۴۳۲

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

فی شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

قمر نظامی ، عبدالغفار

طباعت :
ہند لیتھو پریس ٹیکوڈ گنج گیا

مدیر

کلام حیدری

محتویات

مزامیر

مضامین

افسانے

نئی نظم کا مطالعہ

غزلیں

تبصرے

حرفِ اوّل

ہندوستان میں اردو کا جو حال ہے اُس سے اگر اردو صحافت اور ادب متاثر ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اردو اخبارات دھڑا دھڑ بند ہو رہے ہیں۔ ادبی رسائل یا تو بند ہو چکے ہیں یا پابندی سے نہیں نکل رہے ہیں۔

ایسے میں اگر ہم یہ شکایت کریں کہ اردو ادیب لکھ ہی نہیں رہا ہے تو شاید ہم حق بجانب نہ ہوں گے۔ اگر پڑھنے والے دن بہ دن گھٹتے رہیں، اشاعت کے امکانات اور مواقع ختم ہوتے جائیں تو ادیب کیوں لکھے گا؟ کس کے لئے لکھے گا؟ ——— ہمیں تو اب ایسا لگتا ہے کہ اردو ادیب شاید آہستہ آہستہ سوچنا بھی چھوڑ رہے ہیں۔ ——— ایک معمولی سی مثال لیجئے۔ کسی یونیورسٹی میں اگر بیس ہزار روپے ہر سال اردو کتابوں کی خریداری کے لئے ملتے ہیں تو یہ رقم خرچ نہیں ہو پاتی۔ یونیورسٹی کے اردو اساتذہ سے دریافت کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ہر سال بیس ہزار روپے کی کتابیں چھپتی بھی نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر ہندوستان کے اشاعتی گھروں کی فہرست سامنے رکھ کر بیس ہزار کی کتابوں کی فہرست بنانے کی کوشش کی جائے تو (پیشِ نظر لائبریری میں موجود کتابیں بھی ہوں) ایسی فہرست نہیں بن سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ایک ایک کتاب کی کئی کئی جلدیں اس لئے خرید لی جاتی ہیں کہ اردو کے نام پر دئیے گئے روپے خرچ ہو سکیں پھر بھی ہر سال منظور شدہ رقم میں سے کافی حصہ بچ ہی جاتا ہے ———

غور فرمائیے کہ یہ صورت حال ہے تصنیف و تالیف کی۔

پھر؟

ہم ایک بار پھر اُردو کی انجمنوں سے درخواست کر رہے ہیں کہ خدا کے لئے اُردو پڑھنے والوں کی کم ہوتی ہوئی تعداد کو روکئے۔ اور اُردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھائیے۔ سرکاری انعامات، اکیڈمیوں اور بورڈ میں اُلجھ کر مت رہ جائیے۔ خدارا اصل مسئلے کو سمجھئے۔ اُردو زبان کی بقا آج ہندوستان میں اُردو والوں کے لئے اصل مسئلہ ہے۔ اُردو ادب کی ترقی کا مسئلہ اُس کے بعد آتا ہے۔

——— کلام حیدری

شمس الرحمن فاروقی

غزل

کس بدن سے اٹھتی ہے خوشبو گریز پا
ستارا ہے آدھی رات کا جادو گریز پا

اب دل سے دھل گیا ہے وہ نقش ہزار رنگ
ہیں دشت جاں کے سیکڑوں آہو گریز پا

بے حد و بے مثال مسافت کے آسماں
تجھ میں مرا وہ اختر خوش خو گریز پا

سب کھیتوں کا چہرۂ شاداب کٹ گیا
آنکھیں دھواں دھواں ہیں تو ابرو گریز پا

اس ربط بے کنار کا اٹھتا نہیں ہے بوجھ
آنکھیں ہیں پاؤں قوت بازو گریز پا

نظام صدیقی

کمِٹمنٹ اور فن کار

ادبی تخلیق بذاتِ خود اس دنیا کے متوازی ایک خود مختار کائنات ہی تو ہے جو ادیب و شاعر کے ذہنی عوامل کی مرہونِ منت ہے اور فنی تعمیر و تشکیل کے مخصوص آداب و آئین اور روایات کی متقاضی ہے۔ فنکار اس کے لیے خام مواد خواہ مادی دنیا سے لیتا ہو۔ لیکن اس کی تخلیق، تعمیر و تشکیل وہ اپنے ہی خوابوں، یادوں، آرزوؤں، ضرورتوں، دباؤں، ذہنی پیچیدگیوں اور نظریوں کے مطابق کرتا ہے۔ اپنی اس فنی کائنات کا وہ خالق ہے اور اس دنیا میں وہاں کے پیغمبر کی حیثیت سے رہتا ہے۔ فنی کائنات کی تخلیق، فنکار کی شخصیت کے اس انتہائی پیچیدہ، وحدت جو اور تقریباً ناقابلِ تشریح پُراسرار پہلو کے ہاتھوں ہوتی ہے جو خلاقانہ روح کی حامل ہے۔ پھر اس کی رونپذیری کا اس تخلیقی تناؤ کے لمحوں میں ہوتی ہے جب فنکار کی بصیرت و ذہانت چیزوں کے آر پار دیکھنے لگتی ہے۔ ان کی روح کی گہرائیوں کو سمجھ لیتی ہے اور فنکار اپنے تاثرات، تعصبات اور معتقدات کو کبھی جھٹک کر مظاہرہ فطرت اور حقائق عالم کا ایک نیا پہلو، ایک چھوتا نادیدہ، ایک نامعلوم اور غیر مرئی روپ کو کھینچ کر ہمارے سامنے دکھلاتا ہے۔ ممکن ہے یہ ساری عجوبگی اور نیاپن پہلے سے ہی اشیائے عالم اور مظاہر کائنات میں موجود ہو۔ لیکن وہاں سے اس کو تلاش کر ایک آزادانہ وجود کے روپ میں متوازی طور پر ہمارے سامنے قائم کر دینے کی اس کی غیر معمولی عارفانہ جبلت فنکار کو حقیقتاً عظمت بہ کنار کرتی ہے۔ اور ہماری عقیدت کا مرکز بناتی ہے۔ فن اس کے لیے فقط کاشفی یا نمائندہ نہ ہو کر خود ایک نئی تخلیق کے روپ میں ہویدا ہوتا ہے۔ اور ایک آزاد اور خود مختار کائنات کا معتبر وسیلہ بنتا ہے۔ اس کائنات کے مقابلے میں زیادہ حقیقی، زیادہ پسندیدہ، زیادہ معقول اور متوازن معلوم ہوتا ہے۔

یہ صداقت اور توازن کبھی حال کے ذہنی منت ہوتے ہیں اور کبھی مستقبل کے۔ آج کی کریہہ اور بے ہنگم صداقت اور عدم توازن ممکن ہے۔ کل کے متوازن حسن کی زمین ہموار کرے اور تعمیر کی پروردگار بن جائے۔

لیکن اسی سطح پر وہ خود کو آج کے ان گنت اچھے اور برے چیلنجوں کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے۔ حال کی ہمہ ہمی کبھی اس کو خوشحالی سے تو کبھی اپنے وجود کے تحفظ کے لیے طرح طرح کے واسطے دیتی ہے کبھی قدامت کا تو کبھی حال کی وسعت کا۔ لیکن فنکار کو ہر قیمت چکا کر ان چیلنجوں کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ اپنے حقیقی فرض و منصب سے وابستہ فنکار کی یہ مجبوری نہیں ہے بلکہ اس کا ازل سے مقدر ہے۔

اور اسی مقام پر آج کے فنکار کے سامنے موجودہ صورتِ حال کا یہ شدید چیلنج شاید سب سے زیادہ پیچیدہ شکل میں سامنے

آشوب۔ تاریخ کا عجب نازک لمحہ ہے جب کہ حال، ماضی اور مستقبل سے بیک وقت کٹ گئے ہیں۔ یقین اکھڑ گئے ہیں اور سب حد بندیاں ٹوٹ گئی ہیں اور صرف البلد بکھر گئے ہیں نتیجتاً پہلے بنے بنائے راستے مسدود ہو گئے ہیں اور تمام پیکر بے ہیئت ہو کر گڈمڈ ہو گئے ہیں ایک عجب سی نزعی کیفیت سے دوچار ہے۔ وہ تہذیب کے جس دوراہے پر کھڑا ہے۔ وہاں اس کے سامنے کی دو دیو قامت آہنی حقیقتیں ہیں۔ دونوں ہی بے رحم ہیں اور دونوں ناقابل قبول۔ دو مجبوریاں ہیں اور ان سے نجات کی بھی کوئی صورت نہیں۔ دلدل ہے جو اس کو سرتاپا دھنسا دیتی ہے۔ دو حال ہیں اور دونوں ہی بر خود غلط ہیں۔ لیکن دونوں ہی متوازی طور پر بے حد دہشت ناک فنکار کے راستے میں آ پڑے ہیں اور ان کی بے پایاں پھنکار، زہر اور گرفت میں وہ خود بری طرح پھنسا ہوا تڑپ رہا ہے۔

آزادی کے بعد کے فنکار کی ایک دنیا وہ ہے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور جس سے اس کو بے پناہ نفرت ہے۔ لیکن جس میں وہ رہتے، ٹوٹتے، بکھرنے، بکنے اور سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے جس کے خلاف وحید اختر یوں صدائے احتجاج بے محابا بلند کرتے ہیں۔

یہاں سے بھاگو

اگر یہاں تم نہ رکے تو صلائے کوہ ندا کبھی پھر نہ مل سکے گی۔

یہ ساحران ندا کا جادو نگر ہے۔

جس میں ہزاروں لاکھوں ندا کے طالب پھنسے ہوئے ہیں

رکا یہاں جو وہ کرسیوں میں الجھ گیا ہے

رکا یہاں جو وہ کرسی میں ڈھل گیا ہے۔

وحید اختر ——— کرسی نامہ

مزید برآں وحید اختر اس بیوپاری دنیا کی مکروہات کے خلاف اپنی مناجات میں بھی آتش زیر پا ہیں جس کو انہوں نے عصر حاضر میں ایک نیا تخلیقی ڈائمنشن عطا کیا ہے۔ جو عصری آشوب آگہی اور خلوص فن سے مملو ہے۔

خدا وندا

یہ بخنایہ خریداری

سراسر ہے زیاں کاری

عزیز مصر کے ہاتھوں بکے یوسف تو دونوں ہی کا نقصان ہے۔

اس کی مکمل لاحاصلی اور بے معنویت عادل منصوری کے تاسف آگیں لہجہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

بند شہروں میں اجنبی بے حس

شور کے آر پار خالی ہاتھ

ہاتھ میں دو جہان مگر خالی

دوسری دنیا وہ ہے جس کو اپنے اندر سے نکال کر اس نے بے محابا باہر پھیلا دیا ہے جس کی تخلیق، تعمیر اور تشکیل اس نے خود کی ہے اور جو اس کے ٹوٹنے، گھٹنے اور گھسٹنے کی اور بھی کثیف اور دلدوز تصویر کو سامنے رکھتی ہے۔ اس کی بیچارگی، شکست اور نا امیدی کی

نہ جنت!
نہ فلسفہ کوئی
یہ راستہ ہے یہاں راستے کی منطق ہے

ندا فاضلی ——— راستے کی منطق

خدا عقیدت خلوص نیکی
خوشی محبت سکون
سب مر چکے ہیں بھائی
چلو اب ان کو
ممی بنا کر
لحت کے اہرام میں سُلا دیں

علوی ——— ممی بنا کر

وہ دن کہاں ہے۔
وہ آخری دن
کہ جب خدا یہ تمام چیزیں سمیٹ لے گا
مجھے اسی دن کی جستجو ہے
کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں

علوی ——— آخری دن کی تلاش

اس کو خود بخوبی نہیں معلوم کہ جب بے ہنگم اور کریہہ تخلیق کا اکثر ذمہ دار اس کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس میں خود اس کی ذمہ داری کتنی ہے۔ جس رنگا رنگ، بوقلموں، زرق و برق اور سلمہ ستارہ جڑی دنیا کو اس پر زبردستی مسلط کر دیا گیا ہے۔ اس کی بد صورت جذام زدہ سسکتی روح کو کھینچ کر باہر لانا جرم ہے۔ یا اپنی اندرونی بدہیتی اور داخلی کثافت کو فن کے وسیلے سے اور بدیہہ پھیلانا اور یوں تخلیقی صلاحیت کا بیجا استعمال کرنا جرم ہے۔؟ فنکار کا جرم کہاں ہے؟ وہ اپنے فنی منصب کے نباہ یا نہ نباہ سکنے کی مجبوری میں پوشیدہ ہے؟ آیا ذمہ داری کی قبولیت یا کسی بھی ذمہ داری، کسی بھی وابستگی، کسی بھی الزام تراشی، ننگی کے نشانے سے بھاگ نکلنے کی روح فرسا اذیت میں پنہاں ہے؟

فنکار کا یہ مسئلہ بیسویں صدی کے ٹھیک وسط سے شروع ہوتا ہے جہاں افق عالم پر ایک جنگ عظیم آویزاں ہے۔ اور یہ عالمی جنگ ہر نوعیت کی عقلی، ذہنی، اقتصادی یا سیاسی تحریک ٹوٹنے والی دنیا کی تاریخ کو ٹھیک بیچ سے کاٹ دیتی ہے اور ہماری ساری سمتیں جیسی اپنی اپنی جگہیں بدلنے لگتی ہیں۔

ایک مدت دراز کی بدترین نوعیت کی غلامی کے بعد کسی ملک کا آزاد ہونا بذات خود ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ پھر ایسے یہاں تو

ان مشکلات کے ساتھ ملک کی تقسیم کا المیہ بھی وابستہ ہے جس سے برق رفتار انحطاط پذیر اقدارِ حیات کے زلزلے جڑے ہیں۔ منتشر اور بکھرے ہوئے لوگوں کے دم بے سر و سامان قافلے بھی جڑے ہیں جن کو تہذیبی اور اقتصادی کرب ناک کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اخلاقی قدروں کی پامالی، ملا انسانیت، انسان کی بے وقعتی اور فسادات کی ہیبت بھی جڑی ہوئی ہے جس کی آگ میں اچھا اور برا سب کچھ ہی خاکستر ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی کھلے آسمان اور پھیلی دھرتی کے درمیان متوسط اور مفلوک الحال اور لوٹے ہوئے لوگوں کی سر پر چھت تلاش کرنے کی وہ گہری سیماب آسا بے چینی نظر آتی ہے جس میں غیر معمولی انسانی جد و جہد اور بدترین نفسا نفسی کا عجیب عبرتناک عالم نظر آتا ہے۔ رہنے کے لئے گھر بنانے، زندگی کے وسائل تلاش کرنے اور ساتھ ہی ان آزاد ملکوں کے درمیان اپنی شخصیت کو ابھارنے کی مجبوریاں لاحق ہیں جن کی برادری میں طوعاً کرہاً شمولیت بہرحال ان کا مقدر رہی۔ سب سے قدیم تاریخ اور دیرینہ تہذیبی عظمت کے قابل رحم طور کھلے پن سے سراسیمہ اس نئے ملک سے سب کو ہمدردی ہے۔ اس لئے سب ہم کو عزت، ہمدردی اور خیرسگالی کے نیک جذبات کی خیرات نہایت فراخ دلی سے دیتے ہیں۔ کسی نے ہم کو ادھار کی شکل میں یا بطور عطیۂ خاص کثیر زر بھی وقتاً فوقتاً عطا کیا ہے۔ کسی نے اشیائے خوردنی سے نوازا ہے۔ کسی نے ہمیں تکنیکی امداد، مشینوں کی فراہمی اور اپنی اشیائے فروخت سے ہماری ازلی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے تو کوئی اپنے خصوصی ماہرین بھیجتا ہے۔ تہذیبی اور سائنسی وفدوں کا تو جیسے نہ ٹوٹنے والا تانتا بندھا ہوا ہے اور ان گزشتہ بیس پچیس سالوں میں کہیں ایشیا کا سب سے بڑا باندھ بن گیا ہے۔ کہیں دنیا کی سب سے بڑی نہر نکل آئی ہے۔ کہیں مکانات اگ رہے ہیں تو کہیں آسمان چھوتے پہاڑ اڑا دیئے گئے ہیں۔ جدید ترین فارم، تحقیقات اور تجربات کے بڑے بڑے ادارے، علوم و فنون کی اسناد بانٹتی اور بیکاری کو بڑھاتی ہے۔ یونیورسٹیاں، خون آشام ملیں، دیوہیکل کارخانے، پلانٹ، پروجکٹ، سڑکیں، اور ریلیں، جگمگاتے میلے اور بجلی نمائش، ہنگامہ پرور جشن اور جینتیاں، شور مچاتی اکادمیاں اور خاموش ٹرسٹ، میٹنگیں اور کانفرنس، انتخاب اور پریس کا غل غپاڑہ ـــــ پنج سالہ منصوبوں کے انتظار بخش طویل سلسلے ـــــ ہر نوعیت کی ترقی کی جہت میں امید اور حوصلہ انگیز اقدامات کا دھوم دھڑاکا ـــــ داخلی اور بیرونی خطروں سے لڑتے ہوئے بڑھتے چلنے کے مضبوط اور اٹل ارادے ـــــ بھکمری اور مجبوری سے لڑنے کی آمادگی، زیادہ سے زیادہ خود کفیل ہونے کی پرخلوص کوششیں ـــــ نشر و اشاعت اور اخبار و اذکار کے یہ بڑے بڑے چیختے اور چنگھاڑتے ہوئے ہیں جو سارے آسمان پر افق تا افق ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے کسی نیلے ٹیلے کے مانند منڈلا رہے ہیں۔ کبھی اوپر اور کبھی نیچے سے دھماکے کے ساتھ ایک نئی سنسنی رکھ دی جاتی ہے اور آپ اس کو جب تک بخوبی سمجھیں اس وقت تک ایک دوسری بڑی اشتہاری لائن کے ساتھ دوسری سنسنی آ جڑتی ہے ـــــ جمہوری طریقوں سے اشتراکی نظام کا تجزیہ ـــــ اور سب کچھ ملا کر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے ملک نے ہندوستان کو ساتھ لینے میں بے پایاں گرمجوشی اور تپاک کا مظاہرہ کیا ہے۔ سبھی یہاں آئے ہیں اور سبھی نے ہم کو بلایا ہے۔ ہماری ترقی اور روایت کو سراہا ہے۔ ذہانت اور محنت کا لوہا مانا ہے۔ برابر کی سطح پر صنعتی اور سیاسی تعلقات استوار کئے ہیں۔

لیکن اسی جگمگاتی مگر اندر سے کھوکھلی دنیا میں ایک اور شخص رہتا ہے اور وہ فنکار ہے یا کہیں فنکار ہونے کی مجبوری کے عذاب کو برداشت کر رہا ہے۔ اس کو اس نمائش پسند دنیا سے بے پناہ نفرت ہے۔ یہ ساری چمک دمک، شور و شرابا، دکھاوا اور مکر اس کو اور زیادہ دکھی کرتے گئے ہیں۔ اس کی روح کے درد و داغ میں مزید اضافہ کر کے اس کو اور زیادہ اکیلا اور حرماں نصیب

سناٹے کی بیں

وسعت میں سمندر کی اکیلا ہے جزیرہ
موجوں کے تلاطم کا ہر اک ناز دہ جانے

(پرکاش فکری)

ہر آدمی اپنا رہا / سپنا جو تھا سپنا رہا /
دوری سمتی دوری ہی رہی حاکم تشنگی ادھوری ہی رہی
تنہا تھا وہ، تنہا رہا

جمیل مظہری (نشانے ودلی)

اس کے سامنے کی دنیا تو بالکل ہی دوسری ہے اور یہ تاش کے محل جس قدر اونچے ہوتے جارہے ہیں ۔ اس کا دل اسی قدر اندر سے دہکتا جاتا ہے ۔ دماغ پاش پاش ہوتا جاتا ہے ۔ کب کہاں پتہ اپنی جگہ سے ذرا سا سرک جائے اور جو کھوکھلی دنیا اس کے سامنے ہے ۔ وہ اس کی کہانیوں ، ناولوں ، نظموں اور تصویروں میں ابھر رہی ہے اور سب مل کر ایک ہی بڑی تصویر کے ڈیپلیس ابھرتے چلے جاتے ہیں ۔ بلند و بالا جھنڈوں کے اوپر غبارے اور آتش بازیوں کے سنہرے ستارے رقصاں ہیں ۔ آراستہ ستونوں اور دالانوں اور محرابوں کے اوپر قوس قزحی بلب روشن ہے ۔ لاؤڈ اسپیکروں کی سمع خراش آوازوں میں مقابلہ آرائی ہو رہی ہے اور کیمروں کی کوندتی بجلیوں میں آنکھیں کھولنا دشوار ہے ۔ لیکن یہ سب تو اس تصویر کا پس منظر ہے ۔ سامنے پورے کینوس پر چھایا ہوا ایک دل شکستہ اور بیمار و نحیف نوجوان سر جھکائے ، گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے ، ہتھیلیوں میں سر پکڑے ، ناامیدی اور بے سمتی کے کرب سے چور بیٹھا ہوا ہے ۔ ہر بار فنکار کا موئے قلم اس نام نصیب ، شکست خوردہ ، پامال اور تباہ حال شخص کے چہرے کی فکر آلود خراشوں کو اور ابھار دیتا ہے ۔ ہر بار دل کے کسی ایک اور نازک گوشے کے ٹوٹنے ، کٹنے پھٹنے ، جلنے ، بکھرنے اور ریزہ ریزہ ہونے کی کراہ سنائی دیتی ہے ۔ ہر بار اس کی یاس آلود نگاہ اپنی راندۂ درگاہ شخصیت کے کسی حساس عنصر کے یک لخت فنا ہو جانے کی دہشت انگیز خبر لاتی ہے ۔

لرز گئی ہے جو آنکھوں کے آئینوں میں کبھی
کسی کے پھٹتے ہوئے اندر کی انتہا ہی تو ہے

ظفر اقبال

لوگ ہی آن کے یک جا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

ظفر اقبال

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

ظفر اقبال

ہوا کی سمت فصیلیں کھڑی ہیں چاروں طرف
نہیں یہاں سے کوئی راستہ نکلنے کا

ظفر اقبال

بیک لیب ذہنیت کی وجہ فرسائے دست و پائی، شکست خوردگی، قسمت پرستی، اور حرماں نصیبی کا غلبہ جنگ کا باعث ہوتا۔ جانے والا ہر شخص ہاتھ دھرے نہایت بے بسی سے کسی معجزے کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور جو کچھ گرد و پیش میں ہو رہا ہے اس کو سب جھوٹ، فریب، مکر و ریا اور سراب آسا معلوم ہوتا ہے۔ نتیجتاً آتش زیر پا ہو جاتا ہے۔ اس کی برافروختگی ہسٹریائی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ لیکن بالآخر اس بر تعلیکے "لک بیک ان اینگر" کے ہیرو جمی پورٹر کی خود ترحمی کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

عموماً لوگ کہتے ہیں کہ جنگ سے سب سے بڑا نقصان کشت و خون اور استعمار کی شکل میں نہیں ہوتا بلکہ ایک اور مہیب اور خوفناک روپ میں رونما ہوتا ہے۔ ملک کی ساری حسین، برتر اور صحتمند روحیں، قدریں، باتیں اور چیزیں جنگ کے شعلوں میں خاکستر ہو جاتی ہیں۔ صرف ہر نوعیت کے بدنما پیلے سامنے منہ چڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہٹے کٹے قد آور نوجوان جنگ کی بھٹی کے ایندھن ہو جاتے ہیں اور بوڑھے، بیمار، معذور اور مجہول افراد آنے والی نسل کے باپ بننے کے لئے بچ جاتے ہیں اس طرح پوری ایک نسل کا خوفناک حد تک انحطاط ہو جاتا ہے۔ آنے والی نسل اور زیادہ کمزور، پست حوصلہ اور قوت رجولیت سے محروم ہو جاتی ہے لیکن حالات کی یہ کیسی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جن ممالک نے فی الحقیقت خوفناک جنگیں لڑی ہیں جس دھرتی نے ہر نوعیت کی تاراجی اور بربادی کا نظارہ کیا ہے۔ اور اس کے بے پایاں کرب اور ہولناکیوں کو برداشت کیا ہے۔ وہاں کی برافروختہ اور بیدار مغز نسل ہر نوعیت کی بے انصافی اور حق تلفی کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی سینہ سپر ہے اور جہاں یہ سب حشر سامانیاں برپا نہیں ہوئیں۔ وہاں حقیقی جنگ کے بعد کی پسپائی، ناامیدی اور بے دستی و پائی کا تسلط ہے۔ اسکی نوجوان نسل انفعالیت، مجہولیت اور رواقیت کا شکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی درخشاں مستقبل ہی نہیں ہے۔

کٹی زبان والوں کی بھیڑ
مردہ آنکھوں کی سوغات لئے
جسے ڈھونڈتی ہے
وہ ــــ شہر، دشت، صحرا
کچھ بھی نہیں

ـــــــــــ شاہد احمد شعیب ـــــ دھندلی تصویریں

بار ہا فنکار نے خود اپنے آپ سے اور دوسروں نے اس سے دریافت کیا ہے؟ کیوں نہیں ملک کی تعمیر و ترقی میں وہ بھی اپنی سماجی، شہری اور فوری ذمہ داری کو سنبھالتا؟ کیوں نہیں عمل کی اس والہانہ مسرت و نشاط کو اپنا زور قلم وقف کرتا جو ملک کی بیکاری، کم خیالی اور کھوکھلے پن کو بھر رہا ہے؟ انتہائی خود ذاتیت یا خود مرکزیت، سلبی موضوعیت اور مجہول کلبیت کے قتیل فرد کے بجائے آزاد ملک کا ایک جاندار اور جانباز جوان اس کی تحریروں کے آئینہ سے کیوں نہیں جھانکتا؟ کیوں نہیں کچھ بھی کہیں اس کو روشن نظر آتا؟ کیوں اس کو موجودہ چینگاریوں میں صرف پرچھائیاں ہی پرچھائیاں نظر آتی ہیں روشنی کی کوئی بھرپور کرن دکھائی نہیں پڑتی؟ کیوں کوئی زندگی اعلیٰ اور برتر پہلو اس کی نگاہوں کی گرفت میں نہیں آتا؟ اور اکثر و بیشتر اس پہ الزام وارد کیا گیا کہ وہ اپنی ذمہ داری سے روگرداں ہے۔ کسی بھی نوعیت کی پابندی کو قبول نہیں کرتا اور گھٹتا ہے۔ وہ کسی ذہنی عدم توازن اور ...!

دہ [illegible] گدار و مشہور سہی لیکن اس کا عضو بننے کا بہرحال ذمہ دار ہے۔

[illegible] ذمہ دار ہے۔ کیوں کہ ہر سچا اور اچھا فنکار نے اپنے عرفان نفس و کائنات کے غیر جانب دارانہ طور میں باہر کے [illegible] اور اندر کی کثافت سے گھبرا کر بار بار خود سے بھی یہ استفسار کیا ہے کہ اس کی ذمہ داری کیا ہے؟ اس کا بنیادی فرض و نصب العین کو کس کے ساتھ وابستہ (کمیٹڈ) کرتا ہے۔ فنکار کا کمٹمنٹ کیا ہوتا ہے؟ اس کی پابندی اور وابستگی کی کیا نوعیت ہوتی ہے۔ اس کے فن کا کیا تقاضہ ہے؟

اس وابستگی اور پابندی کے ضمن میں اس کے سامنے سب سے پہلا نام "انسانیت" کا آتا ہے۔ ادیب کو وسیع انسانیت سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ ٹھیک ہے کون منع کرتا ہے۔ لیکن کون سی انسانیت؟ بھوکے، پیاسے، ننگے، دبے، کچلے اور پسے ہوئے لوگوں اور بھکاریوں کو بھیک دینا اور ان پر رحم کھانا انسانیت ہے یا دکھی اور بھوکے ہونے کی تشویشناک صورت حال کے خلاف جدوجہد کرنا انسانیت ہے؟ زیر دست مرنے والے کے لیے رونا انسانیت ہے یا مارنے والے زبردست ہاتھ کو پکڑ لینا انسانیت ہے؟ یا مارنے والے جابر ہاتھ پر قدغن لگانا ہی انسانیت ہے؟ لیکن جابر ہاتھ کو پکڑنے کے لیے ان گنت فلاسفیاں ہیں۔ اس لفظ کے کھوکھلے پن اور لامعنویت کو پُر کرنے کے لیے ان گنت معانی ہیں اور جو معنی یکبارگی ہی اپنی طرف توجہ کو مرکوز کرتا ہے۔ وہ عام آدمی کے لیے عام آدمی کے ذریعہ یکساں مواقع اور یکساں سہولیات، آزادی، اخوت اور مساوات کا فلسفہ ہے۔ آدمی کی روح کی وسعت پذیری اور اس کے حدود مفاد کے ماسوا اپنی نوع انسان سے پیار کا جذبہ ہے۔ عیسیٰ اور بدھ، مشرق اور مغرب کے ان الہامیات کی توسیع ہے جو بنی نوع انسان کے لیے فلاح و بہبود کے حامل رہے ہیں۔

لیکن اپنی مطلب برآری کے لیے اسی درخشاں نام کے رخ پہ "انسانیت" کی سیاسی تہذیبی اور ثقافتی حب ڈل خولہ چند علامتیں ٹانک دی جاتی ہیں جن کے تحفظ کے لیے اتنے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور راکٹ بم ہیں کہ ساری انسانیت کا دسیوں بار صفایا ہو سکتا ہے۔ فوجیں اور انٹر کانٹی نینٹل میزائلیں ہیں اور آہستہ آہستہ یہ "انسانیت پسندی" اپنا خوف ناک جذام زدہ چہرہ بے نقاب کرتی جاتی ہے۔ پیڑوں اور بجلی کے کھمبوں پر آویزاں زندہ نیگرو، شور مچاتی شاداں و فرحاں سفید بھیڑ کو "تفنگ" کا درجیانہ انبساط و اہتزاز فراہم کرتے ہیں۔ اور افریقہ کے جنگلوں میں لومبا کی آزادی ٹھنڈی بھی نہیں ہوتی ہے کہ گولی کھائے کینیڈی کا سر جیکولین کی گود میں لٹک آتا ہے۔ یہاں خود بخود سوال اپنا سر اٹھاتا ہے کہ یہ کیسی جمہوریت ہے جو کمیونزم کے خلاف ہندوستان کو اسلحہ [illegible] دیتی ہے اور ہندوستان کے خلاف پاکستان کو، امن کے نام پر آدھے کروڑ لوگوں کو ناگاساکی اور ہیروشیما میں بھون دیتی ہے۔ اپنے ملک سے پانچ ہزار میل دور لاکھوں افراد کو گولوں اور ڈیزی کٹروں سے کچل دیتی ہے۔ کوریا اور ویت نام کی ہزاروں میل کی آبادیوں میں آتشیں بموں سے لاکر آخر یہ کس کو کیونزم سے بچانے کی بات کرتی ہے؟ ان ممالک میں جمہوریت کی برکتوں اور جمہوریتوں سے فیض یاب ہونے کیلئے کون بچ جائے گا۔ یہ تو ساری دنیا کو اپنی تجارتی منڈی بنا ڈالنے کیلئے پہلے متفکر ہے۔ جمہوریت کا تحفظ کرنے کے لیے بعد میں کوشاں ہے۔

لیکن وہ تو بدیسی انسانیت ہے اور ہمارے شعور اور روح کو ذرا کم ہی متاثر کرتی ہے۔ لیکن ہماری روح کو بے حس قاتل تو دیسی انسانیت ہے۔ جس کا نفوذ ذرائع نشر و اشاعت کے ہر وسائل سے ہمارے رگ و پے میں کیا جاتا ہے۔ ہر ریاست دار اور سیاستداں آدمی جانتا ہے کہ اس انسانیت، عدم تشدد، امن و آشتی اور صداقت پرستی میں ہر نوعیت کا جھوٹ، بدعنوانی،

اور ادھر ادھر ادوں کے بیچ
کوئی راستہ ہی نہیں
اب کوئی پیغمبر نہیں آئے
نازل نہ ہو ——— کوئی کتاب
انسان کو کتاب کی ضرورت نہیں ——————— صادق (چھ)

——————— صادق

اور .... اللہ اکبر ———!"

[یقیناً، یقیناً]

کہیں نور کے سرخ لاہوتی نقوش نے
کچھ داڑھیوں میں گناہوں کو اگلا
خداگاہ ——— گرد تقدس جبینیں
خداگاہ ——— لیکن خدا تو سیہ داڑھیوں تک ہی الجھا ہوا تھا
خداگاہ ——— کالے گناہوں کا اک ڈھیر
——— کووں، گدھوں اور چیلوں کا مسکن
خداگاہ ——— کچھ مشرقی لاشوں کا گاڑھا تعفن
تعفن ——— جسے شوق سے سب کے سب پی رہے تھے
——— یہ پوچھا کہ ——— "مذہب ———؟"
کہا ——— "پیٹ ———،
اس سے بڑا کوئی مذہب نہیں ہے !"

عبداللہ کمال ——— نقابوں کا شہر

~~~~~~

خدا عقیدت خلوص نیکی
خوشی محبت سکون
سب مر چکے ہیں بھائی
چلو اب ان کو
ممی بنا کر
لغت کے اہرام میں سلا دیں

علوی ——— ممی بنا کر

~~~~~~

مظہر امام کی نظم "جلتے خیموں کا درد" بھی ہر نوعیت کے عقیدوں، خوابوں، قدروں، آدرشوں، نشوں اور نعروں

[illegible] اس نظام کو لانے والے افراد ہمارے ہیرو بن گئے ۔ اس دور میں اسٹالن اور ماؤ کے [illegible] مصداق تھے اور ہر دانشور کے لئے بحث و مباحثہ اور ایمان و ایقان کا موضوع بن بیٹھے تھے ۔ ان [illegible] وہ فرد تھا اور اس کے قطعی ناقابل قبول ہونے میں کسی ذہنی کشمکش کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا ۔

[illegible] کے جنت ارضی کی دیوار کی حق ترشین کیمپوں کی جھریوں سے دہلنے لگی اور ایلیا اہرن برگ کا "سمتا" "دو دنت [illegible] تا سڑیاں بہتیا لیمن" پاسترناک کا "ڈاکٹر ژواگو" "یوتیو شنکو کی نظمیں [illegible] "اے میری کاشش آٹو بائیوگرافی" اور سولزے [illegible] کا "ون ڈے ان دی لائف آف ایوان ڈینی سوو چ" جیسی کتابیں اس دیوار کے [illegible] سے برآمد ہونے لگیں ۔ ادھر دوسری [illegible] کی فردوس ارضی بھی دنیا کی سب سے قدیم دیوار کو ہماری سرحدوں کے اندر کھسکانے لگی ۔ اس وقت ہمارے ہیروؤں کے پیچھے [illegible] پہنچنے لگی اور عظیم دیوتاؤں کی مورتیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ڈھنے لگیں ۔ یہ کیسی اشتراکیت ہے جہاں کروڑوں افراد کو توڑ کر ایک شخص بنتا ہے اور اس کا ایک اشارہ باقی سب کو کٹھ پتلیوں کے مانند نچاتا ہے ؟ یہ کیسی قومیت ہے جو دوسرے کے گھر میں پاؤں پھیلاتی ہے اور پاکستان جیسے دقیانوسی مذہب زدہ ملک سے ہم آغوش ہوتی ہے پھر چینی امریکی دوستی تو دیانت داروں سے کھلا اور بھونڈا مذاق ہے ۔ وہ اصول و نظریہ جو چشم زدن میں اپنی ساری نقابیں اتار پھینکے ۔ وہ فن کار کے ایقان و ایمان کا معبود کیسے ہو سکتا ہے ؟ [illegible] عقیدہ کا [illegible] کیسے بن سکتا ہے اور اس عریاں فکر کی آنچ میں سارے سرخ سورج کالے پڑ گئے اور ساری سرخ صبحیں مرجھا گئیں ۔

پھر ایک فریب شکستگی ، گم کردہ راہی اور بے سمتی کا کرب اس کا مقدر ٹھہری ۔ جس میں گلیلو سے لے کر کوپرنکس تک کی سائنس اور عقل کی فرعونیت کی حشر سامانی ، مذہب کی اوہام شکستگی بادشاہت کی جمہوریت کے بدولت جلاوطنی اور جمہوریت کی امریکہ کے ہاتھوں بے توقیری ، زار شاہی سے لے کر اسٹالن کے انحطاط تک ٹوٹلی ٹیرین نظام کی کم شکستگی ، پھر خروشچیف کی بے سروسامانی ، ہنگری سے لے کر ویت نام تک کارفرما انسان کش سیاسی بازی گری اور چین امریکی دوستی سے لیکر اقوام متحدہ کے فیصلوں تک کے طلسم کے ٹوٹنے کے المیوں کی روح فرسا داستان پوشیدہ ہے ۔"

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے -
رستوں کے سب نشان اڑا لے گئی ہوا ـــــــــــــ بشر نواز

ان تلخ اور کرب ناک تجربات کے بعد ہر خارجی مقررہ اصول ، نظریہ ، عقیدہ ، نعرہ ، نشہ ، پیغام اور آدرش کا منگر ناقابل اعتماد اور ناقرار ٹھہرا ۔ فن کار کا عقیدہ اور کمٹمنٹ کا ان میں کوئی بھی مستحق نہیں ہے ۔ وہ کسی سے بھی وابستہ نہیں ہوگا ۔ وہ تو صرف اپنی فن کارانہ ذات ، اپنی عقل ، اپنی نظر ، اپنے حواس ، اپنے ادراک ، اپنے ضمیر ، اپنے خلوص اور اپنے تجربہ سے وابستہ ہوگا ۔ وہ ہر متعینہ نظریہ ، ہر [illegible] ہر سیاست ، ہر فلسفہ ، ہر اصول اور ہر سماجی ذمہ داری سے بلند ہے ۔ ان بالائی منزلوں پر اس سے کچھ بھی توقع [illegible] کو مجروح کرتا ہے ۔ اس کی شخصیت کو مسمار کر اس کو حقیر بناتا ہے ۔ وہ تو کارلائل [illegible] شوپنہار کا جینیئس ، [illegible] ارونند کا سپر مائنڈ ہے جو دل چاہے گا ۔ وہی لکھے گا ۔ وہ کسی کا پابند نہیں ہے بقول شمس الرحمٰن فاروقی [illegible] کا گناہ ہے ۔ جدیدیت کمٹمنٹ کو برداشت نہیں کر سکتی ہے ۔" اپنے ذاتی محسوسات اور انفرادی [illegible] اوپر یا باہر سے صادر احکام کے مانند سوہان روح ہوگا ۔

لیکن ہم نے قومی اور عالمی ادب کے آئینہ میں دیکھا کہ یہ دنیا جہان سے بیزار "احساس پسندی" [illegible] خارجی [illegible] سے گھبرا کر اپنی ذات کے اندر تعمیر خانقاہ کا [illegible] دوسرا نام ہے جو [illegible] احساس اور [illegible] کا عکس ہے۔ ایک نیا مفاہمت جو رویہ ایک انتہائی خود ذاتیت اور خود مرکزیت زدہ تصور اور ایک بیمار وہم اور [illegible] نام نہاد متصوفانہ زاویۂ نگاہ ہے جو اکثر و بیشتر تخریبی رجحان، مریضانہ دروں بینی، فرویت و لذت، سلبی موضوعیت اور [illegible] کلبیت سے عبارت ہے۔ انسانی تجربات اور محسوسات کے سرچشمے سے ایک دم کٹے ہوئے افرادی خود کو آنکھ سے اوجھل [illegible] ہوا سمجھتے ہوئے نظرئیے جن کے اندر بے رحم اور سفاک حقائق سے مفاہمت، بغاوت اور برسرپیکار رہنے کی جرأت ہی نہیں ہے ان کے ہاتھوں میں انفرادی احساس پرستی اور تجربہ زدگی کا یہ قابل رحم ہتھیار تھا جس سے وہ اپنی فن کارانہ ذات، محسوسات اور تجربات کے منفرد ہونے کے ضبط کا تحفظ کر رہے تھے۔ حالانکہ حقیقتاً یہ محسوسات بیشتر نہ کسی خصوصی کردار کے حامل تھے۔ اور نہ کسی پہلو سے اہم اور دقیع تھے۔ یہ انتہائی شخصی اور نجی اسرار کے حامل تھے۔ خود پسندی اور نرگسیت زدگی کے تحت یا ادبی مریض، زمان و مکان سے ماورا صرف (نفسیاتی نقطہ نظر سے) اپنے نابالیدہ دماغ اور ناتراشیدہ دل کے انتہائی نجی اور مبہم محسوسات کو انتہائی نئے اور جگ سے نرالے اور اچھوتے تجربہ ہونے کی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہو کر بڑے طمطراق سے پیش کر رہے تھے۔ اور بات بات پر انفرادی تجربات اور محسوسات کی صداقت اور خلوص کے بلند بانگ دعاوی بلند کرتے ہیں۔ اور اپنی قوت تمیز کو قطعاً مطلق تصور کرتے تھے۔ چونکہ انفرادیت پرست، مجبوطالحواس اور راندۂ درگاہ افراد اپنی شخصیت اور حسیت کو بالیدگی اور برنائی عطا کرنے والی خارجی سرچشموں کو حقیر ثابت کر کے خود کو ان سے عمداً کاٹ رہے تھے۔ اس لئے اپنے چکنے بکھرنے اور ختم ہونے کے احساس کو غیر معمولی دقیق، مبہم اور مجلسی [illegible] کی آڑ میں چھپاتے رہے۔ اپنے انفرادی شعری تجربات اور محسوسات کے عرش بریں تک دوسروں کی فکر کی رسائی نہ ہونے کی بے چارگی وہ غیر فطری بچکانی نرگسیت زدہ تسکین پاتے رہے اور اپنے شخصی اور فنی نجابت کے تحفظ کے لئے ہر سہولیت اور موقع کے مطابق نظریہ اور فلسفہ بدلتے رہے اور ہر نئی تخلیق یا تنقیدی کاوش میں خود کو صحیح اور حق بجانب ثابت کرتے رہے۔ عقیدہ اور کمٹمنٹ ان کے لئے (SELF JUSTIFICATION) سیلف جسٹی فیکیشن کا دوسرا نام رہ گیا ہے۔

آج کے بیزار منتشر فن کار کو شدت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نام نہاد کمٹمنٹ بھی کہیں غلط ہے۔ نتیجتاً کئی سوال از سر نو ابھرتے ہیں۔ آیا اس کو وابستہ ہونا چاہیئے یا نہیں ہونا چاہیئے؟ وہ صرف اپنی فن کارانہ ذات سے وابستہ ہوتا ہے یا اپنی ذات سے باہر کسی جماعت یا اقتدار یا صداقت یا قدر سے بھی۔ اگر وہ صرف اپنے سے وابستہ ہوتا ہے یعنی اپنے انفرادی محسوسات، جذبات اور تجربات سے تو بے محابا سوال اٹھتا ہے کہ اس کی جذباتی حسیت میں کن عناصر کی شمولیت ہوتی ہے کیا صرف اس کا احساس جمال یا اس کے ساتھ اس کا احساس انصاف احساس صداقت اور احساس خیر بھی کارفرما رہتا ہے؟ اگر وہ اپنی فن کارانہ ذات سے باہر بھی کسی سے وابستہ ہوتا ہے تو وہ با ہر والا کون ہے؟ آیا کوئی سیاسی پارٹی یا سماجی جماعت یا تہذیبی ادارہ یا اپنے وقت کا سربراہ مملکت یا ارباب سیاست یا اپنا ملک یا بین الاقوامی انسانیت یا موجودہ زمان و مکان کا دبا اور کچلا ہوا طبقہ۔ ان میں کوئی ایک یا سب اپنی اپنی سطح پر یا کوئی نہیں؟ آخر فن کار کی وابستگی اور ذمہ داری کس سے ہے؟ اگر کوئی ہے۔ وہ کیوں لکھے؟ کس کے لئے لکھے؟ عقیدہ بذات خود کیا کوئی [illegible] قدر ہے یا اس کا کوئی سہارا ہے۔ کیا اس ذہنی سہارے کا نام پرانی محولا بالا تجزیہ کردہ آدرشوں کو وہ اپنا عقیدہ [illegible]

[illegible] غیر سائنسی فرسودہ اور از کار رفتہ ہے یا اس مذکورہ بالا تشریح کردہ سائنسی نظریہ کی آمریت اور ادعائیت [illegible] دیتا ہے اور اس کو ہر نوعیت کے روحانی سہاروں سے محروم کر اس کی خود اعتمادی تک کو فنا کر دیتا ہے ۔ ایک [illegible] انفرادی صلاحیتوں اور فطری میلانوں کو بے محابا کچلتا ہے ۔ یا اوپر تذکرہ کردہ اس غیر ذمہ دار، مفاہمت [illegible]، مفاد پرست، ریاکار، ابن الوقت، شترِ بے مہار ذات کو جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے اپنی غیر بالیدہ اور ناتراشیدہ انا [illegible] سب سے بالا اور اہم سمجھتا ہے اور اس کی برملا اعلان کرتا ہے ۔ ؟ یا صرف اس سہل پسند قاری کو جو فنی کاوش کو انسانی [illegible] ثروت کو فرصت کے لمحات کی محض ذہنی تفریح تصور کرتا ہے ؟ ایسے کتنے ہی اہم اور پیچیدہ استفسارات ہیں جن کی بابت ابھی ہم ذرا اور سنجیدگی اور گہرائی سے غور و فکر کریں گے ۔ لیکن میرے خیال سے یہ سوال کسی سطح پر کچھ اس طرح کے بھی سوال [illegible] ہیں جیسے ہم کبھی کبھی تفریحاً بچوں سے دریافت کرتے ہیں ۔ تم کس کو زیادہ پیار کرتے ہو ۔ ابی کو یا امی کو ۔ تم کو کافی زیادہ پسند ہے یا چائے ۔

دوسرے تمام آدمیوں کے مانند فن کار بھی ایک ذی روح ہے ۔ دوسرے تمام لوگوں کی طرح وہ بھی زندہ اور بیدار حواس [illegible] اور پردہ نشیں جبلتوں کا امین ہے ۔ اس کو بھی انہیں کے مانند بھوک اور پیاس کی آنچ مضطرب کرتی ہے ۔ اس کو بھی کسی بات پر [illegible] کسی بات پر فلک شگاف قہقہہ اور کسی بات پر رحم انگیز رونا آتا ہے ۔ کمال ہے کہ یہ سب کہنے کی ضرورت پڑ رہی ہے [illegible] کہ کچھ خود پسند افراد نے اس کی ایسی رومانوی اور مافوق الفطری تصویر بنا رکھی ہے ۔ جس کا عام گوشت و پوست کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے آدمی سے جیسے کوئی مماثلت ہی نہ ہو ۔ وہ کسی دوسری دنیا کا مخلوق ہو ۔ اس سے عجیب عجیب باتیں اور عجیب عجیب توقعات وابستہ کر لی جاتی ہے ۔ بشر نواز اس رومانوی رویہ کے خلاف احتجاج کناں ہیں ۔

- انہیں میں یوں نہیں کہتا / یہ دنیا جہنم ہے اور ہم سب اس کا ایندھن ہیں
نہیں یوں بھی نہیں کہتا / کہ ہم جنت کے باسی ہیں

مجھے کہنا ہے / ہم سب اپنی دھرتی کی
برائی اور بھلائی ، سختیوں اور نرمیوں ، اچھائیوں کوتاہیوں ، ہر رنگ ، ہر پہلو
کے مظہر ہیں
ہمیں انسان کے مانند / خیر و شر ، محبت اور نفرت اور دوستی کے ساتھ جینا ہے
اسی دھرتی کے گھٹ مٹ جانے پہچانے مزے کا جام پینا ہے ۔
مجھے بس اتنا کہنا ہے
کہ ہم کو آسمان اور خلاؤں کی کوئی مخلوق مت سمجھو

اگر فن کار کے اعمال و افعال کا جائزہ بھی ایک عام آدمی کے سطح کے آئینہ میں پایا جائے تو وہ بھی اپنے دور اپنے ماحول اور اپنے [illegible] سماج سے ایسے ہی الجھا ہوا نظر آئے گا ۔ جیسے اس کے دوسرے ہم عصر عام آدمی ہیں ۔ وہ بھی دوسرے تمام لوگوں کے مانند اپنے

[illegible] انسانوں کے مابین رہتا ہے اور وہی سب ظلم و ستم، غم و نشاط اور رنج و کرب کو برداشت کرتا ہے جو کہ دوسرے [illegible] مقدر ہے۔ ان تمام باتوں سے اس کے نت نئے تجربات کی تشکیل ہوتی ہے۔ جو زیادہ [illegible] اس کے ادب میں [illegible] کی صدائے بازگشت جب قاری کے دل میں ہوتی ہے۔ تو اس کو محسوس ہوتا ہے گویا کوئی [illegible] کے دل کی ہی بات کہہ رہا ہے ایسی بات جس کا احساس تو اس کو بھی ہوتا تھا۔ لیکن جس کے حسن اظہار کے لئے اس کے پاس موزوں اور مناسب الفاظ نا یاب تھے۔ صرف اتنی ہی سی تو ادب کی معجزہ نمائی ہے جو بیک وقت حیرت انگیز نشاط اور عرفان دونوں کی ہی پروردگار ہے۔ ایسا نہ ہو تو کوئی افسانہ یا نظم تخلیق کر کے شائع کرنے کی زحمت کیوں کرے اور دوسرا آدمی اسے کو پڑھنے کا کیوں درد سر مول لے۔ وہ اپنی مسرت و بصیرت میں مزید اضافہ کے لئے ہی کسی اس ذہنی مہم پر آمادہ ہوتا ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی قطعاً نہیں ہے کہ ادیب اور قاری میں کوئی تفاوت ہی نہیں ہے۔ یقیناً ان میں تفاوت ہے سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ ایک کے محسوسات، جذبات اور تجربات گونگے ہوتے ہیں دوسرے کے پاس اس کے بھرپور اظہار کے لئے زبان و بیان کے ہزاروں نازک اور لطیف وسائل ہیں۔ ایک کا دل عدم اظہار کی بے بسی سے کڑھتا ہے۔ وہ ہزار تمناؤں کے بعد بھی کچھ کہہ نہیں پاتا۔ دوسرا اس کو کچھ اس شان دلربائی سے کہتا ہے کہ اس کی ہر بات حرز جاں بن جاتی ہے۔ انہیں معنوں میں فن کار دوسرے عام آدمی کے مقابلہ میں منفرد اور ممتاز ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایک خاص وہبی صلاحیت ہے جس کی پرورش وہ اپنے خون جگر سے کرتا ہے۔ اور جس کے نوائے سینہ تاب سے دوسرا محروم ہے اور یہ فطری صلاحیت محض زبان و بیان کی رعنائی کی [illegible] نت ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ فن کار زیادہ بصیرت انگیز شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ دوسرے آدمی کی نگاہ جہاں کچھ بالائی باتوں میں الجھ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ فن کار کی جرأت انگیز، دوررس اور نکتہ شناس ان کی تہہ میں رسائی حاصل کرتی ہے۔ اور تہہ نشیں راز کی عارف ہوتی ہے۔ دوسرا آدمی جہاں اشیا، و حقائق اور واقعات و مظاہر کو علٰحدہ علٰحدہ اکائیوں میں دیکھنے کا خوگر ہوتا ہے۔ فن کار انہیں ان کے اندرونی رشتوں میں بھی دیکھ سکنے کا اہل ہوتا ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ اس کے پاس وہ غیر معمولی تخلیقی ذہانت ہوتی ہے۔ جو اس کے نادرہ کار احساس و تجربہ کے خام مواد کو اس کے موزوں ترین پیکر میں ڈھالنے پر قادر ہوتی ہے۔ جس میں اس خصوصی فن کارانہ تجربہ کی لطیف ترین، عمیق ترین اور نفیس ترین شناخت پوشیدہ ہوتی ہے جس کی کبھی کبھی تو صفحہ قرطاس تک آتے آتے ہی مکمل قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ اور فن کار خود انگشت بدنداں رہ جاتا ہے لیکن تو اسے تامل کے بعد بے اختیار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات صرف اسی ہیئت، انہیں الفاظ، اسی آہنگ اور اسی طرح کہی جانی چاہئے تھی۔ ورنہ اس کا سحر فنا ہو جاتا۔

لیکن فن کار کے دل و دماغ کی یہ تینوں خاص صلاحیتیں جنہیں ہم ایک میں جوڑ کر اس کی تخلیقی ذہانت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے ادبی کام سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی زندگی کی حقیقی صورتحال سے نہیں۔ وہاں پر وہ بھی اسی عام سطح پر کھڑا ہوتا ہے جہاں دوسرے تمام افراد کھڑے ہیں اور اب اس بات پر مزید تاکید کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

یہ تمام انسانی سطح وہی ہے جہاں پر وہ فرد بھی ہے اور [illegible] کا زندہ اور [illegible] کتا ہوا حصہ بھی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور نہ ان کے درمیان حد فاصل کھینچا تھا۔ سب ہے۔ فن کار اور اس کے تخلیقی عمل کی رومانوی تعریف سے ہی ایسی خیالی دیواریں نکلتی ہیں اور نہ صرف قومی ادب بلکہ عالمی ادب کی تواریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ زیر بحث زمان و مکان میں آدمی جو

[illegible] ۔ اس کا مگر یہ خاص جمالیاتی نظریہ اکثر اس بحرانی دور میں رونما ہوتا ہے جب معاشرہ کسی بھی نوعیت کے اپنے اعلیٰ اخلاقیات سے روگرداں ہو کر بھٹکنے، ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا ہے جب معاشرتی زندگی میں ایسی کوئی [illegible] فعلیت معقولیت کی رمق باقی نہیں رہتی جو کسی اقدار کی حامل ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ سمیٹ کر ایک بہتر جرأت و حوصلہ کے ساتھ ایک ایسی راہ پر گامزن ہو جو محض دنیاوی کامرانی کا جویا نہ ہو بلکہ سب سے پہلے کسی نئے شعور و اقدار کو زندگی کے رگ و پے میں سرایت کرنے کا خواہاں ہو۔ ٹھیک وہی زبوں حالت جو آج اس ملک میں رونما ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی کارفرما ہے۔ اسے ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ اقتدار کے لیے سماج دشمن رجحانات (جن کے نزدیک کسی بھی نوعیت کی سماجی وابستگی زہر کے مانند مہلک ہے) کسی ملک کی جنگ آزادی یا انقلابی جد و جہد کے دوران نہیں نمودار ہوتے بلکہ آزادی کے ملنے کے بعد نئے ملکی حکمرانوں کی تخت نشینی کے دور میں رونما ہوتے ہیں جب آزادی کے حصول کے بنیادی اغراض و مقاصد کی خلاف ورزی کر عوام الناس کے بے پایاں اعتماد کو کاری ضرب لگائی جاتی ہے۔ اور ملک کے عوام کی قوت ارادی اور مستقل مزاجی تھوڑی دیر کے لیے ٹوٹ جاتی ہے اور سماج نئے جد و جہد کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا اور زیادہ سے زیادہ برسر اقتدار لوگ بدکردار بلکہ ایک ہی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگتے ہیں ٹھیک وہی بات جو آج ہمارے ملک میں ہو رہی ہے۔ حصول آزادی اور تقسیم ہند کے بعد پرانے حسین و زریں، خوابوں، آدرشوں، قدروں، معیاروں، نعروں اور نقشوں کا طلسم جس طرح ٹوٹ گیا ہے وہ ایک ایسی سفاک حقیقت ہے جس کی نظر اندازی میں کوئی سیاسی مصلحت پرستی ہی کارفرما ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی بیدار مغز اور باشعور فن کار کو اس بڑے شکست خواب کے المیہ کے شدید احساس سے نہیں بچایا جا سکتا۔ اس روح فرسا اعتماد شکنی اور فریب شکستگی کے کرب کے عرفان کے بغیر نہ تو نئے فن کار کے غم و غصہ، کرب و بغاوت، ہر نوعیت کی ذمہ داری سے روگردانی سے اور رستگاری اور بے پایاں اضطراب و التہاب کو سمجھنا ممکن ہو گا۔ اور نہ اس کے اس غیر معمولی شعلہ آسا احساس دل و دماغ کی گہری بے چینی کو جو کسی بھی اخلاقیات، فلسفہ، نظریہ، آدرش کی عینک اور پردے کے بغیر موجودہ کربناک اور بے ہنگم حقائق کو جوں کا توں فنی ذکاوت کے ساتھ تاثر آگیں انداز میں رکھ دینے کی خواستگار ہے۔ ہر جگہ سے جلا، ٹوٹا، بکھرا، کانپتا، تنہا اور ناامید فن کار فقط آج سوچتا ہے۔ وہ کسی مستقبل اور ماضی سے وابستہ نہیں ہے۔ موجودہ اردو ادب میں ایک بھی تاریخی یا پورا پیانی تخلیق کا نہ ہونا یہی ثابت کرتا ہے کہ فن کار کے سامنے نہ کوئی ماضی ہے اور نہ مستقبل ہے۔ اس کے سامنے تو محض حال کی ہلاکتیں ہیں جو اس کے شعور و احساس کا دکھتا ہوا حصہ ہے۔ وہ انتشار آگیں اہرمن زدہ سڑا گلا پر عفونت ماحول ہے جو بےحد سفاک حالات اور فریب شکستہ، ٹوٹے پھوٹے، یاسیت زدہ آدمی کی گہری روحانی ہم آہنگی اور اتحاد کا نتیجہ ہے جو بیک وقت ایک ناقابل تقسیم رشتہ بھی ہے اور ایک ناگزیر سیاق اور دونوں ایک دوسرے کی تعمیر میں مساوی طور پر کہیں ذمہ دار بھی ہے۔ اس آتش زیر پا فن کار کو نہ باہر سے ادھار لیا ہوا۔ درد پھوٹی آنکھ بھاتا ہے اور نہ اندر سے کھینچ کر نکالا گیا انبساط، اس کے تجربہ کی رو سے دونوں غلط ہے۔ کیوں کہ اول الذکر اس کو ذاتی تجربات اور محسوسات کی صداقت اور خلوص سے کاٹ دیتا ہے۔ جو اس کی شخصیت، ضمیر، حواس اور ادراک کے انکار کے مترادف ہے تو مؤخر الذکر غیر شخصی معروضیت اور ثنویت سے دور لے جاتا ہے مستعار درد و مسرت اس کے فکر و فن کے موضوع ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کا فنی موضوع تو آج کے آدمی اور حالات کی وہ گہری کرب ناک ہم آہنگی ہے۔ ماحول کا وہ پھیلا، بو کا اور محسوس کیا ہوا لمحہ ہے۔ جو آج کی بے رحم حقیقت ہے۔ بالکل اپنا ہے

رات ہیں پھر شب پا کے جانے کیا کریں گے
صورت ہم بکھرے ہیں دن کا سورج ڈھلے ——————— پرکاش فکری

شب سنگ ہے ۔ دن آئینہ ۔ ——————— عبداللہ کمال (آئینہ)

بیشتر حضرت شاعر باقر مہدی کو بھی شب و روز کے حالات کی اس سنگینی کا عرفان ہے ۔ ان کو یہ ڈلیما مختلف سوالات کے بیچ پہنچا دیتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا بھی احساس برابر کا ذمہ دار رہتا ہے کہ ان کے پاس کوئی واضح جواب نہیں ہے

میرے پاس سوالوں کے تیز نکیلے نشتر ہیں
اور بھلا کیا ہے
ہر لحظہ ڈلیما مجھ میں چھپ کر
میرے ساتھ رہا کرتا ہے
میری نظمیں عکس ہیں اس کا
لرزاں لرزاں دھندلا دھندلا
شاید کچھ کچھ بے معنی سا

قاضی سلیم کو اپنی تمام تلخی اور معصومیت کے ساتھ زندگی کے جہنم زار ہونے کا شدید احساس ہے ۔ لیکن وہ اس سے روگردانی کے قائل نہیں ہیں ۔

ہزاروں کائناتیں ٹوٹتی بنتی ہیں ہر لحظہ ۔
تناور پیڑ گرتے ہیں
چٹانیں ریزہ ریزہ ہو کے نس نس میں کھٹکتی ہیں
دریچے پے بہ پے برسات کے حملوں سے اندھے ہیں ۔
فضا گونگی ہے بہری ہے ۔
چلو یہ زندگی اور موت دونوں آج سے میرے نہیں ہیں
چلو میں بھی تماشائی ہوں خود اپنے جہنم کا
میری دنیا تماشہ ہے ۔
میں اپنے سامنے خود کو
تڑپتا سر پٹکتا دیکھ سکتا ہوں
اور ایسا مطمئن ہوں آج جیسے یہ جہنم مجھ کو

ابھی کچھ دیر پہلے ہی رِلا ہے -
اور کسی اَن جانی دنیا سے
برستے بادلوں کے ساتھ آیا ہوں

"نجات" کا ایک حصہ ــــ قاضی سلیم)

محمد علوی بھی ہر نوعیت کے انا کے سحر سے مقاومت کے لیے تیار ہیں
ننھی منی چڑیاں نے
توپ کے دہانے میں
گھونسلہ بنا لیا ہے ــــــــــــ محمد علوی)

نئی نسل کے چند اور شاعروں کے اشعار دیکھئے جس میں موجودہ حالات سے عہدہ برآئی اور زندگی سے آنکھ ملانے اور اس کو سمجھنے
اب آرزو کر دینے والی محسوس ہوتی ہے جو زندہ رہنے اور زندگی کو پہچاننے کا حوصلہ رکھنے والوں کی پہچان بنجاتی ہے

وقت بے رحم ہے لمحوں کو کچل جائے گا
دن کو رو کو کہ ہیولے میں بدل جائیگا (شاذ تمکنت)

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امیں
کوئی سمجھے بساط لمحہ کیا (بشیر بدر)

میں دن ہوں میری جبیں پر دکھوں کا سورج ہے
دیئے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں (بشیر بدر)

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سرخ سرخ پھولوں میں جب مسکاؤں گا (بشیر بدر)

یہ کیسے دور کا سقراط بن کے جینا تھا
بجائے زہر مجھے گالیوں کو پینا تھا
اکھاڑ لے گئے مالیوں سے کھیلنے والے
ہزاروں سال کا گاڑا ہوا دفینہ تھا ــــــــــــ مظہر امام

پربتوں، چٹانوں میں، پرسکون جزیروں کے خواب ڈھونڈتے ہیں لوگ
پاش پاش نیندوں کی، ڈولتی پھوٹی گاڑی پر، خود کو ڈھو رہے ہیں لوگ
مشعل ہواؤں کے بازو، نکلی ہیں زبانیں بھی، یہ سفر ہے صحرا کا
زادِ راہ کچھ دانے، خالی خول مشکیزے، پیاسے قافلے ہیں لوگ ——— نصر [illegible]

پیاس کے [illegible]
سے کاندھوں پہ [illegible]

پاؤں جب سمٹے تو رستے بھی ہو گئے چھوٹے
بوریاں جب تہ کیا دنیا اٹھا کر لے گئے ——— شہاب جعفری

بازو جدا ہوئے تو ملی تیغِ بے نیام!
اور انگلیاں جو تراشیں تو لوح و قلم لئے ——— عبداللہ کمال

چھلکتا جام ہوں، پھر بھی ہوں پیاسا
میں اپنے آپ میں اک کربلا ہوں! ——— عبداللہ کمال

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں!
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں ——— سلیم احمد

شاید کبھی اجالوں کے اونچے درخت ہوں
صدیوں سے آنسوؤں کی چمک بو رہے ہیں ہم۔ ——— ندا فاضلی

ریت میں پیاس کے دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں ہی میں دریا ہوگا ——— عزیز قیسی

ایک رات ہم ایسے بے جب دھیان میں سائے نہ ہوں!
جسموں کی اس سم درد میں عدو حزن کے مسئلے نہ ہوں! ——— شاہد فاروقی

اس کی [illegible] ہوتی ہے۔

پتنگ [illegible] آسمان پر یہاں وہاں بل کھاتی ہوئی اڑتی ہے۔ کبھی مستانہ وار جھکتی ہے تو کبھی جوش میں آ کر دیوانہ وار اوپر چڑھتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ لیکن [illegible] اس وقت تک خود سے زمین پر نہیں آتی جب تک اس کی ڈور کسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ نہایت استواری سے زمین پر پیر جمائے کھڑا رہتا ہے۔ یہ ڈور نہ ہو تو پتنگ نہ جانے کس گھاٹ لگے اور اس سے بھی پہلے ڈور کے بغیر وہ آسمان پر کیسے [illegible]؟ اسی ڈور کے سہارے تو وہ زمین سے آسمان پر جاتی ہے۔ طرح طرح کے کھیل کرتی ہے۔ پیچ لڑاتی ہے۔ کبھی کاٹتی ہے۔ کبھی کٹتی ہے اور بچی رہ گئی تو غروب آفتاب کے وقت آسمان سے زمین پر اتر آتی ہے۔

فن کار کا تخلیقی عمل بھی کچھ ویسا ہی ہے۔ وہ زمین پر نہایت استواری سے قدم جمائے اپنی اسی وابستگی کے ڈور سے زمین اور آسمان کو ایک کئے رہتا ہے۔ پتنگ کی تمثیل اپنے دونوں ہی معنوں میں اس کے تخلیقی عمل پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ ایک تو اپنی اس وابستگی کی ڈور سے بندھا رہنے کے سبب اس کا تخلیقی عمل طرح طرح کے تھپیڑوں میں پڑ کر (جن سے میری مراد زندگی کے نشاط و غم سے بھی ہے اور نری اور [illegible] مسائل سے بھی ہے) بہکنے اور بھٹکنے نہیں پاتا اور اگر کبھی کچھ گم گشتگی آتی بھی ہے تاہم جلد ہی اس کو اپنا صحیح راستہ مل جاتا ہے۔ دوسرے یہی وابستگی تخلیقی عمل کی تحریک بھی ہوتی ہے۔

پہلی بات کی بات شاید زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کہیں پر کسی سے وابستہ نہیں ہے۔ اس کے بھٹکنے یا [illegible] کا اس شخص کے مقابلہ میں کہیں زیادہ امکان ہے۔ جو وابستہ ہے۔ کمٹمنٹ بھی ایک طرح کی وابستگی ہی ہے۔ لیکن جس طرح سب پابندی تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ بلکہ کتنی ہی بندش کو آدمی قبول کرتا ہے۔ اور ان میں راحت پاتا ہے۔ اسی طرح وابستگی جہاں اوپر یا باہر سے مسلط کردہ پابندی کی حامل نہیں ہے بلکہ اپنی مرضی سے قبول کردہ بندش ہے تو وہ روحانی طور پر اذیت ناک نہیں ہوتی بلکہ اس کے برخلاف مسرت بخش ہوتی ہے۔ اوپر سے عائد کردہ پابندی خواہ کیسی بھی ہو۔ کسی بھی سیاسی یا سماجی یا مذہبی ادارہ یا اقتدار کی رہین منت ہو۔ اس سے انسانی روح کلیے محاباً قتل ہوتا ہے۔ ظاہری طور پر ہو یا اندرونی طور پر، جلد ہو یا بدیر ——— غرضیکہ ہوتا ضرور ہے اور ایسی تمام بالائی پابندیوں اور بندشوں کو بے محابا توڑ کر ان کی بے باکانہ مقاومت کر ان کے خلاف علانیہ برسرپیکار ہو کر ہی ادب حقیقی روپ میں زندہ رہ سکتا ہے۔ اسی میں اس کی معنویت اور اہمیت نہاں ہوتی ہے۔

اسی مقام پر ایک خاص طرز فکر کے حامل فن کار اوپر یا باہر سے مسلط کردہ پابندی اور حسب منشا خواہ وابستگی کے تفاوت کو نہ سمجھ کر یکسر محض وابستگی سے ہی [illegible] رستگاری میں اپنی نجات کے متلاشی ہوتے ہیں اور گم راہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس دنیا میں [illegible] کی کوئی نجات ہے ہی نہیں وہ تو اوپر سے اوڑھی اور لادی ہوئی مفروضہ نجات ہے اور جس طرح اوپر سے مسلط کردہ وابستگی، روح کی صداقت کا جھٹکا کر زندگی کی صداقت کے قتل کا ارتکاب کرتی ہے۔ بعینہ یہ اوپر سے اوڑھی اور لادی ہوئی نجات بھی، زندگی کی صداقت کا قتل کر روحانی صداقت کا بے محابا دم گھونٹ دیتی ہے۔ درحقیقت زندگی کی صداقت دنیاوی پابندیوں کے مابین پائی جانے والی نجات میں ہے۔ ان پابندیوں کو جھٹلا دینے والی نجات میں نہیں۔

اس کا مطلب یہ بھی قطعاً نہیں ہے کہ ہم مابعد الطبیعاتی اور روحانی حقائق کو، فکر عقبیٰ کو، ترک دنیا اور روحانی نجات کی ذاتی ریاضت کی اہمیت کو کم [illegible] کرنے کی خواست گار ہیں۔ ہم تو صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ادب کا دائرہ کار نہیں ہے۔ اگر کچھ لوگوں کا [illegible] جولان گاہ ہو تو ہمیں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ ان کی افتاد طبع کا معاملہ ہے لیکن ان کا مخصوص زاویہ نگاہ بیشتر

غیر یقینی کردار کا حامل ہوتا ہے۔ جب کہ ادب کا مقصد انفرادیت کا امین ہوتا ہے۔ ہر نوعیت کے گریز، فرار اور مفاہمت کے
باوجود تفاوت اس کی روح ہوتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ احساس یا منظر کی خود فریبی ہے جب وہ کہتا ہے کہ وہ تمام پابندیوں
سے آزاد ہو کر رہے گا۔ کس کس پابندی سے رستگاری حاصل کرے گا؟ بھوک اور پیاس سے، مرنے اور جینے سے، بیماری اور
دکھ سے، سماجی رشتوں سے جو انجانے ہی دو اشخاص کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیتے ہیں؟ رشتہ بھی پابندی ہے۔
محبت بھی پابندی ہے۔ پابندیاں تو زندہ رہتے ہوئے کسی طرح ختم ہونے کی صورت نہیں ہے۔ اچھی پابندی ہی اچھی آزادی کی
امین ہوتی ہے لیکن وہ بے چارہ بیگانگی کا پرستار فن کار سوچتا ہے۔ اور بڑے خود غلط زعم میں کہتا ہے کہ وہ تو آزاد فطرت کے مانند
آزاد ہو کر رہے گا۔ ہم نہیں واقف کہ کائنات میں کیا ہے جسے ہم تمہاری بوہیمین معنوں میں قطعاً آزاد ہے۔ فطرت پرست
اس لاابالی شاعر کے خواب و خیال [illegible] مشق متعین نہ ہو لیکن سورج اپنے مقررہ وقت پر طلوع ہوتا ہے اور متعینہ وقت پر
غروب ہوتا ہے۔ وہ گھڑی کا [illegible] یا اخبار والا بھی وقت کا اتنا پابند نہیں ہوتا ہے۔ یہی حال
چاند کا ہے۔ ستاروں کے جوار بھاٹے سب متعین ہیں۔ ہزاروں برس کے سورج گرہن اور چاند گرہن کی تاریخ اور وقت کی نشاندہی کرنے والی
تقویم ڈھونڈنے سے مل جائیں گے۔ اپنے محدود علم اور سائنس کے زعم میں آدمی جس قدر بے ہودگیاں کر رہا ہے اس کے سبب بارش
کا نظام ذرا تھوڑا سا گڑبڑا گیا ہے۔ لیکن تو بھی بہت نہیں۔ ہم پنجابی واقف ہیں کہ بیس جون تک مان سون آ ہی پہنچے گی۔ ان
بڑی بڑی چیزوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی سب متعین ہیں جیسے آم گرمی میں ہوتا ہے۔ اور امرود جاڑے میں۔ کہنے
مطلب یہ ہے کہ تمام نظام شمسی اور اسی طرح کے اور بھی جانے کتنے لاتعداد آفتاب شمسی سلسلے ثوابت اور سیارے سب اپنے وجود
کے اور ایک دوسرے کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور کائنات کا تحفظ و بقا بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ کہیں پر ذرا سا بھی خلل
اندازی بھی واقع ہو جائے تو قیامت برپا ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسی کوئی مخل اندازی نہیں ہوگی اور اگر قیامت
ہوگی تو فطرت کے قہر سے نہیں بلکہ آدمی کی اپنی بے ہودگی سے ہوگی۔ فطرت کے آئین سے زیادہ سخت تو کوئی قوانین ہی نہیں ہے۔ جس کی خلل
اندازی کی عبرتناک سزا ملتی ہے۔ یہ رومانوی مکمل آزادی، بیگانگی اور نجات انسانی معاشرہ کی تو بات ہی چھوڑیئے۔ فطرت میں
بھی کہیں دکھائی نہیں پڑتی۔ وہ ایک نئے رومانوی مزاج کے حامل برگشتہ خاطر فن کار کا محض خواب و خیال ہے بیمار واہمہ ہے اور
خود فریبی اور خواب بیداری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو ساون کے اندھے کے مانند سب کو اپنے ہی رنگ میں دیکھنے کی خواہش کا رہے
البتہ ایک بات ضرور ہے کہ فطرت کے سب قوانین کو توڑ کے خود کو تباہ اور برباد کر لینے کی آزادی فطرت میں ضرور بھرپور رکھی ہے
وہ آزادی تو انسانی معاشرہ میں بھی ہے۔ فطرت میں اور بھی زیادہ ہے کیوں کہ اس کے آئین انسانی معاشرہ کے قوانین
سے زیادہ غیر شخصی اور معروضی ہیں۔

شاعر و ادیب کے اپنے کو تباہ اور برباد کر لینے کی بات محض حسن مبالغہ پر مبنی نہیں ہے۔ ادب کی تاریخ میں ایسے سرگشتہ فنکاروں
(نثر نگاروں کی کم شاعروں کی زیادہ) کی مثالیں دستیاب ہوتی ہے۔ جہاں انہوں نے اپنی اس مکمل آزادی کے خبط میں پڑ کر
اپنے کو گولی مار لی ہے یا زہر کھا کر سو گئے ہیں یا بے حساب عورت خوری، جنس پرستی اور منشیات پسندی کا عمداً شکار ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیت
سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور تھوڑا بہت لکھ کر تخلیقی طور پر قبل از وقت رحلت فرما گئے ہیں۔ دونوں ہی حالتوں میں بات ایک ہی ہوتی
ہے۔ فن کار اپنے تخلیقی امکانات کو صحیح معنوں میں حاصل نہیں کر سکا۔ اور بیچ میں بکھر گیا۔ ایسی بہت ساری عبرتناک مثالیں آج

منصور [illegible]

جدید غزل میں خوف اور تحیر زائی

آج کی داخلی اور خارجی زندگی کے عدم توازن، سماجی استحصال، سیاست فریب، اقتصادی کرپشن اور روح و جسم کے ضروری لوازمات کے فقدان نے مابعد الطبیعاتی نظریات اور جدید سائنس کے درمیان منافقت کی راہیں مشکوک کر دی ہیں۔ یہ موجودہ خطرناک حد تک ذہین نئی نسل جسے شاعری کی زبان میں نامراد نسل کہا جاتا ہے حقیقی طور پر کسی دشت نامرادی میں جنم لینے کی مرتکب نہیں بلکہ ہوا یہ کہ اس نے گرد و پیش اور زمان و مکان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ نئی باشعور نسل عجیب الخلقتی فردوس اوہام میں گم نہیں تھی بلکہ دھیرے دھیرے خود اپنی شخصیت کو اپنے ہاتھوں کچلنے پر مجبور دیکھ کر اسے اپنے وجود کی ضرورت کا احساس نہ ہو سکا اسے اپنی زندگی کیڑوں مکوڑوں کے سماجی نظام سے بھی زیادہ غیر منطقی اور حقیر تر احساس رائیگاں کی پروردہ دکھائی دینے لگی۔ شناوروں کی کمی نہ تھی مگر پایاب دریا میں ہاتھ پاؤں مارتے جسم ہی شل نہیں ہوئے ذہن کے وہ سوتے جنھوں نے غالب، اقبال اور شکسپیر کے الہامیت انگیز فلسفوں کو برآمد کیا تھا وہ بھی جبلی ہوس کے ریگ سیاہ میں غبار بن کر دفن ہو گئے۔ آندھیاں بھی آئیں مگر سادہ آندھیاں نہیں آئیں انھوں نے اس ریگ مردہ کی طرف نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا جو ایک جھونکے میں زندہ ہو سکتی تھی۔ دانش وروں کے تصادم فلسفے روحانیات کے مقدس مسیحاؤں کے ہاتھوں میں آب زمزم سے لبریز پیالے ٹوٹی پرچھائیوں کی طرح اپنے اندر ہی ڈھیر ہو گئے۔

تسخیر فطرت اور تسخیر کائنات کی تمام تر ارضی فتوحات کے باوجود آج بھی ہر انسان کے اندر ایک چور، ایک بدطینت ایک پیدائشی مجرم خندہ زیر لب سے پورے سماج کی اخلاقی اور روحانی قدروں کے فاتحانہ احساس کو چیلنج کرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

"کائنات کے مسخر ساحرو! تم نے ساری
دنیا کو تو جیت لیا مگر خود کو اپنے ادنیٰ
ترین لمس سے بھی آشنا نہ کرا سکے۔"

سائنسی بصیرت اور فن کارانہ افق کے مطابق میں جدید شاعری وجود میں آئی جس کا کوئی آبائی وطن نہ تھا بلکہ وطن کے نو آبادیاتی وجود کا کوئی مذہب نہ تھا۔ کوئی خدا نہ تھا مادہ پرستی اور ترقی پرستی کے مابین اس شاعری کا۔ اس شاعری کے خالق کا جائز یا ناجائز طور پر جنم ہوا تھا۔ اس لیے اسے کوئی آبائی ترکہ نہ ملا۔ کیونکہ خانقاہوں، صومعوں اور دربارعن کی الف لیلوی داستان میں اس عہد کی [illegible]

[illegible] ایک [illegible] سے نیلو ہے
[illegible] کا آزار کھینچ لے

شام تنہائی کے ان بانجھ سناٹوں میں
سائے رہ جائیں گے دیواروں پہ پرچھائیں گے

——— شاد نوحی ———

راقم الحروف کو اپنے بارے میں کچھ کہنا نہیں اس
مصور سبزواری کے بارے ضرور شکایت کرنی
ہے جسے میں نے رومان اور محبت کی زنجیروں میں باندھا
تھا مگر وہ مکڑی کے جالوں کی طرح ان کمزور رشتوں کو
توڑ کر خود تجسس کے بیکراں دشت میں ایک دن اتر گیا
اور میرا خالی جسم اس کی راہ دیکھتا رہا۔ میں جانتا ہوں
کہ وہ اب کبھی نہ لوٹے گا .... کیونکہ اس کے رشتے
خوفناک اور اجاڑ مناظر کی پیکر تراشی سے اس قدر
استوار ہو چکے ہیں کہ اب وہ کسی 'آسیب شام' ہی کی
صورت میں واپس لوٹے گا۔ میرے پاس اب اس کے
ان بصورت اور خشک اشعار کے علاوہ اور کچھ بھی
نہیں بچا ہے۔

نہ کھینچی تھی ہمیں سطحِ آب کی چادر
کبھی کا گھات میں بیٹھا بھنور نکل آیا
سکوت تہ سے ڈر کر جو ماری چیخ اس نے
تو اک کٹا ہوا دریا سے سر نکل آیا

چلا بھی آ یونہی بجلی کے ننگے تاروں تک
یہاں میں حادثہ تو تری تلاش میں ہوں
مرے وجود کی ہر موت سے ڈرا کیوں لا
میں اب بھی زندہ دریدہ گلو کی لاش میں ہوں

یک بیک سائے سمٹنے لگے دیواروں کے
جانے کیا آ گیا زینے سے اتر کے اندر
اب ایک پل میں وہ آسیب سامنے ہوگا
کواڑ ٹوٹ چکے ہیں ہوا سے لڑتے ہوئے

آہستہ کسی قبرِ دریدہ سے گزر جا
ایسا نہ ہو اک ہاتھ نکل کر تجھے چھو لے

میں خوشبوؤں کی لاش جسے پی گئی ہوا
تو میری اوپر اوپر جکڑنے کو رہ گیا

دودِ آسیب سا جامد ہے بکھرتا ہے کہاں
سانس روکے ہوئے رہتا ہے وہ مرتا ہے کہاں

منظر ہوئے ڈراؤنے سب آس پاس کے
لرزاں غبارِ شب میں ہیں پتے ہراس کے
پردوں کی سرسراہٹیں چہروں میں ڈھل گئیں
پتھر چیخ رہے ہیں فصیلِ حواس کے

فرازِ کوہِ ندا سے لے کر ہجومِ دیوارِ قہقہہ تک
تمام عفریت کا راں ہیں کہ اسمِ اعظم چلا گیا ہے

——— مصور سبزواری ———

مندرجہ بالا حوالہ جات سے کئی باتیں واضح ہوتی
ہیں ایک تو یہ کہ ان اشعار میں تشکیک کا نیا پہلو ہے۔ یہ
قدیم تشکیک کی طرح خدا اور آسمانوں کی زمین والوں پر
حکومت بیجا کے بارے میں نہیں ہے بلکہ یہ اقتصادی جبریت
تاریخی جبریت اور تہذیبی جبریت کا غضب ناک ردعمل ہے

[illegible]نسان کی خود کیفیتی کے خلاف ایک جہد ہے۔ بظاہر [illegible] شاعر نے زیادہ تر اپنے آپ سے لڑی ہے، کیونکہ وہ اپنے لئے بھی قابل اعتبار نہیں رہا مگر حقیقی طور پر ان منفی آسیبی قوتوں کے مقابل ہے جنھوں نے اس کی کایا پلٹ کر کے اسے جینے کے قابل نہیں چھوڑا۔

ابھی اس قسم کی شاعری نافہمی کی بنا پر غلط سمجھی جا رہی ہے۔ خوف اور سسپنس کو محض شعبدہ بازی کہا جا رہا ہے۔ کہیں اسے دہشت پسندی کہیں خواہش مرگ کا نام دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ الزام کی منزل میں بھی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید آرٹ اور ادب بے مقصد انسانی زندگی کی عکاسی کے مجرم ثابت ہوئے ہیں۔ اور پھر پسند یا ناپسندیدگی تو اخلاقی قوانین کے ساتھ روبہ زوال ہوتی رہتی ہے۔ کل کی سچائیاں آج مسترد ہو گئی ہیں۔ آج کے جھوٹ کل سچ بن سکتے ہیں فی الحال اس نوعیت کی شاعری نے بہت سے اخلاقی مفروضوں کو جڑ سے اکھاڑنے کے ساتھ ساتھ بہت سے مذہبی مغالطوں سے بھی مقہور و مجبور انسانوں کو نجات دلائی ہے۔ اور خیر و شر کی اس کشمکش کو اس استدلال کے ساتھ ختم کیا ہے کہ انسانی رغبتوں اور نفرتوں کے پیکر ہی خیر و شر ہیں جو شخصی آزادی کے منکر ہی نہیں بلکہ عہد سازی کے بھی مدعی ہیں۔

ان اشعار میں دوسرا پہلو خوف کا ہے۔ لگتا ہے کہ واحد متکلم بے حد خوف زدہ اور شگون پرست ہے، لیکن بغور ان اشعار کا جائزہ لینے پر واضح ہو جاتا ہے کہ ان اشعار کا اپنا ایک زندہ کردار ہے جو اپنے مدمقابل سے نپٹنے کے لئے لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اتر آیا ہے۔ ابتدا میں اسے اپنے حریف سے کچھ دہشت ہوتی ہے، مگر جلد ہی اس کے منہ میں جھاگ بھر آتے ہیں اور پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ اپنے دشمن سے کشتم کشتا ہونے کی ٹھان لیتا ہے اور پھر بری طرح گتھ جاتا ہے۔ اور مدمقابل کو پچھاڑ کر اکثر یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ وہ ان قوتوں کا بھی کھلونا نہیں ہے جو اس کے اختیار سے باہر ہیں۔ ابتدا میں یقیناً شاعر خوف زدہ اور اعصابی طور پر مغلوب نظر آتا ہے مگر انجام کار دگر ہے۔ اس طرح خوف، دہشت اور ڈر اما کا ماحول پیدا کر کے جدید شاعر نے ایک ایسی حقیقت کا سامنا کیا ہے جس کا سامنا کرنے میں ادب کو صدیاں لگ چکی ہیں۔ اسی نے اس صداقت کو دریافت کیا ہے جو پورے سماج کے لئے مہلک ثابت ہو سکتی تھی مگر بنی نوع انسان کو فن دروغ گوئی نہیں سکھایا ہے۔

خوف اور تحیر زائی والی شاعری میں آسیب، جن، بھوت، چڑیل، دیو، عفریت، ہوا۔ بادل، وحشی درندے۔ آدم خور پرندے۔ خونی پرچھائیاں۔ نحوست انگیز سیہ سائے، زہراب چڑھے ہوئے دانت سانپ، اژدہے۔ ہمزاد۔ تشدد پرست دیوتا زائی تقدیس۔ شکار کرنے والے کیڑے وغیرہ جو گڈمڈ نظر آتے ہیں۔ یہ الف لیلوی یا فوق الفطرت کردار نہیں ہیں۔ بلکہ یہ موجودہ سماج کی لعنتوں کے سمبل ہیں۔ وہ مکروہ سچائیاں جنھوں نے انسانی جھوٹ کو برافگندہ نقاب ہونے پر ڈرا دیا ہے ان اشعار کا خمیر بن گئی ہیں۔ اور ان میں روایتی اور سماجی ڈھانچوں کا وہ قاہرانہ مظاہرہ بھی ہے جو عالمگیر انسانی بدنصیبی اور تباہ کاری کے اعمال نامے کی سیاہی بن چکا ہے

جدید شاعر کو اس نفسیاتی اور ذہنی کشمکش کی کھوج کرنے والوں میں شمس الرحمن فاروقی، محمود ہاشمی عالم خوندمیری۔ مغنی تبسم، [illegible] عمیق حنفی بشر نواز۔ وحید اختر۔ وارث علوی اور [نفیعہ؟] [illegible]

انور سدید

نئی نظم کا مطالعہ

زنجیر ــــــــــــــ یونس احمر

رات کی آہنی زنجیر بہت ہے بھاری
کب سے دیکھا نہیں تابندہ سحر کا چہرہ
کب سے چمکا نہیں، جگنو کوئی، تارہ کوئی
کب سے نم ناک نگاہوں کا سفر ہے جاری

ایک عرصہ ہوا چٹکا نہیں کوئی غنچہ
ایک مدت سے تیرا ہجر ہے ناسور مرا!
ایک مدت سے تصور کا بنا ہوں قیدی
جانے کب حسنِ ستم کوش کی ہوگی برکھا

یہ نظم ہجر و فراق کی ایک ایسی دل دوز کیفیت کو سامنے لاتی ہے جس سے نظم کا مرکزی کردار ایک طویل عرصے سے برسرِ پیکار ہے۔ کرب کی یہ کیفیت اتنی طویل ہے کہ شاعر وقت کی ابعادِ ثلاثہ میں بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا چنانچہ اب اسے یہ احساس بھی نہیں رہا کہ اس نے تابندہ سحر کا چہرہ کب سے نہیں دیکھا اور کوئی جگنو یا کوئی ستارہ کب سے نہیں چمکا۔ نمناک نگاہوں کے سفر میں رات کی آہنی زنجیر پاؤں میں بھاری ہو گئی ہے تو اس کا باعث یہ ہے کہ عرصے سے کوئی غنچہ تک نہیں چٹکا۔ پہلے بند میں شاعر نے بے بسی اور نا امیدی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پوری سحر آفرینی سے کام لیا ہے اور پوری چابک دستی سے اس راز کو پوشیدہ رکھا ہے کہ اس کرب کا باعث کیا ہے۔ یہ عقدہ نظم کے دوسرے بند میں کھلتا ہے کہ شاعر پر یہ کیفیتِ فراقِ محبوب نے یوں ڈھائی ہے کہ اب اس کا ہجر ناسور کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس فطری موڑ پر لا کر شاعر نے درد کی المناک فضا تخلیق کرنے اور نظم کا دائرہ

مکمل کرنے کے لئے صرف دو مصرعوں کا سہارا لیا ہے۔ پہلا مصرعہ:

"ایک مدت سے تصور کا بنا ہوں قیدی"

اس ویرانی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اب شاعر کا مقدر بن چکی ہے اور جس سے گزرنے کی اب اس میں تاب نہیں اور دوسرا مصرع:

"جانے کب حسنِ ستم کوش کی ہوگی برکھا"

اس امید کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ابھی ٹوٹی نہیں اور جو شاید شاعر کا آخری سہارا ہے اور اسے رات کی آہنی زنجیروں کو اٹھانے اور سرگرم انتظار رہنے پر مائل کر رہی ہے

اس نظم کا موضوع نیا نہیں۔ اس سے پہلے کئی نامور شعرا اس موضوع پر کامیاب نظمیں کہہ چکے ہیں مجھے اس نظم کی جس خوبی نے متاثر کیا ہے وہ اس کی خود کلامی اور ذیریلی کیفیت ہے۔ شاعر نے محض تصورات کا سہارا نہیں لیا بلکہ الفاظ کی صوتی نزاکتوں سے بھی عمدہ کام لیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنے تصور کو صرف ایک نقطے پر مرکوز رکھا ہے اور نظم نے بہاؤ میں۔ بات بنے بغیر اس کے پھیلاؤ کو خوب صورتی سے صرف آٹھ مصرعوں میں پابند کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس نظم کا اختصار اور کفایتِ لفظی بھی اس کی ایک خوبی ہے۔

پہلے بند میں شاعر نے رات سے ابتدا کی ہے، اور جگنو اور ستارے کے ذکر کے بعد نم ناک نگاہوں کا تذکرہ کیا ہے جو درحقیقت رات، جگنو اور ستارے کا ہی استعارہ ہیں۔

دوسرے بند میں اس نے غنچہ سے ابتدا کی ہے اور حسنِ ستم کوش کی برکھا پر اختتام کیا ہے۔ جو غنچے کا ہی تلازمہ ہے اور اسے متبسم پھول بنانے کے لئے برکھا کی اہمیت واضح ہے۔ یہ تلازمات جس فطری انداز میں نظم میں ظاہر ہوئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے فطرت نگاری شعوری سطح پر نہیں کی بلکہ یہ سب خود بخود نظم کی بنت میں شامل ہو کر اور اس کے تاثر کو دو چند کرتا ہے۔

فنی لحاظ سے یہ ایک مستحکم نظم ہے جس میں کوئی فن کارانہ اخفا یا ابہام پیدا نہیں ہوتا۔ اور قاری کو مطالعے میں ہی مفہوم سے پوری آگہی حاصل ہو جاتی ہے اس لحاظ سے نظم کا صرف ایک پہلو ہے۔ اور اس کی معنوی تہیں زیادہ نہیں۔ تاہم اگر محبوب سے مراد وطن لی جائے تو معنی کی ایک اور گرہ کھل جاتی ہے اور مفہوم اپنا زاویہ بدل لیتا ہے۔

اس نظم کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے ایک نازک اور کومل احساس کو کامیابی سے نظم کا پیکر عطا کیا ہے۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طرح فیض سے متاثر نظر آتا ہے چنانچہ اس نظم کی کئی ترکیبیں مثلاً آہنی زنجیر، تابندہ حسنِ ستم کوش اور کئی مفرد الفاظ مثلاً جگنو، ستارہ، غنچہ، ہجر، ناسور، برکھا وغیرہ میں فیض کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ ہر چند لفظوں پر کسی کی اجارہ داری نہیں لیکن تخلیقی ذہن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان پر اپنی ذاتی تخلیقی مہر ثبت کرنے کی کوشش کرے اور الفاظ اور تراکیب کے مقبول عام مواد کو پرانے استعمال شدہ انداز میں نہ برتے کہ اس سے شاعر کی اپنی انفرادیت نہ صرف دب جاتی ہے بلکہ اس کا اپنا اسلوبِ سخن نکھر کے سامنے نہیں آسکتا۔ اردو نظم میں ترقی پسند طرز کی شاعری نے اس قسم کے بے شمار کلیے رائج کئے ہیں جنھیں استعمال کرنا تو بے حد آسان لیکن ان سے ندرت پیدا کرنا بہت مشکل۔ چنانچہ آج بھی کئی نامور شعرا ان معروف گھاٹیوں میں ہی سفر کر رہے ہیں جنھیں ان کے پیش رو ترتیب دے کر عرصہ ہوا رخصت ہو چکے ہیں۔ یہ طویل جملۂ معترضہ اس لئے عرض کرنا ضروری ہو گیا کہ مجھے احساس ہوتا ہے کہ [بقیہ صفحہ ۵۶ پر

رشید امجد

لا = ؟

اُس نے اپنے آپ کو یہ سزا دی ہے کہ زہر کا پیالہ پی لے یا جلا وطن ہو جائے، لیکن بزدلی بچپن ہی سے اس کے دل کے آنگن میں گدا مارتی چلی آئی ہے، اور موت نے کئی بار اس کے گھر پر شب خون مارا ہے۔ اس لئے اُس نے جلا وطن ہونے کو ترجیح دی ہے، لیکن جانے سے پہلے وہ رشتوں کی ان تمام ڈوریوں کو کاٹ پھینکنا چاہتا ہے جن سے اس کی زندگی کی کشتی کا مستول بندھا ہوا ہے۔

وہ کئی سالوں سے سیدھی سادی زندگی گزار رہا تھا کہ ایک دن ایک چیل اڑتی ہوئی آئی اور اس کے کندھے پر بیٹھ گئی، اس نے چیل کو اُڑانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ چکر کاٹ کر دوبارہ وہیں آ بیٹھی اور اپنی چونچ سے اس کے جسم پر بے اطمینانی کے بیج اُگانے لگی۔

اُس دن وہ اس ڈر سے باہر ہی نہیں نکلا کہ لوگوں کی آنکھوں کی تسبیح میں پروئے ہوئے سوالوں کے جواب کہاں سے لائے۔ لیکن جب رات نے دیواروں پر دستک دے کر اندھیرے کے مشکیزے کا مُنہ کھولا تو اس نے چیل کو اُڑانے کی ایک کوشش اور کی، لیکن چیل سیاہی کی چسکی لے کر وہیں آ بیٹھی۔ اس رات بے خوابی اس کے بستر پر ناچتی رہی۔ صبح جب روشنی نے رات کے ٹھٹھرتے بدن پر کرنوں کی چادر ڈالی تو اس نے دیکھا کہ چیل ساری رات اس کے جسم کو اپنی چونچ سے کھودتی رہی تھی اور اب آلنا بنا کر اس کے دل پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی چونچ اُس کے ہونٹوں میں
اس کے کان اس کے کانوں میں
اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں
اور اس کا جسم اُس کے جسم میں رچ بس گیا ہے
وہ بوکھلا کر باہر بھاگا۔

لوگوں کے جسموں میں دھوئیں کے تنور لگے ہوئے تھے۔ ان کے مساموں سے کوئی بدبودار شے رِس رہی تھی
اُس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا، اس کا ہاتھ کسی چپچپی شے میں لتھڑ گیا، اس کے نتھنوں نے ایک نئے احساس کو سونگھا
اُس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو ٹھونگا مارا۔ اُس شخص نے مڑ کر دیکھا اور ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟
اذیتیں میرے راستوں کے سبھی موڑوں پر چھپی ہوئی ہیں۔ میں قطرہ قطرہ مر رہا ہوں۔
میں اس شہر میں جہاں ہر شخص اپنی خوشبو چھوڑ چکا ہے، اپنے خوشبودار جسم کے ساتھ کیسے رہوں؟
کل وہ مجھے ملا تھا،
میں نے پوچھا۔ "کیسے ہو؟"

کہنے لگا ــــ "چیل اُڑ گئی ہے ' وہ مجھے چھوڑ گئی ہے "

خوف اور اذیت کے جہاز ساری رات اور سارا
ن اس کی پلکوں کے رن وے سے اپنے پہئے چھواتے رہتے
ہیں ۔ اور ایک ان دیکھا دکھ کاک پٹ سے اچھل کر
باہر نکلتا اور اس کے شعور کی باڑیں پھلانگ کر اس کے
وجود کے گلی کوچوں میں دوڑتا رہتا ہے ۔

نہ جانے کتنی ویں رات ہے کہ اس کا جسم اسے
رات کی گود میں یوں اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گیا ہے ، ان
گزری ہوئی راتوں میں وہ اسی طرح خوف اور اذیت
کے میدان میں فٹ بال کی طرح ایک ٹھوکر سے دوسری ٹھوکر
تک چلتا رہا ہے ۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ یہ عہد کر کے
سوتا ہے کہ آج رات وہ اپنے جسم کو باہر نہیں جانے دے گا
لیکن آدھی رات کو باہر سے ایک آواز آتی ہے اور اس
کا جسم اسے چپکے سے ایک طرف کر کے باہر نکل جاتا ہے ۔

اُس نے مجھے بتایا ہے کہ آدھی رات کو وہی چیل
اسے آواز دیتی ہے ، تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے ، کیا اب
بھی بیعت نہیں کرو گے ؟

اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ کا نغمہ پھوٹتا
ہے ، اور وہ مری ہوئی آواز میں بولا ۔

میری آنکھوں میں ابھی دوسرے نہیں آئے
آواز گونجتی ہے تو زندگی جاگ اٹھتی ہے ، یہ بات
اُس نے کئی دن ہوئے مجھ سے کہی تھی ۔

میں نے پوچھا تھا ــــ آج کل کہاں رہتے ہو
نظر نہیں آتے ،

وہ کچھ دیر سوچتا رہا ، پھر بولا ــــ "پتہ نہیں "
پھیلے ہوئے بے سمت فاصلوں کے اندھے پیٹ
میں ! وہ رفتار کی ٹھہری ہوئی سوئی میں پرو دیا ہر روز اپنی
چونچ سے اپنی قبر کھودتا ہے ، اور اپنے پروں سے مٹی

اڑاتا ہے ۔ وہ مٹی جو اس کے بدن سے لمحہ لمحہ جھڑ رہی ہے
پرنی صبح کا سورج زیرو بلب کی طرح ، بے بسی سے اس کے
جسم کی گھنی تاریک راہداریوں میں منٹوں ، سیکنڈوں اور
گھنٹوں کی خیرات بانٹتا ہے ، اسے ایک اور دن زندہ رکھنے
کے لئے سانسوں کا انجکشن لگاتا ہے ۔

ــــ "کسی سے خوف زدہ ہو "
ــــ "ہاں ، ہوں "
ــــ "کس سے ؟ "

"میں نہیں جانتا ، میں صرف ، اس کے قدموں کی
چاپ سنتا ہوں ۔ "

آواز ــــ آواز ــــ آواز
ہونہہ ــــ

اب تو آوازیں ردی کاغذوں کی طرح بے اثر
ہو چکی ہیں ۔ اور گندی ٹوکریوں میں دم توڑ رہی ہیں ۔
زبانوں پر زہر کے سرکنڈے اُگ آئے ہیں ۔
ہونٹوں کی بیلوں پر منافقت کی پیلی پتیاں کھل
اٹھی ہیں ۔ مکانوں میں اب صرف سائے سرسرا رہے ہیں اور
بدنوں کی چار دیواریوں میں شک کے محل ٹھہر چکے ہیں ،

" تو اب تم شاعری کرنے لگے ہو ؟ "
" شاعری ــــ یہ شاعری ہے ، مجھے تو نہیں معلوم "
" آج کل کیا سوچ رہے ہو ؟ "
اس نے کندھے جھٹکے ــــ " پتہ نہیں ۔ "

خوف اور اذیت کا یہ کھیل اب دن کی روشنی میں
بھی اپنی پہچان کرانے لگا ہے ۔ اس کا جسم اب دن کو بھی
اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے ۔ وہ جب بھی اسے پکڑنا چاہتا
ہے تو جسم ہاتھ جھٹک کر اسے پرے کر دیتا ہے ، اور کہتا
ہے ــــ " مجھے زندہ رہنا ہے ، اور زندہ رہنے کے لئے
مجھے وہی کچھ کرنا پڑے گا ، جو دوسرے کرتے ہیں ، ورنہ

[illegible] راستہ بتاؤ۔
اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔
کوئی راستہ نہیں۔
کہنے لگا —— "اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہر سانس کے ساتھ ہوا کی بجائے اذیت میرے اندر جاتی ہے۔"
میں نے کہا "تو بیعت کر لو۔"
کہنے لگا —— "ابھی میں نے دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنا اور دوسروں کے کانوں سے سننا نہیں سیکھا۔"
پھر چیخ کر بولا۔ "اکثریت یہ کیوں چاہتی ہے کہ میں ان کے راستے پر چلوں، مجھے اپنے عقیدے پر چلنے کی اجازت کیوں نہیں، یہ زمین میری بھی تو ہے۔!

اکثریت کا تشدد — ہاہا۔
اور ہوا ——
سرکنڈوں میں بیٹھی ہوا۔
سیٹیاں بجا بجا کر پوچھتی ہے۔
تم کون ہو —— تم کون ہو؟
آؤ میرے ہاتھ پر بیعت کر لو۔
چلو میرے ساتھ چلو
آؤ میں تمہیں منافقت کے دودھ میں
گندھی ہوئی روٹی کھلاؤں،
اس گندے جوہڑ کا پانی پلاؤں
جہاں لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلنے والے مگرمچھ رہتے ہیں

"اب تم ہی بتاؤ، میں کہاں تک خود کو بچائے رکھوں۔"
"اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے شانے پکڑ لئے اور بولا —— "جب میں پیدا ہوا تھا تو میرے باپ نے میرے کان میں اذان دی تھی۔"
پھر اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا ——

"تمہارے باپ نے بھی تمہارے کان میں اذان دی تھی۔"
میں نے کہا —— "مجھے تو یاد نہیں، اگر دی بھی تھی تو اب میں اسے بھول گیا ہوں۔"
اس نے سر ہلایا۔ "لیکن میرے کانوں میں تو وہ آواز اب بھی گونجتی ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ابھی ابھی پیدا ہوا ہوں۔
—— "شاید یہ ٹھیک ہے' اس لئے تمہیں اپنے آس پاس کی ہر شے اجنبی لگتی ہے۔ یا پھر یوں ہے کہ تم پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے اور اب پھر پیدا ہوئے ہو۔"
اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا۔
"کیا کوئی شخص ایک ہی زندگی میں دوسری بار پیدا ہو سکتا ہے۔"

ہم ہر روز پیدا ہوتے ہیں اور ہر روز مرتے ہیں۔
میری دادی کہا کرتی تھیں، آدمی جس روز پیدا ہوتا ہے، اسی روز اس کی قبر بھی کھد جاتی ہے، اور ہر رات کو قبریں اپنے اپنے آدمیوں کو پکارتی ہیں اور کہتی ہیں

اے میرے محبوب
دیکھ میں تیرے فراق میں، پہاڑ ایسی کالی راتیں
کس بے کلی سے کاٹ رہی ہوں۔
آ میرے سینے سے لگ جا،
آ —— آ —— آ

"یا' تمہاری دادی بڑی عقلمند عورت تھی، اب وہ کہاں ہے، میں اس سے اپنے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"
"اس نے اپنی قبر کی آواز سن لی تھی۔"
لیکن اب قبروں کی آوازیں کون سنے گا۔
"اب تو سب نے اپنے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال لیا ہے۔"

ہاں اب تو ہم دوسروں کے کانوں سے سنتے ہیں۔"

" اچھا ایک بات بتاؤ۔"

" پوچھو۔"

" کیا اس شہر کے سارے لوگ بیلے پر آئے ہوئے ہیں؟"

" کیوں؟"

" کسی کو کسی چیز کی فکر ہی نہیں، دیکھو نا رات سورج کا کلیجہ چبا کر اب ان کی ہڈیوں میں سرسرا رہی ہے، لیکن کسی کو اس کی پرواہ ہی نہیں۔"

" ہم سب دوسروں کے بیٹ مین (Bit man) ہیں۔"

" اور دوسرے"

" وہ پہلوں کے۔"

" اور پہلے؟"

" پہلے ان سے بھی پہلوں کے۔"

" گویا ہم سب دوسروں کے بیٹ مین ہیں۔"

" آؤ مل کر ہنسیں ——— ہا ہا ہا"

" ہا ہا ہا"

رات سورج کا کلیجہ چبا کر اب اپنے پنجوں سے ہمارا گوشت نوچ رہی ہے۔

وقت کی تسبیح سے ہمارے نام کے دانے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے ہیں۔

ایک ——— دو ——— تین، چار

ایک دو ——— تین، چار

کئی طویل ٹھٹھرتی راتوں کو، آنکھوں کی گودیوں میں اُتار اُتار کر اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ زہر کا پیالہ پی لے یا پھر جلا وطن ہو جائے۔

تو کیا وہ سچ مچ جلا وطن ہو جائے۔

اسے اس شہر سے بڑی محبت ہے، وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔

کسی حالت میں بھی نہیں۔

تو پھر زہر کا پیالہ پی لے، لیکن یہ ہو تو بھی رہی ہے.....

....

— —

بقیہ: جدید غزل میں.....

چند کے تعاون کا قابل ذکر ہاتھ رہا ہے جس سے ادب اور قاری کے فاصلے کچھ نہ کچھ کم ضرور ہوئے ہیں اور پھیلتی ہوئی سچائیوں کا احساس ہونے لگا ہے۔

غرض کہ زیرِ نظر شعراء نے زندگی کا منفی انداز میں جائزہ لے کر اپنی کشتیاں پھونک دی ہیں اور اپنے آپ کو نئے امکانات کی خاطر ان جلا وطن خوفناک جزیروں میں پہنچا دیا ہے جہاں ان سے پہلے کسی بنی نوع انسان کے نقش قدم نہیں ملتے۔ انسانی جستجو کا یہ کارنامہ آخر کب تک ہماری نظروں سے چھپا رہے گا؟ — —

بقیہ: نظم کا مطالعہ

اس نظم کے شاعر کے ہاں الفاظ کو سیال صورت میں استعمال کرنے کا سلیقہ موجود ہے اور وہ اپنی انفرادیت تسلیم کروانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں آرزو افسانے سے نظم کی طرف یونس احمر کی آمد کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ — —

پیغام آفاقی

سفید خوف

شدید جاڑوں کا موسم تھا۔ صبح نے اپنی بوجھل پلکیں کھولیں۔ روشنی کے آسمان پر ایک دیو پیکر جیٹ طیارہ زمین والوں سے بے نیاز دھویں کے بادل چھوڑتا ہوا۔ بڑھا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہیلی کوپٹر بستی کے اوپر لہرایا اور کاغذ کی بے شمار پتیاں فضا میں تیرنے لگیں۔ پراسرار پتیاں ہوا میں ڈولتی ہوئی زمین کو چھونے لگیں۔ بچے بوڑھے عورتیں انھیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ وہی تنبیہیں، وہی ہدایتیں

بڈھا پھر کھانسنے لگا۔ لوگ پھر آ کر الاؤ کے پاس اپنی برف دھونے لگے۔ کتنی کڑاکے کی سردی تھی۔ پوری فضا، پورا آسمان، پوری زمین ہر چیز برف سی ہوتی جا رہی تھی اور لوگ سر چھپاتے پھر رہے تھے۔ لیکن بڈھے میں اب چلنے پھرنے کی طاقت کہاں تھی۔ وہ پاؤں پھیلائے، پھٹی رضائی اوڑھے اسی طرح کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ وہ اکثر دعویٰ کیا کرتا تھا کہ پہلے وہ بہت دور تک دیکھ لیتا تھا، میلوں دور کھڑے لوگوں کو پہچان لیتا تھا۔ لیکن اب اس کی نگاہ دھندلا گئی تھی۔ اس نے ایک عینک لیا تھا لیکن عینک کا یہ شیشہ بھی اب پرانا ہو چکا تھا، اس پر بہت گرد جم گئی تھی۔

"کیا ہے یہ؟ اب لڑائی آسمان میں ہونے لگی ہے کیا۔"
ایک عورت نے اس کی طرف ایک کاغذ کا ٹکڑا بڑھایا

لیکن بڈھے نے رضائی کے اندر سے ہاتھ نہیں نکالا۔ صرف اپنے دھندلے عینک کے پیچھے سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مشکوک نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

"اس پہ کیا لکھا ہوا ہے؟"

"ہمارے ملک کو زبردست خطرہ ہے۔ دشمن کے جاسوس ہر طرف پھیل گئے ہیں، اس لئے ان پر کڑی نگاہ رکھنے کی سرکار نے ہدایت کی ہے۔" بچوں نے کچھ خوش ہو کر کہا۔

"کیا اس کاغذ کے معنی وہی ہیں جو اس میں لکھا ہوا ہے یا دال میں کہیں کالا ہے۔"

"کیا" بچوں نے چونک کر پوچھا۔

"تم لوگ ابھی بچے ہو، تم مکاری کو نہیں سمجھ سکتے تم لوگ زہریلی چیزوں کو بھی کھلونا سمجھ لیتے ہو۔" عورتوں اور بچوں کے ہاتھوں سے خوبصورت کاغذ کے ٹکڑے گر پڑے۔ وہ پاس کے نل پر جا کر جلدی جلدی ہاتھ دھونے لگے

"جاسوس! کون پہچان سکتا ہے جاسوس کو، کون کسی چیز کے معنی بتا سکتا ہے؛ ایک چیز کے ہزاروں معنی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی یہ معنی بالکل مخالف ہوتے ہیں، میرے بچو! بھولے سے بھی کبھی یہ غلطی مت کرنا۔" بڈھے نے

[illegible] سمندر سے کہرے کا ایک طوفان آیا اور فضا
پاگل ہاتھی کی طرح ہو گئی۔ ایک دوسرے کا چہرہ پہچاننا مشکل
ہو جاتا تھا۔ اور ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ گھروں میں
بھاگنے لگے، ایک عورت کو ٹھوکر لگی وہ گر پڑی۔ پھر
بے بسی سے اٹھی اور اندر چلی آئی، کہرے کا بادل کھڑکی کے اندر
گھستا رہا ——— دن بھر کہرا چھایا رہا۔ لوگ
بکھرے رہے۔ سڑک۔ کھیت۔ مکان۔ جھونپڑیاں،
ہر چیز اندھی پڑی تھی۔ شام ہوئی، رات آئی۔ آسمان
پر سرخ، سبز، ستارے برف کے سمندر میں تیرتے
رہے۔ اور اپنی بے معنی آوازوں کی گرد بستیوں پر
برساتے رہے۔

دوسری صبح ہوئی، نیلا آسمان اور گہرا ہو گیا
تھا۔ سورج زمین تک پہنچنے میں بمشکل کامیاب ہو سکا
کچھ پرندے آسمان میں اپنے پروں کی برف دھو رہے تھے
زمین پر لوگ ہل بیل لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

دور ——— سورج کی ابھرتی کرنوں میں
ریلوے پل کے پاس ایک بھیڑ جمع ہوتی جا رہی تھی، بات
بڑی عجیب تھی۔ جو جاتا حیران و ششدر رہ جاتا۔ ایک
عجیب سا خوف ——— ایک گہری تشویش
جیسے کوئی انتہائی خوف ناک بات ہونے والی ہو،
سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے ———

پوری بستی اس خوف ناک چیز کی طرف کھنچتی
چلی جا رہی تھی۔ سب کی آنکھیں اجاڑ تھیں اور لب
پھڑپھڑا رہے تھے۔

"تم کہاں جاتے ہو؟ تم گھر جاؤ" ایک باپ
نے اپنے بچے کو ڈانٹا اور پھر وہ بھیڑ میں شامل ہو گیا، بھیڑ،
سینکڑوں لوگ، بوڑھے۔ بچے۔ مرد۔ عورت۔ ان
کی آنکھوں میں ایک شدید تجسس جھلک رہا تھا اور ان کے
کندھوں پر ایک عجیب ذمہ داری آ گئی ہو جیسے [illegible]
کبھی کبھی وہ لڑکھڑا جاتے۔ پھر سنبھل جاتے۔

"دوڑو ——— دوڑو" آوازوں کا ایک سیلاب
تھا، اور لوگ بھاگے جا رہے تھے۔ "اگر کچھ ہو گیا تو پورے
گاؤں کے لوگ پھنس جائیں گے۔" کسی نے کہا۔
راستوں اور کھیتوں پر لگاتار دوڑ رہی۔

اب بے شمار نگاہیں پل کی دیوار سے سٹی ہوئی،
ربر کے گیند کے برابر اس سفید گولے جیسی چیز پر چپکی ہوئی اسے
کرید رہی تھیں۔ پھر سب ایک دوسرے کی آنکھوں میں
کسی نام کی تلاش کرنے لگے لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ یہ عجیب
چیز تھی۔

"ذرا اسے اٹھا کر دیکھنا۔"

ایک آدمی جوتے کھول کر، بدن ہلکا کر کے سنبھل کر
آگے بڑھا، اسے بڑھتے دیکھ کر ایک دوسرا آدمی آہستہ آہستہ
پیچھے کھسکنے لگا۔ تمام لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف ڈری
ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور سبھی ہٹنے لگے۔

"اتنی بہادری مت دکھاؤ۔ یہ رام گھاٹ والا
باگھ نہیں ہے۔" کسی نے اس بہادر آدمی کو ہدایت کی
اور وہ پیچھے ہٹ آیا۔

ایک اسکول کے طالب علم کو سب سے زیادہ تشویش
تھی، اس کے لئے ہر لمحہ خطرناک بنتا جا رہا تھا۔ "ممکن اگر
یہ ٹائم بم ہوا تو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے، اور یہ
پل کو اڑانے کے لئے کافی ہے۔ یہاں کھڑا رہنا مناسب
نہیں۔" لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح بھاگے اور دور
دور کھیتوں میں کھڑے ہو کر اس عجیب و غریب چیز کو
دیکھنے لگے۔

اور اب اس چھوٹے سے پنڈولم (Pendulum)
کے سفید گولے سے ایک ایسا بادل ابھر رہا تھا جو ان کی

[illegible] کچھ چھایا ہوا تھا، جس کے سائے میں وہ جیتے [illegible] ، جس کا احساس ان کی زندگی کے ریشے ریشے میں سمایا ہوا تھا لیکن جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ آپس میں بڑے گہرے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

"زمانہ بہت خطرناک آگیا ہے۔ ہر چیز دشوار فہم اور پُراسرار ہوتی جارہی ہے، کسی چیز کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔" ایک فلسفی دیہاتی نے کہا۔ سب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کی باتیں سچی معلوم ہورہی تھیں۔ "یہ نئی دنیا عجیب سے عجیب تر ہوتی جارہی ہے۔" کہتے ہوئے اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ "سائنس ہر چیز میں گھسی جارہی ہے، گھروں میں، مکانوں میں، کھیتوں میں، ہواؤں میں —— یہاں تک کہ لوگوں کے دماغوں میں بھی۔"

"دماغوں میں؟"

"ہواؤں میں؟" کچھ لوگوں کو حیرت تھی۔

"ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ ریڈیو سے جو آواز نکلتی ہے وہ بجلی کی صورت میں نکلتی ہے، اور وہ بجلی ہمارے جسموں کو چھیدتی چلی جاتی ہے، ہمارے کھیتوں کو نامرد بناتی جاتی ہے۔ یہ جو جیٹ جہاز اڑتے ہیں، ان سے جو دھواں نکلتا ہے، وہ بھی سُنا ہے بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ کھیتوں میں ہم جو کھاد ڈالتے ہیں اس سے ہماری تندرستی خراب ہوتی ہے اور بہت ساری بیماریاں جڑ پکڑتی جاتی ہیں [illegible] دن بدن خطرناک حد تک چالاک ہوتے جارہے ہیں، ان کے طور طریقے عجیب و غریب ہوتے جارہے ہیں۔ کچھ اندازہ نہیں ملتا وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ دنیا ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہے۔ وہ ہماری زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ ہمارے جسموں پر تجربہ کرتے ہیں ——

دوسری طرف کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ امریکہ اور روس والے اگر چاہیں تو ہمارے ملک پر حملہ کئے بغیر ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں بھوکے مار سکتے ہیں، نہ جانے کیسے؟ میں نہیں جانتا، لیکن جو لوگ کہتے ہیں ان کو اس کا یقین سا ہے۔"

"اور روس اور امریکہ نے تو شاید ایسے بم بنالئے ہیں کہ اگر لڑائی ہوئی اور انہوں نے ہمارے ملک پر صرف ایک بم گرادیا تو پھر نہ ہماری کھیتیاں ہوں گی، نہ مکان ہوں گے نہ سڑکیں ... سب کچھ ریت کی پہاڑیوں میں بدل جائے گا۔ ایک پاگل انسان پوری دنیا کو تباہ کرسکتا ہے، مٹا سکتا ہے۔"

سبھی گہری سوچ میں ڈوب گئے، جیسے سب کی زندگی کسی اجنبی طاقت کے رحم و کرم پر ٹھہری ہوں، انہوں نے انتہائی لاچاری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، لیکن سب کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔ ایک بڈھا ان سے کافی دور کھیت میں بیٹھا کھانس رہا تھا۔ وہ دور تھا لیکن ان باتوں سے بے نیاز نہیں تھا۔

تھوڑی دیر میں نیلی پگڑی باندھے، ہاتھ میں لمبی لاٹھی لئے گاؤں کا چوکیدار آیا۔ وہ سہما سہما سا پل کے پاس گیا، آگے جھک کر اس نے جلدی جلدی غور سے دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔

"سب لوگ دور رہیں، لیکن جائیں نہیں دیکھتے رہیں۔ میں کراسنگ کے گیٹ مین کو خبر کرتا ہوں اور پھر تھانہ جاؤں گا۔"

"لیکن اسے پل کے نیچے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟" کسی نے چوکیدار سے کہا۔

"اتنے لوگوں میں ایک بھی کو ڈالو سمجھ رکھا ہے، ہٹا کیوں نہیں دیتے۔" اس نے غصہ ہو کر جواب دیا۔

"سب سے پہلے اسے کس نے دیکھا تھا۔" چوکیدار نے پوچھا۔

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چوکیدار ان پر گہری نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لوگوں پر خوف کی ایک اور پرت جم گئی۔

"اب قانون اور پولس کا چکر عجیب ہو گیا ہے، کون بتائے کہ اس نے پہلے دیکھا ہے، کوئی بات ہو گئی تو دوڑتے دوڑتے تلوے گھس جائیں گے۔ آج کل سرکاری باتیں چڑیوں کا جال بن گئی ہیں۔" فلسفی نے کہا اور سب کے منہ مزید لٹک گئے۔

پھر تھوڑی دور پر لوگ آگ جلا کر، حلقہ باندھ کر تاپنے لگے، چنگاریاں ناچتی رہیں، اور دھواں ان کے سروں پر بگولا بناتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد دور ریلوے لائن پر آتی ہوئی گاڑی کا دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا۔ ادھر گیٹ مین لال جھنڈی لئے بے تحاشا بھاگا آ رہا تھا، وہ ہانپتا ہوا آیا اور جلدی سے پل سے کچھ آگے پٹریوں پر لال جھنڈی گاڑ کر، رونگٹے کھڑے کر دینے والی جاڑے کی صبح میں، اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے لگا۔

گاڑی قریب آئی، جھنڈی سے کچھ دور پر رکی اور اس میں سے ڈرائیور اور گارڈ نیچے اترے۔ آگ کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ اب دھیرے دھیرے ٹوٹتی ہوئی ٹانگوں کو سیدھا کر کے دھیرے دھیرے ان کے پیچھے چلنے لگے۔ ان میں ایک عجیب سا تجسس پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ گارڈ اور ڈرائیور کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے لیکن قریب جانے سے کتراتے تھے، دور ہی سے ان کی باتوں کو سننے کے لئے ایک ہولناک سناٹا پالے ہوئے کان بنے تھے۔

گارڈ اور ڈرائیور گیٹ مین کے ساتھ پل تک گئے اور اس چیز کے قریب پہنچے۔ سب کی سانسیں کھنچے ہوئے لگام کی مانند رکی ہوئی تھیں۔ لیکن ڈرائیور کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے [illegible] اٹھایا اور لوٹنے لگا۔ اس کی شخصیت پر اب بھاری [illegible] کا لبادہ پڑا ہوا تھا، [illegible] اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے کچھ رینگ رہے تھے، [illegible] ڈرائیور سے کچھ نہیں پوچھ سکا وہ انجن میں چلا گیا، گیٹ مین جھنڈی اٹھانے گیا، پھر گاڑی جھک جھک کرتی پل کے اوپر سے گزر گئی، تھوڑی دیر میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"کیا تھا معلوم ہوا؟" بڈھے نے جو کافی دیر سے دور دور بیٹھا تھا، اپنے بھاری شیشوں والا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" ایک آدمی نے جواب دیا۔

"یہ باتیں ہم کبھی نہیں جان سکیں گے۔" بڈھے نے مایوس ہو کر کہا اور اس طرف دیکھنے لگا، جدھر گاڑی گئی تھی کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کے جسم کے کانپتے ہوئے رونگٹوں کو دیکھتے رہے۔ اور سپاٹ چہروں کی دکان سجائے رہے اور پھر سبھی اپنے اپنے پراسرار اور بھاری دلوں کے ساتھ کھیتوں کی طرف لوٹ گئے۔ پھر ایک سفید سیلاب پورب سے ابھرنے لگا، سورج اندھا ہوتے ہوتے قبر میں ڈھک گیا۔

پھر کھیت اور میدان سبھی اس سفید طوفان کی لپیٹ میں آ گئے۔ اور درختوں اور پودوں اور کھیت میں کام کرتے ہوئے مزدوروں کے لباس پر برف کی موٹی موٹی تہیں جمنے لگیں۔

— —

رسالہ : **اوراق** (سالنامہ)
ادارہ : وزیر آغا ، عارف عبدالمتین
صفحات : ۳۰۶۰
قیمت : ۸ روپے
چندہ سالانہ : (چار خاص اشاعتیں) ۲۴ روپے
مقام اشاعت : دفتر اوراق ، چوک اردو بازار ، لاہور

دو ممالک کے درمیان شاید دنیا میں کہیں ایسی پابندی رسل و رسائل پر نہیں رہی ہے ، جیسی کہ پچھلے دنوں ہندو پاک کے مابین مسلط تھی۔ ایک فن کار جو ہمیشہ اظہار کے کرب سے بے چین رہتا ہے اس کے لئے یہ پابندی عام آدمیوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ روح فرسا ثابت ہوتی ہے۔

اب اس پابندی کے منسوخ ہو جانے کے بعد پاکستان سے جو رسائل کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو جذبات کے بند ٹوٹ گئے اور ضبط کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ جذبات کا یہ انوکھا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں خاتمہ ہے اس کا ؟ میں نہیں جانتا۔ ہمارے جذبات کی داستان اتنی آسان اور مختصر بھی نہیں کہ لفظوں کی کم مائگی کا احساس نہ ہو۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ پاکستانی ادب کے معماروں اور پرستاروں نے بھی جذبات کے سمندر میں خود کو بے بس محسوس کیا ہے۔

"سوال یہ ہے" یہ "اوراق کا ایک مستقل عنوان ہے۔ جس کے تحت ہر شمارہ میں ادب کے کسی ایک گوشہ پر مباحثہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت اوراق کے پچھلے شمارہ میں بحث کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں وزیر آغا "پہلا ورق" میں فرماتے ہیں :

> نثری نظم کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے ایک بار لکھا تھا کہ یہ نام بے معنی ہے۔ کیونکہ یہ دو بالکل مختلف مزاج کی حامل اصناف کو یکجا کرنے کی ایک ایسی کوشش ہے جو کبھی مشکور نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس سارے لٹریچر کے لئے جو نثری نظم کے نام سے پیش ہو رہا ہے کوئی اور نام تجویز ہونا چاہیئے ...... ہمارے ایک کرم فرما نے نثری نظم کے لئے "نثر لطیف" کی ترکیب تجویز کی ہے جو ہمیں نہایت مناسب نظر آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نثر میں پیش کئے گئے مواد کو اس کی نوعیت کے مطابق ہی نام ملنا چاہیئے اور اسے کسی صورت بھی نظم کے زمرے میں شامل نہیں کرنا چاہیئے ...... ہمارے نزدیک "نثر لطیف" وہ تخلیقی مواد ہے جو ایک تا دُکی کرکے باعث شعر کے مقام تک نہ پہونچ سکا یعنی اس میں شعری آہنگ تو پیدا ہو گیا ! لیکن یہ شعری آہنگ سے محروم رہا .... آئندہ کے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ .... نثری نظم کی ترکیب کو یکسر ترک کر دیں گے ۔"

نثری نظم یا نثر لطیف کے سلسلے میں وزیر آغا کا یہ جرأت مندانہ اور دو ٹوک فیصلہ لائق ستائش ہے۔

پیش نظر شمارے میں وزیر آغا۔ عارف عبدالمتین۔ انور سدید، عبادت بریلوی، مرزا ادیب، غلام الثقلین نقوی، رام لعل، رشید امجد، شاذ تمکنت، قاضی سلیم، ادیب سہیل، حنیفہ صدیقی، اللہ پرور دہیلہ نے حاشر اور دکھایا۔

"اوراق" کے صفحات ہندوپاک کے بڑے فن کاروں کی معیاری تخلیقات سے مزین ہیں جو ستھرے ادب کے قارئین کے لئے ایک حسین تحفہ ہے۔

——— عشرت ظہیر

رسالہ: "سیپ"

مدیر: نسیم درانی

صفحات: ۲۹۰

قیمت: ۶ روپے

سالانہ: ۲۵ روپے

مقام اشاعت: بلاک ڈی۔ شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸

"سیپ" کا شمارہ ۳۱ پیش نظر ہے۔ اس کے مشتملات زیادہ تر ایسے ہیں جو یا تو ہندوپاک کی سرحدوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں یا بھارت کے فن کاروں کے قلم کے رہین منت ہیں۔

اسد محمد خاں کا "دوام دائرے" وہیں کلاتھ مل کے ۱۹۶۵ء کے مشاعرے کی رپورتاژ ہے۔ اس کی اب اشاعت اس سلسلے کی تصدیق ہے کہ "ہم" نے ایک دوسرے سے لاتعلق ہو کر جو ایام گزارے ہیں وہ اب بھی ہمارے سینوں میں مچل رہے ہیں۔ ہم اپنی ساری باتیں ساری کارروائیاں ایک دوسرے کو سنا دینا چاہتے ہیں کہ فن کار اظہار کے کرب سے ہمیشہ بے چین رہتا ہے، ادیب جذباتی بھی۔

سیپ کے سولہ افسانوں میں سے چھ افسانے خواتین افسانہ نگاروں کے تخلیق کردہ ہیں۔ زہرہ جبیں کا افسانہ "آخری سجدہ" دم توڑتی اور ٹوٹتی بکھرتی تہذیبوں اور قدروں کا نوحہ ہے، جو انسانی زندگی پرانی قدروں سے لگاؤ اور اٹوٹ محبت کی بے حد متاثر کن کہانی۔ "چاچا" کا کردار حقیقی اور جیتا جاگتا کردار ہے۔ جس نے تقسیم ہند اور اس کے بعد کی صعوبتیں جھیلیں اور پرانی قدروں کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی اپنا ناطہ دائمی دنیا سے جوڑ لیا۔

ذکیہ صدیقی کا افسانہ "سرحد" دو ملکوں کی سرحد کی کہانی ہے۔ "جہاں دو ملک ملتے بھی ہیں اور الگ بھی ہوتے ہیں۔ دو دلوں کا ملاپ بھی ہوتا ہے۔ اور جدائی بھی۔ لوگوں کے قافلے آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ کوئی پرنم آنکھوں سے اپنے پیاروں کو الوداع کہتا ہے۔ کوئی خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ لئے کسی کو خوش آمدید کہتا ہے ——"

آغا بابر کا افسانہ "گلاب دین چٹھی رساں" ہر ملک اور ہر زمانہ کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ منٹو کے موضوع اور کرشن چندر کی کردار نگاری کا ایک حسین اور انوکھا امتزاج ہے۔ انسان کا کردار حالات کے تحت وقت کے سمندر میں کتنی سبک روی اور تیزی سے بدلتا ہے، اس کا احساس گلاب دین کو اس وقت نہیں تھا جب کہ وہ طوائفوں کے علاقے ہیرا منڈی میں تبدیل کئے جانے پر اپنے افسر سے احتجاج کر رہا تھا۔

اور آخر میں پوسٹ ماسٹر نے جب اس سے کہا:۔

"... کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے"
تو اس نے کہا "حضور میری صرف اتنی عرض کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے"
"...... طلاب دین کی داڑھی غائب تھی لمبی سی ٹھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا غبار تھا"

اس شمارے میں محمد احسن فاروقی، نجم الحسن رضوی، علی حیدر ملک، سلیم احمد، عبدالعزیز خالد، شاذ تمکنت، احمد اسلام امجد، مجروح سلطان پوری، غلام ربانی تاباں، محشر بدایونی اور زیب غوری نے متاثر و محظوظ کیا۔
رسالہ سیپ اپنے ہیئت و مواد کے لحاظ سے ادب کے ذوق کی تسکین کا وسیلہ ہے۔

——— عشرت ظہیر

رسالہ : ماہنامہ۔ تحریریں (عبدالعزیز خالد نمبر)
ایڈیٹر : زاہدہ صدیقی
صفحات : ۴۱۶
قیمت : ۱۲ روپے
سالانہ چندہ : ۳۵ روپے
مقام اشاعت : چوک اُردو بازار لاہور،

کسی شخصیت پر نمبر نکالنا جتنا اہم ہے تو حد درجہ دشوار گزار بھی۔ اگر محض خانہ فرسائی مقصد ہو تو کوئی بات نہیں۔ ورنہ فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر صحت مندانہ انداز فکر اور خلاقانہ صلاحیتوں کا اظہار جتنا فعال کام ہے اتنا ہی مشکل اور صبر آزما۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے کسی شخصیت پر نمبر نکالنے کا مقصد خامہ فرسائی کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا۔
لیکن پیش نظر خالد نمبر اس سطحیت اور حوصلہ شکن رجحان سے مبرا ہے۔
اس کے مشمولات میں تنوع اور زندگی ہے جو دیانت داری اور لگن کی رہین منت ہے۔
ایک مضمون کا عنوان ہی ہے: "خالد کی سب سے بڑی کمزوری۔"
عبدالعزیز خالد قادر الکلام شاعر ہیں لیکن ان کی فطرت میں مشکل پسندی اس طرح رچی بسی ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ اجنبی اور غیر مانوس الفاظ، مشکل تراکیب اور اساطیری اور تاریخی تلمیحات نظم ہوئے ہیں۔ جس کے سبب خالد کی شاعری کو سمجھنا اور ان کے فن کا تنقیدی جائزہ لینا خالد کی شاعری ہی کی طرح مشکل ہے۔ لیکن تحریریں کے مشمولات میں عبدالعزیز خالد کے فن کے مختلف گوشوں کو جس ہنر مندی اور حسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ بڑی عرق ریزی اور لگن سے اس کام کو پائے تکمیل تک پہونچایا گیا ہے۔

خالد کی شاعری، خالد کے تراجم، یونانی شاعرہ سیفو کے خالد اثرات کلاسیک اور عصری آگہی سے لگاؤ کے علاوہ خالد کی ذاتی زندگی کا کوئی پہلو بھی شاید ہی چھوٹا ہو۔
زاہدہ صدیقی، عبدالمجید عدم، وزیر آغا، عارف عبدالمتین، مرزا ادیب، انور، کامل القادری، اور وقار عظیم کے مضامین

ان کے عالمانہ انداز فکر کی غمازی کرتے ہیں۔

"عبدالعزیز خالد نمبر" اردو ادب و صحافت میں شخصیتوں پر نکالے گئے نمبروں میں نمایاں اور ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ادبی دستاویز کی حیثیت کا متحمل ہے۔

سرورق کی سادگی و پرکاری اور مضامین کی ترتیب و تدوین میں ہنرمندی خوش سلیقگی کو بڑا دخل ہے۔

———————— عشرت ظہیر

نام کتاب : اردو خدمات
مصنف : صادق نوید
صفحات : ۱۹۶
قیمت : پانچ روپے
ملنے کا پتہ : صادق نوید۔ مکان نمبر ۸۴۹ - ۲ - ۱۲، آصف نگر، حیدرآباد ۲۸

پیش نظر کتاب "پدما بھوشن پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی ادبی خدمات" وہ مقالہ ہے جسے صادق نوید نے ۱۹۷۴ء کے ایم اے (اردو) کے امتحان کے سلسلے میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔

پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی شخصیت ان کے علمی و ادبی کارناموں کے لئے بڑی پرکشش ہے۔ وہ ماہر عمرانیات و سیاسیات بھی ہیں، اچھے مورخ اور انشاپرداز بھی۔

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سوانح کا ہے اور دوسرا حصہ "کارناموں" سے متعلق ہے اور تیسرا حصہ علمی خدمات پر روشنی ڈالتا ہے جس کے تحت بحیثیت مترجم، بحیثیت مصنف اور بحیثیت مضمون نگار ان کی شخصیت اور ان کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی اردو مطبوعہ کتابوں کی فہرست بھی اس کتاب میں شائع کی گئی ہے۔

کتاب، صاف ستھری کتابت اور لیتھو کی اچھی طباعت سے آراستہ ہے۔

———————— عشرت ظہیر

The AAHANG Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA.

Printed by Kalam Haidri at Hind Litho Press and Published
from Mohalla Bairagi, Gaya.

[illegible] ہاؤس، [illegible] روڈ، گیا

جولائی، اگست ۱۹۷۵ء
شمارہ: ۶۱ / ۶۲

فون: ۵۴ — ۴۳۲

کتابت: قمر نظامی، عبدالغفار

طباعت: ہند لیتھو پریس نیگو ٹولہ گیا

شرح خریداری
سال کے لئے ۱۵ روپے
دو سال کے لئے ۲۸ روپے
تین سال کے لئے ۴۰ روپے
فی شمارہ ایک روپیہ ۲۵ پیسے

مدیر
کلام حیدری

مضامین

رپورتاژ

افسانے

نظمیں

غزلیں

نئی نظم کا مطالعہ

تبصرے

خطوط

میں اس شمارے میں اداریہ لکھنے
سے قاصر ہوں۔ کیوں کہ میرے
دوست نرمدیشور پرشاد، وائس چانسلر
مگدھ یونیورسٹی کا ۲۹ر جولائی کو
انتقال ہوگیا۔ یہ آسمانوں کو چھوتا
ہوا شاعر، مفکر، اسکالر اور باغ و
بہار دوست ملک عدم کو چلا گیا
میں ابھی تک سزا بھگت رہا
ہوں۔

زندہ رہنے سے بڑھ کر کوئی
سزا ہے؟

—— کلام حیدری

لہو فیصلہ چاہتا ہے

یہ رات بھی گزر گئی
جراحتوں کا بوجھ دوش پہ لئے
نہ میری رازداں بنی
نہ میری ہمزباں بنی
نہ میری پاسباں بنی
بنی تو ایک تیرِ بے اماں بنی
مگر جراحتوں کا بوجھ دوش پہ لئے ہوئے گزر گئی

سرہانے کوئی تھا کھڑا
نظر چرائے، تیغ ہاتھ میں لئے
میں اُس سے پوچھتا بھی کیا؟
میں اُس سے بولتا بھی کیا؟
یہ کیا خبر — وہ کون تھا؟
عدوئے جاں
کہ کوئی میرا مہرباں
کہ کوئی میرا میہماں
مگر نہ تیغ اُٹھا سکا
یہ راز بعد میں کھلا
نہ تھا وہ کوئی دوسرا

وہ 'میں' تھا جس سے میری دشمنی نہ چلے کب کا
کہ اور کون ہوگا میری خاکساریوں کا اتنا قدردا
کہ اور کون ہوگا اتنا مہرباں
کہ اور کون ایسی ناسپاس رات میں بنے گا میہ
ازل سے ہوں میں گھات میں
کہ رکھ سکوں خود اپنے حلق پر چھُری
بچائے کون مجھ کو میرے وار سے
نہ رُک سکوں نہ مُڑ سکوں
سکوتِ جاں طلب کو کیا جواب دوں
کہ چاہتا ہے فیصلہ مرا لہو

—

صفر ——— دو تبصرے

وہاب اشرفی　　انور سدید

کلام حیدری کے نئے افسانوی مجموعے کا نام 'صفر' ہے۔ 'بے نام گلیاں' کے افسانہ نگار کلام حیدری اور 'صفر' کے افسانہ نگار میں نہ صرف فکری رویہ کا فرق ہے بلکہ طرز ادا اور اسلوب کا بھی ہے۔ پھر یہ فرق اور نمایاں ہو جاتا ہے جب فکر اور طرز ادا کے معیار کے لحاظ سے دونوں میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ 'بے نام گلیاں' اپنے وقت کی چیز تھی۔ اس کے اکثر افسانوں پر تیز بھاگتے ہوئے لمحوں کی گرد پڑ چکی ہے۔ لیکن 'صفر' کے کئی افسانے وقت کی گرفت سے آگے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جنھیں فراموش کرنا آسان نہ ہوگا۔

اب اگر یہ کہوں کہ کلام حیدری EXISTENTI-ALIST ہیں تو چونکنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے کارل بارتھ، پال تیلخ، جبریل مارسل، کارل یسپرس، مارٹن ہائیڈیگر یا کیکے گارڈ کو باضابطہ پڑھا ہے اور انھیں اپنے افسانوں میں برت ڈالا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ لمحوں کو گرفت میں لانے کی کوشش، تشکیک، نہلزم، اجنبیت، شخصیت کا انہدام، داخلیت اور اپنی تلاش اور عقلیت کے خلاف بغاوت کا جو رجحان وجودیوں کے یہاں ملتا ہے، وہ غیر شعوری طور پر کلام حیدری کی افتاد طبع بھی ہے۔

مجموعہ کا نام 'صفر' ایک قسم کی نفی ہے، یہ نفی کہاں کہاں ہے وہ تو افسانوں کے جائزے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔ اس سے فکر کی ساخت کا ایک عمومی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ نام دو سطحوں پر کام سرانجام دیتا ہے۔ 'صفر' انگریزی میں باضابطہ ایک صنعت ہے جس میں الفاظ کوڈ بن جاتے ہیں۔ یہ کوڈ عدد میں دوسرے الفاظ کے سبٹی چیوٹ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں SWIFT نے JOURNAL TO STELLA میں صفر کی صنعت اپنائی ہے۔ یہ ایک طرح کی اشاراتی زبان ہے۔ اس طرح ایسے افسانے جو کئی سطح پر سمجھے جا سکتے ہیں ان کے لئے یہ نام خاصا SUGGESTIVE ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ افسانے کے مطالعے سے نفی کی فضا ذہن پر زیادہ واضح ہوتی ہے۔ گمان یہ ہے کہ افسانہ نگار کے ذہن میں نفی کا پہلو نمایاں رہا ہوگا۔ لہٰذا 'صفر' معنوی لحاظ سے دعوت فکر دیتا ہے۔

مجموعہ 'صفر' میں سولہ افسانے ہیں۔ آخری افسانہ 'صفر' کے عنوان سے ہے۔ وہ کون سی منزل ہے جہاں پہنچ کر مسرت کی آخری حد چھوئی جا سکتی ہے۔ پھر اس مسرت کو دائمی بنایا جا سکتا ہے۔ LUST ہمیں آگے لے جاتا ہے۔ اس کا حصول اسے بھی بے معنی بنا ڈالتا ہے۔ ہر آگے کا مرحلہ پیچھے کا مرحلہ بنتا جاتا ہے اور نتیجے میں ترقیوں کی لایعنیت، پیہم کامیابیوں کا فریب، یہ افسانے مفہوم کے اعتبار سے ہم جہتی ہیں۔ اسی پر مفہوم کی پرتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ لیکن لایعنیت یا نفی مرکزی تصور بن کر ابھرتا

وہاب اشرفی

کلام حیدری سے میری پہلی ملاقات "شب خون" میں ہوئی تھی۔ پھر رسائل کے کبوتروں کو سرحدیں عبور کرنے سے منع کر دیا گیا اور کلام حیدری میرے لئے اجنبی ہو گیا۔ کبھی کبھی کسی خاتون افسانہ نگار کو حقیقت کو تجریدی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے دیکھ کر مجھے کلام حیدری بے اختیار یاد آتا۔ ان دونوں میں معنویت کا فنی ادراک بالکل ایک جیسا تھا۔ ماہ و سال کی اس گردش میں انسان کی اجتماعیت شکستہ ہوئی اور وہ اپنی ذات کے تحفظ کے لئے ایک ایسے قلعے میں بند ہو گیا جس پر چاروں طرف سے تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ جب بھی خارج سے کوئی نیا حملہ آور اس پر جھپٹتا وہ قلعے کی محفوظ کھڑکی کا ایک پٹ کھولتا، چہرے پر منافقت کی مسکراہٹ اوڑھ لیتا اور حملہ آور کو مفاہمت کی سفید جھنڈی دکھا کر اپنی ذات کو محفوظ کر لیتا۔ کتنے عجیب دن تھے اور کتنے عجیب دنوں میں ہم بھی ایک ایسے ہی محفوظ قلعے میں اپنے داخل کو مسلسل زخمی کر رہا تھا۔

اس روز ۱۹۷۵ کی جنوری کا دسواں دن تھا اور ادھر کے دونوں طرف خطوں کے تیور نکوں کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا بے شمار سائلوں کی درخواستوں کو اسی اسلوب سے نپٹا رہا تھا۔ مسائل اور مزید مسائل کے اس سمندر میں ہر سائل میرے مثبت طرز عمل سے غوطہ کھا رہا تھا۔ اور مضطرب بے چین ہو کر سمندر کی تہ میں بیٹھ جاتا تھا۔ سائل کے اس عمل پر میں اندر ہی اندر کتنا خوش تھا۔ خوشی کی

اسی کیفیت میں غلام محمد نے میرے سامنے جب ایک رجسٹرڈ پیکٹ پیش کیا تو میں نے اسے ایک چونی انعام دی۔ ایک عرصے سے میری ڈاک میں سے رسائل اور کتابیں گم ہو رہی تھیں۔ غلام محمد ڈاکیہ ہر سرزنش کو ہضم کر چکا تھا۔ لیکن جب سے میں نے اسے انعام دینا شروع کیا تھا۔ میری ڈاک مجھے محفوظ مل رہی تھی۔ میں نے اور غلام محمد نے زندگی کی ایک حقیقت کو پا لیا تھا اور ایک شریفانہ مفاہمت سے کتابوں کی گم شدگی کا قلع قمع کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے پیکٹ کا بند قبا کھولا۔ یہ افسانوی کتاب "صفر" تھی۔ میرے ذہن کی سطح پر پہلے "لا" پھر "شب خون" اور سب سے آخر میں کلام حیدری ابھرا۔ میں نے کاغذات کا پلندا سمیٹا۔ چپراسی کو کہا کہ وہ سائلوں کو اگلی تاریخ دے کر رخصت کر دے اور انھیں بتا دے کہ "صاحب" ایک بین الاقوامی میٹنگ میں شرکت کر رہے ہیں۔

اب میں کلام حیدری کے افسانوں کی کتاب "صفر" کی ورق گردانی کر رہا ہوں۔ سفید دبیز کاغذ پر اجلی اجلی کتابت اور صاف ستھری طباعت میں یہ کتاب سرخ و سیاہ سرورق میں ملفوف تھی۔ کچول اکادمی۔ رینا ہاؤس، گیا نے اسے شایع کیا تھا۔ قیمت بھی واجبی تھی۔ صرف دس روپے انتساب "گیا" کے نام ہے اور "گیا" بھارت کا وہ شہر ہے جہاں کلام حیدری نے بے گانہ وضع زندگی بسر کی ہے۔ اور اب بھاگ رہا ہے کہ اس شہر میں وہ اجنبی ہو گیا ہے۔ افسانوں کی فہرست طویل ہے۔ کل سولہ افسانے ہیں۔ ہر افسانہ مختصر ہے $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کے دس پندرہ صفحوں پر محیط۔ میں ایک گھنٹے میں سو صفحات آسانی سے پڑھ لیتا ہوں۔ صفر کے ساتھ میرا سفر ایک اعشاریہ چھیاسٹھ گھنٹوں کا ہے اس تیز رفتار مطالعے کے بعد میں اس کتاب پر "اوراق" کے لئے تبصرہ لکھوں گا اور کلام حیدری کو کبھی گردش چند سے

اور کبھی بلراج مینرا کے فیصلے کا عزم شہرت کی کوشش
کروں گا۔ اور یوں ایک ادبی فریضے سے خوش اسلوبی
سے فارغ ہو کر طمانیت محسوس کروں گا۔

اب میں کتاب کا پہلا افسانہ "عنابی کانچ کا ٹکڑا"
پڑھ رہا ہوں۔ کانچ کی ایک انی میرے دل میں اتر گئی ہے
میں اس افسانے سے آنکھیں چرا رہا ہوں۔ لیکن سوچ بھی رہا
ہوں کہ کلام حیدری گیا میں کیوں اجنبی ہو گیا ہے۔ اور
ریٹائرڈ کمشنر محمد بیگ کی شعلہ جوالہ صاحبزادی بھری محفل
میں کیوں تنہا ہے۔ اور انٹرنیشنل کلب کے گرد کتے کیوں
منڈلا رہے ہیں۔ اب میں نے افسانہ "سخی" پڑھ لیا ہے
کانچ کا ٹکڑا میرے دل میں مسلسل چبھن پیدا کر رہا ہے۔
کیا یہ "میں" تھا جسے ایڈیٹر نے ترجمے کا کام نہیں دیا،
اور جس نے سکینہ کے منی آرڈر کے روپے اپنی جیب میں اڑس
لئے کر شیرانیں اڑائی ہیں۔ نہیں یہ "میں" کیسے ہو سکتا
ہوں۔ اگر "میں" ہوتا تو سکینہ کے خاوند کی لاش پر
پڑے ہوئے روپے بھی آنکھ بچا کر اڑا لیتا اور ہوٹل میں
بیٹھ کر ان سے دادِ عیش دیتا۔ کلام حیدری میری منافقت
سے کیسے واقف ہو سکتا ہے۔ ہزاروں میل دور وہ میرا چہرہ
کیسے پہچان سکتا ہے۔ لیکن یہ کانچ کا ٹکڑا مجھے کیوں چبھ رہا
ہے۔ میں نے "زندانی" بے دلی سے پڑھا ہے۔ یہ اس
بیوی کا افسانہ ہے جو اپنے خاوند کی آغوش میں بھی اجنبی
رہتی ہے۔ اس افسانے نے میرے منہ کا ذائقہ تلخ کر دیا
ہے۔ میں نے کئی بیاہتا عورتوں کو اپنے پالتو خاوندوں سے
بے وفائی کرتے دیکھا ہے۔ کئی ہری چگ خاوندوں کو
وفادار بیویوں کو دھتکارتے سنا ہے لیکن کوئی ان
سب کا بھانڈا یوں چوراہے میں پھوڑتا ہے۔ اب
میں جلدی جلدی آگے بڑھ رہا ہوں، حادثہ۔ بابو
تلاشی۔ کس کی کہانی۔ لا۔ صفر ——— سب

سیاہ، مکروہ، اور منافقت آلود چہروں کی کہانیاں ہیں ان
چہروں پر مسکراہٹ کا گندہ جھلی لپٹا ہوا ہے۔ انہی میں میرا
چہرہ بھی موجود ہے۔ ان افسانوں کا واحد متکلم بھی میں ہوں۔ واحد
غائب بھی میرا ہی نام ہے۔ میرے ہاتھ میں منافقت کی سفید
جھنڈی ہے۔ اور میں اسے مسلسل لہرا لہرا کر خطرے کی پٹری
سے سلامتی کی گاڑی کو حفاظت سے گزار رہا ہوں۔ لیکن
میں ان افسانوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔ ان افسانوں
سے میری نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے کتاب بند کر کے
میز پر پھینک دی ہے۔ اب اسے پھر اٹھایا ہے۔ اور
اسے میز کی سب سے نیچے والی دراز میں بند کر دیا ہے۔
میں اس کتاب پر تبصرہ نہیں لکھ سکتا۔ اپنے آپ پر تنقید
کون کرتا ہے۔ اور اب میں چپراسی کو کہہ رہا ہوں۔
"سائلوں کو میرے سامنے پیش کرو۔ بین الاقوامی
میٹنگ ختم ہو چکی ہے۔"
اور چپراسی کمرے کے باہر صدا لگا رہا ہے۔
"سرکار بنام دینو یودی۔ اکرم علی حاضر ہوں۔"

——— انور سدید

سبز پتوں کا گھر

پڑتیر وارسوٹی

دھوپ کے شہر میں
آگ ہی آگ ہے
اور بجھتی نہیں آگ برفاب سے
ب ہیں سوکھے درختوں کے بتیاں
ہر سڑک کا بدن ہے سلگتا ہوا
سرخ تپتے ہوئے گرم بازار ہیں
ریستوراں - بار - تھیٹر - کلب،
سب کے سب
آتشیں پتھروں اور اینٹوں کی ہیئت سے بیزار ہیں
لو بہت تیز ہے
جیسے ننگی ہوا کی لپکتی ہوئی کوئی شمشیر ہو

اور دھرتی سے آکاش تک کی فضا
آگ اگلتے جہنم کی تصویر ہو
لو سے جھلسے ہوئے ہیں برہنہ شجر
پتھروں کا نگر،
تشنہ لب ہے۔ مگر
دور تک کوئی سایا نہیں
ہم نشیں !
کیوں نہ دو خوبصورت پرندوں کی مانند ہم بھی کہیں
شہر سے دور چل کر
کسی کنج تنہائی میں ڈھونڈھ لیں
سبز پتوں کا گھر

———— ————

رپورتاژ

عبدالرحیم نشتر

چہرہ ——— چہرہ

جناب کلام حیدری صاحب

آداب ونیاز

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ سہ روزہ سفر و قیام کی شعوری واردات اور سارے واقعات نیز تاثرات میں نے رپورتاژ کی شکل میں قلمبند کیا ہے۔ اسے ڈاکٹر اخلاق اثر (بھوپال)، اور محمود سعیدی نے پڑھا ہے اور ہر دو صاحبان نے اسے بہت سراہا۔

آہنگ اور مورچہ کا پرانا قلم کار ہوں، اس لئے چاہتا ہوں کہ میری یہ نثری تخلیق "آہنگ" کے ذریعہ سب کے سامنے آئے،

میرے کسی دوست نے کہا تھا کہ چونکہ آپ ترقی پسند ادیب ہیں اس لئے اس رپورتاژ کو شائع نہیں کریں گے لیکن میرا خیال ہے آپ ایک منصف اور کھلی آنکھ کے ادیب ہیں اور ادارت کے فرائض نبھاتے ہوئے آپ کی شخصیت پر کسی تحریک کی چھاپ یا دباؤ نہیں ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ اس رپورتاژ کو ضرور شائع کریں گے۔

اپنی رائے سے بے لاگ رائے سے ضرور نوازیں ویسے تو آپ کا خط کبھی نہیں پایا ہے، اس بار شاید یہ آرزو کی تکمیل ہو سکے، امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص — عبدالرحیم نشتر

بھائی۔ سلام علیک

آپ کا رپورتاژ آپ کے خط اور اس خط کے نوٹ کے ساتھ شائع کر رہا ہوں، اس لئے نہیں کہ اسے ڈاکٹر اخلاق اور محمود سعیدی کی پسندیدگی کی سند حاصل ہے اور نہ اس لئے کہ میں خود کو "ایک منصف اور کھلی آنکھ کا ادیب" ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ ترقی پسندی انصاف اور کھلی آنکھ رکھنے میں کبھی حائل ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے۔ میں ترقی پسند ادبی تحریک کی دین کا معترف ہوں، میں اس کے تعصب سے واقف ہوں، میں ان افراد سے بھی واقف ہوں جو ترقی پسند ادب کی بجائے ترقی پسندی کے بل پر منصب اور انعامات سے لیکر آسائشوں تک پہونچے ہیں لیکن اس سے کسی ادیب و شاعر کو کیا؟ بہت سے لوگ دوسرے ذرائع اور راستوں سے آسائشوں تک پہونچے ہیں۔ ان کا ذکر ادباء و شعراء کہاں کرتے ہیں؟ ادب میں کوئی سیڑھی اوپر جانے کی نہیں ہے تو تحقیقات کی سیڑھی کے کوئی طلسم منتقل نہیں ہو سکتا۔

نامرئی نہ روسی نہ چینی (لو)

آپ کے رپورتاژ پر تبصرہ قارئین کا حق ہے لیکن ان تک اس کو پہنچا رہا ہوں اور اس سے مجھے جو لذت ملی ہے وہی اس کی اشاعت کی تنہا سفارش ہے۔

آپ کا ——— کلام حیدری

[illegible] کا وہ جہاں آنکھوں کے سامنے
[illegible] کتنی کہانیاں بن گئیں مجھے شہر طلسم
[illegible] یہاں کتنا ابھر رہا ہے ۔ ہر کہیں ایک
[illegible] یہاں کیسا ہے ۔ پتہ نہیں تم سے شہر میں
[illegible] یہ یا یہ محض میرا گمان تھا ۔

بمبئی، کلکتہ، بھوپال، دہلی سب ایک جیسے ہیں، دور
[illegible]، حسین، دلکش اور اپنی طرف کھینچنے والے عجیب
[illegible] بے ہنگم، بہت سا کیا دینے والے ۔
[illegible] شاہراہوں کے کنارے جہاں تو نئی طرز کی
[illegible] نیک عالیشان! او پھر سارا شہر جادو کا،
[illegible] اونچا اور پر کشش ۔ لمبی لمبی چوڑی
[illegible] سڑکوں پر ٹراموں، بسوں، رکشوں، تانگوں
[illegible] کا بھاری بوجھ!

[illegible] والوں کا ہجوم اور شور و غل سے گونجتے ہوئے
[illegible] شانے سے شانے ٹکراتے ہیں ۔ اور کھوے سے کھوا چھلتا
ہے ۔ ننگے بدن جوان اور رنگ رنگ کی لڑکیاں ۔ اسکرٹ!
ساڑیاں اور بیل باٹم!!

[illegible] زدہ سا آتی جاتی اور کھلی لڑکیوں میں اتر
رہا ہوں ۔ اچانک کسی نے میری بش شرٹ کو کھینچا ۔ میں جھلا کر
پلٹا ۔ ایک چھوٹا سا بچہ، پھٹی پرانی قمیص، سر میں کنگھی تیل
نہیں ۔ میلا کچیلا چہرہ ۔ دبلا پتلا جسم ۔ جلد سے جھانکتی ہوئی
ہڈیاں اور پھیلا ہوا دست سوال ؟

آزاد ہندوستان کی ننگی تصویر ۔۔۔!
[illegible] زندہ آزاد ہندوستان ۔۔۔!!
نئی دہلی کتنی خوبصورت ہے ۔۔۔ کناٹ پلیس
[illegible] ہے ۔ ریزرو بینک ۔۔۔ ریڈیو
اسٹیشن ۔۔۔ پارلیمنٹ ہاؤس ۔۔۔ اور دوسری
[illegible] ۔۔۔ جن کے نام بھی مجھے معلوم نہیں ۔ میں
ان کے بیچ مسرت خیز استعجاب لیے کھڑا ہوں اور وہ ننھا سا بہت
سوال میری آنکھوں کے آگے پھیلا ہوا ہے ۔ نئی دہلی میں یہ
کیسا نیا شہر آباد ہو گیا ۔۔۔ ؟ اطراف و جوانب میں پھیلتا
ہوا نیا شہر ۔۔۔!

میں پرانے پن سے اکتایا قلم کار ۔۔۔ اس وقت بڑی
کوفت محسوس کر رہا ہوں پچیس برس پرانی دہلی پانچ برس کے نئے
قالب میں سامنے آ گئی ہے اور میں اسے دھتکار کر ریڈیو اسٹیشن
کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا ہوں ۔

مدحت میرے ساتھ ہیں ۔ وہ اجازت نامہ بنواتے ہیں
اور پھر ہم دونوں مختلف کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے
نیوز پہنچتے ہیں ۔ ہندی یونٹ ۔۔۔ فارسی یونٹ ۔۔۔
اور پھر آتا ہے وہ کمرہ جس کے دروازے پر اردو یونٹ کی
تختی لگی ہوئی ہے ۔ ہم دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں ۔ بائیں
جانب کی آفیسر کرسی خالی ہے ۔ خالی کرسی کے سامنے بڑی سی میز
۔۔۔ مختلف فائلوں سے لدی ہوئی ۔ میز کے سامنے ملاقاتیوں
کے لیے لگی ہوئی چار کرسیاں ۔ ایک کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا ۔
بیر سلے اجنبی ۔ پیروں میں [illegible] ۔ تھکا ہوا چہرہ ۔ بکھرے
ہوئے بال ۔ بیٹھے ہوئے شخص کے دائیں ہاتھ پر تین میزیں ۔
پہلی میز کے اس طرف ایک خوبرو چہرہ، لمبے بال ۔
درمیانہ قد، لبوں میں سگریٹ پھنسی ہوئی اور اڑتے
ہوئے دھوئیں کے مرغولے ۔

"عتیق صاحب نہیں آئے ؟" میں نے سوال اچھالا ۔
خوبرو چہرہ خاموش ہے لیکن نووارد چہرہ میری طرف
مڑا ہے ۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں ؟"

"بھنڈارہ سے ۔"

"بھنڈارہ ۔۔۔!" نووارد چہرہ سوچ میں
ڈوب گیا ۔

"عبدالرحیم نشتر تو نہیں؟"

"جی ہاں اور آپ"

"میں رئیس فراز ہوں"۔

اور پھر ہم دونوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ شب خون اور فاروقی صاحب کی خیریت پوچھی گئی وہ آہستہ آہستہ میری باتوں کا جواب دے رہے ہیں۔ پھر اتنے میں عتیق صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہیں میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ دو صاحبان اور داخل ہوتے ہیں، دونوں مسکراتے ہوئے چہرے میرے لئے اجنبی ہیں۔

عتیق صاحب بڑے پریشان سے ہیں۔ ماتحت ریڈیو اسٹیشنوں سے کنٹرکٹ موصول نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کبھی اٹھتے ہیں۔ کبھی بیٹھ جاتے ہیں۔ زبیر رضوی اپنی کرسی سے غائب ہیں اور ان کا کام بھی عتیق صاحب کو کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ مجھ سے اور مدحت سے کانٹرکٹ لے کر نیچے چلے جاتے ہیں۔

پھر زبیر صاحب کے آتے ہی کمرے میں جیسے شگفتگی آگئی ہے۔ میری ان کی ملاقات کامٹی کے ایک مشاعرے میں ہو چکی تھی۔ وہ میری خیریت دریافت کر رہے ہیں۔ مدحت سے حال پوچھ رہے ہیں اور شاہد کبیر کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔ اس اثنا میں اردو یونٹ میں خاصی رونق ہو گئی ہے۔

محمود ہاشمی اور فضیل جعفری اپنی اپنی سگریٹ اور پائپ سے دھواں چھوڑ رہے ہیں۔ عتیق اللہ، ممتاز راشد، اور زبیر رضوی آپس میں محو گفتگو ہیں۔ میں اور مدحت بور ہو کر باہر نکل آئے ہیں، رئیس فراز بھی ساتھ ہو لئے ہیں مدحت پان کے لئے بے چین ہے اور رئیس فراز کو چائے کی طلب ہے۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہل کر ہم پھر کمرے میں آگئے ہیں۔ زبیر فون پر ہیں۔ کسی کو اطلاع دی جا رہی ہے کہ محمود ہاشمی بھی مشاعرہ پڑھ رہے ہیں۔ غالباً ان کے لئے یہ پہلا کا تجربہ ہے۔ مگر وہ من موجی کہیں نیچے اتر گیا ہے۔

عتیق صاحب نے ساری دفتری کارروائی مکمل کر لی ہے ہم لوگ واپسی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور زبیر کہہ رہے ہیں کہ وہ چھ بجے "نانہ ہوسٹل" پر گاڑی بھیج دیں گے تاکہ ہم سب ایک ساتھ ایوانِ غالب پہنچ جائیں۔

ممتاز راشد، رئیس فراز، میں اور مدحت نئی دہلی کی سڑک پر پیدل ہی نکل چلے ہیں۔ ممتاز نے چائے پلانے کا وعدہ کیا ہے اور چائے کی تلاش میں ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ چائے پی کر ممتاز کہیں اور نکل گئے ہیں اور ہم تینوں نے دریا گنج کے لئے آٹو رکشہ کر لیا ہے۔

آٹو پھڑپھڑاتا ہوا آگے نکلا جا رہا ہے اور مناظر پیچھے چھوٹتے جا رہے ہیں۔ زندگی لمحہ لمحہ گھٹتی جا رہی ہے اور ہم یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہماری عمر بڑھتی جا رہی ہے۔

دو رویہ اشجار،
مئی کی دھوپ،
تارکول کی طویل رہ گزر
آتی جاتی سواریوں کا شور
فٹ پاتھ پر اٹھتے ہوئے، گرتے ہوئے ہزاروں قدم
اور کہیں دور ——— کسی تالاب کے کنارے ———
ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتا ہوا میں۔
دھیرے دھیرے ڈوبتی ہوئی شفق اور مجھے چاروں طرف سے گھیرتی ہوئی شام!

اچانک دیئے سے جل جاتے ہیں۔

آٹو رکشہ ایک جھٹکے کے ساتھ رکتا ہے اور مجھے اپنی پشت پر ایک لطیف سا لمس محسوس ہوتا ہے۔ میں پیچھے مڑتا ہوں۔ ارے ——— میں تو اس لڑکی کو بھول ہی گیا تھا۔

[illegible] ہے۔ آدمی اپنے خوابوں میں ایسا کھو
جاتا ہے کہ [illegible] سے بکھری ہوئی حقیقتوں کا بھی علم نہیں
[illegible] عجیب مخلوق ہے!

بھوپال تال کے کنارے بھوری بھوری شام ہے۔۔
[illegible] پانی میں اتر رہا ہے اور ہلکی ہلکی لہر دل میں
[illegible] میں ترتیب ہوئی دور تک چلی جا رہی ہے
کہاں نئی دلی کی بھری پڑی سڑک اور کہاں بھوپال کی مدھ بھری
شام [illegible]؟ ہم لوگ دریا گنج کے کسی چوراہے پر اتر
گئے ہیں۔

[illegible] کی مدد سے وحدت اور فراز چلے جا رہے ہیں
اور [illegible] کسی کے گرم گرم رخسار میرے گالوں سے مس
ہو رہے ہیں۔ میں "جولی" کا بڑا سا ہوس فیز پوسٹر دیکھتے دیکھتے
آگے نکلا جا رہا ہوں۔ کبھی بھیڑ میں کھو سا جاتا ہوں کبھی بھیڑ سے
الگ نکل آتا ہوں۔ فراز کی انگلی میرے ہاتھوں میں ہے اور
وہ "اے یار" "ارے بھائی" کرتا ہوا لپک جھپک چلا
آ رہا ہے۔

ناز ہوٹل پہنچ کر ہم نے سکھ کا سانس لیا ہے ناز کے
پہلو میں وکیل ہوٹل ہے۔ روم نمبر بارہ میں فضیل جعفری اور
[illegible] راشد کا قیام ہے اور اب رئیس فراز کا بھی اضافہ ہو گیا ہے
پہلی منزل میں عتیق اللہ اور ندا فاضلی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تیسری
منزل پر قیصر شمیم اور خلیل تنویر نے ڈیرا ڈالا ہے۔

وحدت نے اظہار اثر اور عبداللہ کمال کی باتوں میں
آ کر ایک خاصا شاندار اور آرام دہ کمرہ بک کر لیا ہے۔ کرایہ کی
[illegible] اونچی ہے۔ اتنی رئیسی کا مظاہرہ صرف ہم دو احمقوں
سے سرزد ہوا ہے اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عتیق اللہ جہاں کہیں
ہمیں دیکھتے ہیں "سرمایہ دار" کا تمغہ سجا دیتے ہیں اور ہمیں جھینپ
مٹانے کے لئے ہنس دینا پڑتا ہے۔

میں سوچتا ہوں ہم کیسے انحراف پسند ہیں۔ ہم تو
ڈرائنگ روم کلچر سے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ وہی آداب
نشست و برخاست۔ وہی رسمی گفتگو۔ وہی جھوٹا تبسم
کھوکھلی ہنسی اور بے روح لفظیات ہم کتنے مہذب ہیں۔۔؟

کل ۱۶ مئی شام کی سہ پہر کو محمود سعیدی نے ایک نظم
سنائی۔ "بند دشک کی موت پر دو لفظ" اس میں کہا گیا ہے
کہ ہم نے اپنی کینگی اور سنا بری کو مصنوعی تہذیب کے غلاف
میں لپیٹ رکھا ہے ہم بہت پہلے مر چکے ہیں لیکن یہ سوچ کر
خوش ہیں کہ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔

اس وقت مجھے وہ نظم رہ رہ کر یاد آ رہی ہے۔

جدیدیت انحراف پسندی کا رجحان ہے۔ سیاست،
مذہب اور عقیدے سے انحراف جدید ذہن کی پہچان مگر عمیق
حنفی کی اسلام پرستی اور کمار پاشی کی دیو مالائی سلام مذہب
سے انحراف تو نہیں؟ محمود سعیدی، شاذ تمکنت، مظفر حنفی
اور دیگر شعراء کے یہاں روایتی اسلوب ایک عقیدے کی
طرح موجود ہے اور بیشتر جدید فنکاروں کے گفتار و
کردار کا تضاد بتاتا ہے کہ وہ سیاست سے بھی کنارہ کش نہیں
ہوئے ہیں۔ ویسے بھی سیاست اور مذہب دو ایسے دھارے
ہیں جن سے کوئی بشر کسی طرح نہیں کٹ سکتا۔ کسی نہ کسی سطح پر
ہیں اسے ان عوامل کا ایک حصہ بننا ہی پڑتا ہے تو کیا جدیدیت
بھی محض نعرے بازی اور لیبل سازی کا فیشن ہے۔۔۔؟

بات نکلی ہے تو محمود صاحب کمزور پہلوؤں کا اعتراف
کرتے ہوئے جدیدیت کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی بھی
کرتے رہے۔ میں نے ان سے پوچھا آج جب کہ نئی نسل اردو
درس و تدریس سے دور ہوتی جا رہی ہے جدیدیوں کی
لسانی توڑ پھوڑ کی کوشش کس حد تک لائق تحسین ہے؟"
انہوں نے جواب میں افتخار جالب اور ظفر اقبال کی لسانی
توڑ پھوڑ کو سعی رائیگاں سے تعبیر کیا ہے مگر بعض حالات میں
اسے ناگزیر بھی گردانتے ہیں۔

میں نے کہا "اگر آپ اسے مناسب سمجھے تو کیا وجہ ہے [illegible] میں بعض اوقات بے سر دیا نظمیں بھی چھاپ دیتے [illegible]؟"

وہ خود اکھل کر مسکرا دیتے ہیں۔

"بھئی بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے نوجوان قلم کار بہت جوشیلے ہیں اگر انہیں چھاپا نہیں جاتا تو وہ ایک ٹولی بنا لیتے ہیں۔ اور مل جل کر ایک جدید رسالے کا اجراء کر دیتے ہیں آج کل ادبی رسائل کی حالت یوں بھی ناگفتہ ہے اور ان کے پڑھنے والے وہی لوگ ہیں جو ان میں چھپتے ہیں، اگر یہ بھی رشتہ توڑ لیں تو کوئی ادبی رسالے چلے کس طرح؟"

اور مجھے یاد آگیا کہ پچھلے چند برسوں میں کئی چھوٹے موٹے جدید رسالوں کا اجراء ہوا تھا جو سال چھ مہینے چلنے کے بعد ناپید ہو گئے۔

ساتھ ہی مجھے کتاب (لکھنؤ) کے بند ہونے کا خیال آیا۔ میں سوچتا ہوں کتاب تو خالص ترقی پسند فکر و نظر کا ہمنوا ہے اسے کیوں بند ہونا پڑا؟ کیا ترقی پسند بھی اندر ہی اندر ٹوٹ رہے ہیں۔ اس وقت مجھے سجاد ظہیر اور مہندر ناتھ کی یاد آگئی ہے۔ جب بنے بھائی نے سماج واد کا پرچار کیا تو مہندر جی نے کہا۔ "بنے بھائی! آپ جن لوگوں کے لئے بات کر رہے ہیں ان کا "سماج واد" تو کب کا آچکا۔ اب تو ہمارے سماج واد کی فکر کیجئے۔"

جان نثار اختر، ڈاکٹر اخلاق اثر، اجلال مجید نیز دو صاحبان اور بیٹھے ہیں۔ یہ بھوپال کی بات ہے۔ اور ندا فاضلی بنے بھائی اور مہندر جی کی ملاقات کا چٹ پٹا حال سنا رہے ہیں یوں بھی ندا بڑے چٹ پٹے آدمی ہیں ان کے ساتھ رہیں تو وقت بڑا اسبار رفتار ہو جاتا ہے۔ کب کتنا بیت گیا پتہ ہی نہیں چلتا۔

میں رئیس فراز اور مرحت کے ساتھ "مکتبہ شاہراہ" کی سڑک سے گزر رہا ہوں۔ اچانک نظر مکتبہ جامعہ میں

[illegible] جاتی ہے [illegible] کا [illegible] نظر [illegible] بھی [illegible] ہیں جو [illegible] داخل ہو رہا ہوں [illegible] گیا ہے اور [illegible] کا دفتر کھل گیا ہے۔ [illegible] بھی کر رہے ہیں۔ نداکا [illegible] ہو رہا ہے اور [illegible] ٹیکسی کے لئے پریشان ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی [illegible] بھی "ٹیکسی" کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ [illegible] "انتظام" [illegible] ہو رہے ہیں۔ پھر وہ [illegible] کے ساتھ [illegible] گیٹ کی طرف نکل گئے۔

رئیس فراز ہوٹل کو لوٹ گئے اور میں مرحت کے ساتھ "دفتر ہماری زبان" میں جا دھمکا ہوں اردو گھر کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ دفتر ہماری زبان کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ صدر دروازے کے پاس ایک عارضی کمرہ تیار کیا گیا ہے۔ یہاں عبداللہ کمال مع اپنی نائب ادارت کے کرسی نشیں ہیں اور زیر تعمیر اردو گھر کے ایک کمرے میں خلیق انجم اپنی کرسی میں پریشان سے دھنسے بیٹھے ہیں۔ ہونٹوں میں سگریٹ، ہاتھوں میں فون۔ کبھی فائلوں سے الجھتے ہیں۔ کبھی کاتب سے۔ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کرنا ہے؟ ہر بات کی فکر، ہر کام کی سوچ۔

میں اچانک جا دھمکا ہوں۔ وہ پہچان نہیں سکے ہیں۔

"کیوں۔ پہچانا نہیں؟ عبدالرحیم نشتر!"

"ارے ہو آپ"۔ وہ ایک دم اچھل پڑے ہیں "آپ مرحت الاختر ہیں؟"

"اچھا اچھا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

پھر حسب دستور تکلفات، چائے نوشی، مزاج پرسی وغیرہ وغیرہ

عبداللہ کمال اپنی کوئی مشکل لے کر آگئے ہیں وہ دونوں ڈسکس میں مصروف ہو گئے ہیں اور میں پورے

[illegible] ہوتی ہے۔ اور شفیق صاحب
[illegible] اور ہم دونوں مسرت خیز تحیر کو
[illegible] ۔ ہم صرف تحریر آشنا تھے۔ صورت
[illegible] ۔ عبداللہ کمال بھی لکھتے ہیں اور پھر جلے ہوتا
[illegible] کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ وہ مصر ہیں کہ ہم ان
[illegible] کریں۔

[illegible] خلوص اور محبت کا اعتراف کرتے ہوئے
[illegible] کی تعمیل کے ناقابل پا رہا ہوں۔ پھر بہت
سا [illegible] ۔ الہ آباد کی، کانپور والا بھی کی شمس الرحمن
فاروقی، نظام صدیقی، عربی یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو،
اردو اکیڈمی فرش پاؤں کا دائرہ پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔
اور ہم اظہار اثر کے گھر نہیں جا رہے ہیں یہ راستہ تمام دوستوں
تمام دشمنوں، تمام آشناؤں اور نا آشناؤں کی طرف
جا رہا ہے۔

اس شام کی رسائی کہاں تک ہے ——— ؟
اس شام کی رسائی کہاں تک نہیں ہے ——— ؟
ایسی شامیں بار بار نہیں آتیں ہاں بار بار یاد ضرور
آتی ہیں۔

پھر وہ سے چراغ جلاتی ہوئی۔
یادوں کے ایاغ چھلکاتی ہوئی۔
[illegible] کے سیڑھی سے اترتے ہی ایک بڑا سا پوسٹر
[illegible] تھا۔ حکیم فلاں ابن فلاں ——— گپت روگوں کے
ماہر [illegible] ——— اولاد، صحت اور جوانی ———
صحت [illegible] ——— تو دن میں مکمل علاج۔ پھر اس
[illegible] شہر جگہ جگہ دکھائی دیئے اور میں سوچنے لگا
[illegible] کیا سوچتے ہیں ؟
[illegible] ساتھ [illegible] حیرت کی انتہا نہیں رہی میں نے
[illegible] ایک بورڈ [illegible] اظہار اثر کا نام جو باہر پڑھتا آ رہا

ہوں سب شمار جاسوسی ناول اور رومانی افسانوں کے
مصنف ——— میں سمجھتا تھا وہ بوڑھے ہیں تو ادھیڑ
عمر کے ضرور ہوں گے۔ مگر یہاں تو سامنے ایک ایسا نوجوان
جوان ایستادہ ہے جو تیس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا۔
عبداللہ کمال نے تعارف کرایا تو وہ بڑے خلوص سے ملے۔
پہلے تو انہوں نے ان سقوں سے پانی پلوایا جو کٹورے بجانے
میں اپنا جواب نہیں رکھتے پھر وہ ہمیں مینا بازار کی طرف
لے چلے۔

مینا بازار کیا اسی جگہ کا نام ہے ؟
میں حیران رہ گیا۔

مینا بازار کا سارا تاریخی حسن اور تاریخی شہرہ
نابود ہو گیا ہے جہاں کبھی مغل شہزادیاں اور مملکت کی
رئیس زادیاں اپنے حسن و جمال کی تابانیاں بکھیرتی رہی ہوں گی
وہ اب اس طرح اجڑا اجڑا سا ہے جیسے کسی بیوہ کا دل ہو۔
یہاں اظہار اثر ہمیں چاٹ پلاتے رہے۔ پھر وہ اپنے
کمرے کی طرف لے چلتے ہیں۔ پورا کمرہ جاسوسی ناولوں
سے بھرا پڑا ہے۔ ایک الماری انسائیکلوپیڈیا کی جلدوں
سے بھری ہے۔ میز پر مجرم اور دوسرے جاسوسی ماہنامے
رکھے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی میز کو وہ صاف کرتے ہیں
اور پھر سوڈے کی بوتل منگائی جاتی ہے۔ برف انڈیلی جاتی
ہے اور ....

تو یہ اظہار اثر کی صحت کا راز ——— ادھر
اظہار صاحب نے جدیدیت کا روگ بھی پال لیا ہے۔ غزلیں
بھی کہہ رہے ہیں اور غزل کی تنقید بھی لکھی جا رہی ہے ———
آنکھیں ذرا گلابی ہوئیں تو سر میں شاعری کا سودا سمایا۔
اصرار ہوا کہ تازہ کلام سنایا جائے۔ میں نے طویلے کی بلا
بندر کے سر منڈھ دی ہے۔
چالو ہو جاتا ہے ابتدا اظہار اثر نے کی۔ سائنسی موضوعات

بہت اچھے اشعار سنائے اس کے بعد عبداللہ کمال کی باری تھی۔ کمال جتنے ہی سنجیدہ اور سنیئر اپنی باتوں سے لگ رہے تھے وہی سنجیدگی اور متانت ان کی شاعری میں بھی دکھائی دی۔ مدحت الاختر نے دھیمے دھیمے لہجے میں چھوٹی بحر کی دو غزلیں سنائی۔ سلیم شیرازی کے یہاں شدری لہجہ تھا۔ ان کی غزلوں سے نسائیت جھلک رہی تھی۔

میں نے نظمیں ختم کیں تو رات بھیگ چلی تھی۔ اور جب رات بھیگنے لگتی ہے .... میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ رات؟ اندھیروں کی آماجگاہ۔ اندھیرا ــ؟ گناہوں کی ترغیب دینے والا شیطان۔ اندھیرا ـــ! جس کے پہلو میں جھونپڑیاں سوتی ہیں اور فلیٹ جاگتے ہیں سلگتا ہوا دن تھک کر سوتا ہے اور بھڑکتی ہوئی رات سلگ سلگ کر بھی جاگتی ہے

یہ ایک تھکا ہوا دن تھا۔ بستر پر گرتے ہی نیند نے مجھے دبوچ لیا۔

۱۷ مئی ۸۵ء کی صبح گیارہ بجے نمودار ہوئی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا تو سورج کی ایک بھی شعاع نہ تھی۔ ساری شعاعیں تارکول کی سڑکوں اور دریا گنج کی دکانوں کو منور کر رہی تھیں۔ روشنی کا غسل کرنے کے لئے میں باہر نکل آیا مدحت کو شکایت ہے کہ پیدل چلا چلا کر میں نے اس کی ٹانگوں کا کچومر نکال دیا ہے۔

"کتنے نازک ہو میری جان"

میں اسے چھیڑتا ہوں اور وہ جھلا کر پان کے ٹھیلے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں کا مٹی کے پانوں جیسا لطیف ذائقہ نہیں۔ جو پان کی مٹی میں پانچ پیسوں میں مل جاتا ہے نئی اور پرانی دہلی میں تیس پیسوں میں بھی نہیں ملتا۔ پھر ایک تکلف ہے یہ لوگ پان کا جوڑا بنا کر دیتے ہیں۔ اوپر تلے پان رکھتے ہوئے میں نے منہ کھولا تو کتھے کی دو بوندیں قمیص پر ٹپک گئیں اور سفید قمیص سینے کے پاس سرخ ہو گئی۔ مدحت پان کو منہ میں دبا کر مسکراتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

"پان کھانے کی ہوس ہے تو دہن پیدا کر"

فٹ پاتھ پر گندی کتابوں کا ڈھیر لگا ہے۔ بیل باٹم میں ملبوس گیسو دراز چھوکرے آتے ہیں۔ ٹھیرتے ہیں۔ کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے ہیں اور پھر دائیں بائیں دیکھ کر ایک آدھ ناول خرید لیتے ہیں۔ کتابوں کے اس ڈھیر میں باقی کا حرف معتبر، ندا کی ملاقاتیں، زبیر کی خشت دیوار، کرامت علی کی شعاعوں کی صلیب، راجندر بیدی کی چادر میلی سی اور دوسری خالص ادبی کتابیں نظر آ رہی ہیں مگر انہیں کوئی نہیں پوچھتا لے جانے والے اظہار اثر کے جاسوسی ناول خریدتے ہیں یا پھر حسینہ کانپوری کے چٹ پٹے گرما گرم ناول۔

میں بکتی ہوئی کتابوں کے کم ہوتے ہوئے ڈھیر کو دیکھ رہا ہوں اور دیوار پر لگے ہوئے "مقتل مشورہ" کے اشتہار کو بھی۔ شب خون مشکل سے نکلتا ہے۔ کتاب بند ہو گیا۔ سطور بند ہو گیا۔ پیکر بند ہو گیا۔ شعر و حکمت کی بھی یہی خبر ہے اور دوسرے ادبی رسائل کا حال بھی دگرگوں ہے۔

"بھائیو! ادبی رسالہ بند کر دو۔ شمع اور روبی نکالو جاسوسی ناول چھاپو اور گرم مسالہ بیچو۔ اردو قاری کا ذوق تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔ اور پھر جدیدیت کی آڑ میں صلاح الدین پرویز جیسے لوگ جس قماش کی نظمیں لکھ رہے ہیں تو کیا برا ہے جو اس طرح کے ناول بھی لکھے جائیں۔ کیا حسینہ کانپوری بھی جدید نہیں ہے؟

چلتے چلتے ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ سامنے والا راستہ شادھی کی طرف جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے آتی جاتی سانسوں کے ہجوم میں ہم چلتے ہی جاتے ہیں۔ اس

انتظام کرنے میں مصروف ہیں۔ اسپیکر سے کسی مغنیہ کی مدھر آواز سارے ہال میں گونج رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ مشاعرہ شروع ہو ہم سب گرین روم میں پہنچا دیئے گئے ہیں۔ کوکا کولا کی چسکی لیتے ہوئے آزاد گلاٹی میرے قریب کھسک آئے ہیں۔ ہم دونوں ٹوٹ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ باتوں کا دائرہ پھیلایا جائے کہ قیصر قلندر صاحب نے ڈائس پر آنے کی درخواست کر دی ہے ہم سب اسٹیج پر شوکیس کے مجسموں کی طرح سج گئے ہیں۔ سامنے سننے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ اعلیٰ آفیسروں کے علاوہ مرکزی وزیر جناب اندر کمار گجرال صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔

سردار جعفری نے مسندِ صدارت سنبھال لی ہے اور اب وہ اپنی صدارتی تقریر سے مشاعرے کا آغاز فرما رہے ہیں۔

پدم شری سردار جعفری مائیک پر ہیں۔

غالی ترقی پسند سردار جعفری مائیک پر ہیں۔

گجرال صاحب کے دوست سردار جعفری مائیک پر ہیں

مختلف ادبی، تہذیبی، اور سماجی تنظیموں کے روحِ رواں سردار جعفری مائیک پر ہیں۔

جدیدیت کے مخالف سردار جعفری مائیک پر ہیں۔

اور ایک زبردست مقرر سردار جعفری مائیک پر ہیں۔

اور یہ تو تقریر کا بہترین موقع ہے ——— !

اور میں سوچ رہا ہوں یہ ایک چہرہ ہے یا چہروں کا سلسلہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنی بے چہرگی کو چھپانے کے لئے رنگ رنگ کے مکھوٹے پہنتا ہے اور اتارتا ہے۔ لکھنؤ کی جگمگاتی جاگتی راتیں ——— میلوں پیدل چلتی ہوئی سڑکیں ——— مجاز کے نغمے ——— پتھر کی دیوار ،، ایشیا جاگ اٹھا، پیراہنِ شرر بمبئی ——— سونا اگلتی ہوئی زمین ——— خوب صورت فلیٹ ——— اعلیٰ سوسائٹی ——— فلمی دنیا ——— صحافت

——— ادب ادب ——— [illegible]

کے سوا۔

اس وقت مرحت کا شعر یاد آرہا ہے

ہمارا جھوٹ بھی شامل نہ ہو بزرگوں میں
سنا گئے ہیں وہ قصے کہ اور کیا کہئے)

جعفری صاحب کہہ رہے ہیں

"آج کے مشاعرے میں وہ فن کار شریک ہیں جن کی پیدائش ۱۹۶۰ء کے بعد ہوئی ہے۔ ان کا لہجہ نیا ہے۔ اسلوب نیا ہے علاوہ موضوعات نئے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ انہیں پسند کریں یا یہ لوگ آپ کی سمجھ میں نہ آئیں پھر بھی ان کے تجربے کی قدر کرنی چاہئے انہیں سننا چاہئے۔"

وہ کہہ رہے ہیں۔

"آج سے تیس سال پہلے علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس میں ان کے علاوہ اختر الایمان، کیفی اعظمی، مجاز، جاں نثار اختر اور جذبی نے شرکت کی تھی۔ اس وقت یہ سارے نام نئے تھے۔ ایک عمر اور ریاض کے بعد ان ناموں کو اعتبار حاصل ہوا ہے۔ آج کے نئے فن کار بھی معتبر ہوں گے مگر اسے ایک عرصہ لگے گا۔"

اس کے بعد وہ جدیدیت پر اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے ہیں اور جیسا کہ ان سے توقع رکھنی چاہئے تھی انہوں نے وہی ساری باتیں دہرائی ہیں۔ ان کی نظر میں جدید شاعری بے گانگی کی شاعری ہے۔

جعفری صاحب ان خیالات کا اظہار اس سے پہلے بھی ایک دو جلسوں میں کر چکے ہیں۔ یہاں انہوں نے مخلص لفظوں کا سہارا لیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ ان کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔

سامعین نے خلیل تنویر، قیصر شمیم، حسن کمال، نزہا اعظمی

[illegible] یوسف جمال کو تو بڑے
[illegible] نے اپنی علامتی
[illegible] سامعین میں سے بیشتر حضرات الف
[illegible] داری جو بہت ہی زندہ دل، کاظم
[illegible] قسم ہیں۔

[illegible] ہوئی ہے۔ صدارت اور نظامت
[illegible] صاحب کا قبضہ ہے مگر وہ انہیں استعمال
[illegible] ہیں۔ وہ سامعین کو نہ مشاعرے کے آداب یاد
[illegible] ہیں نہ انہیں ہوٹنگ کرنے سے روک سکتے ہیں۔ ایسا لگ
[illegible] رہا ہے وہ جعفری صاحب کے حسب
[illegible]

[illegible] نہیں آئے ہیں پیچ و تاب کھا رہے ہیں
[illegible] صحیح سلامت لوٹ آئے ہیں وہ اطمینان کا سانس
لے رہے ہیں۔ آوازیں لگ رہی ہیں اور برجستہ جملے کسے
جا رہے ہیں۔ کمار پاشی کا موڈ بہت خراب ہے، ندا فاضلی پہلے
[illegible] ہیں، [illegible] راشد بھی ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ فضیل
[illegible] مع الصابرین کی تصویر بنے بیٹھے ہیں

[illegible] کا نام پکارا گیا۔ درمیانہ قد، اچھی صحت،
پکا چہرہ۔ دونوں ہاتھ ادھر ادھر پھینکتے ہوئے وہ مائک
پر [illegible] ہیں جیسے اکھاڑے میں کوئی پہلوان اترا ہو۔
سامعین میں سے مولا بخش سنگھ نے آواز لگائی، "ترنم سے
[illegible]"

[illegible] جعفری نے بھی آواز ملائی۔
"[illegible] ترنم سے"
[illegible] راشد بھڑک گئے ہیں۔ ہوا میں ہاتھ لہراتے
[illegible]
"نہیں —— ترنم سے نہیں پڑھوں گا۔"
سامنے [illegible] گئی ہے۔

"پڑھے گا۔ پڑھے گا۔ راشد وا ترنم سے پڑھے گا۔"
ایوان غالب قہقہوں سے گونج اٹھا ہے۔ اور جب
راشد نے ترنم بکھیرا ہے تو اس کی آواز ساری آوازوں پر
چھا گئی ہے۔ ہال خاموش ہے اور ممتاز راشد کامیاب لوٹ
آئے ہیں۔

فضیل صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ ترنم ترنم کی آوازیں
اٹھیں مگر وہ شور سے بے پروا اپنی غزلیں سناتے ہیں اور لوٹ
جاتے ہیں۔ اتفاق سے ہال میں کہیں زبیر رضوی آ گئے ہیں۔
چاروں طرف سے شور اٹھا: "زبیر کو بلاؤ۔ زبیر کو بلاؤ"
جعفری صاحب اعلان فرماتے ہیں کہ آج کے مشاعرے میں
زبیر صاحب نہیں پڑھ سکتے۔ کسی نے آواز لگائی۔
"کیسا مشاعرہ ہے؟ آپ نے شاعروں کو تو بلایا ہی
نہیں۔"

پھر ناہید زیدی کھڑی ہوتی ہیں۔ پھر شہریار پڑھتے ہیں۔
کمار پاشی کے بعد مجھے اور میرے بعد مدحت کو بلایا گیا ہے
اور پھر بلا کسی تنقید و تبصرہ کے مشاعرے کے اختتام کا اعلان
کر دیا گیا ہے۔

باہر نکلتے ہی بانی اور کنور سین نے جعفری صاحب کو
گھیر لیا ہے۔ بانی بہت غصے میں ہیں۔ وہ جعفری صاحب کے رویہ کی
سخت مذمت کر رہے ہیں اور یہی عالم کنور سین کا بھی ہے۔
ریڈیو والے بوکھلائے ہوئے پھر رہے ہیں۔ زبیر رضوی اور
محمود ہاشمی نے ہمیں ایک طرف ہٹا لیا ہے اور ادھر ادھر کی
باتوں میں الجھا رکھا ہے۔ بانی اور کنور سین اپنی بھڑاس نکال چکے
ہیں پھر بھی ان کا غصہ کم نہیں ہوا ہے۔ ہم سب واپس ہو رہے ہیں
گاڑی میں بہت سارے لوگ ہیں۔ کچھ بالکل خاموش
ہیں اور کچھ بہت باتیں کر رہے ہیں۔ جلتے بجھتے قمقموں کے بیچ
تارکول کی طویل رہ گزر اور ایک بند ڈبے میں ہم سب اپنے اندر
گرد سے بے خبر اپنی باتوں میں، اپنی خاموشی میں، اور اپنے قہقہوں

اپنی خوش مذاقی اور بدمزاجی کا موڈ درشلتے ہوئے جامع مسجد چوک کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے اور دو چار چار کی ٹولی میں ہم سب ادھر ادھر تقسیم ہو گئے ہیں۔

۱۸ مئی ۷۵ کی صبح دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ مدحت دروازہ کھولتے ہیں۔ عتیق اللہ اور عبداللہ کمال کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور میں پہلو بدل کر لیٹ گیا ہوں۔

"ارے اٹھو بھائی" عتیق اللہ کہہ رہے ہیں "تم تو پورے سرمایہ دار نظر آتے ہو کرائے کی ایک ایک پائی وصول کر رہے ہو۔"

میں تیار ہو گیا ہوں۔ مدحت کی نظریں کہہ رہی ہیں کیا مہمانوں کو چائے بھی نہ پلاؤ گے؟

اور میں نے بیرے کو آواز دی ہے۔

"چائے کے ساتھ کیا لاؤں؟" بیرے نے سوال کیا۔

"بریڈ یا توس۔ جو بھی اچھی چیز ہو"

عتیق اللہ نے کہا ہے اور میں نے ہامی بھر لی ہے۔

"توس مکھن لگا کر لاؤں صاحب؟"

"ہاں ذرا اچھا لگانا۔"

اور جب بل میرے سامنے آیا تو ایمان لانا پڑا کہ دہلی والے مکھن بہت اچھا لگاتے ہیں۔

ناز سے نکل کر ہم وکیل میں پہونچ گئے ہیں۔ فضیل صاحب کے روم میں محمود ہاشمی بھی تشریف فرما ہیں۔ نوجوان شاعروں کی پوری ٹیم بھی موجود ہے۔ محمود ہاشمی پان چبا رہے ہیں، سگریٹ پھونک رہے ہیں اور باتیں کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت کمرے میں کائنات سمٹ آئی ہے

ہاشمی صاحب چھیڑ رہے ہیں۔ "بھئی کمرے سے باہر نکلنا دہلی والے جدید شاعروں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

فضیل صاحب ہلکے سے مسکرا دیتے ہیں اور رئیس فراز نے دیوار سے پشت لگا دی ہے۔ "کیا شاعر ہو تم نے بچا لیا ہے" ہاشمی رئیس فراز کو گھیرتے ہیں۔ "نہ تم وہ نظم پڑھتے نہ مشاعرے کی فضا خراب ہوتی" رئیس اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ ناکام رہتے ہیں۔

اتنے میں زبیر رضوی بھی آ گئے ہیں اور پھر ہاشمی نے ہر شاعر پر دس روپے کا تاوان رکھ دیا ہے۔ زبیر مدحت کو لے کر مارکیٹ چلے جاتے ہیں۔ واپسی پہ ان کے بیگ سے شیشے کے دو گلاس نکلتے ہیں اور ....

انوار رضوی (روشنی، میرٹھ) منت میں پھنس گئے ہیں۔ وہ چسکیاں نہیں لے رہے صرف کھانا چبا رہے ہیں اور میں ——— ہاشمی صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا ہے۔ وہ میرا امتحان لے رہے ہیں۔

"کیوں نشتر! اگر چاندنی چوک پہ ہندوستان کے تمام جدید شاعروں کے مجموعے اکٹھے کئے جائیں اور انہیں جلانے سے بیشتر تم سے کہا جائے کہ تم ان میں سے کوئی ایک مجموعہ اٹھا لو تو تم کون سا مجموعہ اٹھاؤ گے؟"

اس سے پہلے سردار جعفری اور کمٹمنٹ کی بات چل رہی تھی۔ میں نے اپنے مجموعے کا نام لے لیا ہے اور اس طرح امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔ زبیر وضاحت فرماتے ہیں۔ "اصل میں ہاشمی کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان میں بہترین جدید شاعر کون ہے؟" اس وقت مجھے سوجھا نہیں کہ ایسے سوالات قبل از وقت ہیں اور پھر کسی شاعر کو گڈ، ویری گڈ یا دی بیسٹ کا ریمارک دے کر نہیں آنکا جا سکتا کہ شاعری حساب کا پرچہ نہیں ہوتی۔

پسندیدہ شاعروں میں ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور بانی کے ساتھ بشیر بدر کا نام سن کر ہاشمی بھڑک اٹھے ہیں۔ وہ بدر کو سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے۔ انہوں نے کہا ہیں بدر کے

[illegible] اتفاق دیکھئے کہ اس وقت مجھے بدر کا کوئی شعر یاد نہیں آرہا ہے۔ ذہن میں ایک شعر گونج بھی [illegible] کالج میں عشق بازی اور چاند ماری کرنے [illegible] پیش کر سکتا ہوں۔ اجلالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ بانٹ دو!

محمود ہاشمی سب سے الجھ رہے ہیں۔ سب کو آزما رہے ہیں پھر وہ سب سے گھل مل گئے ہیں جیسے ہر ایک سے مطمئن ہو گئے ہوں یا پھر یہ سوچ کر تکیہ کر لیا ہے کہ ان میں میرے ایسا ذہین کوئی نہیں۔

دوپہر گذری —
سہ پہر گذری۔
شام سر پہ آ گئی۔ کسی کو کھانے کا ہوش نہیں۔ چائے نوشی، سگریٹ نوشی اور باتیں —— بے شمار باتیں بھانت بھانت کی، کچھ پرائی، کچھ ادبی، کچھ غیر ادبی۔ قیصر شمیم عبداللہ کمال کے ساتھ کھانا کھا کر لوٹ آئے ہیں۔ اور اب عبداللہ کمال، عتیق اللہ اور ممتاز راشد بانی کے ساتھ ان کے یہاں جا رہے ہیں۔ تقریباً دس بجے بلراج کومل چلے آئے ہیں۔
سرخ سرخ —— شگفتہ شگفتہ —— زبیر مسہری پر دراز ہیں بش شرٹ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ پائنتی کومل بیٹھے ہیں۔ دوسری مسہری پر فضیل جعفری اپنے پائپ سے جوجھ رہے ہیں۔ مدحت اور خلیل تنویر ان کے پیچھے ہیں۔ تیسری مسہری پر ہاشمی ہیں۔ میں ہوں اور یوسف جمال ہے۔ دروازے کے پاس کرسی میں اظہار اثر ہیں۔ زبیر کچھ سناؤ کا شور شرابہ چھوڑ دیا ہے۔ خلیل اور ہاشمی نے ہاں میں ہاں ملائی ہے اور کومل صاحب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے نظم سنانی چاہی ہاشمی نے احتجاج کیا۔

"نہیں — نظم نہیں غزل۔ ابھی تو مشاعرے کی نظمیں ہضم نہیں ہوئیں"

اور میں نے غزل شروع کی ہے ——

ہم بدنصیب لوگ اسے مانتے نہ تھے
تقدیر ہم کو بخش گئی بس دھواں غبار

مدحت نے کہا ——

میں بھی اس انبوہ ناموراں میں شامل تھا مگر
ایک لڑکی مجھ کو جنگل میں اکیلا کر گئی

خلیل تنویر، اظہار اثر اور یوسف جمال نے بھی بڑی خوب صورت غزلیں سنائیں۔ فضیل جعفری کی غزل بڑی لاجواب تھی خاص طور سے یہ شعر تو میں بھول نہیں سکتا ——

کی میری تخلیق —— مجھ کو ہی بنایا
میری ماں جاہل تھی سب سے بڑی ہے

زبیر نے اپنا ترنم بکھیر دیا ہے۔

دونوں ہم پیشہ تھے دونوں میں ہی یارانہ تھا
قاتل شہر سے پر ربط رقیبانہ تھا

زبیر ڈوب کر پڑھ رہے ہیں۔ اور ہاشمی گلے کا ہار ہوئے جا رہے ہیں۔ کومل صاحب نے نظمیں شروع کیں تو ساری غزلیں پھیکی پڑ گئیں —— ایک —— دو —— تین ——
کومل صاحب سنانے کی موڈ میں ہیں "رشتۂ دل" پڑھتے ہوئے ان کی وارفتگی دیکھنا چاہیئے۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ کھلتی ہیں۔ ایک ہاتھ ہاشمی کے گلے میں ہے اور ایک ہاتھ میں زبیر کا پنجہ دبا ہوا ہے۔ آواز کھوئی کھوئی سی۔ کومل کہیں دور کسی جھیل کے کنارے آوارہ پون کی طرح ڈول رہے ہیں اور مجھے ایسا لگ رہا ہے شدید گرمیوں کے موسم میں مہکتی ہوئی سرد ہوا چل پڑی ہے اور ہم سب اس کے ساتھ اڑتے جا رہے ہیں۔

[illegible] اس جسم کے ستر ستر
[illegible] لا کیوں وہ قیامت نہ لگے
[illegible] میں مزا آتا ہے
[illegible] ایک حقیقت نہ لگے
آئینہ، عکس، میرے ہاتھ، تجلی غائب
میرے دشمن کو بھی یارب میری عادت نہ لگے

(فضیل جعفری)

اور کس طرح زندگی کرتے
عمر گذری ہے خودکشی کرتے
ہر طرف بھیڑ تھی خداؤں کی
لوگ کس کس کی بندگی کرتے

(دویارتن عاصی)

یہ [illegible] کہ مجھے خاک میں ملا دے گا
مگر بتا کہ وہ کس جرم کی سزا دے گا
عجب ہے اس کی عدالت، عجب اس کے اصول
نہیں سنے گا وہ کچھ، فیصلہ سنا دے گا

(کمار پاشی)

کھرا کھوٹی دوستی
میں بھی کیا ایک مدت سے ڈھونڈ رہا ہوں
اس [illegible] ہے اب تک
لیکن میرا دوست بڑا مخلص ہے
وہ میرا چاہنے والا ہے
اس کی چاہت
اس کی یاری
اور
اس کا ایمان کا میں خود بھی قائل ہوں
کیسے اس چاہت کو رکھوں
کیسے کھو دوں۔

تم میری بائیں پسلی،
مجھ کو لوٹا دو

(عبدالرحیم نشتر)

سر پہ سورج ہے کڑی دھوپ میں جاری ہے سفر
مجھ کو سایہ بھی میرے قد کے برابر نہ ملا۔
لوٹ آیا ہوں تہی دست، بھرے باغوں سے
پھل تو پیڑوں پہ بہت تھے کوئی پتھر نہ ملا
اس سمندر میں گرے چاروں طرف کے دریا
کون سا رنگ میری ذات کے اندر نہ ملا

(مدحت الاختر)

یہ تخلیقات شاید ہلکی ہیں۔ بہت کمزور ـــــــ اتنی کمزور کہ ایک نقاد/ ایک نامور شاعر ان میں کوئی ادبیت نہیں پاتا کوئی حسن، کوئی خوبی نہیں پاتا اور ہر شاعر کو یہ کہہ کر جاتا ہے کہ اب میں فلاں کو زحمت دے رہا ہوں۔ اور فلاں کو دعوت دے رہا ہوں

یہ نظامت ہے تو اس نظامت کے کیا کہنے ـــــ؟ شاید جعفری نے سارا زور بیان اپنی تقریر پر لگا دیا ہو اور میں نے سنا ہے اس مشاعرے کی صدارت کا مقصد بھی یہی تھا کہ جعفری صاحب جدیدیت سے متعلق اپنے "زرین خیالات" کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔

جعفری صاحب جو مہاراشٹر اردو اکاڈمی میں ہیں۔ اردو بورڈ اور نیشنل بک ٹرسٹ میں جن کا عمل دخل ہے۔ جن کے "مداحوں" میں سرکاری افسران اور وزراء تک شامل ہے۔ جن کی رسائی گجرال صاحب اور اندرا گاندھی تک ہے۔

"دنیا سانپ اور سیڑھی کا کھیل ہے بابا۔ دانے پھینکتے جاؤ اوپر چڑھتے جاؤ۔ مگر خیال رہے جس وقت ذلالت کا

سانپ ڈسے گا پھر اسی خواہش میں رستے لفظ اُڑ گے جس پر تم نے سیڑھیاں لکڑی کی تھیں اور فاصلے پھلانگتے ہوئے بلندیوں کو چوم رہے تھے۔ آج تمہارا وقت ہے اور کل کس نے دیکھا ہے؟

ٹرین تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور میں نیند کا آنچل اوڑھے لیٹا ہوا ہوں۔ گزرتے ہوئے اسٹیشنوں سے بے پروا ——— اور ——— جس وقت میری آنکھ کھلے گی میں ایک نئے اسٹیشن کو دیکھوں گا۔ "کہ لے آنکھیں بند کر لے۔ خود غرضی، مصلحت کوشی، جی حضوری، ریا کاری سارے اسٹیشن گزر جانے دے۔ ہر شئے گزشتنی ہے، اور رات سیاہ ہے۔ سیاہ رنگ آنکھوں میں بھر لے یہ وہ رنگ ہے جس میں سرخ، سفید، نیلا، سبز سارے رنگ اپنی پہچان کھو دیتے ہیں۔"

میری آنکھوں میں صندل کے پیڑ ہیں۔ کہیں جھنڈ کا جھنڈ کہیں اکا دکا ——— ہوا میٹھی میٹھی خوشبو سے رچی جا رہی ہے۔ اور ایک ناگ آنکھیں بند کئے ان پیڑوں سے لپٹا جا رہا ہے۔

جدید فن کار کسی کسی شہر میں زیادہ ہیں اور کہیں ایک ایک دو دو، اور ہر طرف سے مطالق مہری ترقی پسندی نیا منشور، نئے ارادے،

احتجاج، اختلاف

انتشار، انحراف

کھری گالیاں۔ جھوٹے جاپ

صندل اور سانپ

!

عرشی سہیل

غنڈہ

بچہ اباپارک کے گلی کی جانب جا رہا تھا کہ ایک شخص نے اس کا راستہ روک لیا۔

"آپ باجی سے کیوں نہیں ملتے۔ دیکھئے نا کتنے لوگ روز باجی سے ملنے آتے ہیں۔" ننھے نے بغیر سوچے سمجھے یہ بات کہہ دی۔ اس نے ننھے کے گال سہلاتے ہوئے کہا۔ "منے ہم نے تمہاری باجی کو دیکھا ہی نہیں دوستی کیسے کریں گے۔ تم ملاؤ گے تو دوستی ہو جائے گی۔ کبھی اپنی سالگرہ پر تم ہمیں بلانا، ہم ضرور آئیں گے اور ایک خوبصورت سا تحفہ بھی دیں گے۔ ہاں منے تمہارے بابا کیا کام کرتے ہیں؟"

"بابا ہے ہی نہیں تو کیا کام کریں گے۔"

"اور ممی؟"

"وہ بھی نہیں۔"

"تم باجی کے ساتھ تنہا رہتے ہو۔"

"تنہا کیوں رہنے چلا۔ باجی کے بہت سے دوست ہیں جو دن رات گھر آتے رہتے ہیں۔"

"منے وہاں کس سے باتیں کر رہا ہے۔ پڑھے گا نہیں؟"

یکایک ایک نسوانی آواز گونجی جس میں پیار اور غصے کی ملی جلی شمولیت تھی اس نے پلٹ کر دیکھا کھڑکی میں ایک نوجوان صنف نازک کی دوسرے عورت کی طرح لگ رہی تھی، بظاہر منے سے مخاطب تھی۔

"اچھے اب گھر جاؤ۔ تمہاری باجی تمہیں بلا رہی ہیں۔"

اس نے دوبارہ جب کھڑکی کی طرف نظر دوڑائی تو اس نے غصہ سے کھڑکی بند کر لی۔

اس کی پہلی ملاقات اس طرح ہوئی تھی۔ وہ اس محلے میں نیا نیا آیا تھا۔ یہاں اسے کوئی مناسب مکان نہیں ملا تھا۔ آفس کی قربت کے سبب اس نے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ بس آسانی اتنی تھی کہ باتھ روم اور دوسری چیزوں کی یہاں سہولت تھی۔

دوسرے دن وہ آفس جانے کے لئے اپنے روم کو لاک کر کے باہر آیا تو منا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"آفس"

"آفس کیا ہوتا ہے؟"

اس نے منے کے اس سوال پر قدرے سٹپٹا کر کہا۔ آفس یوں سمجھ لو اس جگہ کا نام ہے جہاں کام کرنے پر تنخواہ ملتی ہے۔

"تنخواہ کا کیا مطلب؟"

پیسہ روپیہ

"یہ تو باجی کو بغیر آفس گئے بھی ملتا ہے۔"

وہ شک جو منے سے پہلی ملاقات کے بعد اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اب اس نے یقین کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ منے کی باجی ایک عورت ہے۔ جو رات کے اندھیرے میں اپنا جسم بیچتی ہے۔

"منے پھر وہاں چلا گیا۔ پڑھائی میں دل نہیں۔ آوارہ بننے کا ارادہ ہے کیا؟"

آواز کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں کھڑکی کی طرف منعطف ہو گئیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں اس نے کھٹاک سے کھڑکی بند کر لی تھی اس بار اس نے غصے کا اظہار کیا تھا اور نہ پیار کا۔ ہاں وہ منے سے ناراض ضرور لگ رہی تھی۔

اسم

مٹ میلا خفیف، اندھیرا
بہت ہی دور ہے
تمہارے پاس آتا ہے
تو بھی
جھاڑیوں میں سہمی ہوئی سگِ شب
تمہارے عکس بخیل کو
کہاں تک دھندلا کر سکے گی ؟
اندھیرا چپ ہے
کچھ کہہ نہیں سکتا ، بہت ہی دور سے
تمہارے پاس آتا ہے
اور قرب کے جتنے کچھ اسم ہیں
وہ تو بس حکایتِ شب کی عنان ہیں
مگر آفاق تو
ایک دوراہے کا نام بھی ہے
جہاں پر ہمارے نام کی
شکستہ تختیاں
روشنی کے قلم سے
رہنمائے خاک ہیں

— —

وہم

پسِ غبار وہ چہرہ
رواں رواں سی یہ دھوپ
ثنائے دیدِ منائیں
کہ اعتکافِ جنوں
یہاں سے دور نہیں
تھکن کا جام گراؤ کہ کاسۂ شام
کسی کے وصل کے وہموں سے
آج جاگا ہے
اچھا لو
شب کو کہیں کا بوسی سکوتِ ہمیشہ
رگوں میں نیند کا پنجہ
نہ گاڑ دے یہ کہیں

— —

قمر الحسن

تیسری لڑکی

وہ جوابھی ابھی ایک اسمارٹ اور وجیہہ انسان دفتر میں آیا ہے اس کا نام محمد صدیق ہے اور یہاں کا اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر ہے۔ اس عہدے پر وہ آج آٹھ سال سے کام کر رہا ہے۔ اس کے باوقار اور سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اور اس کے قدموں کی ٹھوس آواز سن کر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ جلد ہی اس فرم کے کسی بڑے دفتر کا پبلک ریلیشنز آفیسر ہو جائے گا۔ وہ دفتر کی میزوں کے درمیان کی راہداری سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آتا ہے، اپنا کوٹ اُتار کر کرسی کی پشت پر لٹکاتا ہے، ٹائی کو پورب پچھم گھماتا ہے، اور بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا ہے کہ گووند چپراسی کی آواز آتی ہے:

"گڈ مارننگ سر، آپ کو بڑے صاحب نے یاد فرمایا ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے صدیق سوچتا ہے 'اتنا سویرے یہ چاند کیوں؟' پھر گووند سے کہتا ہے۔

"چلو آتا ہوں۔" گووند جانے لگا تو اس نے آواز دی "سنو گووند، کیا صاحب کے کمرے میں کوئی اور بھی ہے؟"

"نہیں صاحب وہ اکیلے ہی ہیں۔"

صدیق نے کوٹ پہنا، اپنا نوٹ بک لیا اور صاحب کے کمرے کے سامنے رُک کر، صاف مگر ملائم آواز میں بولا،

"مے آئی کم اِن سر؟"

"کم اِن پلیز۔"

"گڈ مارننگ سر، آپ نے مجھے یاد فرمایا۔؟"

"کون؟ مسٹر صدیق! بیٹھ جاؤ بھئی"

صدیق سامنے والی کرسی پر قدرے اکڑوں بیٹھ گیا۔ مسٹر آر۔ ان۔ ملہوترا جو ایک عرصہ سے پبلک ریلیشنز آفیسر (P.R.O) کے عہدہ پر فائز تھے۔ اپنی نظروں کو فائل سے ہٹاتے ہوئے بولے:۔

"کہو بھئی صدیق، سب خیریت تو ہے؟"

"آپ کی دعا ہے سر"

"ماں کیسی ہیں؟ مسز اور بچے کیسے ہیں؟ بھئی مجھے تم سے شکایت ہے۔ تمہاری شادی ہوئی، بچے ہوئے، لیکن آج تک تم نے اپنی مسز کو میرے یہاں نہیں لایا۔ میں یقین دلاؤں مسز ملہوترا ایک اچھی میزبان ہیں۔"

"جی شرمندہ ہوں سر۔ جلد ہی سبھوں کو لے کر آؤں گا۔"

"THAT'S LIKE A GOOD BOY" پھر ایک وقفہ کے بعد مسٹر ملہوترا بولے:

"اچھا بھئی سنو۔ وہ تمہیں یاد ہے نا کہ ہم لوگ اسٹیٹ گورنمنٹ سے اپنے ORAL CONTRACEPTIVE کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ ہماری کوشش تھی کہ ڈیل پکی ہو جائے تاکہ ہمارے پلز اسٹیٹ کی ہر سرکاری ڈسپنسری میں پہنچ جائیں۔"

"جی ہاں سر، مگر فیملی پلاننگ کے ڈائرکٹر نے اپنے دفتر کے نمائندوں کو ابھی تک ملاقات کا وقت ہی نہیں دیا ہے۔ دو دفعہ یاد دہانی کے ٹینڈرز بھیجے جا چکے ہیں۔ اس کی اطلاع آپ کو بھی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ ابھی ابھی جنرل منیجر نے مجھے فون پر

[illegible] MORALITY کہتے ہیں۔ ایسا کام
[illegible] تھوڑی دیر کے لئے بھول کر فرم کے ضمیر
[illegible] سے بک دوش ہونا پڑتا ہے۔ اس
COMPETITIVE [illegible] میں جینے کا راز
[illegible] زندگی بذات خود ایک خوب صورت چیز ہے۔
[illegible] ہر حال جینا ہے EITHER WITH
TEARS OR WITH SMILES اس لئے
میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم لڑکیوں کا انتظام کرو۔ اور پھر
تم جیسے اسمارٹ ینگ مین کے لئے ٹین کیا تین درجن
لڑکیوں کا بھی انتظام کرنا دشوار نہیں ہونا چاہئے۔"
"ٹھیک ہے سر، میں کوشش کروں گا۔"
"فائن۔ اگر میرا کوئی آفیسر یہ کہے کہ وہ فلاں کام
نہیں کر سکتا ہے تو پھر اس میں RESOURCEFUL
RESOURCEFULNESS کی کمی ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم
RESOURCEFUL ہو۔ میں یہ کام کسی اور کے سپرد کر سکتا تھا۔
مگر مجھے تمہارے مسائل معلوم ہیں اور اسی لئے جلد از جلد
تمہاری ترقی چاہتا ہوں۔ یاد رہے مسٹر صدیقی، ترقی کا
راستہ میرے کمرے سے ہوتا ہوا جنرل مینیجر کی میز پر ختم ہوتا
ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"
صدیقی اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔
SON OF A BITCH THIS FIRM
وہ غصہ میں بڑبڑایا۔ پھر اس نے کرسی کی پشت پر اپنی گردن
ٹیک دی اور چھت سے آویزاں پنکھے کے تینوں بلیڈوں کو
تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ اس کے اذیت
زدہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہن نے معائنہ خود کرنا چاہا۔
نہایت ہی روایتی قسم کی تصویر سامنے اُبھری۔
ایک ضعیف ماں، ایک غیر شادی شدہ سی بہن، پھول
سے دو بچے۔ ایک خوب صورت بیوی سلمیٰ۔

بائبل کی سلمیٰ۔ آسکر وائیلڈ کے ڈرامہ سلومی
کی ہیروئن۔ سوتیلے باپ کے سامنے رقصِ ہفت نقاب۔
خوب صورتی۔ کتنی حسین رہی ہو گی وہ۔ سلمیٰ کی خوبصورتی
ہی اس کی موت کا باعث ہوئی۔ جو صحرا میں ٹڈیوں کا
گوشت کھاتا تھا۔ اور شیر کی کھال پہنتا تھا۔ اور یہ سلمیٰ۔
حسن، اخلاق، پاکیزگی۔ وہی روایتی پیکر بنت حوا۔
"تم کون ہو؟"
"میں اس اسٹیبلشمنٹ کے مہیب جبڑے کا صرف
ایک دانت ہوں۔ میری زندگی دوسرے دانتوں سے ہم آہنگ
ہو کر ہی چل سکتی ہے۔"
"لیکن تم ہو کون؟"
میں وہ تو ہرگز وہ نہیں جس کا سر سلمیٰ نے اپنے
باپ کے روبرو عریاں رقص کے بدلے چاندی کے طشت پر
حاصل کیا تھا۔ میں آج کی تہذیب کا بچھڑا ہوں۔
میں وہ بچھڑا تو ہرگز نہیں جسے بنی اسرائیل نے
موسیٰ کی عدم موجودگی میں پوجنا شروع کر دیا تھا۔
میں تو قربانی کا بچھڑا ہوں۔ مثلث کے وسط میں
کھڑا قربانی کا بچھڑا۔ ماں، بہن، بیوی کی مثلث۔
تین چار منگ گرلس کی مثلث۔ پنکھے کے بلیڈوں کی مثلث۔
"مسٹر صدیقی، تم ایک پمپ (PIMP) ہو۔"
"ہاں، میں ایک پمپ ہوں۔"
"تین چار منگ گرلس کس طرح حاصل کرو گے؟"
"میں ان تمام لڑکیوں کے پاس جاؤں گا جو ابھی تک
غیر وابستہ ہیں۔ اور ماضی میں مجھ سے وابستہ رہی ہیں۔"
تم انحطاط کی ایک علامت ہو۔"
میں ایک یاسیت ہوں۔ فلک بوس عمارتوں
اور عظیم کارخانوں کی بنیاد پر کھڑی عصری تہذیب مجھے پیس
ڈالے گی۔ میں اپنی بقا کے لئے ان غیر وابستہ لڑکیوں کے پاس

جاؤں گا۔"

"تم رابعہ، ششما، بلقیس، مالتی، اوشا کے پاس جاؤ گے؟"

"ہاں میں ان کے پاس جاؤں گا۔"

"لیکن اگر وہ راضی نہ ہوئیں تو ....."

"YOU SHUT UP! BLASTED FOOL!"

"...... راضی نہ ہوئیں تو پھر تم جائز کر دیے جاؤ گے فرم کی نوکری تمہیں دھاگے سے بندھی ہوتی ہے۔ تم فارغ کر دیے جاؤ گے۔"

"اور اگر میں کامیاب ہوا تو میری ترقی کے امکانات ہیں ___"

چھ نمبر۔ صدیقی نے پی آر او سے دن بھر کی فرصت لی اور اپنی سرگزشت میں نکل گیا۔ اس کی پہلی منزل۔ ورکنگ ویمنس ہوسٹل۔ اس کے ریسپشن روم (RECEPTION ROOM) میں لوگ مسحور لکڑوں کی طرح بیٹھے اپنی اپنی سرکی (CIRKE) کے منتظر تھے۔ ان مسخروں کے درمیان وہ بھی بیٹھ کر رابعہ اور ششما کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے سوچا سرکی کے جزیرہ میں جانوروں میں منتقل اپنے رفقار کے درمیان ادیسیز (ULYSSES) بھی شاید اس سے بڑا مسخرہ نہیں نظر آیا ہوگا۔

رابعہ اور ششما، سرخ اور سفید ساڑی میں ملبوس نمودار ہوئیں۔ گویا صدیقی کی قسمت چاندی کے ورق طشت پر سجا کر لائی ہوں۔

دونوں کی تقریباً ایک ساتھ آواز آئی "ہیلو صدیقی؟" پھر تینوں [illegible] گوشے میں بیٹھ گئے۔

ششما نے پوچھا "کیسے آئے؟"

"چل کر آیا ہوں۔" اس نے بھونڈے پن سے جواب دیا۔

"مقصد؟" رابعہ نے پوچھا۔

"مجھے تم دونوں کی ایک شام چاہیے۔"

"کس لئے؟" ششما کی آواز تھی۔

"کچھ لوگوں کی شام رنگین بنانے کے لئے۔"

"کیوں؟" رابعہ نے مستجابانہ پوچھا۔

"میری ترقی کے لئے۔" تفصیل سن کر دونوں مسکرائیں۔

ششما بولی "تو مسٹر صدیقی ہم لوگوں کو WHORES بنانا چاہتے ہیں۔"

رابعہ کے چہرے پر شہوت کی لکیریں کھنچ گئیں ششما کی آنکھوں میں ہوسناکی کا خمار چھا گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم لوگوں کی پوزیشن کو کسی بھی صورت میں کمپرومائز (COMPROMISE) نہیں کیا جائے گا۔" صدیقی بولا۔

"IT'S IMMATERIAL" ششما بولی۔ پھر اس نے شہوتی انداز میں پوچھا "اجرت کیا ملے گی؟"

"تم لوگ جو بھی کہو۔"

"ہمیں تمہارا ایک دن چاہیے پرنس چارمنگ" رابعہ نے کہا۔

"کوئی INHIBITION؟ کوئی اعتراض؟" ششما نے پوچھا۔

"لیکن میرا دفتر اور سلمی؟"

"اوہ پھر وہی WIFE FIXHTION ارے دفتر آؤ، پھر فرصت لے لو۔ سلمی اس میں کہاں مخل ہوتی ہے۔" رابعہ بولی۔

"اچھا کوشش کروں گا۔" مر [illegible] رائی۔

"کوشش نہیں، وعدہ۔" ششما نے کہا۔

سات نومبر۔ صدیق بارہ بجے دن تک دفتر میں [illegible] کے بعد ورکنگ ویمنس ہوسٹل دو لڑکیاں، ایک [illegible] [illegible] ان سمت۔ شام سے قبل جب وہ لوٹے تو سورج [illegible] ت ڈھل چکا تھا اور یہ لڑکیاں بھی۔ صدیق کے چہرے پر [illegible] بتدریج زائل ہو رہا تھا۔

صدیق جب سو کر اٹھا تو آٹھ نومبر کا سورج اس جگہ آ چکا تھا جہاں پر ایک کالا کوا روز بیٹھا کرتا تھا دفتر پہنچ کر اس نے ادشا اور رانی کو فون کیا۔ دونوں چند [illegible] کے لئے شہر سے باہر۔ دوسرا فون؟ بلقیس کو؟ [illegible]۔ اس ڈر کی بنیاد اس کے اور بلقیس کے [illegible] تعلقات تھے جن پر شادی کا غلاف پڑا رہا [illegible] بلقیس کی فاسق شعلہ رو غیر روایتی تجربات [illegible] شی زندگی سے ڈر کر اس نے سلمیٰ کی پرسکون گود [illegible] حاصل کیا تھا۔ لیکن بلقیس ابھی تک اس سے پیار کرتی تھی۔ اس کی مجروح انا نے اب اس پیار میں جذبۂ انتقام تحلیل کر دیا تھا۔ اسے موقع کی تلاش بلقیس ایک کچلا ہوا سانپ، صدیق خائف۔ اس نے فون کیا۔ بلقیس سے کل شام ملاقات ہو سکتی ہے۔

نو نومبر کی شام۔ صدیق سوئے بلقیس۔ کال بل۔ دروازے کھلے۔ ایک دل کش سحر انگیز استقبالیہ مسکراہٹ زلف بدوش بلقیس ایک حسین سرکی (CIRCE) ــ صدیق ایک احمق بکرا۔

"ہائی ہینڈسم، میں دیر سے تمہاری منتظر تھی۔ اب تو سمجھا چلی ہوں۔"

"مجھے ایک ضرورت ہے۔"

"مجھ سے؟ میں نے تو سمجھا تھا ہماری کتاب بند ہو چکی ہے۔"

استعاروں میں گفتگو کرنا تجریدی فعل ہے۔ آؤ بیٹھو ہم کھل کر باتیں کریں گے۔"

صدیق نے خود کو مبارک باد پیش کی ایسے برا تر [illegible] لغو جملے پر۔ بلقیس اس کی بغل میں بیٹھ گئی۔ صدیق کھل [illegible] بلقیس یار۔ صدیق ممیایا۔

"مجھے تمہاری ایک شام درکار ہے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہیں کچھ لوگوں کو انٹرٹین کرنا ہوگا۔"

"کس لئے؟"

"میری ترقی کے لئے۔"

"اوہ آئی سی۔" وہ مسکرائی۔ ایک بے باک، دعوتی مسکراہٹ۔ اس کا آنچل سرک چکا ہے۔ صدیق کی زرد آنکھیں وادیوں میں گم ہیں۔ اس کی چھٹی حس نے خطرہ محسوس کیا۔

"اور ــ اگر میں انکار کر دوں تو ....؟"

"میں نے سمجھا تھا تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔" بلقیس کو موقع ملا۔ وہ صدیق پر جھک گئی۔

"ہاں کرتی ہوں بے وفا در ندے"

وقفہ

"اگر ثبوت چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔" اس نے صدیق کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ صدیق کھڑا ہے۔ اس کی نظریں بلقیس کے سینوں پر۔ بلقیس ساڑی سنبھالتی ہوئی بیڈ روم کی طرف بھاگتی ہے۔ بلقیس کی کمر میں ہوش ربا گداز ہے رابعہ اور رشنا کے ساتھ کل کی دوپہر۔ صدیق پر جھرجھری۔ صدیق کے روزنِ دل سے سلمیٰ جھانکتی ہے۔ وہ اپنی مدافعت میں ایک سرعت سے پلٹتا ہے۔ چشم زدن میں وہ فلیٹ سے باہر ــ

صدیق سڑک پر ہے۔ صدیق دہکتی سیج سے اٹھ کر بھاگا ہے۔ صدیق شعلہ زن دائرے میں مقید ہے۔ صدیق

سڑک پر چل رہا ہے۔ اسے سمتوں کا اندازہ نہیں۔ صدیق نہ مجاہد ہے، نہ شہید۔ صدیق ایک بزدل زندیق ہے۔
بے نور روشنی کے ستونوں نے انسانوں کے اس مدفن پر اپنے تاریک سائے پھیلا رکھے ہیں۔ صدیق اس مدفن میں صدیوں بھٹکتا رہا اور جب مر گیا تو کفن میں ملبوس اپنی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ صدیق اپنے کمرے میں۔ سلمیٰ سو رہی ہے۔ صدیق کو بھوک لگ رہی ہے۔ سلمیٰ سو رہی ہے بے پرہیز پن رکھے ہیں۔ سلمیٰ سو رہی ہے۔ اس کے سیاہ گیسو گلابی چہرے پہ بکھرے ہیں۔ اس کا لباس شب خوابی کھسک گیا ہے۔ شفاف دادیاں۔ مرمریں جانگھیں۔ تہ دار جسم صدیق کمرہ بند کرتا ہے۔ سلمیٰ جاگ جاتی ہے۔ صدیق کہتا ہے۔ "سلمیٰ مجھے بھوک لگی ہے۔" صدیق چل رہا ہے۔ سلمیٰ اٹھنا چاہتی ہے۔ صدیق اسے دبوچ لیتا ہے۔ لمحات رک جاتے ہیں۔ ان لمحات میں پیراہن چاک ہوتے ہیں، مسلے ہوئے برگ گل کی طرح بستر پر گرتے ہیں۔ ان کی نبضوں سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ صدیق اس میں جلتا ہے۔ سلمیٰ کو جلاتا ہے۔ پھر آتش کدہ ٹھنڈا ہے۔

"یہ کیا وحشی پن ہے۔" سلمیٰ کی آواز مصنوعی ہے۔ صدیق کی آنکھیں سلمیٰ کی عریاں آنکھوں میں۔ آنکھیں جیسے آب دار موتی۔ یہ دل فریب جسم، یہ ملکوتی حسن۔ صدیق مدہوش ہے۔ وہ اپنے مدفن سے چلاتا ہے "یوریکا! یوریکا!!"
سلمیٰ نے گھبراہٹ میں پوچھا "یوریکا کیا؟"
"میں نے پا لیا!!"
"لیکن آپ نے کیا پا لیا؟"
"میں نے ترقی کی سیڑھی پالی۔ تم تیسری لڑکی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔"

"کیا بے ربط باتیں بول رہے ہیں آپ!"
"مجھے تیری ایک شام درکار ہے۔ ایک شام جو ہماری ان گنت شامیں رنگین بنا سکتی ہیں۔ تجھے کل میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"
"کیا مطلب؟"
"تیرے حسن کی فسوں کاری، یہ چیز کمیٹی کے ممبروں کی شہوت آلودہ آنکھوں کو متحوش کر دے گی۔ اور ہماری فرم کے ORAL CONTRACEPTIVE کی ڈیل پکی ہو جائے گی۔" صدیق جاں کنی کے عالم میں بولا۔
"لیکن یہ کس لئے؟"
"مستقبل کی شاہراہ کو سونے کی اینٹوں سے سجانے کے لئے۔"
سلمیٰ کانپ اٹھی۔ اس نے کہا "مجھے اجاڑ سڑک ہی پسند ہے۔"
"تم ایک معصوم و نادان کبوتر ہو۔"
"تو کیا اپنی بیوی کو ان کے حوالے کر کے سودا کرو گے"
"ہاں۔ اپنی بیوی کو نہیں، بلکہ ایک غیر معروف لڑکی کو صرف پیش کروں گا۔"
"لیکن ایسا نہیں ہوگا۔"
"ہاں ہوگا۔"
"نہیں۔ تم ان سے کہہ دو کہ ایسا نہیں کر سکتے ہو"
"میں نے کہہ دیا ہے کہ ایسا کر سکتا ہوں۔"
"لیکن کیوں کہہ دیا ہے؟"
"اس لئے کہہ دیا ہے کہ مجھے کار چاہئے، فرج چاہئے، پانچ روپئے اسکوائر فٹ والی پولش تو کلینی میں مکان چاہئے، گرمیوں میں ہل اسٹیشن پر جانے کے لئے زر چاہئے۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے مجھے ترقی چاہئے۔ ترقی کا انحصار میری لڑکی پر ہے۔ بولو، تم میری تیسری لڑکی ہو گی

آپ پر تادیبی کارروائی کا اطلاق ہوتا ہے۔ آپ کو نئی الحال معطل کیا جاتا ہے۔ آخری فیصلہ آپ کے تشریحی جواب کے موصول ہونے پر کیا جائے گا۔ مراسلہ ملنے کے پندرہ دنوں کے بعد تک تشریحی جواب دفتر میں آجانا چاہیئے۔

مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔

آر۔ ایل۔ ملہوترہ
(PRO)

صدیقی کا چہرہ کفن جیسا سفید تھا۔ اس نے کوٹ پہنا۔ لفافہ جیب میں رکھا اور دفتر سے باہر نکل کر مہیب عمارتوں کی قبرستان میں کھوگیا۔

— —

انجم نیازی

[illegible] ساحل سے آخری خط

[illegible] بوسیدہ دیوار و در بھی لرزنے لگے
[illegible] کالی زدہ خول
[illegible] کی مانند اکثر تڑخنے لگے
[illegible] تو سرکشہ سوچوں کی یلغار اور اپنے اندر کے دکھ کی کڑی دھوپ سے
[illegible] پایوں کی ندیاں خشک ہونے لگیں
[illegible] سے پہلے کہ یہ زرد دیمک ہمیں چاٹ جائے
یا پھر وہ [illegible] اماوس کی تاریک راتوں کی گھاٹی میں ہنستا ہوا دیوتا
اپنے مسکن سے باہر نکل کر ہمیں ایک ٹھوکر سے ذروں میں تبدیل کر دے
شفق کے حسیں بازوؤں سے نکل کر
ذرا [illegible] چلے آؤ
اور یہ [illegible] کے تاریک سائے
یہ ساری بلائیں
ہوس اور شورش کا آسیب ۔ جو ہر گلی، سڑک پر رواں ہے
انھیں اپنی زلفوں کی زنجیر میں باندھ کر
دور برفیلی وادی کی تہ میں کہیں دفن کر دو

تنہا تماپوری

تہمت بینائی

ساری پرچھائیاں دیکھتی رہ گئیں
شام کجلا گئی
کھنڈرے میدان میں
لہلہاتی ہوئی فصل رونے لگی
نیم کی شاخ کے ساتھ چمٹا ہوا
چاندنی کا دوپٹہ خلل بن گیا
رہبری کی نظر سر ہلانے لگی
سوکھی مٹی حلق میں اٹکنے لگی
رہزنی کارواں کی غذا بن گئی
پھر بھری ریت میں زنگ پلنے لگا
خوف پر اُگنے والا ببول آگ کی پشت پر
سو گیا
ہر سمجھ میری آنکھوں میں محفوظ ہے
پھر وہی اک عمل
مٹھیوں میں چھپی آگہی کا خلا، زیج کر پھینک دے

عبد المتین

وہ اور میں: وہ اور میرا بچہ

میں جب اس کا ذکر کرتا ہوں تو تم مسکرا کر کافی کی پیالی میں منہ لگا دیتے ہو اور اس کی چسکی میں اپنی مسکراہٹ کو غائب کر کے چہرہ پر ایسا پھیکا پن پھیلا دیتے ہو جیسے کوئی لغو بات میں کر رہا ہوں تمہارا یہ انداز میرے لیے سوہان روح ہے۔ میں جانتا ہوں، تم ایسا اس لئے کرتے ہو کہ میں نے تمہاری بات نہیں مانی۔ تم نے مجھے اسے قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر اس کا قتل کرنا آسان نہیں، میرے دوست آسان نہیں، میں نے کئی بار کوشش کی، مگر .... ہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں، بے حد پیار، اتنا پیار کہ اس کے لئے میں معمولی کپڑا پہنتا ہوں، معمولی کھانا کھاتا ہوں، تاریک اور تنگ مکان میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ خود بھی تکلیف جھیلتا ہوں اور انہیں بھی جھیلواتا ہوں۔ مگر پھر بھی مطمئن ہوں۔ اس نے مجھے قناعت پرست بنا دیا اور کیا یہ آج کی دنیا میں معمولی بات ہے؟ .... دیکھو، دیکھو پھر اپنی زہریلی مسکراہٹ نہ پھیلاؤ۔ میں بزدل نہیں ہوں .... میں تمہاری بات مانتا ہوں کہ جس دن اسے قتل کر دوں گا، میری زندگی بدل جائے گی۔ میں وہ نہیں رہوں گا، جو آج ہوں، لذیذ کھانے، عمدہ کپڑے اور خوبصورت مکان میرے مقدر ہو جائیں گے۔ میرے بچوں کے لئے اسمبلی آف گاڈ اور سنیٹ پیٹرک کے دروازے وا ہو جائیں گے.....

اور پھر کوئی میری حالت زار پر خنداں نہ ہوگا۔ مگر پھر بھی میں اسے مار نہیں سکتا، کیوں کہ اس کی دوستی مجھے وہ سکون بخشتی ہے، جو دولت کے بس میں نہیں۔

تمہارے پاس دولت ہے اور تم اس سے عیش و آسائش کی ہر شے حاصل کر سکتے ہو۔ پھیکے لمحوں کو رنگین بنا سکتے ہو، اندھیروں کو روشنی کے سیلاب میں تبدیل کر سکتے ہو۔ اپنے کمرے کو موسم سرما میں گرم اور موسم گرما میں ٹھنڈا رکھ سکتے ہو۔ مگر وہ سکون حاصل نہیں کر سکتے ہو، جو اس کے پاس ہے، میں کڑکڑاتے جاڑے میں بغیر کوٹ کے آفس سے گھر آنے کے لئے جب سنسان سڑک پر چلتا ہوں اور برفیلی ہوا نیزے کی طرح جسم کو چھید نے لگتی ہے تو میرے پاس وہ ہوتا ہے اور اپنے وجود کی مدھم آنچ سے مجھے گرمی پہونچاتا ہے اور اس وقت میں موسم کی شدت سے بے نیاز ہو کر آسمان کی پر سکون بلندی اور وسعت میں محو پرواز ہوتا ہوں اور وہاں سے تمہاری دنیا بہت حقیر معلوم ہوتی ہے۔ بہت ہی تنگ اور بے رنگ....... میں دیکھ رہا ہوں، اس کے تذکرہ سے تمہاری پیشانی پر شکنیں پڑنے لگیں، اُف تمہیں اس سے اتنی چڑ کیوں ہے؟ ....

آؤ، میں تمہیں اس سے پہلی ملاقات کے بارے میں بتاؤں۔ میں چھ یا سات سال کا تھا کہ اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ والد صاحب نے مجھے ایک پیتل کی دوانی دی اور کہا کہ "بنیا سے پوچھ کہ یہ دوانی لے گا" میں بنیا کے یہاں گیا اور حسب ہدایت دریافت کیا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ واپس آ کر میں نے والد صاحب کو بتایا کہ بنیا نہیں لیتا ہے۔ تب انہوں نے کہا کہ "اسے کوڑا دان میں پھینک دو۔" میں نے کہا۔ "اسے پھینکنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسری دکان میں بغیر بتائے ہوئے چلا دوں گا" میری بات سن کر انہوں نے کہا۔ "نہیں، نہیں، ایسا نہ کرو۔ یہ دھوکا ہوگا۔" میں نے والد صاحب سے کہا "اچھا پھینک دیتا ہوں۔" مگر میں نے دوانی پھینکی نہیں بلکہ

لاٹا دوسری دکان پہنچ گیا اور ایک آنے کی مونگ پھلی نے رکھ لی دی۔ اب میرے لئے سوال یہ تھا کہ مونگ پھلی کھاؤں کہاں؟ کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر ریلوے سنیما کے میدان میں چلا گیا اور ہری ہری گھاس پر بیٹھ کر جوں ہی کھانے والا تھا کہ اس نے میرے شانے پر تھپتھپایا۔ میں چونک گیا۔ اس نے مجھ سے کہا "تم یہ غلط کام کر رہے ہو۔ تم نے بنیا کو دھوکا دیا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں، یہ گناہ ہے .... تمہیں تمہارے والد نے منع کیا تھا، پھر بھی تم نے ایسا کیا؟" میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں وہاں سے اٹھا اور والد صاحب کے پاس آیا۔ انہوں نے مجھے آبدیدہ دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے سارا ماجرا بتایا۔ انہوں نے اکنی دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ بنیا کو یہ دے دو اور دوانی لے آؤ" میں نے دوانی لا کر والد صاحب کی موجودگی میں آنگن میں اتنے زور سے فضا میں اچھالی کہ یہ میرے مکان کے پشت کے تالاب میں جا گری۔ میں نے دیکھا کہ والد صاحب کا چہرہ خوشی کی ہلکی ہلکی سرخی سے دمک رہا ہے۔ شاید انہوں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے ایک بہت ہی قابل اعتماد دوست مل گیا ہے، جو زندگی کی کڑی دھوپ میں میرے ہمراہ رہے گا .... وہ بہت ہی خوش تھا جیسے مجھے کوئی نادر شے مل گئی ہو۔ اس کے بعد خوشی خوشی دن بھر آنگن میں انار، امرود اور مہندی کے درمیان کھیلتا رہا۔

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد وہ میری زندگی کے سفر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ موجود نہ رہا لیکن جب کبھی بھی میں راہوں کے کنارے خوشنما پھولوں کے حسن سے متاثر ہوا اور ان کی طرف کھنچنے لگا تو وہ آ دھمکتا منزل کی طرف اشارہ کرتا۔ ان پھولوں میں چھپے کانٹوں سے باخبر کرتا اور بتاتا کہ "ان کے حسن کے گرویدہ نہ ہو۔ ان میں چھپے کانٹوں کو دیکھو۔ یہ تمہیں مجروح کر دے گا۔ اس طرح کہ تم ایک قدم نہ بڑھ سکو گے اور تم اپنی منزل سے دور ہو جاؤ گے۔ چھوٹی سی راحت کے لئے بھٹک جاؤ گے، جہاں تاریکی ہی تاریکی ہے۔" اس طرح وہ میری تیسری آنکھ بن جاتا جس سے میں اپنی منزل کا تصور کرتا اور اس کی جانب بڑھنے لگتا۔ پھر ایسا بھی وقت آیا، جب میں اس سے بے حد خفا ہوا، ایسا خفا کہ اس کی جان لینے کی ٹھان لی۔ ایک دفتر میں اپنے ایک اسسٹنٹ کے ساتھ کام کرنا پڑ گیا۔ میرا اسسٹنٹ بڑی کوٹ کے نفیس شرٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا اور اس کی خوشبو ہوتی پرفیوم کو جسم پر لگائے ہوا تھا۔ میں اس کے لباس سے متاثر ہوا اور اس سے مجھے گفتگو ہو گئی۔ پھر بات ایک نازک موڑ پر پہونچی اور میرے مشورے کی شدت محسوس ہوئی تو میرے اسسٹنٹ نے میری اہمیت اجاگر کی۔ مگر میری شخصیت ہو بہو ہو چکی تھی۔ میں وہ دوست بے چین ہو گیا۔ مگر اس کا ذمہ دار میرا اسسٹنٹ نہیں بلکہ وہ تھا، میرے بچپن کا ساتھی۔ جو مجھے ریلوے سنیما کے میدان میں ہری گھاس پر ملا تھا۔ مجھے اس سے نفرت ہونے لگی۔ پھر تمہاری ساری باتیں یاد آئیں۔ تمہارا شعور تاریکی میں جگنو کی طرح چمکا۔ میں نے اسے قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ گھر پہونچنے کے بعد جب میں غصے میں بھرا اپنے ارادہ کا اظہار بیوی سے کرنے والا ہی تھا کہ اس نے مسکرا کر کہا:

"جانتے ہیں ایک بات؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔ بیوی نے کہنا شروع کیا۔

"آج بابو نے مجھے ایک روپیہ کا نوٹ دیا۔ میں نے پوچھا کہ کہاں سے لایا تو اس نے بتایا کہ "ایک دن ابا کی جیب سے گر گیا تھا اور اسے میں نے انچی میں چھپا دیا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ کس لئے چھپایا تھا تو اس نے جواب دیا کہ "ٹافی خریدنے کے لئے" یہ سن کر میں نے پوچھا "تو پھر ٹافی کیوں نہیں خریدی" یہ سوال سن کر اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "جب میں نے چاہا تو یہاں پر کوئی بولا کہ نہیں یہ بری بات ہے۔ اس لئے میں نے نوٹ آپ کو واپس کر دیا" اپنے چھ سالہ بچے کی بات سن کر میرا غم و غصہ غائب ہو گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ بچپن میں میری

باقر مہدی

ایک کالی غزل

بے نوائی کا چلن آپہنچا
پھر وہی عہدِ کہن آپہنچا
اپنی زنجیر بجاتا آخر
خوگرِ رنج و محن آپہنچا
سرفروشی کی تمنا لے کر
دستکیں دیتا کفن آپہنچا
تنگ کمرے کو مبارک ہو کہ پھر
شعلۂ گنگ و جمن آپہنچا
سرخ بادل سے سفیدی برسی
آگ پانی کا ملن آپہنچا
ٹوٹے شیشوں کو تجلی دینے
ایک گم گشتہ رتن آپہنچا
خامشی مہر بہ لب رہ نہ سکی
شاعرِ خوف شکن آپہنچا
کالی غزلوں کو منور کرنے
ٹوٹ کر نیل گگن آپہنچا

غزلیں

آزاد گلاٹی

اب ذہن کے گنبد میں یوں صدا نہ لگا
جو کھو گیا ہے یہاں اس کا کچھ پتہ نہ لگا

رہا تھا وہ نئے رشتوں کے بعد کچھ ایسے
کہ برسوں بعد بھی وہ مجھ کو دوسرا نہ لگا

سلگتے درد دہکنے لگیں گے سینے میں
انہیں زبان نہ دے، لفظ کی ہوا نہ لگا

خوشی تھی ملنے کی تجھ سے کہ دکھ بچھڑنے کا
ان آنسوؤں سے تو اس راز کا پتہ نہ لگا

وہ شخص جس کو ملا تھا تیری نگاہ کا لمس
میری نظر میں وہ جو کچھ تھا، پھر تو برا نہ لگا

ترے بچھڑنے کے اک زخم ہی کا احسان ہے
کوئی بھی زخم لگا۔ ہم کو وہ نیا نہ لگا

وہ میرے غم سے الگ رہ کے جی بھی سکتا تھا
مگر اسے تو کسی کا کہا سنا نہ لگا

عجیب زود طبیعت تھی اپنی اے آزاد!
کسی بھی رت میں کوئی رنگ بھی ہرا نہ لگا

تیری پیشانی پہ میرے غم کی تابانی نہیں
اور تو کچھ بھی ہے تو، لیکن میرا ثانی نہیں

ہم تو اب بھی جھیلتے ہیں چاندنی شب کا عذاب
تم یہ کہتے تھے: لہو کی آگ لافانی نہیں

اپنا ہونا اور نہ ہونا، اک خیال اک خواب ہے
اس مقامِ لامکاں میں کچھ بھی امکانی نہیں

دیکھئے تو ایک لمحہ ہے ازل سے تا ابد
سوچئے: تو وقت طولانی بھی طولانی نہیں

کیسے کیسے ہم سفر راہوں کو ویراں کر گئے
اب سفر میں کوئی شے بھی جانی پہچانی نہیں

سید جعفر عباس

وہ آدمی

وہ آدمی یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔ جس کو چند دنوں سے اس علاقہ میں دیکھا جا رہا تھا۔ سارے علاقہ میں وہ آدمی بحث کا موضوع بن رہا تھا۔ میں نے اس وقت تک اس کو دیکھا نہیں تھا بس اس کے بارے میں سنا تھا

مگر ایک دن جب میں شرد کے ساتھ بس اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ تب ہی شرد نے مجھکو اس آدمی کو دکھلا دیا۔ اس آدمی میں کوئی بھی بات مجھکو ایسی نہ لگی جو ذکر کا موضوع بن جاتی یا بن رہی تھی۔ میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بنا کوئی تاثر دیئے ہوئے میں شرد کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

پھر وہ مجھکو روز ہی دکھائی دینے لگا۔ اور مجھکو ایسا لگنے لگا کہ میں جیسے جیسے اُس سے نفرت کرنے لگا ہوں ویسے ویسے وہ میرے دل میں بستا جا رہا ہے۔ میں اس سے آپ ہی آپ بھاگنے لگا۔ میں اس آدمی سے ڈرنے لگا ——— آپ ہی آپ اور بلا وجہ۔

پھر میں نے اُسے [illegible] خانے میں بیٹھے دیکھا پان کی دکان پر [illegible] اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا [illegible] اور [illegible] رہا تھا اور مجھکو اس سے نفرت [illegible] ہوا

محسوس ہونے لگا۔

میں دن رات اُسی کے متعلق سوچتا رہتا، ہر وقت انتقام کی آگ میں جلتا رہتا، میری بیوی کو مجھ میں پہلی سی شگفتگی نظر نہیں آ رہی تھی، میرے بچے مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے میرے دوست مجھ سے چھوٹتے جا رہے تھے۔ میں کتنا پاگل اور کتنا اکیلا ہوتا جا رہا تھا۔ پر میں کتنا مجبور تھا۔ کتنا بے بس۔

میں ایک ایسی آگ میں جل رہا تھا جس کو کوئی دوسرا آدمی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ میں اندر ہی اندر جلتا اور کڑھتا جا رہا تھا۔

پھر بہت دنوں تک وہ آدمی مجھکو نظر نہ آیا۔ میں بیحد خوش ہوا۔ اور پہلے کی طرح نارمل رہنے لگا۔ میرے بیوی بچے میری اس بدلتی ہوئی حالت سے بہت خوش تھے۔ میں بھی خوش تھا۔

پھر بہت دن بیت گئے۔ اور میں تقریباً اس پُر اسرار آدمی کو بھول چکا تھا۔

ایک دن شام کو جب میں عابدہ کے ساتھ پکچر دیکھنے جا رہا تھا۔ تو وہ پان کی دکان پر پھر نظر آ گیا۔ میری حالت عجیب ہو گئی۔ میرے جسم کا رواں رواں اکڑنے لگا۔

میری بیوی عابدہ نے میری اس اچانک تبدیلی کو محسوس کیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں غصہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔

مگر وہ آدمی نہایت بے فکری اور لاپرواہی سے پان کی دکان پر کھڑا ہوا ہنس رہا تھا۔ ابھی تک اُس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری طرف دیکھے۔ تاکہ میں اس پر تھوک سکوں۔

اچانک وہ مڑا، تیزی سے میرے قریب آیا اور مسکرایا اور تیزی سے نفرت سے میری طرف دیکھا۔ اور زمین پر تھوکا۔ اور اچانک وہ ایک طرف مڑا اور چلدیا۔ مجھے سوچتا ہوا

چھوڑ کر، میں بے بس تھا۔ آج تک [illegible] ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے نفرت کرنے والا اتنی بے باکی سے میری عزت پر ڈاکہ ڈال دے یہ میں برداشت نہ کر سکا۔

گھر واپس آیا، غصہ اور انتقام کی آگ میں جلا ہوا۔ ٹہلتا رہا، عابدہ میرے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی تمام ترکیبیں آزما کر تھک کر سو چکی تھی۔ بچے ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے چپ چاپ پڑے سوتے یا مجھ سے ڈر کر نا وقت سو گئے تھے۔ سارے گھر پر موت کا سناٹا تھا۔ صرف میں جاگ رہا تھا انتقام کی آگ کو سینے میں دبائے ہوئے۔

صبح کو میں نے اُس آدمی کو تلاش کی۔ میں اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ پان کی دکان پر پوچھا، شام تک سارے علاقہ میں تلاش کرتا رہا۔ تب ایک میلے کچیلے نے میرا پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ بابو جی ... پیسے دے دو ... بابا مر گئے۔ چتا جلانی ہے ... بابو ... جی ...

میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ اور آگے بڑھنے لگا تب ہی پھر اُس میلے سے بچے نے روتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔ میں غصہ میں تھا بولا۔ ابے چل سالے، جھوٹے۔ دکھا تیرے بابا کہاں مرے پڑے ہیں ... لڑکا ایک گلی سے دوسری گلی میں مڑتا ہوا آگے آگے چلتا رہا۔ وہ ایک ٹوٹے پھوٹے شکستہ سے مکان کے پاس جا کر رک گیا۔

میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اور حیران رہ گیا۔ یہ تو وہ مرا ہوا آدمی وہی تھا۔ میں دل ہی دل میں بیحد خوش ہوا میرا جی چاہا کہ زور زور سے گاؤں، شور مچاؤں، ناچوں مگر اس بچے کی سسکیوں نے مجھے یکدم چونکا دیا۔ میں نے چند بڑے نوٹ اُس کے ہاتھ پر رکھے اور تیزی سے گلی پار کرنے لگا تاکہ یہ خوش خبری اپنی بیوی عابدہ کو بھی سنا سکوں۔

تیز تیز چلتا ہوا جب میں اُس پان کی دکان کی طرف سے جا رہا تھا تو مجھ کو وہ آدمی نظر آیا۔ میں حیران رہ گیا۔

لیکن اُس نے مجھے دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر بڑی دکھی [illegible] مُردہ سی آواز میں کہنے لگا

"بابو جی میری مدد کیجئے۔ میرا بھائی آج مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ بابو جی ... میرا بھائی مر گیا ... اُس کی داڑھی [illegible] تھا بہت [illegible] تھی)۔ میں نے اس کو [illegible] اُس کو سمجھاتا رہا لیکن اس کا رونا [illegible] کاندھے پر ہاتھ [illegible] لگا

غزلیں

مصور سبزواری

چہرہ ز ل وقت کا عرفان سا کوئی
تھا ڈوبتے جزیرے کی پہچان سا کوئی

اوروں کی قربتوں نے بھلا رکھا تھا اسے
بچھڑے جو لوگ [illegible] بڑھا ہیجان سا کوئی

پل میں زماں مکاں کی طنابیں اکھڑ گئیں
آیا تھا آدھی رات میں طوفان سا کوئی

شاید بدن ہی منکرِ لذت ہوا نہ تھا
در آیا خول توڑ کے شیطان سا کوئی

پھولوں کی وہ کماں کسی کام دیو کی
میں اس کا صید ٹوٹتا ایمان سا کوئی

بلقیس کے سبا کی طرح شہر شہر رات
اُڑتا رہا تھا تختِ سلیمان سا کوئی

کہتا نہ تھا کہ دید سے تُو میری باز رہ
اب دیکھ نصفِ جسم کا حیوان سا کوئی

اپنے بدن پہ ٹوٹ کے پڑنے کو رہ گیا
خود سے میں اس محاذ پہ لڑنے کو رہ گیا

چھو کر تو دیکھ ہانپتی شاخِ شجر کی ڈھال
پتا ہی اک ہواؤں سے لڑنے کو رہ گیا

میں خوشبوؤں کی لاش جسے پی گئی ہوا
تو میری پور پور جکڑنے کو رہ گیا

خوش ہوں کہ تو بھی رہروِ دشتِ فرار تھا
اب کوئی بھی نہ مجھ سے بچھڑنے کو رہ گیا

ان زلزلہ شکار چھتوں سائبانوں میں
اب کون سا ستون پکڑنے کو رہ گیا

آباد مجھ میں سایۂ بدروح ہے کوئی
میں وہ مکان ہوں جو اجڑنے کو رہ گیا

عتیق اللہ

غزلیں

کہاں سے لاؤں وہ دیواریں جو نہ ٹوٹ سکیں
وہ چھت کہاں سے ملے جو امان دے مجھ کو

اب اور رنگ کو سنبھالا نہ جائے گا مجھ سے
پھر اور اپنے لہو کا خراج دے مجھ کو

پھر اس کی کھلی چھاتیوں پہ سر رکھ کر
اڑا لے چلے بگلوں کے سلسلے مجھ کو

سر سے پاؤں تلک ایک آنکھ بن جاؤں
جہاں سے بھی تجھے دیکھوں دکھائی دے مجھ کو

سنسنی سی جو محسوس کر رہا ہوں میں
ہر ایک چیز سے بے دخل کر نہ دے مجھ کو

شب ساعتِ دیر آشنا ہے سنگ پا
راز ہے مٹھی میں بھینچ لے مجھ کو

کھڑا رہا تھا بہت دور آشکار نہ تھا
وہاں گیا تھا جہاں میرا انتظار نہ تھا

اُتار کر مجھے چھلکے کی طرح پھینک دیا
اور اس پہ ظلم کہ چاقو بھی تیز دھار نہ تھا

زباں میں کئی سوراخ ہو گئے پیدا
زمیں کا بوسہ یک لمس سازگار نہ تھا

میں اتفاق سے ہی اس طرف نکل آیا
وہ منتظر تھا مگر میرا انتظار نہ تھا

تمام راستے مسدود کر کے بیٹھا ہوں
میں اب سے پہلے کبھی اتنا بے کنار نہ تھا

محمد منشا یاد

دو جمع دو

تیز گام رکتی ہے۔

پلیٹ فارم پر منتظر اور بے قرار ہجوم ہیں۔ دو نفری پھیل جاتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے سارا ہجوم اے سی سی (ایئرکنڈیشنڈ کوچ) فرسٹ سکنڈ اور تھرڈ چار حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

میں سامنے والے ڈبے کی طرف دیکھتا ہوں۔ گرمی سے میرا جسم جھلس رہا ہے۔ لیکن ایئرکنڈیشنڈ ڈبے پر نظر پڑتے ہی بدک جاتا ہوں۔ اور ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ پھر فرسٹ اور سکنڈ کے ڈبوں پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس جاتا ہوں لیکن میری روح اب تک ایئرکنڈیشنڈ ڈبے میں اٹکی ہوئی ہے جسے دیکھ کر میں بدک گیا تھا۔

مجھے اے سی سی۔ فرسٹ اور سکنڈ کے ڈبوں میں سوار ہونے والوں پر خواہ مخواہ غصہ آنے لگتا ہے۔ جیسے انہوں نے اپنی اپنی جیب سے نہیں میری جیب کاٹ کر ٹکٹ خریدے ہوں اور اپنے اپنے ڈبوں کی کھڑکیوں سے سر باہر نکال کر میرا منہ چڑا رہے ہوں۔

تیز گام روانہ ہوتی ہے۔

پلیٹ فارم پیچھے رہ جاتا ہے۔ ریلوے کوارٹر ساتھ ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ بڑے چھوٹے اور چھوٹے چھوٹے کوارٹر بڑے کوارٹر میں کئی چھوٹے کوارٹر سما سکتے ہیں۔

چھوٹے کوارٹروں میں چھوٹے ملازمین رہتے ہیں۔ خواہ ان کے قد چھوٹے نہ ہوں۔ اور ان کی تعداد بڑے کوارٹر والوں سے زیادہ ہو۔ اور خواہ بڑے کوارٹر والوں کو ایک دوسرے کو تلاش کرتے وقت کتنے ہی ویران اور خالی کمروں سے گزرنا پڑتا ہو۔ بڑے کوارٹروں میں کمرے خالی پڑے رہتے ہیں۔ اور چھوٹے کوارٹر والوں کو چارپائیاں گلیوں میں بچھانا پڑتی ہیں۔ ایئرکنڈیشنڈ فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں سیٹیں خالی پڑی رہتی ہیں۔ اور تھرڈ کلاس میں سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔

ہم سب مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم نے سرکاری ملازمتوں کو بھی چار بڑے بڑے درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اول، دوم، سوم اور چہارم۔

یہ تقسیم بہت پرانی ہے۔

وہ جو سر سے پیدا ہوئے۔ ایک کندھوں اور ہاتھوں سے پیدا ہوئے۔ دو رانوں سے پیدا ہوئے تین اور وہ جو پاؤں سے پیدا ہوئے چار۔

مگر یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب ایک لمبی تاریک رات ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ درخت اور انسان زمین سے چمٹے ہوئے تھے۔ اور زہریلی سرد ہوائیں چلتی تھیں۔ ستاروں کی پھیکی پھیکی روشنی میں ہر چیز پر اسرار معلوم ہوتی تھی۔ درختوں کے تنوں اور انسانوں کی گردنوں سے اژدہے لپٹے ہوئے تھے۔ سانپ سپولئے اور ناگین درختوں کی شاخیں اور ٹہنیاں تھیں۔ کئی کئی ہاتھوں اور سروں والے دیوتا آلتی پالتی مارے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ مردوں کی زبانوں پر قفل اور پاؤں میں زنجیریں تھیں چتاؤں کے بھسم کر دینے والے شعلوں کے خوف سے عورتوں کی زبانیں گنگ اور بدن حرارت سے محروم تھے۔

آدم خور حکمرانوں، خونخوار سرداروں، کئی کئی ہاتھوں اور گردنوں والے دیوتاؤں اور خود ساختہ مذہبی روایات کے ٹھیکیدار اور اجارہ داروں کے خلاف بات کرنے یا سوچنے پر زبانوں میں سوراخ کر دیئے جاتے تھے ان کے برابر بیٹھنے پر چوتڑ کاٹ دیئے جاتے اور منہ میں لوہے کی گرم سلاخیں ٹھونسی جاتی تھیں۔

کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے ہیں فصلیں بیچ رہے ہیں۔ فصلیں
بیچنے کے لئے بیج کھاد اور بیلوں کی خریداری ہوتی ہے اور فصلیں
بوئے جانے سے پہلے نیلام ہو جاتی ہے۔
کھاد مٹی میں مل جاتی ہے۔ بیلوں کو رسہ گیر ہانک کر لے
جاتے ہیں۔ انہیں رکھے ہوئے بیج اُگ کر پودے بن جاتے ہیں۔
پودوں سے پھر بیج حاصل ہوتے ہیں۔
مجھے اپنا باپ یاد آنے لگا ہے۔ شاید میرے باپ
کو بھی اپنا باپ اسی طرح یاد آتا ہو لیکن شاید اپنے باپ کو
باپ اور اپنے بیٹے کا بیٹا میں خود ہوں۔
مجھے یاد آتا ہے جب وہ اس وادی میں آئے۔ یہاں
فصلیں لہلہاتی بھینسیں ڈکراتی تھیں۔ عورتیں دودھ بلوتی اور
بچے گیلی مٹی سے گھوڑے بناتے اور چولہے کی آگ میں پکاتے
انہوں نے عورتوں گھروں اور کھیتوں پر قبضہ کر لیا
لیکن وہ ہل چلانا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ہل [illegible]
والوں کو ملازم رکھا اور اپنے گھروں کو اناج سے بھر لیا۔
گودام اناج سے بھرتے رہے۔
کیڑے مکوڑے اور چوہے اناج کھا کھا کر اژدہے
بھیڑیئے اور راکشس بن گئے۔ اور ہر طرف اژدہوں کی پھنکاریں
سنائی دینے لگیں جو اناج کے ڈھیر پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئے تھے۔
ترمذی میں روایت ہے "ہماری امت میں مہدی
آئے گا جو ایسے زمانے میں آئے گا جب دنیا مصائب و مشکلات
کا شکار ہو گی۔ وہ امن قائم کرے گا۔ انصاف پھیلائے گا اور
دولت کو لوگوں میں برابر تقسیم کرے گا"۔
تیز گام کا عوام ایکسپریس سے سامنا ہوتا ہے۔ ••

بقیہ: غنڈہ

"میں تمہیں ایک شریف آدمی سمجھتی تھی مگر تم تو بڑے غنڈے
نکلے۔"
اس عجیب و غریب کمنٹ پر وہ بوکھلا سا گیا۔ ندامت
سے سر جھکاتا ہوا باہر آیا تو اس کے کانوں میں باجی کی آواز گونجی۔
"سنتے ہیں نا تمہارے دوست جس کی تم نے تعریف کی تھی"
اور اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آج باجی نے اُسے غنڈا
کیوں کہا۔ ••

منظر امام

ماں جو میرے ساتھ ہے

سہانوک کی فوجیں کمبوڈیا کے دارالحکومت نوم پنہ میں داخل ہوگئیں۔ مین الاقوامی ہوائی اڈے پر راکٹوں سے حملہ۔ ہم سرکاری طیارے تباہ۔ دارالحکومت کے شمال میں گھمسان کی جنگ۔ بودین پاکستان اور احالسان کے درمیان مصالحت کرائیں گے۔ — سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت شرف انسانیت ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار خبروں کے عنوانات تھے۔ اور میں ان عنوانات کو کئی کئی بار پڑھ چکا تھا۔

جب میں بس کی سیٹ پر آکر بیٹھا تھا تو مجھے یہ یقین سا ہوگیا تھا کہ میں ان خبروں کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھ سکوں گا۔ اخبار کے جانے پہچانے ۸ سطری کالموں کے علاوہ بھی کچھ اور دیکھ سکوں گا۔ لیکن بس خاصا طویل سفر طے کر چکی تھی اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اُکتا سا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم انسانا کیسے کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے اظہار کے لئے ایسے لفظوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے جو دوسرے حالات میں شخصیت کو مسخ کر دیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ایسے موقعوں پر لفظوں کو غائب پا کر خود کو چھوٹا کرلیا ہو۔

اس لئے وہ لڑکی مجھ سے کہا کرتی تھی کہ تم شاید کبھی بڑا نہیں مانو گے۔

ایک رات جب میں اپنے گھر میں تنہا تھا تو وہ لڑکی مجھ سے یوں ہی ملنے کے لئے آگئی۔ جیسے کوئی چور یوں ہی آپ کا سامان لے اُڑے۔ میں اُسے دیکھتے ہی یہ بھول گیا کہ ابھی دو دن پہلے ہی اس لڑکی نے مجھ سے شرماتے ہوئے کہا تھا کہ میں ایک ہفتے کے بعد نہاؤں گی۔ حالانکہ لفظ اس کے پاس بھی بہت تھے۔ لیکن بات اس طرح واضح ہوگئی تھی جیسے کسی سردار جی کی وہ درخواست جو انھوں نے صرف اس لئے لکھ لی تھی کہ ٹائپ انگریزی تھا۔

لیکن جب وہ لڑکی میرے پاس آئی تو میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ لڑکی بے حد خوبصورت تھی۔ تو یہ تعریف اس لڑکی کی نہیں بلکہ میرے انتخاب کی ہوگی۔ اس نے ایسی قمیص پہن رکھی تھی جس کے آگے کی طرف کھلے ہوئے ڈیزائن کے گلے کو دیکھ کر بے اختیار جی چاہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ملوث کر لیا جائے۔ ہتھیلیاں خالی اس وقت اچھی لگتی ہیں جب آدمی سویا ہوا ہو۔ لیکن وہ لوگ جو لفظوں اور لہجے کے انتخاب میں محتاط ہوتے ہیں ان کی ہتھیلیاں اس وقت بھی بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

قمیص کے علاوہ اس لڑکی نے ایسی شلوار پہن رکھی تھی جو ٹرانسپیرنٹ تھی۔ یوں تو ہر لڑکی ٹرانسپیرنٹ شلوار پہن کر آگے پیچھے ہوتی ہوئی دو دھاری تلوار کی طرح ہوجاتی ہے لیکن وہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت ایسی دکھائی دے رہی تھی جیسے اس نے ایڑیوں سے لے کر کمر تک آگ لگا لی ہو۔ آگ لگنے کا یہ تصور کالی لڑکیوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ یہ صرف گلابی تلواروں کے لئے مخصوص ہے۔ کالی لڑکیاں تو کالا دھواں دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

"تم چاہتی کیا ہو؟"

"کیا مطلب ؟" وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی تھی۔
"میرا وزن صرف ۱۰۲ پاؤنڈ رہ گیا ہے۔
"تم جھوٹ کہتے ہو۔"
"میں سچ بول رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں تھوڑی دیر بعد نہا لوں گا۔"

وہ اچانک میرے پاس سے اٹھی اور کچھ دور جاکر بیٹھ گئی۔

"کیوں؟" تمہیں کیا ہوا؟" میں نے حیرت زدہ لفظ ادا کیے۔

"لیکن میں تو ایک ہفتے کے بعد..." اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اب اگر میں لفظوں کے انتخاب کو اہمیت دیتا تو شاید میرا وزن ۱۰۲ ہی پاؤنڈ رہتا۔ لیکن میں نے ہار نہیں مانی۔

میں نے اس کی طرف گہری گہری نظروں سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔

"جانتی ہو! — آج کے اخبار کی ایک خبر کیا ہے؟"
"نہیں۔" اس نے معصومیت سے سر ہلایا۔
"کل ایک ٹرک سڑک پہ چلتے چلتے اچانک فٹ پاتھ پہ چڑھ گیا۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور کانپ کر رہ گئی۔

اب بتائیے اگر میں لفظوں کے پھیر میں پڑا رہتا تو شاید اس سلگتی ہوئی رات میں مسخ ہو کر رہ جاتا اس لئے جب میں اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو میں نے سوچا کاش یہ اخبار ۸ سطری کالموں کی بجائے ۴ سطری کالموں کا ہوتا۔ تاکہ اخبار سے اپنے چہرے کو چھپائے رکھنے والی خوب صورت لڑکی تھوڑی دیر کے بعد اخبار پڑھ کر اسے نفاست سے تہ کرکے ایک طرف رکھ دیتی اور میں خبروں کا پس منظر جان سکتا لیکن میرے سامنے تو دیت کانگ اور کمبوڈیا کے مسائل تھے۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس اخبار پر دوبارہ نظر دوڑائی۔

افغانستان میں جبری بھرتی ۔ قبائلی باشندوں کی طرف سے مخالفت۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مڑے تڑے کالے کالے چھوٹے بڑے حروف لفظ بنا بنا کر بند آنکھوں کے اسکرین پر ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے رنگوں کے دائرے تھے۔

رنگ جو منجمد ہو جائیں تو اس لڑکی کی طرح ہو جائیں جو اپنے چہرے کے سامنے اخبار لئے بیٹھی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو اس وقت دیکھا تھا، جب بس میں سوار ہوا تھا۔ اس لڑکی کے سامنے اس وقت اخبار کی دیوار نہیں تھی۔

یہ لڑکی ہر اس محترمہ، مس، آنسہ، ڈارلنگ اور جان سے خوب صورت تھی جن سے میں اب تک مل چکا تھا۔ بلکہ جنہیں برت چکا تھا۔ شاید برتاؤ کے بعد لڑکیاں اپنے چھلکے اتار کر اچھی لگنے کے مرحلے سے گزر جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لفظ برتاؤ بھی غلط ہو لیکن میں نے کہا تا کہ لفظ میرا المیہ نہیں ہے۔ بلکہ المیہ تو یہ تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ اور وہ اخبار اس طرح تنا ہوا تھا۔

بس میں سوار ہوتے ہی میں نے اس لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے سامنے کی سیٹ خالی تھی۔ حالانکہ وہ سیٹ بھی عورتوں کے لئے مخصوص تھی لیکن کنڈیکٹر نے مجھے اشارہ کر دیا تھا کہ میں وہاں جاکر بیٹھ جاؤں اور جب میں اس سیٹ پر بیٹھ گیا تھا تو اس لڑکی نے اپنے چہرے کے سامنے اخبار تان لیا تھا۔

اس اخباری لڑکی نے بھی حالانکہ ٹرانسپرنٹ شلوار

غزلوں کے بارے میں جناب مغنی کی رائے ہے :

" غزلوں میں اُردو غزل کی مسلّمہ روایات کی پابندی کی گئی ہے ....
لیکن اب اُردو غزل اتنی بالیدہ و شستہ ہو چکی ہے کہ انفرادیت
اور امتیاز حاصل کرنے کے لئے بڑے ہی خاص قسم کے تجربات و احساسات
نیز ان سے ہم آہنگ اسلوب اظہار درکار ہے ۔ "

شاعری کیا جنون کے علاوہ کچھ ہے ؟ انتظام ، سلیقہ ، تراش و خراش ________ کیا شاعری ان پہ تکیہ کرتی ہے ۔ شاعری دسترخوان چننا ہے ؟

" کائناتِ غم " کو " غم کائنات " کا مرتبہ دینا شاعری ہے ۔

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

" کائناتِ غم " کی شاعری میں پھیلنے کی صلاحیت ہے ؟

جہاں جہاں فرحت قادری نے " جنون کے دامن " میں پناہ لی ہے اُن کا نغمہ پاک ہونے سے بچ گیا ہے ۔
اور دامن کو وسیع دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک دنیا اس میں سما جاتی ۔

خرد ؟ وہ کب تماشا سے آگے بڑھی ہے

فرحت نے تیس سال کے سرمائے کو یک جا کیا ہے ' یہ بذات خود داد طلب ہے ۔ اس مجموعہ کو پڑھنا چاہئے ۔

________ کلام حیدری

نام کتاب	:	بیانات (ناولٹ)
مصنف	:	جوگندر پال
قیمت	:	ساڑھے سات روپئے
پبلیشر	:	انڈین بک پبلی کیشنز ۔ تلک روڈ ۔ اورنگ آباد

اپنی پہچان رکھنے والا جدید افسانہ نگاروں میں بے تحاشا لکھنے والا کون ہے ؟ جوگندر پال ! بے تحاشا سے میری مُراد زود نویسی ہرگز نہ لی جائے کیونکہ زود نویسی بے تحاشا لکھنے نہیں دیتی ۔ اس بے تحاشا لکھنے والوں کا یہ ناولٹ (میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ یہ ناولٹ ہے یا طویل افسانہ یا .....) تین کرداروں کی کہانی ہے نگیٹو ، پازیٹو اور نیوٹرل ____ یہ تینوں میں سے کسی پر کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا ہے ۔ نہ دلیپ کو نگیٹو کہہ سکتے ہیں نہ سا ہو کو پازیٹو نہ سیما کو نیوٹرل ________ مگر کہانی ہے ان ہی تینوں کی ۔ کہاں پر کون کیا ہے یہی معاملہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے

جوگندر پال پر لکھتے ہوئے وہاب اشرفی نے ایک بے حد غلط بات کہی تھی :

"جوگندر پال کے افسانے خالص فکری ہیں اُس اور اُن کا مطالعہ اسی بنیاد پر ممکن ہے" جوگندر پال ادب کے بنائے اصول و ضوابط کے شکنجوں میں جکڑا جانے والا افسانہ نگار نہیں ہے۔ "خالص فکری" ہونا تو خیر ایک طرف زیادہ تو فکر کا ادیب ہی نہیں ہے۔ مروجہ تنقیدی اصول و ضوابط کی گرفت میں وہ کیا آئے گا جو اپنی پہلی سطر سے آخری سطر تک سب کچھ توڑتا پھوڑتا رہتا ہے۔

اس ناولٹ کی پہلی سطر ہے :-

"سچائی کے کئی روپ ہیں اور ان میں سب سے دل کش روپ جھوٹ کا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں جھٹ سے سیما سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔"

پھر فوراً ہی :

"یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں سدا کے لئے اپنے آپ کو ایک ہی سیما کے حوالے کر دوں۔"

پھر :

"ایک آدمی سدا ایک نہیں ہوتا، بس اُسی ایک پل وہی ایک ہوتا ہے۔"

اور :

"سہاگ رات کو میں اپنے سونے کے کمرے کا دروازہ کھول رہا ہوں اور مجھے لگ رہا ہے کہ سیما کے باپ ڈاکٹر رائے نے مجھے اپنا کوئی ادھورا تجربہ بھیجا ہے۔"

اور :

"نہیں سیما، میرا مطلب اس نیچے سے نہیں جو بستر کی تہیں توڑ توڑ کر بنایا جاتا ہے، بستر کی مشقت سے بڑے کام انجام نہیں پاتے۔"

یہاں سے وہاں تک اس ناولٹ میں جوگندر پال نے "شریف کا ریپ کیا ہے"

"ساہو واپس بنارس جا چکا ہے۔ دلیپ لیبارٹری سے لوٹ آیا ہے اور مجھے وہم ہے کہ میری کوکھ میں ساہو کا بچہ پلنا شروع ہو گیا ہے — لیکن دلیپ؟ نہیں دلیپ کو کیا اعتراض ہوگا۔"

۱۰ — بڑے challenging ہیں۔ پال اُوپر جانے کے لئے کوئی فارمولا نہیں اپناتا، وہ خاص ہے۔ یہ کتاب اِس کے مرتبے کو بڑھاتی ہے، بلاشبہ بڑھاتی ہے۔ — کلام حیدری

ایک خط — ایک جواب

احمد داؤد
کلام حیدری

بھائی کلام حیدری۔

خط کے سلسلے میں پہلی آواز میری طرف سے قبول کرو۔ تمہاری
کتاب رشید امجد سے لے کر پڑھی ہے۔ مجموعے پر دلی مبارکباد
قبول کرو۔

تمہاری کہانیاں تو اس سے پہلے بھی نظر سے گزرتی
رہی ہیں۔ مگر مجموعے میں لکھنے والے کا جو امیج بنتا ہے وہ اس تصویر
سے مختلف ہے جو ہم تک رسالوں کے ذریعے پہنچا ہے
رشید کے ساتھ میری اس موضوع پر کافی بات ہوتی
ہے کہ آیا یہ کہانیاں مکمل طور پر جدید ہیں یا؟

تمہارا پتہ غبار خاطر میں سے لیا ہے جس میں تمہاری
اپنی آواز بھی چھپی ہے۔

یہاں کے لکھنے والوں میں سوائے نئے افسانے کے
اب چند لوگ ایسے بہت کم سہارا دے رہے ہیں۔ رشید کی
کتاب تم پڑھ لی ہوگی۔ یہ بھائی صاحب میرے قریب رہتے
ہیں۔ اور غالباً واحد پاکستانی لکھنے والے ہیں جن کے پاس
انڈیا سے اتنی کتابیں آتی ہیں اور اس خوبی کا سب سے زیادہ
فائدہ میں اٹھاتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں یعقوب راہی،
ان کا رپورتاژ پڑھا خاصی چیز ہے۔ کیا کرتے ہیں کہاں
ہوتے ہیں۔ وہاں کی ادبی صورت حال پتہ تو اکثر ہفت
ناموں اور ماہ ناموں کے ذریعے چلتا رہتا ہے۔ سریندر
پرکاش صاحب کی کہانی "کٹا ہوا سر" پڑھا احساس ہوا
ابھی جان باقی ہے اور کم از کم یہاں کے ان لکھنے والوں سے بہتر جا رہے ہیں
جو پرکاش اور پال صاحب کی عمر کے لوگ ہیں۔ انڈیا سے کبھی کبھار کوئی
خوبصورت انتخاب دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہاں اردو ادب کی مزاحمت
کے باوجود بھی ایک مضبوط اور منظم تحریک موجود ہے۔ ایک پرچہ نشانات
نکلا ہے یہاں کے لوگوں نے بہت پسند کیا ہے۔

تم کہاں ہوتے ہو مطلب کس جگہ سے دانا کھاتے ہو۔ پروفیسر
یا دفتری یا ایڈیٹری۔ امید ہے جواب سے آگاہ کرو گے۔ فقط

تمہارا سرحد پار کا دوست — احمد داؤد

برادرم۔

آپ کا خط ملا۔ مبارکباد کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔
پتہ نہیں وہ کون سا امیج تھا جو رسالوں کے ذریعہ
آپ لوگوں تک پہونچتا رہا۔ اور پھر یہ کون سا امیج اور کیسا
امیج ہے جو "صفر" نے بنایا؟ صرف اتنا لکھا کہ دونوں
امیج مختلف ہے، آپ نے میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں
کی۔ مجھے اس اور اس امیج کے متعلق اور دونوں کے فرق
کے بارے میں کبھی کچھ بتائیے۔

رشید امجد ــــ لگتا ہے ان سے بارہا مل چکا
ہوں اور ملتا رہا ہوں۔ قربت کا یہ احساس قلم کا رشتہ ہی
پیدا کر سکتا ہے باقی سب جھوٹ ہے۔

میں کہانیاں لکھتا ہوں ان پر لیبل کون سا لگے گا یہ
کام عالموں اور نقادوں کا ہے۔ میں تو جب بلڈ پریشر میں

[illegible] ہوں تو کچھ خون نکال کر پھینک دیتا ہوں کہ RE
LAX کر سکوں۔ مجھے بھی بتلایئے کہ آپ اور رشید امجد
نے باتیں کر کے میری کہانیوں کے بارے میں کیا رائے قائم کی
ہے ——— "آیا یہ کہانیاں مکمل طور پر جدید ہیں؟"
لیکن میں تو صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کہانیاں
ہیں یا؟

آپ کے یہاں سے ایک اطلاع ملی کہ انشایئے زیادہ لکھے
جا رہے ہیں۔ وزیر آغا کا نمبر ایک ہے، مشتاق قمر نمبر ۲۔ میرے
خیال میں آپ کے یہاں نظیر صدیقی بھی اچھے انشائیہ نگار ہیں۔
مگر انشائیہ نگاری کا مقبول ہونا اور زیادہ لکھا جانا کوئی
صحت مند علامت نہیں ہے۔ اوراق اور سیپ پہونچ پاتے
ہیں۔ باقی لوگوں نے تبادلے میں اپنے رسالے مجھے نہیں بھیجے۔
پتہ نہیں کیوں؟ میں ہر ماہ آہنگ تقریباً پندرہ رسالوں کو
بھیجتا ہوں۔

نشانات اچھا پرچہ ہے۔ یہاں رسالے اکثر شائع ہوتے
رہیں مگر ادھر نکلے ادھر ڈوبے۔ ہندوستان میں اردو پڑھنے
والوں کی قلت روز افزوں ہے۔ آہنگ اور مورچہ کے اداریوں
میں دکھے دل سے کئی بار لکھا ہے۔

آپ کے یہاں اردو میں لکھنے کا حوصلہ، ولولہ اور جوش ہے
یہاں لکھ کر اردو کو پھینک دی جاتی ہے۔ تقریباً تمام لکھنے
والوں نے ہندی میں لکھنے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور اردو
کو صرف انعامات اور بڑی نوکریوں کے حصول کے لئے استعمال
کیا جاتا ہے۔

اردو عجیب مہربان زبان ہے یہاں کے لئے سارے جو
ہندی کا اسلوب بتاتا ہے اردو رسم الخط بدل کر ناگری
اختیار کرنے کی وکالت اور حمایت کرتا ہے وہ بہت پیسے کماتا
ہے اور جو اردو کے حقوق پر بڑے بڑے اداروں (مثلاً انجمن
ترقی اردو، ترقی اردو بورڈ، اردو اکیڈمی، وغیرہ وغیرہ)
میں بحث کرتا ہے، تجویز پاس کرتا ہے، وہ بھی بہت پیسے کماتا
ہے۔ دنیا میں ایسی کون سی زبان ہے جو کمال دینے والوں کو بھی
دولت عطا کرتی ہے اور اپنا وظیفہ پڑھنے والوں کو بھی
مالا مال کرتی ہے۔؟

اردو کے درویشوں کا حال؟ درویشوں کو کیا
چاہیئے۔؟ ایک درد دل کے سوا ان کو کچھ چاہیئے اور نہ
کچھ مل سکتا ہے۔

آل احمد سرور ——— پنشن پانے کے بعد پھر ملازمت
تنخواہ تین ہزار ——— ڈاکٹر عقیل ——— ریٹائر ہونے کے بعد
پھر نوکری، تنخواہ تین ہزار ——— سہیل عظیم آبادی تنخواہ
ایک ہزار ——— آفس، فون، لاکھوں کا بجٹ۔ کہاں
تک گنواؤں، غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی ———
غرض اردو کے لئے کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ مگر اردو جاننے
والوں کی دن بدن کمی ہوتی جا رہی ہے۔

سردار جعفری، پدم شری ہو کر مطمئن ہو گئے۔ اکثر ماسکو
ہو آتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔
ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی یہ سب بڑے لوگوں کے
نام ہیں اور ان سب کے بعد ——— ان کا نام صحیح تلفظ کے ساتھ
لینے والے تلاش کرنے پڑیں گے۔ الغرض سب ان دنوں
اردو کے دعا گو ہیں۔ کیوں کہ وظیفہ خوار ہیں!

کمار پاشی اردو کو ذلیل زبان کہتے ہیں، لکھتے ہیں اور
خود کو ملامت کرتے ہیں کہ وہ اردو کیوں جانتے ہیں (کم از کم
وہ سمجھتے یہی ہیں کہ ان کو اردو آتی ہے) اور اس زبان میں
شاعری کیوں کرتے ہیں ——— اردو کی روٹی نہیں کھاتا۔
اس جواب کے بعد فقیری ایڈیٹری دونوں کا امکان ختم ہو گیا نا؟
تجارت کرتا ہوں، مسرور ہے! اور خدا کا
شکر بجا لاتا ہوں۔

——— آپ کا ———

——— [illegible]

THE Aahang Urdu Monthly
Editor: KALAM HAIDRI
BAIRAGI, GAYA

Printed by Kalam Haidri at Hind Litho Press and Published from Mohalla Bairagi, Gaya.

No. 63-64

کی
تشریح
تفسیر
اور
تنقید
کے افسانوں میں
قیمت

دی کلچرل اکیڈمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

آہنگ

ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء

شمارہ ۶۳، ۶۴

فون : ــــــ ۴۳۲

کتابت : قمر نظامی

طباعت : ہند لیتھو پریس
میکلوڈ گنج گیا

شرح خریداری

سال کے لیے	۱۵ روپے
دو سال کے لیے	۲۸ روپے
تین سال کے لیے	۴۰ روپے

فی شمارہ
ایک روپیہ پچیس پیسے

مدیر

کلام حیدری

محتویات

مزامیر

مضامین

افسانے

نظمیں

غزلیں

مزامیر

امریکہ پسندی اور کمیونزم دشمنی نے اگر کسی اُردو ادیب کے لئے مذہب کا درجہ اختیار کر لیا ہے تو وہ گوپال متّل ہیں۔ کسی کے مذہب میں دخل اندازی نامناسب ہے اس لئے ہم گوپال متل کی روس دشمنی پر کبھی طعنہ زن نہیں ہوئے۔ اُن کے ادارے کی ایسی ہی "مذہبی مطبوعات" پر ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ ہماری جمہوریت میں اس بات کی اجازت ہے کہ اگر امریکی مدد حضرت فورڈ کھلم کھلا ہندوستان دشمنی کا اعلان کریں تو اُس کی تائید گوپال متل اور ان کا ادارہ کر سکتا ہے۔ ان غیر ادبی باتوں پر تبصرہ کرنے کے لیے آہنگ کے صفحات نہیں ہیں۔

لیکن گوپال متّل نے اردو ادب کی مشہور اور لائق احترام شخصیتوں پر اُن کی موت کے بعد جس طرح کی تحریریں ادب کے نام پر پیش کی ہیں وہ بہرحال قابلِ نفرین اور سزاوار مذمت ہیں۔

جب سجاد ظہیر کا انتقال ہوا اور اُن کے سلسلے میں تعزیتی جلسے ہونے لگے تو گوپال متّل نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر وفاداری میں استواری دکھانے کے لیے اُن کے ادبی مرتبے ہی کو نہیں بلکہ شخصیت کو بھی مجروح کرنے کی کوشش کی۔ ایک مضمون سائکلو سٹائل کر کے اُردو کے اخبارات و رسائل کو بھیجے۔ اس غیر ادبی مجنونانہ حد تک کمیونسٹ دشمنی سے لبریز مضمون میں انھوں نے اردو ادب کے ایک محسن کی جس طور پر ہتک کی تھی وہ افسوس ناک تھی۔

تحریک (اکتوبر) میں انہوں نے رشید جہاں کے محض کمیونسٹ ہونے کی بنا پر اس بات پر خفگی کا اظہار کیا ہے کہ اُن کی سالگرہ کمیونسٹوں اور اُن کے ہم سفر ترقی پسندوں نے کیوں منائی اور یہ خفگی اس بات پر اور بھی زیادہ ہوئی کہ اُن کی برسی ماسکو میں کیوں منائی گئی۔ پروفیسر چیلی شیف کی اُس تقریر پر وہ سخت ناراض ہیں۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر رشید جہاں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ موقعوں پر جو تقریریں ہوتی ہیں اُن کو گوپال متل ہی اونچا ادبی مرتبہ دینے پر اصرار کر سکتے ہیں ورنہ ان تقریروں میں عقیدت اظہار زیادہ ہوتا ہے۔

"انگارے" کو رشید جہاں کی تصنیف نہ چیلی شیف نے مانا ہے نہ کسی اور نے۔ 'انگارے' کا موازنہ 'گورا' 'گئودان' 'بھارت بھارتی' سے صرف اس طور پر کیا گیا ہے کہ ان کتابوں نے ہندوستانی ادب کا رُخ موڑ دیا۔ اگر گوپال متل کو شیر کہا جائے تو اس کے قطعی یہ معنی نہیں لیے جائیں گے کہ وہ ماند میں رہتے ہیں یا خونخوار ہیں۔ 'انگارے' کو ایک تاریخ ساز کتاب ماننے سے انکار کوئی ادیب نہیں کر سکتا ہے۔ گوپال متل بھی نہیں کر سکتے۔ گوپال متل نے خلیل الرحمن اعظمی کے تحقیقی مقالے "اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" سے جو اقتباس دیا ہے وہ ادبی بددیانتی ہے۔ جس پیراگراف کے درمیان سے چند جملے نکال لیے گئے ہیں اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے۔

"یہ سارے افسانے فنی اعتبار سے خام ہیں لیکن ان کی اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ پہلی بار ہمارے افسانہ نگاروں نے اس بند کو توڑنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے سماج کے بہت سے

اہم اور پیچیدہ مسائل ابھی تک فن کے حدود میں داخل نہیں ہوتے تھے یا ان میں ممنوع قرار دیئے جاتے تھے ۔ "

صہ ۲۱۱

خاتمۂ بحث کے طور پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو باتیں لکھی ہیں کیا ان سے انگارے کے مضامین کی تاریخی ادبی اہمیت ثابت نہیں ہوتی ؟

وقار عظیم نے (نیا افسانہ صہ ۶۷) لکھا ہے:

" موضوع کے لحاظ سے اس (انگارے) سے پہلے اردو کے افسانوں میں اتنی صاف گوئی اور بےباکی کہیں نہیں ملتی اور نہ فن کے لحاظ سے اتنی نازک پیچیدگیاں ۔ "

اب اس کا کیا کیا جائے کہ رشید جہاں یا سجاد ظہیر کمیونسٹ تھے اور کمیونسٹ ہونا ہی گوپال مِتّل کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم ہے ۔

آخر میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے مقدمے سے یہ اقتباس گوپال متل کی خدمت میں پیش ہے:۔

" اس (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک) کتاب کو اگر ایسا شخص پڑھ لے جس نے اس تحریک کا پورے پس منظر میں مطالعہ نہیں کیا ہے تو اسے یہی گمان گزرے گا کہ یہ تحریک اپنے دامن میں جو ادبی سرمایہ رکھتی ہے وہ قابلِ اعتنا نہیں ہے ۔ " (مقدمہ صہ ۱۴)

سجاد ظہیر ہوں یا رشید جہاں اُن کا شمار اردو ادب کے محسنین میں ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ گوپال متل گاہےگاہے ان پر کیچڑ اُچھال کر اور ان کے ذریعہ روس کو گالیاں دے کر اپنی مخصوص وفاداری کا اعلان کرتے رہیں گے۔ اس سے ان بڑی شخصیتوں کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بےسبب دشمن ہونے کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔

— —

اسلم عمادی

مجھے معلوم تھا

مجھے معلوم تھا
—— ہر راستہ تجھ تک ہی جائے گا

ہوا
ہر صبح کچھ انجان دیسوں کی خبر لاتی تھی
جن میں
سبزہ زاروں میں نئے غنچے مہکتے ہیں
کہ جن میں
جھیل کے اطراف صف بستہ درختوں میں
برہنہ روحِ فطرت ناچتی ہے
کہ جن میں
بانس کی گہری گھنیری جھاڑیوں میں
نئے نغمے پروں کو یوں سمیٹے چھپ گئے ہیں
جیسے بربط میں کوئی لے بند ہو
کہ
جن میں
نیلے برفانی پہاڑوں پر
سحر کی روشنی یوں رینگتی ہے
جیسے
میٹھی انگلیاں جلتے بدن پر
مگر میں چپ رہا

یعنی
مجھے معلوم تھا
—— ہر راستہ تجھ تک ہی جائے گا

مسافر
—— جو فسانے جنم دیتے ہیں
—— (کہ ان کا ہر سفر کچھ گرد کے ذرّے ہی لاتا ہے
کہ ان کا ہر سفر ٹوٹی ہوئی
زنجیر کا پہلا سرا ہے)
فسانوں میں
اندھیرے چائے خانوں کی سسکتی روشنی میں
سناتے تھے
—— کہانی ان جزیروں کی
کہ جن میں عیش کی خوشبو مہکتی ہے
ہوس کے پھول کھلتے ہیں
—— کچھ افسانے
سنہری کروٹوں کے
—— کچھ افسانے
بھیانک مرحلوں، طوفان، وحشت، خون،

درندے، اجنبی۔
بے رحم وحشی قاتلوں کے
لبوں سے منکشف ہوتے تھے
نیلے راز زخمی واقعے جو زیرِ سایہ تھے
مگر
ایسے سفر،
مجھ کو نہ ہرگز دل ربا لگتے
مجھے معلوم تھا
ہر راستہ تجھ تک ہی جائے گا
کبھی
بہتے ہوئے دریا کو دیکھا تھا
(کہ جب فرصت ملی ہے
جو کہ محبوسِ جہاں میں "روز و شب کے کارواں میں
اس قدر نایاب جیسے کہ اطمینان کا ہلکا تنفس
کہ دن کے جاگتے ہی پاؤں میں تارے چمکتے ہیں
کہ شب آتی نہیں، آتی ہے لیکن لاپتہ ہو کر)
تو اس کو دوڑتے پایا تھا، اکثر ایک ہی بحرِ شبِ یلدا کی جانب
کہ جو پھیلا ہوا ہے، نیلگوں افلاک کے نیچے
مگر پھر موج اٹھ کر
آبشاروں کی طرح وادی میں گرتی ہے

صدا کی شاہ راہیں سطحِ نمناکِ فضا میں
ہر طرف ہیں [illegible]
مگر یہ رہ گزر، یہ پیچ و تاب مسحور کر پائے ہیں مجھ کو
مجھے معلوم تھا
ہر راستہ تجھ تک ہی آئے گا
تو اس جادے سے نقطہ پر
جہاں میں منطبق تھا مدتوں سے
تیرتا، بڑھتا
وہ سیدھا راستہ اب آ گیا ہے
بتا میں کیا کروں
—— کس سمت جاؤں

——

ڈاکٹر قمر رئیس

پیروڈی کا فن

پیروڈی کو سنجیدہ ادب میں کوئی خاص مقام حاصل
یں۔ لیکن غیر سنجیدہ یا مزاحیہ ادب میں اس کا چلن، اس کی
یت اور معقولیت مسلّم ہے۔ اگرچہ بعض اہل نظر کے نزدیک
ن کی یہ حیثیت بھی مشتبہ یا متنازعہ ہے۔ مثلاً سید احتشام حسین
احب اسے ایک ادبی صنف کے بجائے محض وقتی تفریح
ار سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادبی محفلوں میں اس
یے کوئی جگہ نہیں جبکہ رشید صاحب (پروفیسر رشید احمد
یقی) کی رائے ہے کہ" اعلیٰ پائے کی پیروڈی اتنی ہی قابل
ر ہوتی ہے جتنی کہ وہ عبارت یا شعر جس کی پیروڈی کی گئی ہے
یسر آل احمد سرور کے نزدیک:

"پیروڈی الہ اردیت کو آسیب بنا کر
پیش کرتی ہے۔ اس ستم ظریفی میں محض
دیوتا کے مٹی کے پاؤں دیکھنے کا جذبہ
ہی نہیں ذہنی صحت کے معیار قائم کرنے کا
احساس بھی شامل ہے۔"

اکٹر محمد حسن کے خیال میں:

"پیروڈی سنجیدہ فن پاروں میں مضحک
پہلوؤں کی تلاش ہے۔ یہ غلط پندار،
خود اہ خودی اور حد سے بڑھی انانیت میں
تناسب اور توازن پیدا کرتی ہے۔"

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ احتشام صاحب کی رائے کے
برعکس اکثریت پیروڈی کو ایک کارآمد ادبی صنف کا درجہ
دیتی ہے اور اسے قابل قدر سمجھتی ہے۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا پیروڈی کا تعلق مزاحیہ ادب
سے بلکہ مزاحیہ ادب کے اس روپ سے ہے جسے طنزیہ کہتے
ہیں۔ دراصل مزاح اور طنز کی داخلی ہیئت اور ان کے
محرکات میں اتنے اوصاف مشترک ہیں کہ ان کے درمیان
کوئی حدِ فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم ایک چیز ہے جو
دونوں کے مابین ہمیشہ وجہ امتیاز رہتی ہے اور وہ ہے ان
کا مقصد جو ان کے تاثر کی شکل میں پہچانا جاتا ہے۔ ایک کا
مقصد تبسم آفرینی تضحیک ہے۔ اور دوسرے کا تبسم آفرین تنقید
مزاح یا ظرافت ہمیں تبسم یا نشاط و انبساط کی ایک عارضی
کیفیت دے کر اپنی تخلیق کا مقصد پورا سمجھتی ہے۔ طنز اس
کیفیت کو دل کی گہرائی میں اتار کر ہمیں زندگی کے کچھ حقائق
کا شعور بخشتا ہے۔ پیروڈی کا سلسلہ نسب طنز سے ملتا ہے۔
دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ طنز اپنا موضوع اور
مواد براہِ راست (اور بالعموم) زندگی سے لیتا ہے۔
پیروڈی ادب اور زندگی دونوں سے۔ ایک مشترک وصف
جو مزاح، طنز اور پیروڈی تینوں میں کارفرما ہوتا ہے ظرافت
کا عنصر ہے۔ یعنی ایک ایسا فنی اظہار جو قاری کے دل میں تبسم

کی انبساطی کیفیت پیدا کرے۔ اس کے داخلی وجود کو گدگدائے
یہاں مزاح کی فلسفیانہ تاویلوں سے بحث کا موقع
نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ارسطو نے اسے جس طرح دریافت
کیا ہے وہ اپنے تصور پرستانہ رُخ کے باوجود آج بھی ناقابل
تردید ہے۔ اس کا قول کہ :

"وہی چیز ہنسی کی محرک ہو سکتی ہے جو بدہیئتی کا
ایک ایسا جزو ہو جس کی کجی یا ناہمواری کسی طرح
کی اذیت یا جراحت کا شائبہ نہ رکھتی ہو۔"

دراصل مزاح کے دو اساسی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے
اول یہ کہ مزاح کا محرک کوئی ایسا بے تکاپن ہوتا ہے جس سے
ہماری متانت اور احساسِ جمال کو صدمہ پہنچتا ہے اور دوسرے
یہ کہ وہ بے تکاپن یا بقول رشید صاحب 'کوبڑا' ایسا
ہرگز نہ ہو جو کسی کے لیے جسمانی یا روحانی اذیت کا باعث ہو۔
اس طرح ارسطو نے مزاح کو بظاہر اپنے اخلاقی آدرش
کا لیکن فی الحقیقت ایک وسیع تر معنی میں اسے انسان دوستی
یا انسانی ہمدردی کا تابع کر دیا۔

پیروڈی کا فن بھی اپنے مزاحیہ عنصر میں انسانی ہمدردی
کے اس پہلو سے عاری نہیں۔ اور چونکہ طنز کی طرح اس کا مقصد
بھی تنقید ہے اس لیے انسانی ہمدردی کا یہ پہلو اس کے
تنقیدی عمل میں پوری آب و تاب لیکن ضبط و توازن کے
ساتھ رونما ہوتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اپنے محرکات، اشتغالات یا موضوع کے
اعتبار سے اس کا میدان طنز سے محدود اور مختصر ہے صحیح نہ ہوگا
جیسا کہ ذکر آچکا ہے مزاح جو دونوں میں مشترک حیثیت
رکھتا ہے ہماری متانت اور احساس جمال کی شکست و برہمی
سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ شعر و ادب جمالیاتی اقدار کا بہترین
مظہر ہے اس لیے اس محدود دائرے میں بھی بے شمار موضوعات
پیروڈی کار کی نگاہ کرم کے منتظر رہتے ہیں۔ دوسرے اسے
اس کی بھی آزادی ہوتی ہے کہ وہ فن و ادب کے اسالیب یا
فن پاروں کے ساتھ ساتھ خود زندگی کے مظاہر کو بھی طنز کا
ہدف بنائے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کا تنقیدی اور
تخلیقی عمل طنز کی بہ نسبت کچھ پیچیدہ اور دشوار ہوتا ہے
طنز نگار زندگی کے بے شمار مظاہر میں سے کچھ ایسی
بے ہنگم یا بے تکی صورتیں اخذ کر کے جو اس کی نگاہ میں کھٹکتی
ہیں اپنے مزاحیہ اسلوب میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ
اس میں نشتر کی سی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیروڈی کا محرک
اور موضوع شعر و ادب کا کوئی خاص اسلوب، خاص رجحان
یا کوئی اہم فن پارہ ہوتا ہے اور اس کی تبسم آفریں تنقید کا
ہدف اس خاص اسلوب، رجحان یا تخلیق کی "کمزوریاں"
ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں لفظ 'کمزوریاں' بہت وسیع المعنی
ہے۔ اس میں صرف فنی نقائص نہیں بلکہ وہ تمام اوصاف و
علامات شامل ہیں جو فن و ادب کے کسی رجحان، اسلوب
یا کسی فن کار کی تخلیقات میں عام قارئین یا پیروڈی کار کو
کھٹکتی ہیں۔ ان کا تعلق اظہار و بیان یا اسلوب و ادا سے
بھی ہو سکتا ہے اور افکار و خیالات کی افتاد سے بھی۔ اکثر
ممتاز ادیبوں یا شاعروں کا ایک MANNERISM 'طرز خاص'
جس میں ایک اکتا دینے والی یکسانیت اور یوسیدگی پیدا ہو جاتی
ہے۔ اور قاری اس کی تخلیقات سے لطف اندوز ہونے
کے باوصف اس یکسانیت یا بعض صفات کی تکرار سے کچھ
بدحظ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح اس یک رنگی کا احساس
اس کے فن کی کجی یا کمزوری بن جاتا ہے جو اکثر پیروڈی کا
محرک ہوتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک موقع پر
صحیح کہا ہے :

" اگر شاعر کے یہاں کچھ مضامین، اصطلاحات،
تشبیہات، تراکیب اور علامات کی تکرار ہے،
اور یہ سب چیزیں ہی اس کی امتیازی صفت

ہیں تو ان کی پیروڈی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر
کسی نثر نگار کے یہاں کچھ مخصوص خیالات کا اعادہ
ہوتا ہے چند خاص خاص فقرے یا ترکیبیں بار بار
ملتی ہیں، واقعہ کچھ ہوتا تو ایک ہی سے رکھتا ہے
تو وہ پیروڈی کے لئے نہایت موزوں ہے۔"

جس طرح طنز نگار کے لیے زندگی سے دلچسپی اور
اس کا بھرپور اور ہمہ جہت مطالعہ ضروری ہے اسی طرح پیروڈی
کار کو بھی طنز نگار کی دیدہ وری کے ساتھ ساتھ شعر و ادب
کا ستھرا مذاق اور فنی اسالیب کی واضح بصیرت درکار ہوتی
ہے۔ جب تک اس کے ذہن میں فن و ادب یا تخلیقی ہنر کا
کوئی مثالی تصور نہیں ہوگا۔ اس کا تخیل شعر و ادب کی کجیوں
یا کمزوریوں کو محسوس کر کے برانگیختہ نہیں ہو سکتا اور اس
کے بغیر اعلیٰ پائے کی پیروڈی وجود میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح
پیروڈی کی تخلیق یا تکمیل میں جن مراحل اور جس طرح کی ذمہ
داریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ ان کو اس طرح بیان کیا جا سکتا
ہے:۔

۱۔ سب سے پہلے ان کمزوریوں یا اس رنگ یکسانیت کی دریافت اور اس کا واضح ادراک جو پیروڈی کار کسی رجحان یا کسی ادیب کی تخلیقات میں محسوس کر کے بے مزہ ہوتا ہے۔

۲۔ اپنے تخیل کو ان کمزوریوں یا اس رنگ خاص کے دائرے میں محدود رکھتے ہوئے اس طرح مہمیز کرنا کہ اس کی تمام امتیازی صفات ایک مضحک اور آسیبی شکل میں سامنے آجائیں۔

۳۔ اور اس طرزِ عمل میں اس کا زاویۂ نظر ہمدردانہ ہو اس کا مقصد ادیب یا ادب کی اصلاح ہو یا اس کی انتہا پسندی اور بے لگامی میں اعتدال و توازن پیدا کرنا ہو۔ اگر پیروڈی کا محرک کسی ادیب سے
ذاتی عناد ہوگا تو عام ہجویہ شاعری کی طرح اس کا
معیار بھی پست ہوگا۔

اس تشریح سے پیروڈی کے کئی فنی اوصاف
واضح ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پیروڈی کار کسی خاص اسلوب
یا فن پارے کی خارجی ہیئت (FORM) کی تقلید کرتے
ہوئے اس کے مواد کو حسبِ ضرورت مسخ کر کے یا ایسی
مبالغہ آرائی اور ظریفانہ پیرائے سے پیش کرے کہ اس کی
اصل صورت بگڑ کر بھی پہچانی جا سکے۔ اس سلسلے میں
ایک مغربی ناقد نے بہت پتے کی بات کہی ہے:

"بہترین پیروڈی وہی ہے (اور یہ واقعہ ہے
کہ بہترین پیروڈی شاذ و نادر لکھی جاتی ہے) جو
ہیئت کے ساتھ وفاداری لیکن مواد کے ساتھ
عیاری کا مسلک اختیار کرتی ہے۔"

مواد کے ساتھ یہی عیاری پیروڈی کار کے تخیل کے
ساتھ ساتھ اس کے فکر و شعور کو بھی آزادی دیتی ہے
اور اس بہانے وہ پیروڈی میں اپنے عہد کی زندگی، بدلتی
ہوئی قدروں اور معاشرتی و سیاسی حالات کو بھی طنز و تضحیک
کا ہدف بنا سکتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے
اس اسلوب یا فن پارے کی ہیئت اور موڈ کے ساتھ پوری
وفاداری برتنا ہوگی جس کو اس نے سامنے رکھا ہے اسی!
کامیاب پیروڈی کا معیار یہ قرار دیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری
خود پتا لگالے کہ اس آئینے میں کس کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔

یہاں مناسب ہوگا کہ پیروڈی کی فنی ساخت پر
غور کرتے ہوئے ہم اس کے محل ورود پر بھی ایک نظر ڈال
لیں۔ لفظ پیروڈی دراصل ایک یونانی لفظ پیرودیا
سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں نغمہ معکوس COUNTER
SONG - پیرودیا قدیم یونان میں ایسے گیت کو کہتے تھے
جو کسی گائے ہوئے سنجیدہ نغمے کی مقدس فضا اور اس کے

سحر و اثر کے طلسم کو توڑنے کے لیے گایا جاتا تھا۔ اس کا کوئی
نمونہ ہمارے سامنے نہیں لیکن قیاس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ
اس کا مقصد ان ہنگامی جذبات کا شوریدگی اور جوش میں
ایک توازن پیدا کرنا تھا جو کسی نغمے کی الاپوں سے لوگوں
کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں یا یوں کہئے کہ یہ اس جذباتی
شدت اور ہیجان میں ضبط و نظم پیدا کرنے کے لیے گایا جاتا
تھا۔ اس کی یہ اصلاحی روح آج بھی برقرار ہے۔ اگرچہ
موسیقی سے رزمیہ، پھر ڈرامہ اور پھر ادب کی دوسری اصناف
تک آتے آتے اس کی نوعیت میں تغیر ہو گیا ہے۔ کیسلس
کی ادبی قاموس میں پیروڈی کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ
میں اشارہ کیا گیا ہے۔

" پیروڈی انتہا پسندی اور جا[illegible] مدہوشی کے
خلاف ایک طرح کا اقدام تحفظ ہے۔ اور سب سے
بڑا تحفظ، یہ ہماری حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کے
سنگین جرم کے خلاف ہے۔ "

شاید اسی مطمح نظر کو سامنے رکھ کر بائرن اور سوئفٹ
جیسے ممتاز اور صاحب طرز شاعروں نے خود اپنے فن کی
پیروڈیاں لکھی تھیں جو ان کے زمانے میں بے حد مقبول ہوئیں۔
یونان میں فنی حیثیت سے اس صنف کا موجد ارسطو
نے HEGEMON OF THE SOS کو مانا ہے
اگرچہ MATRON بھی اس کی اولیت کا دعوے دار کہا
جاتا ہے جس نے ہزاروں اشعار میں ہومر کی رزمیہ شاعری
کی پیروڈی لکھی تھی۔ اس کے بعد HIPPONAX نے
"ایلڈ" کو ایک کامیاب پیروڈی کے آئینے میں پیش کیا۔
اس ابتدائی دور کی پیروڈیوں میں طرز نگارش کے ساتھ
ساتھ تصانیف کی ہجری نوعیت اور ان کے داخلی موڑ کو
بھی تنقید و تضحیک کا موضوع بنایا گیا ہے۔
اردو میں اس صنف کا تعارف براہ راست انگریزی کے
اثر سے ہوا۔ اور اگرچہ انگریزی میں اس کی روایت اور اس
کے فن کا تصور وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا لیکن وہاں بعض ذہین
شاعروں اور ادیبوں نے اپنے بلند تر مقاصد کے حصول
کے لیے ایسی اصناف کو بھی رواج دیا ہے جو اگرچہ پیروڈی
کے معیار پر پوری نہیں اترتیں لیکن کچھ اوصاف میں اس صنف
سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر (MOCK
EPIC) یا ظریفانہ رزمیہ۔ اس میں شاعر کلاسیکی رزمیہ
شاعری کی فنی نزاکتوں، اس کی مخصوص بحر، پُرشکوہ انداز
بیان، معنوی صناعی اور اشخاص کے کارناموں کا مبالغہ
آمیز بیان تمام اوصاف کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن اس کا
مواد وہ روزمرہ کی عام زندگی سے لیتا ہے، اس طرح عام
انسانوں اور ادنیٰ واقعات کو رزمیہ انداز کے اہتمام، شان
و شکوہ اور عظمت کے آئینے میں دکھا کر وہ قدم قدم پر ایک
پُرمزاح تضاد اور ظریفانہ صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اس
نوع کے ظریفانہ رزمیوں کے نقوش ہمیں پوپ کی "زلفوں
کی عصمت دری" سے لے کر ایلیٹ کی "ویرانہ" تک میں
ملتے ہیں (یہ تسلیم کہ "ویرانہ" مزاح سے عاری ہے) دراصل
ان نظموں کا مقصد رزمیہ کی تنقید نہیں بلکہ طنز کے پیرائے
میں اپنے عہد کی زندگی کی تنقید ہے اس لیے ان کا فن
پیروڈی کے فن سے مشابہت کے باوجود بہت مختلف ہے۔
انگریزی ادب میں ISSAC HAWKINS
BROWN کو پیروڈی کا موجد کہا جاتا ہے جس نے
پوپ اور تھامسن وغیرہ کے طرز نگارش کی پیروڈیاں
لکھی تھیں۔ انیسویں صدی میں اس صنف کو بڑا فروغ حاصل
ہوا۔ خاص طور سے نظم کی پیروڈی کو۔ اس عہد کا شاید ہی
کوئی صاحب طرز شاعر ہو جس کے اسلوب کا خاکہ نہ اڑایا
گیا ہو یا جس نے اپنے ہم عصر شعرا کے بارے میں پیروڈی
کے انداز کی نظمیں نہ لکھی ہوں۔ شیلی نے ورڈز ورتھ کی

مشہور نظم PETES BELL کی پیروڈی لکھ کر فطرت
کے اس پجاری کے فن اور ڈکشن کو ہلا کر رکھ دیا۔ سوئنبرن نے
ٹینی سن کی شاہکار نظم IN MEMORIUM کی
جو پیروڈی لکھی تھی اسے اپنے زمانے میں ٹینی سن کی نظم سے کم
شہرت حاصل نہ تھی۔ اگر آپ کے ذہن میں ٹینی سن کے طرز
خاص اور اس نظم کا دھندلا سا خاکہ بھی ہے تو آپ سوئنبرن
کی پیروڈی کے ان مصرعوں سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

GOD WHOM WE SEE NOT, IS
AND GOD WHO IS NOT WE SEE
FIDDLI WF KNOW IS DIDDLI
AND DIDDLI WE TAKE IT, IS THEE

یہاں پیروڈی کار نے الفاظ اور خیالات میں ایک
خاص توبع اور تکرار پیدا کر کے بائرن کی نزاکت خیال اور
بلندی فکر کو جس طرح پستی دکھائی ہے اور ایک متوازن تخیلی
مبالغہ آرائی سے جس طرح بائرن کے اسلوب فن کی یک رنگی
کا خاکہ اڑایا ہے وہی اس کے فن کا جوہر ہے۔

انگریزی کے نثری ادب میں بھی پیروڈی کے
کامیاب نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ اسی صدی میں جیمس
جوائس نے اگر عامیانہ انداز کے صحافتی قصوں کو (جو اس
زمانے میں بے حد مقبول تھے) پیروڈی کا موضوع بنایا تو
اسٹیفن لی کاک نے جاسوسی قصوں کی ہیجان خیزی، تجسس
آفرینی اور خوف و ہراس کی مجرمانہ فضا کو اپنی پیروڈیوں کا
ہدف بنایا۔ جیمس جوائس نے انگریزی نثر کے نمائندہ
اسالیب کو بھی بڑی کامیابی سے پیروڈی کے رنگ میں پیش
کیا ہے اور اگر قریب سے دیکھا جائے تو ایک بڑے کینوس پر
اس کا عظیم ناول "یولیسس" بھی پیروڈی ہی ہے۔ جس
میں ایک طرف اس نے حقیقت نگاری کی روایت، اور
دوسری طرف رزمیہ قصوں کے کرداروں کی عظمت و شوکت کا
مضحکہ اڑایا ہے۔ ... کے پیروڈی ہونے کا ایک بڑا ثبوت
اس کا نام ہے ... یہ ہے کہ بعض ناقدین نے اسے
اس صدی کا سب سے ممتاز پیروڈی کار مانا ہے۔

انگریزی میں اس صنف کی مقبولیت اور ترقی کا
ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے مشاہیر اور صف اول کے
ادیبوں نے بھی اس میں سنجیدگی کے ساتھ طبع آزمائی کی اور
اس طرح ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری سے اس
روایت کا نشوونما ہوا۔ اردو میں صورت حال مختلف ہے
ہمارے یہاں مشاہیر اور ممتاز ادیبوں نے اسے ہاتھ لگانا
کسر شان سمجھا۔

باایں ہمہ اگر تلاش و تحقیق سے کام لیا جائے تو اردو میں
اس صنف کا قابل قدر سرمایہ مل سکتا ہے۔ غالب کی طرز
بیدل والی غزلوں کی پیروڈیاں نہ صرف بعد میں بلکہ ان کے
زمانے میں لکھی گئیں۔ جنھوں نے شاید انھیں خیال بندی
اور مشکل پسندی کی روش ترک کرنے پر مجبور کیا۔ غالب کے
معاصر حکیم آغاجان عیش کے پروردہ عبدالرحمن مہر الشعراء
کے بارے میں مولانا آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں:۔

"...... بعض غزلیں سرمشاعرہ پڑھا تھا جس
کے الفاظ نہایت شستہ و رنگین لیکن شعر بالکل
بے معنی۔ اور کہہ دیتا تھا کہ یہ غالب کے
انداز میں غزل لکھی ہے۔"

مولانا آزاد نے ایسی ہی ایک غزل کا ایک مطلع نقل کیا ہے،

مرکز محور گردوں بہ لب آب نہیں
ناخن قوس و قزح شبہ مضراب نہیں

یہاں غالب کی مشکل پسندی کو ایسے مبالغہ کے ساتھ پیش
کیا گیا ہے کہ شعر چیستاں بن گیا۔

"اودھ پنچ" اور اس عہد کے بعض دوسرے رسائل
میں بھی پیروڈی کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر

پھلجھڑی کی طرح چھوٹ کر دم زدن میں فنا ہو گئیں۔ ان کا مقصد تنقید و اصلاح کم اور تفریح و تفنن یا تضحیک زیادہ تھا۔ ان کا محرک عام طور پر کسی طرح کی مخاصمت یا معاصرانہ چشمک ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا معیار پست رہا اور ان کی ظرافت میں سطحیت یا سستا پن غالب رہا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد کچھ ادیب سنجیدگی کے ساتھ اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور نثر و نظم کے بعض اسالیب کو انھوں نے پیروڈی کا موضوع بنایا۔

نثر میں پیروڈی کے اولین اور کامیاب نمونے پطرس نے پیش کئے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

" پطرس سے قبل اُردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے ملتے ہیں..... لیکن نثر میں پطرس سے قبل اول تو پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں۔ "

" اُردو کی آخری کتاب " اور " لاہور کا جغرافیہ " پطرس کے دو مضامین ایسے ہیں جن میں انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کی درسی تالیف " اُردو کی پہلی کتاب " اور جغرافیہ نویسی کی پیروڈی کی ہے۔ " اردو کی پہلی کتاب " کی بے رنگ سادگی، چھوٹے چھوٹے جملے، بچوں کی لفظیات اور نفسیات کی مناسبت سے بعض گھریلو اشیا اور تفصیلات کا بیان اور ایک طویل مدت تک اس کے شامل نصاب رہنے کی وجہ سے اس کی بیزار کن یکسانیت ایسے اوصاف تھے جنھیں پطرس نے اپنی تخیلی رنگ آمیزی سے ایک دل کش پیروڈی کے قالب میں ڈھالا۔ نمونہ کے طور پر اس کے پہلے سبق " ماں کی مصیبت " کا یہ حصہ دیکھئے:۔

" ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ خوش ہوتا ہے بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب معمول باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا۔؟

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

(۳) دولہا کب بنے گا اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا۔ (اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں) " وغیرہ۔

تیسرے سبق " دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے۔ " کا یہ مختصر پارہ ملاحظہ فرمائیے:۔

" دیکھنا! دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑے پٹڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کیے۔ اب دھوبن گانا گائیگی دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔ "

یہاں آزاد کی درسی کتاب کے متن اور مشقی سوالات کے اسلوب کی کامیاب نقل کرتے ہوئے پطرس نے عبارت اور اس کے مطالب میں ایسی ظریفانہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ قاری زیر لب مسکرائے بغیر نہیں رہتا۔ " لاہور کے جغرافیہ " میں پطرس نے مواد کے سلسلے میں کچھ اور آزادی برتی ہے اور لاہور کی معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ لاہور کے محل وقوع حدود اربعہ اور آب و ہوا وغیرہ کے بعد " صنعت و حرفت " کا

ذکر اس طرح ہوتا ہے :
" اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف اڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے اور فن تنقید ترقی کرتی ہے۔
لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں .... بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نعمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔"

یہاں جغرافیہ نویسی کے مروجہ اسلوب کی پیروڈی میں پطرس نے جس خوبی سے سماجی طنز کی مثال پیش کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے اس طنز کی مہذب تنقید میں زہرناکی نہیں۔ تاہم ان حالات سے پطرس کی شدید بیزاری کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

ملا رموزی کی " گلابی اُردو " بھی کامیاب پیروڈی کا نمونہ ہے۔ جسے انھوں نے ایک مزاحیہ اسلوب کے طور پر پروان چڑھایا۔ یہ دراصل قدیم اُردو ترجموں کی پیروڈی ہے۔ جس میں نفس مضمون کا نہیں بلکہ ان ترجموں کی صرف خارجی ہیئت یعنی زبان اور پیرایۂ بیان کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ یہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

" اے اکبرآباد کے گانے والے شاعرو! نہیں ہے اور البتہ تحقیق نہیں ہے مفید شوق شاعری کا بیچ زمانہ طالب علمی کے واسطے طلباء کے کیونکہ قسم ہے دو چار تھانیداروں کی کہ جو لڑکا بیچ شروع موسم جوانی کے پڑ جاتا ہے بیچ شغل شاعری اور مضمون نگاری کے تو تباہ ہو جاتا ہے سلسلہ تعلیم اس کی کا سبب سے نحوست میز کرسی کے کہ تباہ ہو رہی ہے دولت مسلمانوں کی بیچ خریداری میز کرسیوں کے در آنحالیکہ باپ دادا تمہارے بیٹھا کرتے تھے اوپر فرش قالین کے مگر اسے راستہ بتلایا فرنیچر کا تعلیم نے اسلامیہ اسکولوں کی نے میز کرسی کا۔ اگرچہ آراستہ ہو جاتے تھے کمرے اور کوٹھیاں فرش ہندوستانی سے بہت ارزاں۔ مگر اب نہیں تشریف رکھتے اوپر فرش دیسی کے یہ غلام ہندوستانی تمہارا کو فروش مگر اوپر کرسیوں اور میز عمدہ کے۔ "

یہاں رموزی نے ترجموں کے اس قدیم اسلوب کو سامنے رکھ کر جملوں کی بے ربطی، اضافتوں کی کثرت اور صرف و نحو کے اصولوں سے انحراف کرکے ایک اچھوتا اور مضحکہ خیز اندازِ تحریر پیدا کر دیا ہے۔ ان کی کئی کتابیں اسی اندازِ تحریر میں ملتی ہیں۔

نثری اسالیب کی پیروڈی کے سلسلے میں شفیق الرحمن کی ایک قابل قدر پیروڈی ' تزکِ نادری ' کا ذکر ناگزیر ہے۔ جو مطلق العنان حکمرانوں کے روزنامچوں کا بڑا شفاف اور دلکش آئینہ ہے۔ شفیق الرحمن یوں تو مزاح نگار ہیں لیکن اس روزنامچے میں طنز کے بے شمار پہلو ان کی گہری

سماجی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سلاطین سلف اپنی تزکوں میں نئے مفتوحہ ممالک میں پیش آنے والے تجربات اور عام یا ادنیٰ مشاہدات کو جس طرح اہمیت دے کر بیان کرتے تھے اور ہر جگہ اپنی سطوت و اقبال کے گن گاتے تھے، پیروڈی کار نے انھیں امتیازی اوصاف سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ساتھ ہی اس نے محمد شاہی عہد اور دورِ حاضر کے تضادات کو آئینہ کر کے طنز و تضحیک کی دلچسپ صورتیں پیش کی ہیں۔ [illegible] ذیل پیروڈی کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

جامعہ میں ہماری تقریر

"اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔

ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا "پیارے اطفال، معلمین حضرات و پرنسپل ملا فرقان اللہ بن برہان اللہ! آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں...... اوّل تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں صحت پر تعجب ہوتا ہے۔ رونا بھی آتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ بخدا ہمیں آپ ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر میں گز ڈھا[illegible] ایک انگوٹھی میں سے گزار رہا تھا۔ دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے [illegible] کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گزر گیا۔ اس قدر دھان پان [illegible] پہلے کبھی نہیں دیکھے۔

ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی روایات پر۔ آپ کی قومی روایات بے حد شاندار رہیں۔ آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا۔ کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا رہا ہے۔ اور تو اور آپ نے غلاموں اور عورتوں سے بھی حکومت کروائی ہے۔

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سنے تھے۔ آپ کے یہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے۔ یہ آب و ہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعر و شاعری کے لیے نہایت سازگار ہے...... ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا۔ ہمیں غیظ و غضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ پکے راگ گاتا تھا۔ تعجب ہے کہ ہمیں کچے راگ پکے راگ سے زیادہ مرغوب ہیں۔ سنا ہے کہ آپ کے یہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے۔ غالباً رات کو آپ زیادہ نشہ کر جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصباح مسرور اٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا۔ رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔"

غالب کے کلام کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں اور ان کے بعض اشعار کو عجیب عجیب معنی پہنائے گئے ہیں۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نے اپنے انداز سے دیوانِ غالب کی ایک شرح لکھ کر "شرحوں" کی پیروڈی کی ہے۔ ان کے تخیل نے

غالب کے اشعار سے ان کی زندگی کے ایسے حالات اور حوادث بر آمد کیے ہیں جن تک ان کے کسی سوانح نگار کی رسائی نہ ہو سکی۔

یہ تو عمومی حیثیت سے نثر کے اسالیب یا اصناف کی پیروڈیاں ہیں۔ احمد جمال پاشا نے بعض ادیبوں کے اسلوب خاص کی پیروڈی بھی کی ہے اور ان کے اسلوب کی کمزوریوں یا بیزار کن یک رنگیوں کو طنز و تضحیک کا ہدف بنایا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحریروں میں جو طول کلام اور خیالات کی بیجا تکرار ہوتی ہے، احمد جمال پاشا نے تخیلی مبالغہ آرائی سے انھیں پیروڈی کا رنگ دیا ہے۔ پیروڈی کا عنوان ہے 'کپور کے مضامین میں طنز' یہ اقتباس ملاحظہ ہو:-

"مجھے ـــ یہ ـــ کہنا ـــ ہے ... کہ کپور ـــ کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ اور مزاحیہ ہوتے ہیں۔ ان مضامین میں میرے خیال میں، جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج تک بالترتیب پہنچا ہوں ان سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے۔ یعنی ان مضامین میں طنز ہے۔ طنز ـــ میں کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ لکھ چکا ہوں طنز ہے۔ ایسا طنز جو سودا، غالب، اکبر اور پطرس وغیرہ کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کی بے شمار مثالیں مغربی ادب سے پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً پوپ، گوپ، سوئفٹ لیوکاک مارک ٹوئین وغیرہ کے یہاں جابجا آپ کو ملے گا اور قدم قدم پر ملے گا۔ یہی وہ طنز ہے جس سے کپور اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آجاتا ہے..... ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہوتا اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے کچھ نہ ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور ہر جگہ اس بات کا ہونا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی انھوں نے اس خوبی کو بخوبی نبھا دیا ہے۔ نبھانا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں بھی طنز ملتا ہے۔ لہذا اس سے یہ بات تو بخوبی واضح ثابت، روشن اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں قاری کے علاوہ ناقد کو بھی باآسانی طنز دستیاب ہو جاتا ہے..... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ طنز ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ اُن کے یہاں طنز ہے جس کے لیے قسم خدا کی میں اب حلف اُٹھانے کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے۔"

احمد جمال پاشا نے بعض دوسرے ناقدوں اور محققوں کے طرز نگارش کی پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ کرشن چندر، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی اور شوکت تھانوی کی تحریروں میں بھی پیروڈی یا اس سے ملتی جلتی نگارشات مل جاتی ہیں۔

نظم کے میدان میں فرقت کاکوروی، سید محمد جعفری، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خاں اور بعض دیگر مزاح نگار شعرا نے پیروڈیاں لکھی ہیں۔

۱۹۴۰ء کے بعد اردو میں 'ترقی پسندی' اور آزاد نظم نگاری سکۂ رائج کی طرح چل رہی تھی اور اس میں ایک

طرح کی انتہا پسندانہ بے اعتدالی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ نو عمر شعرا کورانہ طور پر فیض، راشد اور میرا جی کی تقلید کر رہے تھے۔ غلام احمد فرقت نے اسی رجحان سے بیزار اور برہم ہو کر آزاد نظم گو شعرا کی پیروڈیاں لکھیں جو "دادا" نام کے ایک مجموعے میں شائع ہوئیں اور ایک خاص زمانے تک بے حد مقبول رہیں۔ لیکن توازن اور ہمدردی کی کمی کی وجہ سے ان کی مقبولیت کو ثبات حاصل نہ ہو سکا۔

کلاسیکی شعرا میں نظیر، میر اور غالب کی پیروڈیاں بھی لکھی گئیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا محرک اور مقصد ان شعرا کے منفرد اسلوب یا فن کا مضحکہ اڑانا نہیں بلکہ ان کے فن پاروں کی مزاح انگیز نقل کرتے ہوئے خود اپنے عہد کی ناہمواریوں کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنانا ہے۔ اس ضمن میں بعض شعرا کے مشہور کلام کی مزاحیہ تضمینیں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ نظیر اور میر انیس کے مخمس اور مسدس بھی اپنی عام شہرت کی وجہ سے پیروڈی کا موضوع بنے۔ مثال کے طور پر سید محمد جعفری کی نظم "کلرک" کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیے:

خالق نے جب ازل میں بنایا کلرک کو
لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو
کرسی پہ پھر اٹھایا بٹھایا کلرک کو
افسر کے ساتھ پن سے لگایا کلرک کو
سی گدھے کی ڈال کے اس کی سرشت میں
داخل مشقتوں کو کیا سرنوشت میں

چپراسی خلد میں جو بلا لے گیا اسے
حوروں نے کچھ مذاق کیا، کچھ ملک ہنسے
حیران تھا کلرک کہ کیسے برے پھنسے
ہاتف نے دی صدا کہ یہ کچھ دن یہیں بسے
آدم کا رف ڈرافٹ ہے کب تک نہ ہوگے تم
اپروو ہو کے آیا تو سجدہ کرو گے تم

جنت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر
تھا ان کی زندگی کا سہارا روٹین پر
ٹی۔ اے وصول کرنے کو اترا زمین پر
لفظِ کلرک لکھا تھا لوح جبین پر
ابلیس راستے میں ملا کچھ سکھا دیا
اترا فلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا

میر نے ایک مثنوی میں اپنے خراب و خستہ گھر کا حال لکھا ہے۔ ضیاء الدین احمد شکیب نے ایک مثنوی میں اس کی بڑی کامیاب پیروڈی کی ہے۔ مثنوی کا عنوان ہے "مثنوی بیچ بیان اپنے ہوسٹل کے"۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:—

کیا کہوں اپنے ہوسٹل کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال
ایک تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
تار برقی سے ہے سقف بدنام
چھت سے آنکھیں لگی رہی ہیں مدام
بجلی بیمار ہے دعا کریے
موم بتی میں کب تلک پڑھیے
چاہتیں بیٹھنے کی روم کے بیچ
اپنی کرسی کو روم بیچ نہ کھینچ
اس میں جو ہے فرنٹ کا ایواں
ڈبی اس تنگ خلق کا ہے مکاں
نوٹس آتے ہیں اس میں شام و پگاہ
سوئے چلمن ہمیشہ ہے گی نگاہ
لے کوئی اشتہار قلم پھرے
کبھو چلمن سے ڈاک آن گرے

کوئی بستر کہیں پہ اُلجھا ہے
میلے کپڑوں کا ڈھیر اکٹھا ہے
ہے جلے سگرٹوں کا جو اک ڈھیر
بنتا جاتا ہے ہولے ہولے منڈیر
الگنی کپڑوں سے الگ بے حال
ٹائی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
کب تک آوے گا دھوبی اب کے بار
الگنی بھر بھرا وے زار و نزار
اچھے ہوں گے کیا رئیے کے گھر
آپ اپنی مثال ہے یہ کھنڈر

جیسا کہ عرض کیا گیا اس طرح کی پیروڈیوں میں کسی فن پارے کی ظاہری ساخت اور اس کے موڈ کی شعوری [illegible] کرتے ہوئے مواد کے انتخاب میں پیروڈی کار آزاد ہے۔ اگر گرد و پیش کی زندگی سے اس کو دلچسپی اور [illegible] ہمدردی ہے تو وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی رنگ آمیزی سے پیروڈی میں ایسی قوت حسن اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ وہ پیروڈی کے ساتھ ساتھ ایک مزاحیہ و طنزیہ نظم [illegible] جاتی ہے۔

اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار کے اظہار کے لیے [illegible] شاعری میں جن خاص اصطلاحات اور علائم سے کام [illegible] ہے کہیں کہیں ان کی تکرار اور کثرت استعمال قاری کے [illegible] ذہن میں تکدر پیدا کر دیتا ہے۔ شوکت تھانوی نے 'ضرب [کلیم]' کی ایک نظم "مومن" کی پیروڈی میں اقبال کی اس [کمزوری] سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

مومن دنیا میں

کمزور مقابل ہے تو فولاد ہے مومن
انگریز ہو سرکار تو اولاد ہے مومن

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
ہو جنگ کا میدان تو اک طفلِ دبستان
کالج میں اگر ہے تو پریزاد ہے مومن

مومن جنت میں

شکوہ ہے فرشتوں کو کم آمیز ہے مومن
حوروں کو شکایت کہ بہت تیز ہے مومن

یہ ایک مکمل اور کامیاب پیروڈی ہے۔ اقبال کی نظم کے فنی اور فکری نظام سے پوری وفاداری کرتے ہوئے پیروڈی میں ایک دلکش مزاحیہ صورت حال پیدا کی گئی ہے۔ یہاں قاری اقبال کے اکتا دینے والے فنی اور فکری اسلوب سے اچانک رہائی پاتا ہے تو اپنے اندر حظ و انبساط کی ایک لہر سی محسوس کرتا ہے۔ اقبال نے جنت میں مومن کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ یہ ہے:
کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن   حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن
ظاہر ہے کہ جنت میں مومن کی اقامت کے بارے میں اقبال کی تصویر اگر بے حد تصور پرستانہ ہے تو اس کے برعکس شوکت تھانوی کی تصویر انتہائی حقیقت پسندانہ۔ یعنی صرف فنی اسلوب ہی نہیں معنی اور مواد کو بھی مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے اس میں سماجی طنز کے لطیف اشارے بھی موجود ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر پیروڈی میں کسی اسلوب یا فن پارہ کا صرف مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور پیروڈی کار اس میں اپنے تجربات اور اپنے شعور حیات کا رنگ بھرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کا تخلیقی معیار پست ہوگا۔ اور بقول سید احتشام حسین صاحب وہ محض وقتی تفریح و تفنن کی چیز ہوگی۔ لیکن اگر کوئی باصلاحیت فن کار کسی اسلوب یا فن پارے کی بیزار کن یکرنگی یا اس کی کمزوریوں کو طشت از بام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیت اور سماجی بصیرت کو بھی بروئے کار لاتا ہے تو اس کی پیروڈی کو بھی ایک تخلیق کا مرتبہ حاصل ہوگا۔

عبدالمتین نیاز

رنگ کے روشنی کے محافظ بنیں

کئی رنگ کی ایک تتلی
بہت خوب صورت
کہ جو باغ کے سادہ نقشے میں رنگینیاں بھر رہی ہے
جسے دیکھ کر
زرد پھولوں کی آنکھیں
طراوت کے احساس میں کھو گئی ہیں
جسے غنچے معیارِ حسنِ نظر جانتے ہیں
جسے پا کے ساری فضا کھل اٹھی ہے
جو ہر پھول کے رس میں سرشار
پُر کیف ماحول تعمیر کرنے چلی ہے
کئی ہاتھ اب اس کی جانب لپکنے لگے ہیں
کہ رنگین تتلی کے پر نوچ لیں
تاکہ بازار میں ان کی قیمت کبھی کم نہ ہو
خوف و دہشت کی منڈی ہمیشہ ہی قائم رہے
دوستو آؤ تتلی کی ہم سب حفاظت کریں
رنگ کے روشنی کے محافظ بنیں

غزل

جہاں بے سمت ہے آدمی جاہے جدھر جائے
زمیں پر خود کو پھیلا دے خلاؤں میں بکھر جائے

یہ پھیکے رنگ، یہ مٹتی لکیریں کب تلک دیکھوں
کوئی تو نقش میری آرزوؤں کا سنور جائے

سحر سے پہلے گھر پہنچا تو ڈس لے گا اکیلا پن
ابھی تو رات باقی ہے ابھی سے کون گھر جائے

یہ سب مایوسیاں محرومیاں انساں ہی لایا ہے
بدل جائے اگر انساں تو دنیا خود سنور جائے

سمندر کی یہ پیاسی سیپیاں تکتی ہیں رہ کب سے
کہ آئے ابرِ نیساں اور ہمیں سیراب کر جائے

طلسمِ رنگ و بو تو کم نگاہی تک ہے اے لوگو
اگر کھل جائے چشمِ ہوش یہ منظر بکھر جائے

فکری بدایونی

دُعا

بِچھڑ رہی ہیں پُتلیاں
زمین و آسماں کے بیچ
سمندروں کی گہری تہہ
پڑی ہوئی ہے پُرسکوں
انھیں مِلا نہیں کوئی
نہ جانے زخمی سورجوں کی زرد آگ کا لہو
گزر کے لمحہ لمحہ اس محیط سے کہاں گیا
اگر بجھا نہیں تو پھر کون اس کو لے گیا
اُدھر............ نہیں
اِدھر......... نہیں
اِدھر اُدھر......... نہیں نہیں
کسے خبر کے گھات میں رہا ہو کوئی اور بھی
کسی نگارہ بدلے اُس کو چوس تو نہیں لیا
سمندروں کی گہری تہہ
پڑی ہوئی ہے پُرسکوں
زمین و آسماں کے بیچ بچھڑ رہی ہیں پتلیاں
بشر کلیجہ تھام کے
کہیں لہو نہ رو دے اب
دُعا............ دُعا

———

قطرہ قطرہ آگ

کلیجہ مُنہ کو آ گیا
تبر بڑا ہی تیز تھا
چھید ڈالا اُس نے اپنے ہی جگر کو اپنے ہاتھ سے
اُسے ہر ایک روکتا رہا
جگنوؤں کی طرح کیاری کیاری رات بھر
سرتاپا جھلس گیا مگر
برہنہ پاؤں ٹیلہ ٹیلہ چڑھ گیا
پہاڑ آگ آگ چیختے رہے
جمود قطرہ قطرہ پتلیوں سے بہ گیا
حیات جیسے مشکلوں میں رو پڑے
اِدھر زمیں سے مس ہوئے قدم حیات کے
اُدھر
خلا کی ڈور ہاتھ سے نکل گئی

———

ڈاکٹر صابرہ سعید

خطوط اور خاکہ نگاری

خطوط کو دنیا کی تمام زبانوں میں ادبی صنف کا مرتبہ حاصل ہے۔ اِسے مشرق و مغرب میں یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔ خطوط، ادب کا آزادانہ اور مسرت بخش حصہ ہیں۔ موجودہ دَور میں سائنسی ایجادات جیسے ٹیلی فون ٹیپ ریکارڈ، ٹیلی پرنٹر وغیرہ کے توسط سے گفت و شنید اور مختصر و مفید قسم کی مراسلت نے ادبی اہمیت کے خطوط کی تعداد کو بے حد کم کر دیا ہے۔ جس کے ادب کی یہ صنف، روبہ زوال ہو گئی ہے۔

قدیم یونان میں کوئی شخص اپنے ذاتی خطوط شائع کرنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خطوط یا تو مکتوب الیہ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یا ان کی اہمیت کے پیش نظر محفوظ رہ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے افلاطون اور EPICURUS کے خطوط ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ افلاطون کے خطوط نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ ان سے ان کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے EPICURUS کا اسٹائل تنقیدی ہے۔ اس کے اسلوب کا دوسرے معاصرین پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اُس زمانے میں LETTERS OF PHALARES بہت مشہور ہوئے اس کے بعد مشہور ہونے والے خطوط میں سینٹ پال کے خطوط یا مکتوبات EPISTLES OF ST. PAUL مشہور ہیں۔ (106-43 B.C) CIERO نے مکتوب نویسی کے فن کو ترقی دینے میں خاص حصہ لیا۔ اس کے بیشتر خطوط میں ادبیت پائی جاتی ہے۔ آمد، بے تکلفی اور روانی کی وجہ سے اس کے اسلوب میں دلکشی پیدا ہو گئی تھی اس کے خطوط نے بعد کے لکھنے والوں کے لئے ایک معیاری نمونہ فراہم کر دیا۔ چنانچہ لیمپ اور اسٹیونسن نے بھی اس کا طرز اختیار کیا۔ مکتوب نگاری میں سیسرو کا وہی مرتبہ ہے جو رزمیہ کی صنف میں ہومر کا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد YOUNGER PLINY کے خطوط آتے ہیں۔ اکثر خطوط اشاعت کے نکتۂ نظر سے لکھے گئے اس لئے اس میں بے ساختگی نہیں ملتی۔ HORACE 65 B.C. اور WALPOLE کے خطوط بھی اسی انداز کے ہیں۔ جدید لاطینی میں جو خطوط لکھے گئے اس میں کلاسیکل لاطینی کی کامیاب نقالی کی گئی ہے یہ خطوط مورخین کے لئے اہم ماخذ کا کام دیتے ہیں۔

LETTERS OF JUNIUS AND BURKES

LETTERS TO A NOBLE LORD اور

طرز بیان اور ہیئت کے اعتبار سے بالکل جداگانہ قسم کے ہیں۔ ان خطوط سے مکتوب نگار کی سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ انگریزی میں ملٹن، بیکن، کاؤپر، سوفٹ گرے، لیمب، وال پول، بائرن، لارڈ چیسٹر فیلڈ، شیلی، کیٹس، ملکہ وکٹوریہ اور کارلائل وغیرہ کے خطوط نہ صرف

اور بھی بہت قدرے کھل کر بات چیت ہوئی تھی۔ اُس وقت تک وہ ڈائریکٹر شپ کے اعزاز سے مبرا تھے۔ مبرا کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے کیوں کہ آج کل لوگ ڈائریکٹر شپ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں نظر آتے ہیں محسوس کر، اس ملاقات نے میرے ذہن پر اتنے صحت مند اور خوشگوار اثرات چھوڑے تھے کہ ایک بار دیکھا ہے اور دوسری بار دیکھنے کی ہوس کے بمصداق مجھے اکثر اُن سے ملنے کی خواہش بے قرار کرتی رہتی تھی۔ لیکن بُرا ہو ستم ہائے روزگار کا کہ دل کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔

ریڈیو اسٹیشن سے میرا گھر اتنے فاصلہ پر ہے کہ پندرہ منٹ میں پیدل طے کیا جا سکتا ہے۔ گھر تک ہم لوگ چہل قدمی کرتے ہوئے پہنچے کیونکہ اس علاقہ میں تھوڑے سے فاصلے پر جانے کے لئے سواریاں دقت پر مشکل ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔ گیا سے بھوپال کا سفر ہی کیا کم خستہ کر دینے والا تھا اس پر طرہ یہ کہ ریڈیو اسٹیشن سے پیدل جانا۔ مجھے اُلجھن ہو رہی تھی لیکن مثنیٰ صاحب نے چہل قدمی سے لطف حاصل کیا۔ گیا میں رکشے پر سفر کرنے کی غیر صحت مند عادت کے شکار ہو کر رہ گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہاں پہاڑی علاقوں میں چہل قدمی اور پیدل سیر اُن کی تندرستی کے لیے نہایت مفید ثابت ہو رہی ہے۔ جب انہوں نے اس صحت مندی کا سہرا میرے سر پر باندھا کہ اس سلسلے کا آغاز میں نے ہی کیا تھا [تو] بے ساختہ یہ شعر یاد آگیا۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

ریڈیو میں کام کا سلسلہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ بھوپال دیہوں سے فرار حاصل کرنے کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔ ریڈیو کی ملازمت نے ایسی جگہ لا کھڑا کیا ہے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے ماندن۔ اقبال مجید سے ریڈیو اسٹیشن میں ہی سابقہ پڑا۔ آغا سلطان حیدر حیدری (اُن کے ایک علی گڑھی دوست اور کلاس فیلو جو یہاں صوبائی حکومت میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں) اور علی عباس اُمید سے میرے گھر پر ہی مڈبھیڑ ہوئی۔ ڈاکٹر فدا عباس اور قاسم نیازی سے اول الذکر کے مکان پر تعارف ہوا۔ فضل تابش اور قمر جمالی سے نیو مارکیٹ میں سر راہ ملاقات ہوئی۔ شفیقہ فرحت، قمر احسن اور حیدر عباس رضوی سے پہلے ٹیلی فون پر اور پھر بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ غرض کہ ادبا اور شعرا سے قرار کے سارے راستے مسدود ہو کر رہ گئے۔ بُرا ہو ریڈیو کی مصروف زندگی کا کہ اختر جمال اور احسن علی خاں کے اعزاز میں ہونے والے کسی جلسے میں بھی شریک نہ ہو پائے۔ خواہش کے باوجود ابھی تک ڈاکٹر ابو محمد سحر اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور اختر سعید خاں صاحب سے ملنے کا وقت بھی نہیں نکال پائے۔ پروگرام روز بنتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی بات راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

مثنیٰ صاحب کی تصویر میرے ذہن میں دھوپ چھاؤں جیسی تھی۔ سوچتی ہوئی تصویر جو زندگی کی اچھائیوں اور برائیوں کا تجزیہ کرتی رہتی ہے۔ ایسے آدمی کی تصویر جو گھر میں کتابوں میں پناہ ڈھونڈھتا ہے اور کالج میں جمائیاں لیتے ہوئے طالب علموں کے ذہنوں پر غبار کی طرح مسلط رہتا ہے۔ پہلی نظر میں ان کے بالوں کی سفیدی اور لباس کی سادگی سے مفکر کا یہی نقش میرے ذہن پر مرتسم کیا۔ مگر بعد جب گفتگو کا سلسلہ روز و شب شروع ہوا تو ان کی شخصیت کا ایک نیا مگر اصل رُخ سامنے آیا۔ ایک مفکر کی جگہ پر ایک ادیب محو گفتگو نظر آیا جس نے رنگ گلشن بھی دیکھا ہے اور جلتے ہوئے نشیمن کا نظارہ بھی کیا ہے۔ جو موج خرام ناز سے بھی متاثر ہے اور نقش پا پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ جسے رنگا رنگ بزم آرائیاں بھی یاد ہیں اور شام تنہائی کا احساس بھی ہے۔

خطوط لکھے جاتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ جذبات سے بڑی حد تک عاری ہوتے تھے۔ پُر تصنع اور رسمی عبارت آرائی میں مکتوب نگار کی شخصیت گم ہو کر رہ جاتی تھی غالب نے بقول خود وہ انداز تحریر ایجاد کیا کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔

"مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی شخصیتوں پر جو پردے پڑے رہتے ہیں، وہ اس طرز جدید نے اٹھا دیے۔ ایسے ہی خطوط دراصل سیرت اور شخصی خاکوں کا ماخذ بن سکتے ہیں اس ماخذ کی اہمیت، خاکہ نگار کی ذاتی معلومات سے بھی سوا محسوس ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بے تکلف خطوط سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں اُس سے موضوع کی شخصیت و سیرت کے پہلو اپنے آپ منکشف ہوتے ہیں۔ دوسرے ذرائع سے جو مواد حاصل ہوتا ہے وہ لازمی طور پر ان ذرائع سے بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ تازگی اور پاکیزگی باقی نہیں رہ سکتی جو موضوع سے براہ راست حاصل کرنے میں ہوتی ہے۔"

مولوی عبدالحق کے الفاظ میں:

"خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہیں۔ اس میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔"

خطوط، انسان کی سب سے بڑی یادگار ہیں۔ کیوں کہ ان میں اُس کے شبانہ روز کے خیالات اور جذبات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ انسان تو خود فنا ہو جاتا ہے لیکن اس کے خیالات جو کاغذ پر ثبت ہو جاتے ہیں طویل عرصے تک قائم رہتے ہیں۔ ہر شخص کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے اور شخصی مطالعہ کے لئے خطوط، نہایت عمدہ اور بڑی حد تک قابل اعتماد سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر خطوط اس نقطۂ نظر سے نہیں لکھے جاتے ہیں کہ یہ کبھی شائع ہوں گے۔ بعض شخصیتوں کے خطوط کو ان کے انداز بیان کی بے تکلفی، طرز ادا اور بے ساختگی نے ادبی شکل دے دی ہے۔ کیوں کہ ان کے ذریعہ جہاں مخصوص شخصیت کے نفسیاتی مطالعہ میں مدد ملتی ہے، وہیں ان کے ذریعہ فرد کی شخصیت بھی پوری طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

"A MANS SOUL LIES NAKED IN HIS LETTERS"

"تاریخی شخصیتوں کے حالات زندگی جاننے کا ایک ذریعہ اُن کے سوانح ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں مصنف اپنے موضوع کے صرف ظاہری خط و خال کی نقاشی کرتا اور زندگی کے عام واقعات پیش کرتا ہے۔ لیکن انسان کے داخلی جذبات، احساسات اور صلاحیتوں کو پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کمی کو ایک حد تک خود نوشت سوانح عمریاں یا آپ بیتیاں پورا کرتی ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ بیتی بھی اصلی انسان کو پیش کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ صرف ایک ہی صنف، انسان کی حقیقی شکل و صورت کا آئینہ ہو سکتی ہے اور وہ اس کے ذاتی اور نجی خطوط ہیں۔ جن کو تحریر کرتے وقت اس کو بالعموم خبر نہیں ہوتی کہ وہ کبھی منظر عام پر بھی آئیں گے۔ اس لئے وہ اپنا دل ان کاغذ کے ٹکڑوں پر بکھیر دیتا ہے۔ اس آئینہ میں انسان درحقیقت جیسا ہے ویسا ہی نظر آتا ہے۔ یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع اُن خیالات کو

ن کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ پر گزرتے ہیں۔ جنھیں
انشا کی صنعت سے کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات
دیا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحہ پر اپنا دل اور
کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت، ہر خیال اور
جاتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔ مولانا شبلی
لکھتے ہیں:

"انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف
جیسا اُس کی بے تکلفانہ خط و کتابت سے ہو سکتا
ہے۔ ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہو سکتا۔ اسی واسطے
مکتوب کو نصف ملاقات قرار دیا گیا ہے بلکہ
میں کہتا ہوں کہ جب اُس کا وجود عنصری، خاک
میں پنہاں ہو جائے اور اس سے ملنے کا کوئی
ذریعہ باقی نہ رہے۔ تب اس کی ملاقات محض
اس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور بس یہی کسی
مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم
کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم
بالشان حصہ قلم بند کر دینا ہے۔"

خطوط دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں ان میں
خاص خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ ایسی باتیں
جا سکتی ہیں۔ جو مخاطب سے راست طور پر نہیں کہی جا سکتیں
کہ مروت، نزاکت یا نفاست ان کے اظہار میں مانع آ گئی
اس لئے لوگوں کو جب خاص تاثرات اور دلی خیالات کا
مقصود ہوتا ہے تو وہ گفتگو کے بجائے خطوط ہی کا سہارا
ہیں۔ اور خاکہ نگار ایسے خطوط سے جو شخصیت کی سیرت
کردار وغیرہ کے عکاس ہوتے ہیں۔ خاکہ کے لئے مواد حاصل
ہے۔ لیکن یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ ہر شخصیت انکشاف
کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ قدرت نے کسی کو
اس صلاحیت سے نوازا ہے۔ اور کسی کو نہیں۔ جن کو یہ صلاحیت
ودیعت کی گئی ہے جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے یا دانستہ اپنے
آپ کو منکشف کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے خطوط، انکشاف
ذات اور شخصیت کے بارے میں غلط فہمی کا باعث بھی
ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر سرور لکھتے ہیں کہ: ــــــــــ

"اکبر، اقبال، جوش خطوط میں اپنی اصلی
شخصیت کے برخلاف ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے
خطوط میں وہ شوخی، ظرافت اور وہ گرمی
نہیں جو ان کی شخصیتوں میں ہے۔ البتہ حالی،
سرسید، مولانا محمد علی اور رشید احمد صدیقی
جیسے ہیں ویسے ہی ظاہر ہوتے ہیں۔"

اس لئے خطوط کا انتخاب کرنا ان کو خاکے میں صحیح مقام پر
پیش کرنا، خاکہ نگار کی قابلیت، ذوق صحیح اور قوت فیصلہ
پر منحصر ہوتا ہے۔ اور جتنا زیادہ ان کی روح کو جذب کر سکتا
ہے اتنا ہی زیادہ اس کی تصنیف بہتر ہوگی۔ اور جتنا زیادہ
وہ انھیں جا و بے جا استعمال کرے گا وہ مضمون میں خوبی
پیدا کرنے اور ادبی حسن بڑھانے کے بجائے اس کے انتشار کا
سبب بنیں گے۔ اول الذکر کی اچھی مثال محمد طفیل کا "عبدالحق"
پر لکھا ہوا خاکہ ابو سعید قریشی کا " میں انھیں نہیں جانتا
تھا" پطرس کی ایک رُخی تصویر ہے۔

پطرس کے خط کا ایک ٹکڑا درج ہے۔ اس خط سے اندازہ
ہوتا ہے کہ خرابی صحت کے سبب موت کا تصور کس طرح اس
کی شخصیت کے ساتھ سائے کی طرح چمٹا ہوا تھا:۔

"ڈیپارٹمنٹ میں رہنا ہم تنہا پسندوں
کے لئے ناممکن ہوگا۔ ایک پہاڑی عمارت
اس میں درجنوں ڈبے اس پر ہمسایہ مقفل
اور پُراسرار آٹومیٹک لفٹ میں پندرھویں

(بقیہ ص۳۷ پر)

بے خواب آنکھوں کے پیراہن

یوسف اعظمی

پھٹی آنکھ کے ساحلوں کے پرے سے
سمندر خلا کا
واسطہ ایک تھکا تھکا موجوں کے رحم و کرم پر
بیساکھیوں کے سہاروں پہ چلتی ہوئی یاد
سمندر کے آنچل میں اک طفلِ حیراں کی طرح بسولے
برف کی سطح پر تھرکتی ہوئی چاپ خاموش ہے
لاشعاع آنکھ
کھڑا اس کی بوتلوں میں مقید
انکیوبیٹرس میں خواب کے جسم کی دودھیا چاندنی گونگی ہوگئی
بساطِ نظر دل کی بنجر زمیں ہے
یا اک شکستہ عمارت ابھر آئی ہے
موت کی خامشی پی رہی ہے
میں کہ ٹیبل پہ اس طرح بے حس پڑا ہوں
کوما کی گہری تہوں کے تلے
زمیں کی کراہوں کا بہتا ہوا شائبہ ہے
کوئی چیخ، اعصابی لائنوں سے ہٹ کر کہاں دوڑتی ہے
کھلے آسماں کے تلے
جہاں نور — آواز
اک آنکھ میں گھل گئے تھے
نظر چاند کا آئینہ چومتی تھی
سینے پہ تھا کوئی دستِ تسلی
لہو کی صداؤں کے [illegible] جسم

زخم کی ہر امانت سے محروم ہیں
اور آنکھ — اک اندھا آئینہ ہے
سرحدیں کھینچتا ہے بساطِ لہو پر
ابابیل کی چونچ میں مُردہ آنکھوں کے یاقوت ہیں
ذہن خوابوں کے فردوس
جسم تپتی ہوئی آگ سے
اعراف میں رینگتے آ گئے ہیں
دائرہ — وقت کا
احساس کا
اور پرکار کے دو جواں ہاتھ کا وہ سفر رک گیا ہے
انگلیوں کی زباں پر صدا ہی کہاں
اک جہانِ نظر کا تماشا تو ہیں
مرگِ آواز کا اک تسلسل تو ہیں
چاند کے عہد میں
حسن کو
دودھ کی نہر سے کوئی رشتہ نہیں
کون خوابوں کے اسکائی کریپرس سے
اندھے کنوئیں میں اترے
کسے جسم کی نکہتیں
ایک صحرا کے ذرّوں میں
آواز دیں

مہدی جعفر

لمحہ

سرعت لمحہ اب آئی ہے سوا نیزے پہ
لفظ و معنی کو جھلسنے کے لیے
رنگِ گل، رنگِ حنا، رنگِ رخاں
نرمیٔ لمس حسیں
کاکل و خندہ لبی ریشمی و کم خواب و گہر
مے و مینا و سرود و دہل و چنگ و رباب
دولتِ غرقِ فنا
پھول کی شان عجب صبح عجب شام عجب
مشک عارض نہیں کچھ شہد لباں کچھ بھی نہیں

کہکشاں خاطر تنہائی ہجوم
چاند سورج کی نگاہِ معصوم
ساغرِ غالب و خیام سرودِ منظوم
خیرہ برق و فولاد کے آگے معدوم
ایک لمحہ تھا جو اب بار دگر ڈھلتا ہے
شہر صنعت کی فصیلوں کے تلے پلتا ہے

لب پہ فطرت کے مشینوں کی زباں کھلتی ہے
ضبط احساس کی زنجیر کہاں کھلتی ہے
خس و خاشاک یہ ہستی کی دکاں کچھ بھی نہیں

فرصت ہست و بود
اک خلا سارا وجود
لمحۂ ہستیٔ ادراک ہے بجلی کی لپک
خارزاروں میں پھولوں کی تمنا بے تاب
آئی ہے دار تلک
اشک ہو یا کہ لہو قطرے گرے جذب ہوئے
خشک ذرات کی چادر پہ نشاں ختم ہوئے
آب و گِل شعلہ ہوا فصل و زماں کچھ بھی نہیں

لطف الرحمٰن

غزل

آگ جلتی ہوئی کیسی ہے، دھواں کیسا ہے
آج روشن مرا تاریک مکاں کیسا ہے

پتے پتے سے اُڑی خاکِ سیہ کی خوشبو
جامۂ شاخ پہ اب رنگِ خزاں کیسا ہے

دستخط کر کے ہواؤں نے کہاں ڈال دیا
دربدر اُڑتا ہوا صفحۂ جاں کیسا ہے

عکس بن کر مری نظروں میں گھلا تھا کتنا
زہر بن کر مری رگ رگ میں رواں کیسا ہے

اُس کی آواز میں لہجہ مرا ہوگا اب بھی
اُس کی آہٹ مرے شاملِ گماں کیسا ہے

قصۂ شب میں درِ یاد پہ دستک دے کر
کس کا گھر پوچھ رہا ہے وہ جواں کیسا ہے

کون شبنم کا بدن لے کے ادھر سے گزرا
سینۂ گل پہ یہ قدموں کا نشاں کیسا ہے

کوئی اتنی بھی خبر اب نہیں دیتا اس کی
مہرباں کیسا ہے، وہ جانِ جہاں کیسا ہے

اپنا منکر بھی وہ آئینہ شکن تھا کتنا
عکس ٹوٹا ہے تو اب محوِ فغاں کیسا ہے

مہدی جعفر

گیا + بھوپال = ڈاکٹر مثنیؒ

(نے ہاتھ باگ پر ہے ......)

بھوپال میں ڈاکٹر محمد مثنیؒ کی آمد میرے لیے ایک خوش گوار اور لطیف حادثہ سے کم نہیں تھی۔ اس روز میں دفتر کے کام سے سیکریٹریٹ گیا ہوا تھا۔ واپسی پر دفتر کے ایک رکن نے بتایا کہ آل انڈیا ریڈیو سے میرے کسی عزیز کا ٹیلی فون آیا تھا۔ میں نے فوراً ہی فون کیا۔ اُس وقت دن کے ڈھائی بجے تھے۔ اور تاریخ تھی ۶ ستمبر ۱۹۷۵ -

حیرانی اور بڑھ گئی جب فون پر بات کرنے والے ڈاکٹر محمد مثنیؒ نکلے۔ کہاں گیا اور کہاں بھوپال، کہاں فلسفہ وحکمت اور کہاں لحن و موسیقی۔ کجا

بو علی اندر غبار ناقہ گم اور

کجا؛ دست رومی پردۂ محمل گرفت

عجائب روزگار کی ستم ظریفی دیکھئے پروفیسر کو افسر میں بدلنے پر تلے ہوئے تھے۔

یہ ملاقات دس سال بعد ہوئی تھی۔ اس دوران کیا کیا انقلاب نہیں ہوئے۔ ہند و پاکستان اور عرب و اسرائیل کی دو دو جنگیں ہوئیں۔ ویت نام کی طویل جنگ کا خاتمہ ہوا۔ بنگلہ دیش نیا ملک بن کر اُبھرا۔ چاند پر انسان نے نقش قدم چھوڑے۔ نکسن چین اور روس ہو آیا پھر وھائٹ ہاؤس سے واٹر گیٹ میں داخل ہو کر غرقاب ہو گیا۔ اندرا گاندھی کے قدم مضبوط سے مضبوط تر ہو گئے۔ ہندوستان ایٹمی توانائی کا حامل ہو گیا۔ خود مثنیؒ صاحب بھی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر بن گئے۔

لیکن اُن کے مزاج اور بات چیت کا انداز وہی تھا۔ یہاں کسی انقلاب کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ طناب وقت کھنچ گئی ہے۔ اور میں دس سال پہلے کی دُنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ بڑا ہی لطیف احساس تھا۔

فون پر بڑی مختصر گفتگو ہوئی۔ اُنھوں نے بتایا کہ سامان اسٹیشن پر ہی پڑا ہوا ہے۔ کیونکہ دفتر سے منسلک ہونے کے لئے سرکاری حکم کی رو سے وہ آخری تاریخ تھی۔ اس لیے براہ راست آل انڈیا ریڈیو ہی پہنچ جانا مناسب ہوا۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری سے میرا فون نمبر بھی مل گیا۔ جس سے اُنہیں فوری رابطہ قائم کرنے میں سہولت ہوئی۔ اُن کی ڈائری میں میرے گھر کا پتہ بھی درج تھا جس کا علم انہیں اس وقت ہوا جب بھوپال زیادہ دُور نہیں رہ گیا۔

مثنیؒ صاحب رشتہ کے اعتبار سے میرے ہم زلف ہیں۔ اُنہیں پہلی بار اپنی شادی میں دیکھا تھا۔ دوسری بار ایک عزیز کی شادی میں بڑی مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ تیسری ملاقات لکھنؤ میں میرے مکان پر ہوئی تھی، جو تقریباً چار گھنٹہ کی تھی۔

تاریخی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ اپنے اسلوب کی وجہ سے نثر کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اگر نابود ہو جائیں تو انگریزی ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

مشرق میں بھی خطوط نویسی کے فن نے کافی ترقی کی۔ عربی اور فارسی میں مکاتیب کو قدیم زمانے ہی سے ادبی مرتبہ حاصل رہا ہے۔ آغاز اسلام کے بعد عربی میں مکتوب نگاری ایک مستقل فن بن گئی۔ زمانہ نبوت میں مختلف والیان ریاست سے جو خط و کتابت ہوتی اسے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ دعوت اسلام کے لئے ایسے صحابہ سے خطوط لکھوائے جاتے تھے جنھیں زبان پر پورا عبور ہوتا اور جو انشا پردازی کے فن میں ماہر ہوتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا۔ خلافت اُمیہ، خلافت عباسیہ اور بعد کے سلاطین نے نہ صرف اس محکمے کو برقرار رکھا بلکہ مزید وسعت دی۔ اس طرح مکتوب نویسی ایک اہم فن بن گئی۔ جس کو سیکھنے سکھانے کے لئے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ نہ صرف یہ بلکہ مشہور دبیروں اور انشا پردازوں کے خطوط کے مجموعے بھی شائع کئے گئے۔ عربی سے یہ فن فارسی میں منتقل ہوا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں اس فن کو مزید ترقی ہوئی۔ فارسی رقعات کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں بادشاہوں کے علاوہ عالموں اور صوفیائے کرام کے رقعات بھی شامل ہیں فارسی انشا پردازی کی تعلیم کے لئے رقعات کے بعض مجموعوں کو شریک نصاب رکھا گیا تھا۔ ان رقعات میں ادبی اسلوب پر اتنا زیادہ زور دیا گیا تھا کہ شاعری میں اور انشا میں صرف موزونیت کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ ان کی نثر مرصع اور مسجع ہوتی۔ تشبیہات، استعاروں اور صنائع و بدائع کا بکثرت استعمال کیا جاتا۔

اُردو میں غالب نے اس روش کو بدلا اور ...

نگاری کے فن میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ اگرچہ اُردو میں خطوط نویسی کا باضابطہ رواج غالب کے زمانے میں ہوا لیکن اُردو میں مکتوب نویسی کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔ جعفر زٹلی نے اپنے استاد کی ہجو میں ایک منظوم "بھوت بھنڈار نامہ" لکھا تھا جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔ رنگین کے "فرس نامے" ۱۷۹۶ میں بھی منظوم خطوط موجود ہیں۔ قتیل نے جو اُردو رقعات تحریر کئے ہیں ان کو خواجہ امداد الدین نے جمع کر کے "معدن الفوائد" کے نام سے شائع کیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی بھی اُردو خطوط نویسی کے گیسو سنوارنے والوں میں داخل ہیں۔ "فہم قرین" کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں بتایا ہے کہ خط نویسی کس طرح کی جائے۔ غلام امام شہید کے "انشاء بہار بے خزاں" ۱۸۴۵ء صرف مجموعہ خطوط ہی نہیں بلکہ اردو بلاغت قواعد اور ضوابط خط نویسی کا قابل قدر کارنامہ ہے۔

مشہور فرانسیسی ادیب گارساں دتاسی ۱۷۹۴/۱۸۷۸ نے جو لکچر، اُردو زبان کی توسیع اور ترقی سے متعلق دیئے ہیں۔ ان میں اکثر اُردو خطوط نویسی کی کتابوں کا ذکر آیا ہے۔ اور دتاسی نے ان کتابوں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "میں معقول وجوہ کے ساتھ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ "تذکرہ" مشرق ہی کے مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ اسی قسم کی ایک دوسری چیز ہے جس کا نام "انشا" ہے۔ یہ خطوط کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی ایک ہی شخص کی تصنیف ہوتے ہیں۔ گویا فصاحت و بلاغت سکھانے کی کتاب ہوتی ہے۔"

غالب سے قبل اردو اور فارسی میں جس انداز کے ...

اُن سے دنیا جہان کے موضوعات پر جی بھر کر باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن ادب اُن کا محبوب موضوع ہے۔ شاعری میں غزل کے رسیا ہیں۔ شاعروں میں فراق، فیض اور مخدوم کے۔ نثر میں تنقید اور افسانے سے دل چسپی ہے۔ نقادوں میں احتشام حسین اور افسانہ نگاروں میں بیدی، کرشن چندر، منٹو اور قرۃ العین حیدر سے خاص لگاؤ ہے۔ بات بات پر ان فن کاروں کے یہاں سے جو مثالیں پیش کرتے ہیں اس سے ان کی باغ و بہار طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صاحب طرز نثر نگاروں میں رشید احمد صدیقی سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر مثنیٰ کی تحریروں کا اکثر وہی حصہ میری نظر سے گزرا ہے جو آہنگ گیا میں خاص طور پر شایع ہو چکا ہے۔ میری نگاہ میں اُن کی زیادہ تر تصویریں ادبی مصوری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ظاہری تصویریں نہیں بناتے اور خدوخال اُبھارنے سے گریز کرتے ہیں۔ اُن کی پیش کی ہوئی تصویریں چلتی پھرتی، ہنستی بولتی اور سوچتی ہوئی تصویریں ہیں۔ ان میں مثنیٰ صاحب خود بھی جھلکتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی شاید وہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں کو تنہائی کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتے۔ یہ ضرور ہے کہ تصویریں ادھوری چھوڑ دیتے ہیں شاید اس خیال سے کہ ناظرین اُنہیں خود مکمل کر لیں بقول غالب ؎

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

ڈاکٹر مثنیٰ کی ادبی تخلیقات کے نگار خانے میں کھویا ہوا خواجہ غلام السیدین، احتشام حسین، جمیل مظہری، سجاد ظہیر مجاز، اختر انصاری، باقر مہدی اور راہی معصوم رضا وغیرہ کی تصویریں دیکھ رہا تھا کہ یکایک نظر خلیل الرحمٰن اعظمی پر پڑی۔ میں اس تصویر میں خاص طور پر کھو گیا۔ کیونکہ

حال ہی میں اُن کی مرتب کی ہوئی کتاب "نئی نظموں کا سفر" خرید کر لایا تھا جس میں اُن کے خیال انگیز اور جامع مقدمے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ فطرتاً یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے نقوش میرے لیے زیادہ جاذبِ توجہ ثابت ہوئے۔ اسی تصویر کے ساتھ ایک اور تصویر بھی [illegible] اُبھری۔ قاضی عبدالستار ڈاکٹر فدا عباس (حمیدیہ کالج میں پروفیسر ہیں) سے ان کا ذکر سُنا ہے۔ ایک خط جس میں قاضی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مثنیٰ صاحب کی تصویر بنائی ہے حرف بہ حرف پڑھا ہے۔ طرزِ تحریر یقیناً پُرکشش اور اثر انگیز ہے۔ لیکن ہوا یوں جذبات سے مغلوب ہو جانے کا کہ ڈاکٹر مثنیٰ پس پشت رہ گئے اور قاضی صاحب خود اُبھر کر اس طرح سامنے آ گئے کہ اُن سے ملنے کا جی بے اختیار چاہنے لگا۔ دیکھئے یہ نوبت کب آتی ہے۔

یہ تصویریں دراصل یادیں ہیں۔ یاد اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بھوپال میں بھی گیا اور پٹنہ کی یادیں اُن کے ذہن میں اُبھرتی رہتی ہیں بقول فراق ؎

یاد آغازِ محبت کی دلوں سے نہ گئی
قافلے گھر سے بہت دور نہ ہونے پائے

محسوس ہوتا ہے کہ بھوپال میں صرف مثنیٰ صاحب تنہا نہیں آئے آئے ہیں۔ گیا سے کلام حیدری، پروفیسر شکیل، غیاث احمد گدی، افصح ظفر، نجوم اثر، وہاب اشرفی، شاہد احمد شعیب، انجم فاطمی اور مہدی امام وغیرہ بھی آئے ہیں۔ پٹنہ سے سہیل عظیم آبادی، مظہر امام اور علیم اللہ حالی آئے ہیں۔ دیکھئے ان لوگوں سے بھوپال میں ملاقات ہوتی ہے یا گیا اور پٹنہ میں۔

جوابی امور کے لیے ڈاک کے مناسب ٹکٹ ارسال فرمائیں
(ادارہ)

محمد منشا یاد

بند مٹھی میں جگنو

جب پڑوس میں عورتوں کی لڑائی شروع ہوئی وہ گھر میں اکیلی تھی۔ وہ شہر سے اپنے ساتھ کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لائی تھی۔ وہ کتابوں اور رسالوں سے اکتا گئی تھی۔ لیکن وہ شریف کی آٹھویں جماعت کی پھٹی پرانی کتابوں کو صبح سے کئی بار جھاڑ پونچھ چکی تھی۔

شریف اور بیلو صبح سے شریفاں کو لینے چچا کے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ لیکن اسے گھر کی ہر چیز سے شریفاں کے بدن کی خوشبو آرہی تھی۔ شریفاں گھر میں نہیں تھی۔ لیکن لگتا تھا ہر جگہ ہر چیز میں موجود ہے اور وہ؟ ——— وہ موجود تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے کہیں نہیں ہے۔

تھوڑی دیر پہلے پھوپھی کھیتوں کو روٹی لے کر جاتے وقت اس پر تنہائی کا ٹوکرا رکھ گئی تھیں۔ اگر پڑوس میں عورتوں کی لڑائی شروع نہ ہوتی تو اسے خود کو بار بار ٹٹول کر دیکھنا پڑتا کہ وہ ہے یا نہیں ہے۔

تنہائی کے ٹوکرے کے نیچے پڑے پڑے اسے بدبو کے بھبھوکوں نے گھیر لیا تھا کہ پڑوس کے آنگن میں بادل سے گرجے اور چیپ کے گھڑے پانیوں میں آوازوں کے پرنالے گرنے لگے۔

یہ جولائی کے آخری دن تھے۔

بیچ بیچ کے بادلوں اور اجلی دھوپ میں آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ سورج لمبی لمبی زبانیں نکال کر سرمئی بادلوں کے بخیف جسموں سے نمی چاٹ رہا تھا۔

بچپن میں اس کا خیال تھا کہ آسمان پر ہزاروں لاکھوں سورج ہیں اور ہر روز نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک یہی سمجھتی رہی کہ ہر شام ایک سورج بجھ جاتا ہے اور اگلی صبح ویسا ہی یا موسم کے لحاظ سے چھوٹا بڑا سورج طلوع ہو جاتا ہے اسے سارے سورج اچھے لگتے تھے زندہ اور دہکتے ہوئے بھی اور بجھ کر ڈوب جانے والے بھی ۔ ان بجھے ہوئے ٹوٹے پھوٹے سورجوں کے ڈھیر سے بھی اکثر کارآمد ٹکڑے مل جاتے تھے جنہیں فرشتے چمکا کر راتوں کو چاند کے روپ میں طلوع کر دیتے تھے۔ مگر اب اسے پتہ تھا کہ ایک ہی پرانا سورج اور ایک ہی تھکا ہارا چاند ہر روز استعمال ہوتے ہیں۔

پرانی چیزوں سے اس کا جی اوب گیا تھا۔

تازگی کا عالمگیر قحط پڑا ہوا تھا۔ ہر صبح بوسیدگی کی دبلی گائیں تازگی کی فربہ گایوں کو ہڑپ کر جاتی تھیں۔

تازگی کو سورج کی شعاعوں سے بچا کر فریج میں کئی کئی دن تک رکھا جاتا تھا۔ تازگی آٹھ آٹھ دن کی مری ہوئی مچھلیوں کی صورت بکتی تھی۔ جسموں کی بوسیدگی کو ڈھانپنے کے لئے نت نئے فیشن رائج ہوتے تھے۔ اور آؤٹ آف ڈیٹ نظریات پر لفظوں کا ملمع چڑھایا جاتا تھا۔

ٹیلی ویژن اور فلموں کی نقلی لڑائیاں، سُنے سنائے لطیفوں کا سہارا لے رہی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کی لڑائیوں اور چلیبٹی کا تصور کر کے اس نے اپنے آپ کو چپکے ڈر سے نکالا اور ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا تھا۔ آوازوں کے ہوائی گولے فضا میں دور دور جا کر پھٹنے لگے تھے۔

ٹھاہ ـــــ ٹھاہ ـــــ ٹھاہ ـــــ

وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اسے آزادی اور تازگی کا احساس ہونے لگا اور جی چاہنے لگا کہ وہ مرغیوں کے ڈربے پر کھڑی ہو کر ان دور افتادہ لوگوں کو آواز دے، جو اپنے اپنے انڈوں میں زندہ چوزوں کی طرح باہر نکلنے کے لئے ٹھونگے مار رہے تھے۔

لڑنے والیوں کے چہروں پر آگ کے شعلے تھے نفرت کے مکروہ جالے نہیں تھے۔ ان کی آوازوں میں بجلی کی کڑک تھی سانپوں کی پھنکار نہیں تھی۔ ان میں سے وہ نوراں اور جیراں کو پہچانتی تھی۔ شریفاں اکثر ان دونوں کا ذکر کرتی تھی، اور کل شام وہ اسے ملنے بھی آئی تھی۔ مگر اب پتہ چلا تھا کہ وہ دونوں پھیپھے کٹنیاں ہیں۔

کاش وہ بھی پھیپھے کٹنی ہوتی۔

آدمی ایک ہی نام سے اور ایک ہی حیثیت میں رہتے رہتے کتنا اکتا جاتا ہے۔ اس کے جسم پر چکنائی اور میل کے دھبے پڑ جاتے ہیں اور اس کی روح کو یکسانیت کی دیمک چاٹنے لگتی ہے

ابا عید کی نماز پڑھنے ایک راستے سے جاتے اور دوسرے سے واپس آتے، نئے راستے پر چلنے سے زیادہ ثواب ملتا تھا۔ وہ ہر روز جس راستے سے کالج جاتی اسی راستے سے واپس آتی، ہر سال وہی پرانے نوٹس، پرانی باتیں اور دہرائے ہوئے لیکچرز دہراتی اسے عظیم مفکروں کے زرّیں اقوال دہراتے ہوئے شرم آنے لگتی جیسے وہ کلاس کو دونی کا پہاڑہ یاد کرا رہی ہو۔

کبھی کبھی دونی کا پہاڑہ پڑھتے پڑھتے آواز اس کے حلق میں پھنس جاتی۔ کندھوں پر سر کی جگہ چکی کا پاٹ رکھا ہوا محسوس ہوتا اور آنکھوں کے سامنے دہکتا ہوا سورج بجھنے لگتا اکثر متلی ہو کر طبیعت بحال ہو جاتی ورنہ ہوش آنے پر پتہ چلتا کہ اسے دورہ پڑا تھا۔

اس نے خود ہی اپنے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ روز شریفاں کے پاس چلی جائے۔ جب سے کالج بند ہوا تھا اس کے ذہن میں ہر وقت چھوٹی چھوٹی جھینگریاں اپنے آپ چلتی رہتی تھیں۔ وہ سوچنا نہ چاہتی تو بھی سوچ کی سخت جان اور بدشکل چھچھوندر اس کے دماغ میں ٹھوکتی ڈالے مسلسل چیختی رہتی۔

لڑنے والیاں دیورانی اور جیٹھانی دو واضح گروپوں میں تقسیم تھیں۔

دونوں جانب ایک ایک بڑی اور تین تین چار چار چھوٹی عورتیں تھیں لیکن گھوڑ سوار سے گھوڑ سوار اور پیادے سے پیادہ لڑ رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے چھوٹیاں بڑے بڑے خوابوں کے ریشوں سے جکڑی ہوئی ہیں۔

خواب!

معدے کی گرانی؟

واہمے؟

لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشات؟

ایک بار اس نے دیکھا وہ چلّے بناتے بناتے خود پتیلی میں بند ہو گئی ہے وہ چیختی چلاتی ہے مگر کوئی ڈھکنا نہیں اٹھاتا یہاں تک کہ اس کا دم گھٹتا جاتا ہے اور وہ رہ جاتی ہے۔

اکثر اسے شک ہوتا کہ وہ خواب نہیں تھا اور وہ واقعی مر چکی ہے۔ وہ اکثر خود کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی رہتی کہ وہ ہے یا نہیں ہے۔؟؟

بھرے پرے گھر میں بھی اس پر اداسی اور تنہائی کے

تمو پر وقت تنے رہتے کبھی کبھی وہ اپنے جسم کی ان پڑھی
کتاب کھول کر خود ہی تصویریں دیکھنے بیٹھ جاتی پھر میلی ہونے
کے ڈر سے بند کر کے ایک طرف رکھ دیتی۔

پھر جب دونی کا پہوڑہ سینکڑوں مرتبہ دہرانا پڑتا
اسے ہر چیز باسی محسوس ہونے لگتی۔ اسے اپنا جسم — جس پر
اسے خود بھی سونے کا پانی چڑھا ہوا لگتا تھا سوکھا چمڑا نظر
آنے لگتا۔ پسینے سے مردہ مچھلیوں کی بدبو آتی اور کتاب
یا رسالہ کھول کر بیٹھتی تو جگہ جگہ مری ہوئی مکھیاں چپکی دکھائی
دیتیں ——————

بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں سوچ کی مکروہ چمگادڑ
چکر لگانے لگتی اور اسے ہر چیز سے گھن آتی۔ موسیقی مردہ کوے
کی لاش پر سینکڑوں کوؤں کی کائیں کائیں معلوم ہوتی۔ انڈوں
سے مرغی کی بیٹ، روٹی سے برادے اور سالن سے مردہ گوشت
کی سڑاند آتی۔ بدبو کے بھبھوکے اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے
اس کا جی متلانے لگتا اور وہ قے کرنے لگتی۔

جیٹھانی گروپ کی عورتیں چڑیلیں، ڈائنیں اور چھل
پیریاں تھیں، خون چوستی، کلیجے چباتی اور بڑے دل چھل
جاتی تھیں۔

دیورانی گروپ کی عورتیں لچیاں لفنگیاں اور مشٹنڈیاں
تھیں۔ وہ آنکھ مٹکا کرتی، چن چڑھاتی اور ادھل جاتی تھیں۔

اُسے ان پر رشک آرہا تھا۔

آنکھ مٹکا کرنے، دل چھل کرنے اور اپنے یار کے ساتھ
ادھل جانے میں اُسے کہیں کھوٹ نظر نہ آتا تھا۔ سچ کی اس
چلچلاتی دھوپ میں اسے اپنا آپ ہمیشہ سے ابر آلود مطلع
کی طرح لگتا تھا۔

جیٹھانی کی مرغیوں کی عادت تھی کہ وہ دیورانی کے گھر
انڈا دیتیں اور کڑ کڑ کرنے اپنے گھر آجاتی تھیں مگر دیورانی
کا بیان تھا کہ وہ فاحشہ مرغیاں اپنے بانجھ پن کو چھپانے کے لئے
کڑ کڑ کرتی اور مرغوں کی طرح اذانیں دیتی تھیں۔

بعض باتیں اپنے مخصوص جغرافیائی اور تاریخی حوالوں
کی وجہ سے اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھیں۔ مگر موضوع بدلتے
دیر نہیں لگتی تھی اور صنائع بدائع کا استعمال زبان و بیان کو
دل چسپ اور متنوع بنا رہا تھا۔ خاص کر صنعتِ اغراق اور غلو کی
ایسی نادر مثالیں کتابوں میں کہاں ملتی تھیں۔ البتہ تشبیہات
کبھی کبھی زیادہ قریب الفہم ہونے کی وجہ سے درجۂ بلاغت سے
گر جاتی تھیں۔

گھر میں سب محتاط رہتے کہ اس کی طبیعت کے خلاف کوئی
بات نہ ہو لیکن شہر کے لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ گھسی پٹی
اور دہرائی ہوئی باتوں کی شناخت کے لئے ایک قدآدم آلہ
ایجاد ہو چکا ہے جو متروک اور بانجھ چیزوں کی سوفی صد
درست نشان دہی کرتا ہے۔

لڑائی کے بہانے پچھلی سات پشتوں کا سرسری سا جائزہ
بھی لیا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں گڑے مردے اکھاڑنے کی کیا
تک تھی۔ پتہ نہیں ہوں بھی کہ نہیں۔ اور اگر ہوں تو ان کے
تن پر کفن ہوں یا نہ ہوں؟ اُسے قبرستانوں میں راتوں کو
الاؤ کے گرد ناچتی ننگی عورتوں کے قصے یاد آئے۔ اس کا
جی چاہا وہ کسی رات چھپ کر قبرستان چلی جائے۔

لڑنے والیاں اب طعنوں، مہنوں کی دلدل سے نکل کر
پلوتوں اور گالیوں کے گہرے پانیوں میں اتر چکی تھیں۔

ایسی الف ننگی گالیاں اس نے زندگی میں پہلی بار سنی
تھیں انسانی اعضا کے نام سن کر اس کے ذہن کے پنجرے میں
قید بے شمار ننھی منی چھوٹی چڑیاں یکبارگی پھر سے اڑ گئیں اور
کے بدن سے ہمیشہ سے چمٹی ہوئی جونکیں ایک ایک کر کے جھڑنے
لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندر ایک نیا سورج
لگا۔ اس کا سارا جسم اس کی کرنوں سے دمکنے لگا۔ لذیذ
گرمی سے رخسار تمتمانے لگے پسینے سے جسم بھیگ گیا۔ ☆

مظفر حنفی

غزل

آتے جاتے ہر دم ٹھوکا کرتے تھے کھڑکی دروازے
جھلا کر آوارہ ہوا نے توڑ دیئے کھڑکی دروازے

سنتے ہیں گھوما کرتی ہے بستی میں آوارہ خوشبو
یارو! ایسے میں لازم ہے، وا رکھئے کھڑکی دروازے

باہر جانے کی ہر کوشش مجھ کو اندر لے جاتی ہے
سب کھڑکی دروازے بھول بھلیاں کے کھڑکی دروازے

بالآخر وہ رُت بھی آئی جب مُٹھی بھر دھوپ کی خاطر
کھول دیئے ہیں شیش محل نے بھی اپنے کھڑکی دروازے

ہمسایوں سے مل کر موسم، بُنیادوں کو چاٹ رہے ہیں
دیواریں اندر بیٹھی ہیں بند کئے کھڑکی دروازے

روشنیاں دستک دیتی ہیں، دہشت سے پلٹے جاتے ہیں
کھڑکی دروازوں سے پردے، پردوں سے کھڑکی دروازے

بنجارے کا کام مُظفرؔ، چلتے جانا۔ چلتے جانا....
قریہ قریہ اپنے دامن پھیلائے کھڑکی دروازے

شروَن کمار ورما

مُسافِر

وہ گرتا پڑتا اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔

اسٹیشن تک اُسے ایک طویل، اوبڑ کھابڑ راستہ طے کرنا پڑا تھا۔ جنگل، دلدل اور پتھروں پر سے گزرنا پڑا تھا۔ یہ تو اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ سرکنڈوں کے پرے ریلوے لائن بچھانے کا پروگرام تھا۔ اسٹیشن بھی ضرور بنا ہوگا۔ اطلاع دینے والے یہ بتا کر اُسے یوں دیکھنے لگے تھے جیسے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہیں گے اور فیصلہ کرنا اب اس کا کام ہے۔ وہ یہ سب سن کر سیدھا گھر گیا تھا۔ گھر خالی تھا۔ بیٹھک میں اُس کے آباء و اجداد کی گرد آلود تصاویر آویزاں تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی تمام تصویریں بیک زبان بولیں۔

"جاؤ، کوشش کرو، ورنہ ہمارے ساتھ ان دیواروں پر گرد پھانکو گے۔"

"اکیلا؟"

"ہاں، ہم آگے تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہاں سے ہمارا تمہارا ساتھ ختم ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنا اپنا سفر تنہا طے کرنا ہوتا ہے۔"

اس کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا۔ گھر پر، باہر — اُس کے اندر — دور تک!

وہ چل نکلا۔ راستہ بھر وہ لائن، اسٹیشن اور اپنی اگلی منزل کے بارے میں سوچتا رہا۔ کبھی کبھی اُس کی یہ سوچ، خوب صورت، نرم و نازک سپنوں کا روپ دھار لیتی تو وہ خوش ہو جاتا۔ دوسرے ہی پل اس سوچ کے دھارے کسی صحرا میں اچانک غائب ہو جاتے اور وہ اداس ہو جاتا۔ اس لمحاتی خوشی اور اداسی کے بیچ لٹکتا وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔

اسٹیشن پر جس گہما گہمی کا تصور اُس کے ذہن میں تھا وہ وہاں قطعی نہیں تھی۔ وہی خاموشی، وہی سناٹا پھیلا تھا۔ جو اس نے اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت کے سامنے برگد کے گھنے اور برسوں پرانے پیڑ کے نیچے کھڑے اُس نے سوچا۔ یہ خاموشی، یہ سناٹا، یہ سونا پن کہیں اس کے اندر تو نہیں جو ہر جگہ اُس کے ہمراہ چل رہا ہو۔ اس خیال سے وہ قدرے گھبرا گیا۔ اس نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔ نہ برگد کے نیچے کوئی سواری کھڑی تھی، نہ مسافر، کوئی خوانچے والا تھا نہ کوئی فقیر اور نہ ہی کوئی آوارہ جانور سستا رہا تھا۔

وہ بے حد حیران ہوا۔ اسٹیشن پر بھی زندگی کے آثار نہیں تھے۔ اس نے سوچا، وہ کسی غلط مقام پر تو نہیں آ گیا۔ لیکن وہ اسٹیشن ہی تھا۔ ڈیوڑھی کی پیشانی پر لکھا تھا 'آزاد پور اسٹیشن'۔ بالکل یہی نام بتایا تھا اُسے لوگوں نے۔ دائیں طرف دو کوارٹر بھی تھے۔ خستہ، پرانے، دیواروں اور منڈیروں پر کائی جمی تھی۔ کسی منڈیر پر کوئی پرندہ بھی نہیں تھا۔ سناٹے کا سمندر تھا جو چاروں طرف پھیلا تھا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ کوئی
[illegible] نہیں تھا۔ گیٹ پہ کوئی ریلوے کرمچاری بھی نہیں تھا۔
کوئی [illegible] بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیٹ کسی مردار جانور کی آنکھ
کی طرح کھلا تھا۔ سامنے پلیٹ فارم دھوپ میں جل رہا تھا۔
وہ بکنگ آفس تک گیا اور کھڑکی پہ کہنیاں ٹکا کر کھڑکی
[illegible] ۔ ادھر [illegible] شخص کاؤنٹر پر ٹانگیں
پھیلائے [illegible] ۔ ٹکٹ پنچ کرنے والی مشین ایک کونے
میں کھڑی تھی جس پر گرد کی موٹی تہیں جمی تھیں۔ دفتر کے
دیگر سامان [illegible] یہی حال تھا۔ اس نے غور سے
سوئے ہوئے شخص کا چہرہ دیکھا۔ وہاں گرد تو نہیں تھی لیکن
تھکن اور بے چارگی تھی۔ ایک پل کو اسے خیال آیا کہ یہ
آدمی نہیں، چمگادڑ ہے۔ جو کاؤنٹر سے الٹا لٹک رہا ہے
اس نے کاؤنٹر پر دستک دی۔ اس شخص نے بڑے اطمینان
اور آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ اس کی طرف خالی سی نگاہوں
سے دیکھا، لیکن کاؤنٹر سے ٹانگیں نہیں ہٹائیں۔ اس کے چہرے
پر بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس نے سوچا یہ بھی کوئی تصویر
ہے جو دیوار سے کرسی پر آ گری ہے۔

"ٹکٹ۔؟"

"نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"یہاں ایک مدت سے ٹکٹ نہیں آئے۔"

"ٹکٹ نہیں آئے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیسے اور کیوں کا جواب میں نہیں دے سکتا۔"
اس نے لاتعلقی سے کہا۔

"آپ اوپر کیوں نہیں لکھتے۔؟"

"یہ میرے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں ہے۔" اس نے
پھر آنکھیں موند لیں۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آیا کہ وہاں کھڑے رہنے میں اب
کوئی تک نہیں تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم [illegible]
تھا۔ ریلوے لائن دور تک خالی تھی۔ نہ کہیں دھواں تھا
نہ گاڑی کی آواز۔ دور ایک ریلوے کراسنگ کا پھاٹک اٹھا
پڑا تھا اور ایک آوارہ گدھا لائن کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا۔ وہ
کسی کرمچاری کی تلاش میں ایک سے دوسرے سرے تک چکر لگا
آیا۔ اسے پیاس لگی تو وہ پیاؤ پر گیا۔ گھڑے خالی تھے۔ پانی
پلانے والا بھی موجود نہیں تھا۔ وہ مایوس سا ایک قریبی بنچ
بیٹھ گیا۔

اچانک اس کی نظر لائن پار کرتے ہوئے نیلی وردی والے
ایک بوڑھے پر پڑی۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کی طرف
چلا گیا۔

"بڑے میاں۔ سنیئے۔"

بوڑھے نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اس کی طرف
دیکھا۔

"اس اسٹیشن پر ٹکٹ کیوں نہیں ملتے؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں POINTS MAN ہوں"
اسے جیسے اندھیرے میں روشنی نظر آئی۔ وہ خوش
ہو کر بولا۔

"آپ اپنی ڈیوٹی پر جا رہے ہیں۔؟"

"نہیں۔"

"نہیں!" اسے صدمہ ہوا۔ "کیوں؟"

"ڈیوٹی کیسی، ایک عرصے سے ادھر کوئی گاڑی آئی
گئی نہیں۔"

"گاڑی آئی گئی نہیں! کیوں؟"

"پھر کیوں۔ یہ تم حاکموں سے پوچھو۔ میرا اس سے
کوئی تعلق نہیں۔"

اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا وہ اسٹیشن ماسٹر
سے ملے۔ وہ دفتر میں تو تھا نہیں۔ کوارٹر میں ہونا چاہئے۔ وہ

ادھر بھی کوئی نہیں تھا۔ اُس نے بڑے والے کوارٹر پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اور حرکت بھی نہیں ہوئی۔ اس نے اس مرتبہ قدرے زور سے دستک دی۔ وہی خاموشی۔ اس نے ہلکے سے دروازہ کھول دیا۔ کوارٹر خالی تھا۔ صحن میں چارپائی پڑی تھی۔ ایک میلا سا تکیہ رکھا تھا۔ اُس نے آواز دی۔ "اسٹیشن ماسٹر صاحب" لیکن کمروں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اُس نے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا کمرہ خالی تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہ رہا ہو۔ دوسرے کمرے میں اتنا مختصر سا سامان تھا جو صرف ایک آدمی کا ہو سکتا تھا۔ اُس نے سوچا وہ اس اسٹیشن کے اسٹاف کی اُوپر شکایت کرے گا۔

تبھی ایک نحیف و بیمار آدمی کھانستا ہوا کوارٹر میں داخل ہوا اور اُسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"میں مسافر ہوں اور یہاں اسٹیشن ماسٹر سے ملنے آیا تھا۔"

"آؤ۔" وہ شخص نرمی سے بولا۔ اور چارپائی اُٹھا کر برآمدے میں لے گیا۔ "بیٹھو میں اسٹیشن ماسٹر ہوں۔"

"آپ! میرا مطلب ہے آپ دفتر میں۔"

"ٹھیک ہے، میں دفتر میں نہیں تھا۔ مجھے وہاں ہونا چاہئے تھا، آپ یہی سوچ رہے ہیں نا، لیکن میرے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے ٹکٹ بابو کو سوتے دیکھا ہوگا۔ بھلا اس کے وہاں ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"وہ سوتا کیوں ہے۔؟"

"یہ اُس کی عادت ہوگئی ہے۔"

"آپ کوئی ایکشن نہیں لیتے۔؟"

"یہ میری عادت ہوگئی ہے۔"

"اگر کوئی اوپر شکایت کرے اور انسپکٹر آجائے تو؟"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" وہ ہنسا۔ "کوئی INSPECTION پر نہیں آئے گا۔ وہ سب لوگ بھی اپنی اپنی سیٹ پر سوتے ہیں، یا سونے کا بہانہ کرتے ہیں۔"

"لیکن ایسا کیوں ہے۔؟"

"یہ جاننا یا سوچنا میرا کام نہیں ہے۔ میں یہاں اسٹیشن ماسٹر تھا۔" ایک لمحہ چپ رہ کر کہنے لگا۔ "یا ہوں، یہ بھی اب معلوم نہیں۔"

"معلوم نہیں، کیا مطلب؟"

"بالکل معلوم نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ بہت سال ہوئے میں یہاں کا اسٹیشن ماسٹر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا میں یہاں آکر سب ٹھیک کر دوں گا۔ لیکن کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میرے بیوی بچوں نے بھی نہیں۔ میں نے تنہا یہ لڑائی لڑی اور ایک دن اوپر سے حکم آگیا کہ میرا تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ کہاں؟ اس کا کوئی ذکر نہیں تھا اُس حکم نامے میں۔ کوئی چارج لینے بھی نہیں آیا۔ آج آپ کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ آپ مجھے RELIEVE کرنے آئے ہیں لیکن آپ بھی مسافر نکلے۔" وہ پھر ہنسا۔

"آپ کے اسٹیشن پر نہ ٹکٹ ہیں، نہ کوئی شخص اپنی ڈیوٹی پر ہے، نہ پانی ملتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"صرف جاننے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ اس سلسلے میں حکام سے بات کیوں نہیں کرتے۔"

"کوئی ذریعہ نہیں۔"

"لیکن مجھے تو جانا ہے، اور یہ بے حد ضروری ہے۔"

"جانا ہے! لیکن یہاں تو پچھلے ۲۸ سال سے کوئی گاڑی آئی گئی نہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔" وہ مایوسی سے بولا۔

" جو آپ سے پہلے آنے والے ہزاروں لاکھوں لوگ کر رہے ہیں۔ "

" کیا ــــ ؟ "

" یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ خود کیوں نہیں سوچنا شروع کرتے ـ ؟ "

" وہ ہزاروں لاکھوں لوگ کہاں ہیں ؟ "

" پلیٹ فارم پر، ڈیوڑھی میں، باہر۔ ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ نے غور سے دیکھا یا سُنا نہیں۔ جائیے، دیکھئے، وہاں بھیڑ لگی ہے، شور مچا ہے ۔ میں وہیں آ رہا ہوں ـ"

" وہیں سے آ رہے ہیں آپ ! " اس مرتبہ اس نے اس شخص کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا ۔

" تم سب مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو ۔ میں درست کہہ رہا ہوں ۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں ۔ اُنہیں بتا کر ۲۸ سال سے یہاں کوئی گاڑی نہیں آئی گئی ۔ جو ہم سب کو ہماری منزل پر پہنچا سکے ۔ اوپر تو سب سو رہے ہیں ۔ تم لوگ ہی جاگو شور مچاؤ اور صرف انتظار کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ کرو کہ گاڑی آ جائے۔ ورنہ ــــــــ "

اسٹیشن ماسٹر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ــــ ــــ

بقیہ : خطوط اور خاکہ نگاری

منزل میں رہتا تھا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ اگر پندرہ نمبر کا بٹن دبانے کے بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے تو یہ لفٹ کم بخت بے حس بلا تامل پندرھویں منزل تک چڑھتا چلا جائے گا۔ وہاں پہنچ کر اس کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اسے اتنی بھی تمیز نہ ہوگی، کہ جس نے بٹن دبایا تھا محض ایک لاش ہے۔ دروازہ کھلنے پر باہر نہیں نکل سکتا۔ اس خیال سے عجیب وحشت ہوتی ہے۔"

اور موخر الذکر جوشؔ صاحب کا اسکیچ ہے جن میں شاہد احمد دہلوی اور جوشؔ کے خطوط کی کثرت، قاری کے ذہن پر بارِ گراں ثابت ہوتی ہے لیکن یہ شاید ان کی تحریر کا انداز ہے کہ خود نوشت مواد کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے اُنھوں نے ان کو جوں کا توں خاکے میں شامل کر دیا ہے اور مجموعی تاثر اخذ کرنے کی ذمہ داری قاری کو سونپ دی ہے ــــ ــــ

تنہا تماپوری

غزلیں

پڑے ہوئے ہیں یہاں کب سے آستینوں میں
اُتارتا ہی نہیں کوئی اپنے سینوں میں

یہاں وہاں سے اُٹھائے ہوئے ہو مستقبل
تمہارا نام بھی لکھ دیں گے دوربینوں میں

حیات لے کے وہ فٹ پاتھ پر نہیں سویا
کہ موت بھی وہاں شامل تھی نکتہ چینوں میں

کہاں کہاں کا تسلسل نہیں ہے جسموں میں
حسابِ دوست ابھی دفن ہے زمینوں میں

بس ایک چشمِ طلب گار اپنی قیمت ہے
ہمارے نرخ کے چرچے ہیں مہ جبینوں میں

خدا زمین پر آئے تو ہم سے کہہ دینا
اکیلے ہم ہی رہیں گے تماش بینوں میں

— —

بات کچھ یوں ہے کہ یہ خوف [illegible]
لاش دریا میں غنیمت ہے کہ بے گھر تو نہیں

دور صحرائے بدن سے نکل آیا ہوں مگر
ڈھونڈتا ہوں میں جسے وہ مرے اندر تو نہیں

خواہشیں روز نئی، روز نئی، روز نئی
یہ میرا ذہن بھی اخبار کا دفتر تو نہیں

دور تک لے گئی کیوں جنبشِ انگشت مجھے
میں اشارے ہی سے پھینکا ہوا پتھر تو نہیں

آپ تو پھول ہیں خوشبو سے پریشاں کیوں ہیں
آپ کے دل میں کہیں میرا مقدر تو نہیں

بھسماسُر بن گئی ہے آج حسینی دُنیا
کیسی دستک ہے! جگ موہنی در پہ تو نہیں

—

اور واپس...

"واپس! نہیں بھیا! اتنی مشکلوں سے تو یہ کوٹھری......"

"کوٹھری کا موہ چھوڑ دو! ہم سب لوگ واپس چلیں گے۔ میں — تم — اور بچے۔"

"کیا بچے بھی۔؟؟؟"

"ہاں! تاکہ کسی کو کسی سے بچھڑنے کا غم نہ ہو۔"

"مگر واپس جانا بھی تو کٹھن کام ہے۔ وہ —! ...... بچوں کو......"

کوئی مشکل نہیں۔ میں نے وہ ناؤ ندی کے کنارے والے درخت سے باندھ رکھی ہے۔ ہم سب اس میں بیٹھ جائیں گے اور ناؤ کو ندی کے بہاؤ میں ڈال دیں گے۔ ناؤ چل پڑے گی۔ واپس چل پڑے گی۔"

"واپس چل پڑے گی۔"

"ہاں! واپس چل پڑے گی۔ چلو چلنے کی تیاری کرو۔"

"واپس۔ واپس ————"

اس نے برسوں سے بند کوٹھری کا پچھلا دروازہ کھولا بچوں کو باہر نکالا کونے میں پڑی لمبی رسی اور لمبا بانس اٹھایا پھر راما کو بھی نکلنے کی تاکید کرکے کوٹھری سے باہر آگیا۔

راما نے کونے میں بھاری کلہاڑی اٹھائی اور دھیرے دھیرے باہر نکل گئی۔

ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے درخت سے رسی کھول کر ناؤ کو آزاد کیا اور دھیرے دھیرے اپنے زخمی ہاتھوں سے ڈھکیلتا ہوا تیز بہاؤ کے پاس لے آیا۔ اس نے ایک ایک کرکے سارے بچوں کو ناؤ میں ڈالا، پھر راما کو بلایا۔

"پہلے تم ناؤ میں بیٹھ جاؤ۔ تمہارے ہاتھ زخمی ہیں۔"

راما نے کنارے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

وہ ناؤ میں داخل ہوگیا۔ اس عمل میں اس کے زخمی ہاتھوں میں جو تکلیف ہوئی [illegible] کا ہی دل جانتا [illegible] پھر بھی وہ سخت جان ہوکر بانس کے سہارے ناؤ کو [illegible] کی طرف لے چلا۔

"راما جلدی آؤ! ورنہ ناؤ بہاؤ میں چلی گئی تو پھر تم اس میں داخل بھی نہیں ہوسکو گی۔"

"ناؤ بہاؤ میں پہنچ گئی [illegible] بار ڈگمگائی اور [illegible] تیزی سے ندی کے دھارے میں [illegible]

"نہیں — میں [illegible] جاؤں گی۔"

راما نے کلہاڑی ہوا میں لہراتے ہوئے [illegible] میں۔ یہ کلہاڑی لے کر — ان — سے — نپٹنے — جا رہی ہوں، جو میری کوٹھری کو تنگ کرنے میں مصروف ہیں۔"

"میں کہتا ہوں — آجاؤ راما — آجاؤ —! غدار عورت — تم نے مجھے دھوکا دیا۔ او کمینی — کمینی"

اس کی آواز ندی کے شور میں ڈوب گئی — —

بقیہ: پلاٹو کی چھلانگ...

گھڑی کی ضرورت ہے، کیوں کہ میں اس وقت راحت کے پُرکیف لمحے میں ہوں۔ فرحت کے سمندر میں تیر رہا ہوں، لیکن گھڑی تو تکیہ کے نیچے ہے۔ لاؤں کیسے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھڑی کے لانے لانے عشرت کے لمحے ختم ہوجائیں؟ مزید سانحہ یہ کہ ایک قدم چلنا بھی دشوار ہے — اوہ — کہیں یہ راحت برباد نہ ہوجائے؟ اس لئے راحت کے وقت کی پیمائش نہ کرنے کا کرب، کاغذ کی [illegible] دھار بارش کے پانی میں بہاکر — دل کی پرسکون گہرائیوں اور لطافتوں کے ساتھ سکھوں کی بھرپور آمیزش کا احساس کررہا ہوں۔

———— ————

احمد وصی

غزل

نرم گیلی [illegible] پہ جب گر پڑا بھیگا بدن
درد کے [illegible]ساس سے ٹوٹا کیا میرا بدن

صبح [illegible] چھایا ہوا ہے میری نظروں میں دھواں
رات میں نے خواب میں دیکھا تھا اک جلتا بدن

دو جدا دھاروں کا آپس میں کوئی رشتہ تو ہے
روح کی ناکامیوں پہ عمر بھر تڑپا بدن

جو ذرا سا فرق تھا وہ بھی نہیں باقی رہا
ایک جیسا ہو گیا میرا بدن، تیرا بدن

خنجروں سے، جنگلوں سے، دار سے بازار سے
بچ کے کتنے راستوں سے بارہا گذرا بدن

عمر کی اجلی ندی دن کی طرح ایسی چڑھی
رات کی تاریکیوں میں کھو گیا اجلا بدن

سانس کی رنگین تتلی آسماں میں اڑ گئی
خشک سوکھی جھاڑیوں سے رہ گیا الجھا بدن

چار شعر

احساس ہے ہمیں کہ ہم ابھرے ہیں خاک سے
ہر ایک سے ملے ہیں بڑے ہی تپاک سے

یہ ہماری عمر جیسے ہلاکو سے جنگ ہو!
ہر سانس پہ لگے کہ ہوئے ہم ہلاک سے

اب تک تو لگ رہا تھا کہ بجتی ہیں چوڑیاں
یہ کون چیز ٹوٹ گئی اب چھناک سے

دھرتی سے مٹتے جاتے ہیں چہرے اب اس طرح
جیسے کسی نے ان کو بنایا ہو چاک سے

جگدیش مہانتی
یوسف جمال

پلاٹو کی چھلانگ سے راحتوں کی گرفت تک

اڑیا میں نئی نسل کے لکھنے والوں میں جگدیش مہانتی کا اہم مقام ہے۔ یہ کہانی ان کے جذبات و احساسات کی نمائندہ کہانیوں میں سے ایک ہے۔ جو اڑیا کے بھاری بھرکم اور بے حد معیاری جریدہ "جھنکار" کٹک میں شائع ہوکر بے پناہ خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ انھوں نے البرٹ کامو اور فرانسس کافکا سے زیادہ اثر قبول کیا [illegible] سبب ہے کہ ان کی کہانیوں میں ان دونوں کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ اب تک اندازاً سو کہانیاں لکھ چکے ہیں اور تقریباً ساری کہانیاں اڑیا کے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

ماہنامہ "سوربھو" سے عرصہ تک منسلک رہے۔ "ماترسجومی" [illegible] ایک سال تک مستقل کالم لکھتے رہے ہیں۔ اڑیا ادب کے تمام جرائد میں ان کی کہانیاں پابندی سے شائع ہو رہی ہیں ——

آپ گرو مہاسانی (میور بھنج، اڑیسہ) میں ۴۹ء اور ۵۰ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ فی الحال راج گانگ پور میں گورنمنٹ ای۔ ایس۔ آئی ڈسپنسری میں فارمسٹ کے عہدے پر فائز ہیں ——

(ادارہ)

آج سے بہت برسوں پہلے کی بات ہے کہ پلاٹو نام کا ایک ... شہرت یافتہ فلسفی نہ جانے کس لئے جبرالٹر کو روندتا ہوا اٹلانٹک کے ساگر میں کود جانے کو چاہ رہا تھا، کیا ایک ... منظر کے ماحول کو دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں پانے کے لئے۔؟ میری کہانی کا ہیرو انسومان کی سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا تھا۔ ۲۶ عدد جنوری اور ۱۸ دنوں کے پہاڑ پر چڑھ کر

پانچ فٹ چھ انچ کا قد، ۳۲ انچ کا سینہ، کٹک کے کسی دفتر میں کلرک کی ملازمت کرتا ہوا اور گھٹن آلود اندھیر کی گپھا کی مانند ۳۵ روپے کے کرایہ کے مکان میں رہتا ہوا انسومان موٹر ایکسیڈنٹ کی بچاؤ کے آئین کو سامنے رکھ کر چلتا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتا ہے کہ ایک دن چار آدمی کے کاندھے پر سوار ہوکر اسے ایک مخصوص منزل کی طرف چل دیا جائے

دل کے کسی کونے میں جو رنگوں کا لیپ ہے یہ تمہاری دین ہے، ایک عجب صورت عطیہ ہے۔ یہ لیپ میرے دل کو منقش کرتا رہے گا۔" یا ...... نہیں، رہنے دو۔ کسی وقت اچھلے لکھوں گا۔

چوتھی سوچ: ایک سال سے پیر نامے میری جان پہچان ہے۔ یہ کیسا پیار ہے؟ ایک بار بھی اس کا بوسہ نہیں لے سکا۔ آنے والی پہلی تاریخ کو ملاقات ہونے پر اس سے لپٹ جاؤں گا اور بوسہ لوں گا، کہیں میری اس ناشائستہ حرکت سے وہ ناراض تو نہیں ہو جائے گی؟ کیا شرمائے گی؟ ؟ دیکھا جائے گا۔ تجربہ کر دوں گا، اس بار نہیں تو اس بار۔

پانچویں سوچ: تعجب کی بات ہے کہ میں صبح کے وقت ایسی گندی باتیں سوچ رہا ہوں۔ کیا یہ ذہنی عیاشی ہے؟ اسی لئے میرے ملک کی ترقی نہیں ہو پا رہی ہے۔

چھٹویں سوچ: اوہ ...... بہت وقت ہو گیا ہے اُٹھنا چاہئے۔ میں اُٹھ بیٹھا، ٹوتھ پیسٹ اور برش لیا، لنگی ٹھیک سے باندھ کر غسل خانہ میں گھس گیا۔ نہاتے وقت حساب کر کے دیکھا کہ صبح سے اب تک کچھ بھی راحت نہیں ملی۔

پیمائش وقت ۲ دوپہر

آفس میں بیٹھے ہوئے اخبار پڑھتے ہوئے جیسے سکھ کی راہ پا گیا، اس وقت دوستوں کا مجمع کچھ اس قسم کی بحث ومباحثہ یا اطلاعات میں مبتلا تھا۔

"فلانے کے گھر میں ایک رات ...... "

" عجب ہے، اتنے بے وقوف ہو تم؟ رنگ ڈیکلیر ہونے سے پہلے ہی پیر دکھا دیئے۔؟"

"ہاں گھر کے قریب وہ جو باڑھ سب یاد ہیں نا،

دیکھو گے، ایک دن اس لڑکی کو اُڑا لوں گا۔"

" سنا ر ظلم اچھی گی یا گھر سنار؟"

" سیاست کی چال سمجھنے کے لئے آنے والے الیکشن کا انتظار کرو۔"

ممکن میں ...... ان کے ہر معذ کے مجھے ہٹ کر اچانک سے ادب کر اخبار کی سرخیوں میں گھومتے ہوئے اچانک سکھ کی راہ پا لیتا ہوں۔ اس وقت دن کے دو بج کر تیس منٹ ہوئے ہیں۔

ایک۔ اشتہار دیکھا کہ آکاش وانی کے لئے نیوز ریڈر اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ اشتہار میرے دل کی گہرائیوں تک اُتر گیا اور سر سے پیر تک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دل ہی دل میں تصور کیا کہ مجھے یہ ملازمت مل گئی۔ مزید تصور یہ بھی کیا کہ میں اسٹوڈیو کے بند کمرے میں بیٹھا خبریں پڑھ رہا ہوں اور میری آواز سب سن رہے ہیں۔

تصور: آکاش وانی سے انسان بسوال بول رہا ہوں۔ آج کی خاص خاص خبریں ...... خاص خاص خبریں؟

اوہ ... خاص خاص کیسی خبریں ...؟

: " کیو کجھر ضلع میں سوکھے سے، بھوک سے بلبلا کر پانچ آدمی مر گئے۔" "نہیں نہیں ...... یہ نہیں چلے گا۔" " بے کار نوجوانوں کی خودکشی!" "نہیں یہ بھی نہیں چلے گا۔"

: " اُڑیسہ بہت جلد ہمالیہ کے اوپر پہنچ جائے گا!" " یہ چل سکتا ہے۔"

: " وزیر اعلیٰ ...... آج ہوائی جہاز کے ذریعہ سیلاب میں گھرے ہوئے لوگوں کا معائنہ کر کے بہت دکھی ہیں۔"

اس طرح تصور کے اسٹوڈیو میں مزے لیتے ہوئے راحت کی کیفیات سے حظ اٹھاتے ہوئے اچانک خیال آیا کہ میرے پاس کسی منسٹر کا سفارشی نامہ، ریڈیو اسٹیشن

کسی [illegible] پہچان یا میرا کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ گویا [illegible] کی بیں سے میرے پیٹ کی آگ بجھتی رہے گی۔

اس [illegible] کے ساتھ ہی راحت کا عجیب احساس [illegible] ہو کر رہ گیا۔ اس وقت دو بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں اور کچھ کام نہیں کر سکا۔ پانچ بجے تک آفس کے سارے چپراسیوں کو گالیاں دیں، کینٹین کے اُدھار کھاتے سے چائے پی، ساتھیوں سے جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا، اونچے عہدے کے آفیسروں کی ماں بہنوں سے ہمبستری کے ساتھ اعلان کیا کہ جب تک چاند ہے یہ ملک ترقی نہیں کر سکتا ہے۔

بعد میں حساب کرکے دیکھا تو راحت کا وقت پانچ منٹ اور کرب ناک لمحوں کا گھراؤ دو گھنٹے بیس منٹ، لیکن پانچ بجے آفس سے نکل کر سکھ دکھ کی بھاری بھرکم گٹھری کا بوجھ سر سے اُتار کر پھینک دیتا ہوں۔

•پیمائشِ وقت ۳ شام

دراصل بات یہ ہے کہ ہم سب ایک بڑے جہاز میں چڑھ گئے ہیں۔ شہر کی شاہراہیں، شاہی بازار، بس اسٹینڈ، سینما ہال اور آفس وغیرہ کو لے کر یہ جہاز جیسے گہرے سمندر کے بیچ ساکت ہو کر تنہا رہ گیا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ زیادہ تر میری یادداشت سے اتر جاتی ہے، اس جہاز کی بات۔ سمندری جیون کی تنہائی کے کرب کی باتیں اس شہر کے اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں کہ وہ لوگ ایک ایسے جہاز میں رہتے ہیں جو نیلے سمندر کے درمیان اکیلا، تنہائی کے کرب، روشنی، ہوا اور سکھ دکھ کے بیچ سے واپس لوٹ کر کنارہ پا لینا ان کے لئے ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔

آفس سے لوٹتے وقت گہری سوچوں کے ساتھ جہاز کی بات یاد آئی۔ جہاز کی بات کے معنی ہیں خود کو ناامیدی کی لہروں میں مستغرق کر دینا۔ اس لئے اس [illegible] دھوکا دینے کے لئے غسل خانے میں داخل ہو [illegible] بند کر لیتا ہوں۔ غسل خانے میں خود کو دیکھنے [illegible] میں نے اس کے اندر ایک قدِ آدم شیشہ لگا دیا تھا۔ [illegible] شیشے کے آگے کھڑے ہو کر، خود کا اچھی طرح جائزہ لے کر [illegible] عجیب راحت مل جاتی ہے۔

دل میں خیال سر ابھارنے لگا کہ آئینہ میں میرا چہرہ میرا اپنا نہیں ہے۔ آج پچیس برسوں سے جس چہرے کو میں اٹھائے ہوئے چل رہا ہوں اور دھیرے دھیرے ایک فٹ سے پانچ فٹ چھ انچ تک لمبا کر پایا ہوں۔ وہ چہرہ میرے لئے اتنا اجنبی اور انجان ہوا کیوں کر۔ ؟ جس چہرے کو میں نے اتنی محبت سے پروان چڑھایا، اگر کوئی اس صورت کی طرح دوسری صورت کے ساتھ مجھ کو ۲۶ سال تک جبراً رہنے کے لئے کہتا تو میں [illegible] ہو کر کوئی ایسا ویسا کام نہیں کر ڈالتا ---- ؟ نہ جانے کیوں، میرے دل کے اندر سے عجیب سوگ + دکھ + اور پشیمانی کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ ادب اور گھٹن سے بچنے کے لئے شاور کے نیچے خود کو ڈال دیا اور تمام دکھوں کو دھو کر باہر نکل آیا۔

لباس تبدیل کرنا چاہا تو کوئی بھی صاف نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کسی بھی لڑکی کے ساتھ اپائنٹمنٹ رکھنا مناسب نہیں، اس لئے آج کسی بھی لڑکی سے ملنے کا پروگرام التوا میں ڈال کر راموناتا کی چائے کی دکان پر جا کر اسپیشل ہاف چائے کا آرڈر دے کر مباحثہ کرنے والوں کے غول میں شامل ہو گیا۔

- جنگ شاید چھڑ جائے گی، یہ تم کیا کہہ رہے ہو ؟ روس امریکہ کو، چین روس کو، ہر ملک ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہا ہے۔
- اُمّل تلاش کر رہے ہیں۔ ؟ شاید امرت ڈھونڈھنے

ل جائے گی بیوی فوڈ ......؟
: کہانی ... ، اس کوآں ہے ، کیا کر سکتے ہو!
...... ، امریکہ ، مصر ، روس ، چین ،
موزمبیق ، ...... گاندھی ، اندرا گاندھی ، فولاد کا رشتہ
آئی۔ ایس آئی ... اور کرپشن ، ریڈیو ، بجیب ، بھٹو ،
...... بیاریا ، صوفیہ لارین ، دلیپ کمار
راجیش کھنہ ، ڈمپل کپاڈیہ ، انجو مہندرو ، امیتابھ بچن ،
سکس مرڈر ، سکس اینڈ وکٹر ، مرڈر ، سکس ، سکس ......
اسپیشل ہاف چائے میں اور زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا اور
شاید نہیں چاہتے ہوئے بھی اٹھ جاتا ہوں ۔
، بھیڑ ، سانڈوں کی لڑائی ۔ فوٹو اسٹوڈیو کے فریم میں
خوبصورت عورتوں کی دو ہاتھ کی مسکراہٹ ، رکشا ، کار ،
بس ۔ احساس ہوا کہ میرے دماغ کے اندر انگنت کوؤں
کی کریہہ چیخیں ، راستے کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا کہ گھر سے
ہوئے آسمان کا رنگ بالکل صاف ہے ، بس اتنی ہی نیچرل ہے
باقی دنیا جیسے گھر ، گاڑی ، سانڈ کی لڑائی ، عورتوں کا جوڑا ،
سب کچھ مصنوعی ۔ جیسے کہ UN CONCIOUSLY کے
نیچرل احساس کی طرح راشننگ ، بہت دنوں سے مان لیا گیا
ہے ، گھر واپس آ کر حساب کیا تو راحت ، اپنے خانے میں صفر
بن کر میرا منہ چڑا رہا ہے ۔

پیمائش وقت ۲۴ رات

اچانک آنکھ کھل گئی ، اس وقت تک دو خواب
دیکھ ڈالے تھے ۔ پہلا خواب کچھ اس طرح ہے ۔
والد کے چہرے کا کلوز اپ ، چہرے پر جھریاں پڑ
گئی ہیں ، آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں ، ناامیدی میں کھوئی
ہوئی صورت ، دکھوں کا احساس ، کرب ..... اور اچانک
چہرے کا کلوز اپ ختم ہو گیا ۔ مجھے لگا کہ کچھ لوگ میرا تعاقب
کر رہے تھے ۔ میں نے ان کی حد سے نکل بھاگنے کی بے حد
کوشش کی ، لیکن حیرت تو اس وقت ہوئی جب میرے پاؤں
آگے نہیں بڑھ رہے تھے ، جیسے زمین نے پاؤں پکڑ لیے
ہوں ، ناامیدی ، شکست و بیم اور اپنے انجام کے خوف
سے دل رو پڑا ۔ اور آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا ۔ ان
لوگوں نے مجھے پکڑ لیا ۔ گڑگڑاتے ہوئے میں نے کہا ۔
" دیکھو ، مجھے چھوڑ دو ، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں ،
آدمیوں کی طرح ۔ میرے باپ کو تم لوگ پہچانتے ہو؟ وہ زندگی
بھر خوابوں کی ریل پر چڑھ نہ سکے ، زندگی کی آخری سانس
تو آرام سے کٹ جانے دو ، میں ان کا اکلوتا لڑکا ہوں ، وہ
میرے بغیر جی نہیں پائیں گے ۔ جانتے ہو؟ میں بہت دکھی ہوں
ٹھیک والد کی طرح میں بھی خوابوں کی ریل بنا کر اس پر
سوار نہ ہو سکا ۔ ہو سکتا ہے میری آنے والی نسل بھی خوابوں
کی ریل پکڑ نہیں پائے گی ۔ جانتے ہو؟ شاید خوابوں کی
ریل میں متوسط طبقے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ۔ نہیں تو ۔"
" تم جیسس ہو؟ " میری بات سنے بغیر ان میں سے
ایک نے پوچھا ۔
" نہیں ، میں انسومان ہوں ۔"
" نہیں ! کل تک تم انسومان تھے ، آج تم جگن ناتھ[1]
ہو ، جیسس ہو ، محمد ہو ۔"
" کبھی نہیں ، کل میں کیا تھا ، آج انسومان ہوں ،
آنے والے دن میں موزی تنگ ہوں گا ۔"
" جھوٹے ہو ، بکتے ہو ، تمہارا دل ہے ۔"
" سینے کے اندر ایک مشین ہے ، جو ہاتھ کی مٹھی میں بند
ہو سکتی ہے اور جو جسم کا خون چاٹ چاٹ کر پیتی ہے ۔"
" بے وقوف ! وہی تو دل ہے ، وہی بڑھتا ہے ، وہی
ڈالر ہے ۔"

۱ پوری کا جگن ناتھ نیم کا پیڑ سے بنا ہوا ہے ، جسے دارو برہما کہا جاتا ہے

... ہے یا نہیں ؟
... سمجھے ... تب وہ ناستک تجھے سزا لے گی۔"
اس کے بعد وہ لوگ مجھے گھیر لیے۔ سالا ناستک
... سی۔ آئی۔ اے ایجنٹ، ریکشری، نہیں یہ
... بھارتی ... ، امی پاکستانی۔"
... انگنت لفظوں کا اشارہ ... لفظوں نے
مجھے گھیر لیا اور مجھے ثابت کر دیں گے ... ہے۔
اور لفظ میں بڑا ہو رہے ہے وہ لفظ گالی ہوتا ہے۔ گالی
ہوتا ہے اور گالی ہوتا ہے۔

دوسرے خواب کے مکالمے کی صورت ایسی تھی۔

"اے شخص سنو، تمہارے ہاتھ اور پاؤں میں کیلیں ٹھونک کر کن لوگوں نے تمہیں صلیب پہ لٹکایا ہے؟ تمہیں بے حد تکلیف ہے نا۔؟

اے شخص، تمہارے چہرے پر داڑھی بڑھ گئی ہے۔ کتنے دنوں سے نہیں نہائے ہو؟۔

اے شخص، تم تو اس طرح ہاتھ پاؤں لمبا کر کے سب دیکھ رہے ہو، کہو اس مہابھارت کی جنگ میں کون لڑ رہا ہے؟ کون جیتے گا؟ کون ہارے گا؟؟

صلیب پر لٹکے ہوئے شخص نے آنکھیں کھولیں، بند کر لیں۔ آنکھیں کھلنے اور بند ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ مسکرایا۔

"ہنس رہے ہو؟ تم اتنے دکھی ہو، پھر بھی ہنس رہے ہو؟ تمہارے میمنے سب کانجی ہاؤس میں ہیں۔ انھیں کون چھڑائے گا۔ تمہاری محبوبہ کا کیا نام ہے؟"

مگڈلین ـــــ وہ بھی تو ہوٹلوں میں گھوم رہی ہے یا نرسنگ ٹریننگ لے رہی ہے۔"

وہ شخص پھر مسکرایا۔ پوچھا

لے بائبل سے ماخوذ

... HOMOSEXUALITY"

جانتے ہو؟"

... COMPLEX اس نے خود ہی کہا

"پھر بھی، تم اسی لئے رہبانیت کے نام پر ... بات کر رہے تھے؟ اسی لئے مرنے کے بعد قبر کے ... کھا دیا تھا؟؟

اس شخص نے آسمان کی طرف دیکھا اور تمام دکھوں کے بوجھ کو آکاش کی طرف اچھال کر کہا۔

"ہزارہا سالوں سے میں تو اسی طرح زندہ ہوں، تم کہتے ہو جینا ایک دکھ ہے، عذاب ہے، اس کے باوجود بھی اس اذیت ناک عذاب سے بچنے کے لئے کون ہے جو خودکشی کرتا ہے؟ تمہارے اوپر چودہ پونڈ کا بوجھ ہر وقت ڈال دیا گیا ہے۔ کیا تمہیں احساس ہے؟ دکھ تو انسان کے لئے پیدا ہوا ہے اس لئے اس کا نام کیا؟ دکھ سے زندگی ہے، اور زندگی ...."

نیند ٹوٹی تو دیکھا میں پسینے سے شرابور ہوں، سر بھاری ہو کر رہ گیا ہے، اور ایک ایسی تشنگی عود آئی ہے کہ بار بار پانی پینے کے بعد بھی پیاس مزید بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے بعد شدید طور پر احساس ہوا کہ میرے پیٹ کا نچلا حصہ کافی بھاری بھرکم ہو گیا ہے۔ اسی وقت اسے ہلکا کرنا چاہئے اٹھ کر لنگی درست کی، دروازہ کھولنے پر باہر دیکھا، باہر زوردار بارش ہو رہی ہے۔ بارش میں تربتر کھڑا بجلی کا کھمبا، جس کی چاروں طرف خوب صورت ہالہ بنا ہوا دل فریب منظر کی دعوت دے رہا ہے۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے فوری طور پر (رفع حاجت) ...

لے بائبل کا کہنا ہے کہ جیسس مرنے کے بعد قبر سے زندہ اٹھ آئے تھے۔

لے ATMOSPHERE کے پریشر سے ہر شخص کے اوپر چودہ پونڈ کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ (نظریۂ سائنس)

غزلیں

انجم نیازی

یک شیشے پہ پتھر جب کبھی پھینکا پڑا
یکڑوں ٹکڑوں میں خود تقسیم ہو جانا پڑا

ا لفظی قبروں میں خود کو دفن کرنے کے لئے
پنی سوچوں کو کفن لفظوں کا پہنانا پڑا

ود کو سر کرنے چلا جو میں کبھی تنہائی میں
پنی ہی پرچھائیں سے رستے میں ٹکرانا پڑا

ار ہا خودی سے میں نے رحم کی مانگی ہے بھیک
ر دانہ ہی آگے ہاتھ پھیلانا پڑا

وتے روتے سو گیا انجم وہ روٹی کے لئے
پنے بیٹے کو کھلونا دے کے بہلانا پڑا

سورج رعلگیسے

جو ملا ذوقِ میکشی سے ملا
چارۂ دردِ زندگی سے ملا
رنگ میری سیاہ بختی کا
تیری زلفوں کی تیرگی سے ملا
ایک عالم اُداس ہے اب تک
اس طرح کوئی بے رُخی سے ملا
غیر سے رسم و راہ بہتر تھی
یہ سبق تیری دوستی سے ملا
رات دن آنے جانے والوں کا
سلسلہ یار کی گلی سے ملا
زندگی کا فریب لوگوں کو
ایک احساسِ زندگی سے ملا
منزلِ شوق کا نشاں مجھ کو
تیرے عارض کی روشنی سے ملا
تو کبھی اپنے پیار کا آنچل
میرے دامانِ زندگی سے ملا
پھر مجھے کیوں کوئی ملال رہے
ملنے والا بڑی خوشی سے ملا
درد و ہجراں، شکست و ناکامی
جو ملا یار کی خوشی سے ملا

عاصم بریلوی

ہر لحظہ ہر وقت مجھے ڈر سا لگے ہے
یہ دور تو آسیب زدہ گھر سا لگے ہے

احساس کی پلکوں پہ ٹھہر جائے جو آ کر
وہ اشک تو وسعت میں سمندر سا لگے ہے

یہ حسنِ تعلق ہے کہ معراجِ عقیدت
اُس ہاتھ کا پتھر بھی گلِ تر سا لگے ہے

ہر بار نیا روپ نظر آئے ہے اُس کا!
وہ بُت سا لگے ہے کبھی بُت گر سا لگے ہے

اس دورِ پُر آشوب میں جس شخص کو دیکھو
اِک درد میں ڈوبا ہوا پیکر سا لگے ہے

احسان کی نیت سے جو بخشے ہے کوئی دوست
عاصم مجھے وہ پھول بھی پتھر سا لگے ہے

شمیم افزا قمر

رات بھاری ہے

سارا گھر اُلجھا ہوا تھا۔ کسی کو شاپنگ کے لئے جانا تھا کسی کی ٹرین کا وقت ہو گیا تھا۔ شانو ابھی کالج سے واپس آئی تھی۔ بھوک سے اس کی آنتیں اینٹھی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جب سے اُس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا اُس کی بھوک کئی گنا زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شاید خالہ بی کی بے پناہ دیکھ بھال اور رکھ رکھاؤ نے اُسے سچ مچ ہی چھوئی موئی کا پھول بنا دیا تھا۔

"کیوں بی بی! آپ کو کالج میں کھانے کے بدلے ناشتہ ہی چلا گیا نا؟"

اُس کی خالہ بی نے خیریت دریافت کی۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی۔ اُس کا چہرہ کمہلایا سا لگ رہا تھا۔ مچھلی جیسے لچکیلے جسم سے پھول دار شیفون کی ساری اس طرح لپٹی ہوئی تھی، جیسے عشق پیچاں کی بیل منڈھی ہو۔ خالہ بی اُسے شفقت سے تک رہی تھیں اور ماما پلاؤ، قورمہ پیاز کے لچھے اور تلے ہوئے آلو کے قتلے کی پلیٹیں اُس کے سامنے رکھے ہوئے میز پر سجا رہی تھی۔ شانو نے سوچا اگر یہی کھانے کالج میں پہنچتے تو اُس کے ساتھیوں میں اُس کا سر کتنا اونچا ہو جاتا۔ مگر وہاں تو شامت اعمال تلے پراٹھے اور انڈے کا آملیٹ ہی نکل آیا...... تو پھر کیا ہوا ڈھاک تو اُس کی یوں بھی جمی ہوئی ہے۔ بھلا کس لڑکی کا کھانا اس طرح کالج میں سج سجا کر پہنچتا ہے جیسے رحمت پینٹ شرٹ پہن، اپنے بالوں کو سوار، سائیکل پر ٹفن کیریر لئے لیڈیز کامن روم کے دروازے کے قریب اُس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ وہ کس شان بے نیازی سے اپنی تمام ساتھیوں سے معذرت کر کے صرف کسی ایک کے ساتھ اپنا لنچ کھا لیتی ہے۔ ابتدا میں تو اُسے بے حد شرم آتی تھی۔ بھلا تمام ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ وہ خود کس طرح اپنا پیٹ بھر لیتی۔ مگر بار بار خالہ بی کے یہ سمجھانے پر کہ اُس کے خاندان کی بات ہی کچھ اور ہے اُسے بھی اپنے خاندان کی اہمیت کا احساس ہو چلا تھا۔ اُسے دلی آئے ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے۔ خوش قسمتی سے میڈیکل کالج میں داخلہ بھی مل گیا تھا۔ نجمی بھائی جان جو اُس کے کزن تھے وہ دو سال قبل ہی میڈیکل پاس کر کے امریکہ جا چکے تھے۔ اس خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے میڈیکل کالج پڑھنے کی ٹھانی تھی۔ اس لئے اس کی اہمیت خاندان میں ذرا یوں بھی بڑھ گئی تھی۔ پھر اُس کی موہنی صورت اور خود کو لئے دئے رہنے کے انداز نے اُس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش پیدا کر دی تھی۔ خالہ بی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ وقت پر کھانا کھانا صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ بھلا بھوکے پیٹ میں اُس کا شہابی رنگ پھیکا نہ پڑ جاتا۔

ممتاز خالو جان اور خالہ بی کی ہستی اس بڑے شہر میں

نہایت عجیب تھی ۔ مدنا اس خاندان کی پرواز کہاں تک
ممکن تھی؟ خاندان کے ہر فرد و بشر کا ٹیڑھا میڑھا کام بھی
یہاں سلیقے سے بانٹ کے چھوڑا جاتا۔ ممتاز خالوجان ہر اعتبار
سے ممتاز تھے۔ وہ صرف اپنی یونیورسٹی کے پروفیسر ہی نہیں تھے
بلکہ ہندوستان کے چند دانشوروں میں اُن کا شمار ہوتا
تھا۔ اُن کا گھر شاعروں کا ایک مکمل نمونہ تھا۔ خالہ بی بھی
کیسا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ پھر یہ کہ ممتاز خالوجان کا
دل بھی کتنا فراخ تھا۔ خدا نے اُن کو عزت، شہرت دولت
سب عطا کی ______ بس ایک اولاد نہیں،
تو پھر کیا ہوا۔ انھوں نے خاندان کے ہر بچہ کو ہی اپنی اولاد
سمجھ لیا۔ اُن کی بے پناہ محبت کسی ایک کے لئے مخصوص نہ ہوئی
تو ہر ایک ہی اُن کی محبت کا مستحق ہو گیا۔ خدا واقعی کارساز ہے
اس خاندان کی عزت افزائی اُسے منظور تھی سو اس حال میں
اُس نے پورا کیا۔ یہ بھی ٹھیک ہی ہوا جو اُن کی اپنی اولاد نہ
ہوئی ورنہ کیا وہ اپنے خاندان کے ہر فرد و بشر سے اتنی ہی محبت
کیا کرتے؟ کیا خالہ بی اُس کے لئے ٹفن کیریر میں اسی
طرح کھانا سجا کر بھیجا کرتیں یا وہ بھی اگر بہت خوش ہوتی تو
کالج کی تمام لڑکیوں کی طرح کینٹین میں جا کر چائے پی لیتی۔
مگر اُف! اب اُسے چائے سے کتنی نفرت تھی۔ وہ چائے
کے عوض صبح و شام ایک پیالی دودھ یا پھلوں کا عرق ہی پی
لیتی تھی۔ خالہ بی اُس کا خیال بھی کتنا رکھتی تھیں۔ آخر میڈیکل
کی پڑھائی ہے کچھ مذاق تو نہیں۔ ممتاز خالوجان بھی اُسے
کتنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے چاہنے یا نہ چاہنے کا کیا۔ وہ تو
ہر اپنے غیر سے بھی یونہی محبت کیا کرتے ہیں۔

شانو کے خیالات کی رفتار اُس کے کھانے سے بہت
تیز تھی ..... اور ..... اور ان کے اسٹوڈنٹس ـــــ اُن
سے تو اُسے نفرت تھی۔ سخت نفرت۔ اُن کی یہ بھیڑ بھاڑ
اُسے پھوٹی آنکھ نہ بھاتی۔ یہ تو جونک تھے بالکل جونک۔
سارا وقت ان کی جان سے چپکے رہتے۔ ممتاز خالوجان
کا سارا وقت تو وہی کھا لیا کرتے تھے۔ اور یہ لڑکیاں
کیسی ڈھیٹ ہیں جو گھر والوں کے سامنے ہی ہنس ہنس کر
کہتیں۔

"آپ کی اولاد تو ہم ہی لوگ ہیں نا سر؟ اور کون ہے
دوسرا؟ بس آپ کی کتابیں اور آپ کے شاگرد۔"

جیسے ممتاز خالوجان کے اور کوئی رشتہ دار ہی نہیں
بھلا ہم لوگ کیا لگے اُن کے۔ مگر ممتاز خالوجان بھی تو بُرا
نہیں مانتے۔ ہنس کر کہتے۔

"ہاں ٹھیک ہی کہتی ہو تم۔ تم ہی لوگ تو میرا سرمایہ ہو
اور میری عزت۔"

سوچتے سوچتے شانو کا جی جل گیا۔ اور وہ کم بخت
سائرہ کی بچی تو جب آتی سارے مکان میں اس طرح دندناتی
چلتی جیسے اُس کے ابو نے اُسی کے لئے تو بنوایا ہو یہ مکان

سیدہ خالہ کا موڈ ایک دم خراب ہو رہا تھا۔ گلنار آپا
مارکٹ جانے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنی کسی دوست
کو چائے پر بلایا تھا۔ اور اب وہ گل گلنار بنی اُس کی آمد کی
منتظر تھیں۔ جل بھن کر سیدہ خالہ اکیلے ہی مارکٹ جانے کو
تیار ہوئیں۔ چار بج چکا تھا۔ ماما ابھی تک چائے نہیں لائی
تھی۔ اب اس وقت کوئی چائے پئے بنا ہی کیسے نکل پڑتا۔
ڈھیروں سامان خریدنا تھا۔ آخر شادی بیاہ کوئی گڈے
گڑیا کا کھیل تو نہیں۔ وہ بھی ایک نہیں تین تین شادیاں
ممتاز خالوجان کی طبیعت کافی خراب تھی۔ انہیں دل
کے دورے پڑ رہے تھے۔ یہ اچانک ہی اس موذی مرض نے
انہیں پکڑا تھا۔ کسی وقت بھی اُن کی زندگی کی شمع گل ہو سکتی
تھی۔ ایسی حالت میں جلد شادیاں ہو جانا ہی اچھا تھا۔
سیدہ خالہ کو عجلت پڑی تھی۔ وہ اچھی خاصی وہمی بھی تھیں
ممتاز خالوجان کی دعاؤں کی چھاؤں میں نئی زندگی کا شگون

بھی نیک بخت ہوتا۔ سُنتے ہیں کہ نیک دل بزرگوں کی دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ پھر سیدہ خالہ اور اشرف ماموں کو آسانیاں بھی کتنی ہوجاتیں۔ شادی بیاہ کا آدھا خرچ تو ممتاز خالوجان ہی اُٹھالیتے۔ سارا ہنگامہ، ساری مہمان نوازی تو خالہ بی کے سر ہوتی۔ خالہ بی بھی کتنی عظیم ہیں کہ تمام وقت مہمانداری کرتے نہ تھکتیں۔ دل ہو تو ایسا۔ وہ تو خُدا بھلا کرے رحمت کا جو ممتاز خالوجان کی تیمارداری وہ اچھی کرلیتا ہے۔ ورنہ خالہ بی کو اتنی فرصت ہی کہاں ملتی۔ ایک بجمی بھائی جان تھے۔ جو ممتاز خالوجان کی چھوٹی موٹی بیماری پر بھی اُنہیں اپنے ہاتھوں سے دوائیاں کھلایا کرتے تھے، لیکن وہ بھی میڈیکل پاس کرتے ہی امریکہ چل دیئے۔ ہائے ممتاز خالوجان اُنہیں کتنا چاہتے تھے بالکل اپنے بیٹے کی طرح۔

گھر پر ایک ہنگامہ تھا۔ روز روز کے ہنگاموں سے بہت بڑا ہنگامہ۔ سامنے لان میں ایک وسیع شامیانہ کھڑا تھا۔ چاروں طرف قمقمے جگمگا رہے تھے۔ خوب صورت کپڑوں کی جگمگاہٹ میں ہر کوئی خوب صورت لگ رہا تھا۔ بارات آچکی تھی۔ ایک نہیں دو دولھے، دو دلہنیں۔ گھر والوں کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ خاطر تواضع میں کسی طرح کی کمی نہ ہو۔ مہمانوں میں کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ باراتی کم نہ تھے مگر یہ خالہ بی بھی کیسی زبردست انتظام کار ہیں جو ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پا رہا تھا۔ شانو بھیڑ بھاڑ سے بھاگ کر ایک اندھیرے کمرے میں دریچے سے کھڑی جھانک رہی تھی۔ جانے کیوں اُداسی اُس کے دل میں دندناتی گھُسی چلی آرہی تھی۔ بھاری کپڑوں کے بوجھ سے یا دولت و ثروت کے اس بے پناہ مظاہرہ سے۔ بہر حال وہ اس طرب ناک ساعت میں بھی اُداس تھی۔ جانے کیوں۔ تھک کر اُس نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں۔ جیسے ایک یُگ بیت گیا۔ اُسے اپنے اطراف میں ایک ہولناک سناٹے کا احساس ہوا۔

بینڈ پارٹی کی آوازیں مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہوگئیں۔ دو دُلہنیں دعاؤں کی چھاؤں میں رخصت ہوئیں۔ ویسے ہی شانو کو یاد آیا کہ سیدہ خالہ یا خالہ بی کسی نے بھی تو ذکیہ اور نسیمہ کو دُلہنیں بنا کر ممتاز خالوجان کو نہیں دیکھا۔ نہ ہی اُن کی دعاؤں کے لئے وہ اُن کے کمرے تک لے گئیں۔ وہ بے چارے تو خیر بستر سے لگے تھے۔ ڈاکٹروں نے انھیں نہ اُٹھنے کی سخت تاکید کی تھی اور اگر تاکید نہ بھی کیا ہوتا تو کیا وہ اُٹھ سکتے تھے؟ ..... اور ..... اور ...... اور شادی کے اِس ہنگامہ میں، دعوت و ضیافت کے اس طویل پروگرام میں اُن کا سادا کھانا بھی تیار ہوا تھا؟ اُنھیں دوائیں دی گئی تھیں؟ شانو کا ذہن ہر طرح سے اُلجھ گیا۔ وہ گرتی پڑتی ممتاز خالوجان کے کمرے تک پہنچی۔ وہاں منظر ہی عجیب تھا۔ ممتاز خالوجان مسہری سے گر کر زمین پر پڑے تھے۔ سرہانے میز پر رکھی دواؤں کی شیشیاں گر کر چور چور تھیں۔ رنگین دوائیں زمین پر بہہ کر کچھ عجیب نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے کسی ضرورت کے تحت اُٹھے تھے۔ سارے اس ہنگامہ میں آج کم بخت رحمت بھی چوک گیا تھا۔ جلدی سے شانو نے نبض ٹٹولی اور گھبرا کر زور سے چلّائی۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ ویسے ہی خالہ بی، سیدہ خالہ اور گھر کے بہت سے لوگ دوڑے آئے۔ مریضِ غم کی یہ بھاری رات گذر چکی تھی۔

صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی اور اس ملگجی صبح میں آسمان پر ایک تنہا اُداس تارا ٹمٹما رہا تھا۔ ——

ساجد رشید

پرانا چاول

گیند بجلی کی سی تیزی سے آکر بوڑھے بابوجی کی گنجی کھوپڑی سے ٹکرا کر اُچھلی اور فرش پر اُچھلتی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر رک گئی۔ بابوجی نے غصّے کو اپنے دُبلے پتلے وجود کے نہ جانے کن گوشوں میں دبا کر لال پیلی نظریں ربر کی چھوٹی سی گیند پر گاڑ دیں۔ اُنھیں باہر کوریڈور میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز قریب ہوتی محسوس ہوئی اور وہ اخبار پرے پھینک کر اُچھل کر صوفے سے اُٹھ گئے اور لپک کر گیند کو اُٹھا لیا۔ اتنے عرصے میں گڈو کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ بابوجی کے چہرے پر زلزلے کو بھانپ کر وہ نیکر سے ہاتھ رگڑتے ہوئے کبھی بابوجی کو ملتجی نظروں سے دیکھنے لگتا تو کبھی اُن کے ہاتھ کی پتلی پتلی اُنگلیوں میں دبی گیند۔

گڈو بابوجی کی چوتھی اور سب سے چھوٹی لڑکی امرتا کا چھ سال کا لڑکا تھا جو ہر اتوار کو اپنے ماموں اشیون کے گھر چھٹی گزارنے چلا آتا تھا۔ امرتا اُسے سنیچر کی شام کو لا کر چھوڑ جاتی تھی۔ گڈو بابوجی کے لئے ایک غیر متوقع ایٹمی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اتوار کا سارا دن گھر کے باہر چھوٹے سے کوریڈور میں تنہا کرکٹ کھیلتا رہتا تھا۔ اُس کی گیند کو بھی جیسے بابوجی سے عشق تھا کہ وہ ہر شاٹ پر بابوجی کے کمرے میں پہنچ جاتی تھی اور بابوجی اپنے بڑھاپے کو بھول کر گالیوں کی یلغار کر دیتے تھے۔ گڈو نے محسوس کر لیا کہ اب بابوجی اس کی تواضع گالیوں سے لیس کرنے والے ہیں اور بابوجی کا منہ کسی مشین گن کے دہانے کی طرح کھل گیا۔

"ابے سؤر کی ناک، کبھی تو چین لینے دے حرام خور کی روٹی ... ہر اتوار کو میری ...... ڈنڈا کرنے چلا آتا ہے کتے کمینے ... اسی طرح اور نہ جانے وہ کتنی گالیوں کے موجد بنتے چلے گئے۔ گڈو سہما سا چپ چاپ کھڑا اُنگلی ٹکر ٹکر بابوجی کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ غصّے میں آکر بابوجی نے اُسی گیند کو گڈو پر دے مارا مگر گڈو ایک ماہر کھلاڑی کی طرح جھک گیا اور گیند زن سے دروازے سے باہر نکل گئی، گڈو بھی دوڑ کر باہر نکل گیا اور بابوجی غصّے سے اینٹھتے ہوئے دوبارہ صوفے پر آکر بیٹھ گئے اور فرش سے اخبار کو اُٹھا کر زبردستی اُسے اُلٹنے پلٹنے لگے۔ بہو جو باورچی خانے میں تھی بابوجی کی گالیوں کو سن کر اُن کے کمرے میں چلی آئی اور گیلے ہاتھوں کو ساری کے پلّو سے پونچھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا ایسی کون سی آفت آگئی ہے جو آپ سارا گھر سر پر اُٹھا رہے ہیں۔ بے بی ابھی ابھی سوئی ہے اگر اُٹھ گئی تو پھر دوپہر کا کھانا کسی کو بھی نصیب نہ ہوگا۔"

"وہ سؤر کا بچّہ گڈو اُس نے تو آج میرا سر ہی پھوڑ دیا تھا اور اس پر تم کہتی ہو کہ میں سارے گھر کو سر پر اُٹھا رہا ہوں۔ ارے ... اب تو میں تین وقت کی روٹی کے لئے بھی تم سب پر بوجھ ہو گیا ہوں ... ارے یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے کہ

موت آ رہی ہے بہو۔"

باؤجی کی آواز بھرا گئی اور بہو پیر پٹکتی ہوئی بڑبڑاتی باورچی خانے میں چلی گئی۔ باؤجی کا منہ بدستور چلتا رہا۔ گالی تو وہ اس طرح بکتے تھے جیسے کچھ لوگ زور زور سے اخبار پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اُن کی عمر آنے والے چند مہینوں میں ستر سے تجاوز کر جانے والی تھی مگر ان کے بوڑھے شریر میں دن بدن ایک بچہ پھیل کر قابض ہو رہا تھا اور وہ اپنے شریر کے اندر کے بچے کی تسکین کے لئے بالکل بچوں جیسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ گڈو جیب میں ہاتھ ڈالے جب بھی اُن کے سامنے سے گزرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتے کہ گڈو کی جیب میں ضرور کھانے کی کوئی چیز ہے اور وہ اس وقت گڈو کو بڑے پیار سے بلاتے۔ اُن کا یہ پیار جو صرف اُن کی اکلوتی سفید اور بھورے چکتوں والی بلی کے لئے مخصوص تھا۔ تھوڑا سا گڈو کے حصے میں بھی آجاتا۔ گڈو ان کے اس پیار کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مگر نانا کا احترام اُس کے دل میں تھا۔ جو وہ ان کے قریب جاکر خود جیب سے جھجکتے ہوئے گاوی چنے پارلے کی ٹافی، مناکو کے بسکٹ یا اے ون کے کرکرے وغیرہ نکال کر باؤجی کی طرف بڑھا دیتا۔ اور وہ چاپلوس مسکراہٹ کو ہونٹوں پر چپکا کر لے لیتے۔ اور اس سے بلا وجہ ادھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔

دوپہر میں جب بہو اپنے کمرے میں سو رہی ہوتی تو وہ اپنی بلّی کی طرح باورچی خانے میں گھس کر ہر ڈھکے برتنوں کو کھول کھول کر دیکھتے کہ کہیں کوئی چٹپٹی چیز بہو نے اُن سے چھپا کر تو نہیں رکھی ہے۔ کچھ نہ ملنے پر وہ بے بی کے گلوکوز بسکٹ کے پیکٹ کو جو سب سے اوپر الماری پر رکھا ہوتا۔ ڈرائنگ روم سے اسٹول لاکر اُس پر کھڑے ہو کر دو چار بسکٹ پار کر جاتے اور بعد میں بہو اپنے شوہر اشون کے پیچھے پڑ جاتی کہ وہ چوہے مارنے کا جو زہر لاتا ہے اُس میں ذرا بھی دم نہیں ہے اور بسکٹ اُسی رفتار سے غائب ہو رہے ہیں۔ اشون چوہے مارنے کا زہر بنانے والی کمپنی کو گالیاں دینے لگتا کہ وناسپتی گھی کی طرح زہر میں بھی ملاوٹ ہونے لگی ہے۔ باؤجی بھی اشون کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنے طرز کی اونچی گالیاں چوہا مار زہر بنانے والی کمپنی کو دینے لگتے اور کہتے۔

" ارے اب تو ڈی۔ ڈی۔ ٹی کو چوہوں نے اپنے خون میں اتنا ضم کر لیا ہے کہ وہ اب اُن پر اثر انداز ہونے کے بجائے ٹانک کا کام دے رہی ہے اور اب چوہوں کی نسل خاصی تندرست پیدا ہو رہی ہے۔"

باؤجی کو اس عمر میں بھی فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اشون انھیں بیڑی وغیرہ کے لئے ہر ماہ تیس روپے دیا کرتا تھا۔ وہ اُن تیس روپیوں کو بچا رکھتے۔ اور جب بھی کوئی انگریزی فلم آتی جو صرف بالغوں کے لئے ہوتی اُسے ضرور دیکھتے۔ وہ بہو کے سنگھار دان میں سے روز چار آٹھ آنے کی رقم پر ہاتھ صاف کر دیتے اور ہفتہ بھر میں اُن کے پاس اتنے پیسے جمع ہو جاتے کہ وہ فلم بھی دیکھ لیں اور ساتھ ہی انٹرول میں تیز چٹنی کے سینڈوچ بھی کھا لیں۔ انگریزی فلمیں حالانکہ زبان کے اعتبار سے اُن کی سمجھ سے بالاتر ہوتیں مگر اُس میں لڑکیوں کے برہنہ اور نیم برہنہ جسموں کی نمائش اور ہیرو ہیروئن کے گرما گرم جذباتی لو سین جس میں ہیرو ہیروئن کے ہونٹوں کو پیپرمنٹ کی طرح چوستا یہ سب تو اُن کی مرضی کے عین مطابق ہوتا۔ کبھی کبھار تو ایسا اتفاق ہوتا کہ اُن کے بازو کی سیٹ پر کوئی عورت ہوتی تو ان کے اندر کا چھوٹا بچہ اُن کے شریر کے نجانے کس گوشے میں جا دبکتا، وہ اٹھارہ سال کے نوجوان کو اپنے اوپر غالب محسوس کرتے اور اُن کا ہاتھ دھیرے دھیرے بازو کی سیٹ پر بیٹھی عورت کے ہاتھ سے ٹکراتا اور اگر عورت اُن کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیتی تو وہ اور دلیری دکھاتے جس کے نتیجے میں انھیں کئی بار ذلیل ہونا

پڑھا تھا مگر عادتاً اس عادت یا اپنے اندر کے اٹھارہ سال نوجوان کے ہاتھوں مجبور تھے۔

وہ ہر روز شام کو اپنے کمرے سے نکل کر بلڈنگ کے صدر دروازے کے قریب ایک اوٹے پر بیٹھ جاتے، اور سڑک پہ سے گزرنے والی ہر عورت اور لڑکی کو گھورتے رہتے اُن کے جسم کے نشیب و فراز کا بغور معائنہ کرتے! جو لڑکی یا عورت اُنھیں بہت زیادہ بھا جاتی وہ نظروں سے دور تک اُس کا تعاقب کرتے اور نظروں ہی نظروں میں اُس کے ساتھ ہم بستر ہو جاتے۔

اُن کے ہاتھ میں اکثر مقدس کتاب "مہا بھارت" ہوتی۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے کہ اُنھیں مذہبی لٹریچر سے بہت لگاؤ ہے۔ حالانکہ انھوں نے مہا بھارت میں سے صرف وہ باب پڑھا تھا جو دروپدی سے متعلق تھا اور وہ اُس باب کو کئی مرتبہ دہرا چکے تھے۔ انھوں نے کئی بار یہ بھی سوچا تھا کہ وہ سادھو بن جائیں، اس طرح سینکڑوں عورتیں اُن کے پاس آشیرواد لینے یا اپنی کسی گتھی کا حل نکالنے ضرور آئیں گی۔ اُن کے گرد ہر وقت عورتوں کا جمگھٹا رہے گا کیوں کہ عورتیں مردوں سے زیادہ توہم پرست اور مردوں سے زیادہ سادھو فقیروں پر اعتقاد کرنے والی ہوتی ہیں۔ اُنھیں وہ سادھو اچھی طرح یاد تھا جو ان کے لڑکپن کے زمانے میں جوان عورتوں کو اپنے مجرے سے اولاد عطا کرتا تھا۔ اس سادھو کے کئی چیلے بھی تھے جن کے چال چلن اور جسم میں نسوانیت تھی سا تھیں) اس سادھو کا عیش بھی نہ بھولا تھا اُسے قصبے کی زمیندار برہمن عورتیں بڑھاپے سے بڑھیا پکوان لے کر خود سادھو کے حضور میں حاضری دینے آیا کرتی تھیں۔

"بابو جی کھانا!"

بابو جی نے چونک کر سامنے کھانے کی ٹرے لئے کھڑی رسونتی کو دیکھا۔ رسونتی تپائی پر کھانے کی ٹرے رکھنے کے لئے جھکی تو اُس کے بلاؤز کے کھلے گریبان میں بابو جی کی نظریں اُلجھ گئیں۔ رسونتی ٹرے رکھ کر کچن کی طرف جانے لگی تو بابو جی اُس کی کنواری کمر کے ایک ایک بل کو گنتے رہ گئے۔ رسونتی دو وقت کی روٹی، اُترنوں اور بیس روپیہ مہینہ پر گھر کے کام کاج کے لئے رکھی گئی تھی۔ اُس کی عمر پندرہ اور سولہ کے درمیان تھی۔ اُس کے جسم سے نوجوان اور شہوت پرست لوگ دور ہی سے جوانی کی مہک سونگھ سکتے تھے۔ اُس کا جسم سورج کی کمر دری اور تیز روشنی میں تپا ہوا وہ رنگ تھا جسے حاصل کرنے کے لئے یوروپین عورتیں چار چار گھنٹے سمندر کے کنارے دھوپ کی کرنوں میں خود کو تپاتی رہتی ہیں۔ رسونتی پر بابو جی کئی دنوں سے ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ کر رہے تھے مگر مناسب موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ رسونتی سے پہلے جو نوکرانی رحمت تھی اُس پر تو انہوں نے ایک رات شب خون مارا تھا مگر دوسرے ہی روز وہ اپنا حساب کر کے کسی سے کوئی شکایت بابو جی سے متعلق کئے بنا چلی گئی تھی۔

بابو جی دن بھر بیٹھے بیڑی پھونکا کرتے۔ پان کی گلوری اپنے تیس مضبوط دانتوں تلے روندا کرتے یا پھر دن بھر گھر میں آنے جانے والے مہمانوں کی گنتی اور باتھ روم میں فلش کتنی بار بجا اُس کا حساب رکھتے اور موقع ملتے ہی سب کے پیٹ کی خرابی پر لیکچر دینے کے بعد دوائیں تجویز کرتے یا پھر صوفے پر نیم دراز ہو کر ایک بہت پرانا "پلے بوائے" کا رسالہ (جو وہ اپنے بکس میں چھپا کر رکھتے تھے اور جسے انہوں نے فٹ پاتھ پر ردی بیچنے والے سے ایک روپیہ میں خریدا تھا) دیکھنے لگتے۔ ایسے وقت میں اُنھیں اپنی جوانی کے دنوں کی وہ راتیں یاد آجاتیں جب وہ پیشہ ور عورتوں اور فاحشہ قسم کی نوکرانیوں کے ساتھ مل کر عملی کوک شاستر بن جاتے تھے۔ اگر ایسے میں پڑوس کی مسز بھٹناگر کسی کام سے بہو کو پوچھنے آجاتی تو اُن کی پوری کوشش ہوتی کہ مسز بھٹناگر دیر تک اُن سے باتیں کرے۔

وہ مسز بھٹناگر سے بہت سی توقعات لگائے بیٹھے تھے۔ مسز بھٹناگر چالیس سال [illegible] بھی مگر عمر اُن پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اب بھی [illegible] کی [illegible] بھی مگر اس کا [illegible] خطوط بہت نمایاں تھے خود مسز بھٹناگر کو بھی [illegible] تھا۔ اسی لئے وہ ناف سے نیچے ساری یا [illegible] کا تنگ بلاؤز پہنتی تھی۔ مسز بھٹناگر کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں بھی بڑی سیکس اپیل تھی۔

"بابوجی!" مسز بھٹناگر کی مستی بھری کھنکتی آواز کو سُن کر بابوجی نے اخبار پرسے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو مسز بھٹناگر کو سامنے پایا۔ مسز بھٹناگر کی آواز نے جیسے اُن کی کھوپڑی پر گڈو کی [illegible] چوٹ کے احساس کو زائل کر دیا۔

"بابوجی آپ [illegible] سے ایک کام تھا۔"

"ہاں ہاں کہو کیا بات ہے۔" بابوجی نے بظاہر کام میں دلچسپی کا اظہار کیا مگر اُن کی دلچسپی کا مرکز تو مسز بھٹناگر کا جسم تھا۔

بعد میں مسز بھٹناگر نے جو کام بتایا وہ ششی کو پڑھانے سے متعلق تھا۔ ششی مسز بھٹناگر کی مجھلی لڑکی تھی۔ عمر کوئی گیارہ بارہ برس کے درمیان تھی مگر اُسے دیکھ کر بابوجی یہی سوچتے تھے کہ ماں بیٹی کو بنانے میں بھگوان نے شاید ایک ہی سانچہ استعمال کیا ہے! ششی گیارہ بارہ برس کے باوجود اپنے وجود میں اپنی ماں کی طرح چمکیلا اور پُرکشش جسم رکھتی تھی۔ مسز بھٹناگر کی بات کو بابوجی نے فوراً مان لیا اور وہ ششی کو بلا ناغہ پڑھانے لگے۔ گھر میں سب متحیر تھے کہ ششی کو پڑھاتے وقت بابوجی پر وہ جھنجھلاہٹ کا دورہ کیوں نہیں پڑتا جو اُنھیں پہلے کبھی گڈو کو پڑھاتے وقت پڑا کرتا تھا۔ امرتا نے کئی مرتبہ بابوجی کو گڈو کو پڑھانے کے لئے منانا چاہا مگر وہ صاف انکار کر گئے کہ گڈو بڑا نکما اور شریر ہے وہ اُسے نہیں پڑھا سکتے

بابوجی کی اس دلیل کے آگے امرتا کو بھی چپ رہ جانا پڑا۔

ششی کو بابوجی کے پاس پڑھتے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ وہ روز رات میں سونے سے پہلے ایک مرتبہ بابوجی کے پڑھائے ہوئے سبق اور سوال جواب کو ضرور دُہرا لیا کرتی تھی۔

"بس بھی کرو ششی گیارہ بج رہے ہیں۔ رکھ دو کتابیں اور چلو سو جاؤ۔" مسز بھٹناگر نے ششی سے کہا کیونکہ خود اُسے روشنی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور مسٹر بھٹناگر کے بزنس کے سلسلے میں مدراس جانے کی وجہ سے آج کل ششی اُسی کے ساتھ سوتی تھی۔

ششی نے کتابیں بٹور کر رکھ دیں اور لیمپ بجھا کر بستر پر دراز ہو گئی۔

رات کے کسی پہر مسز بھٹناگر کو ایسا لگا کہ کوئی اُن کے سینے کو دبا رہا ہے۔ وہ گھبرا گئی کہ کہیں پڑوس کا وہ نوجوان تو نہیں ہے جو اُسے بہت دلچسپی سے مسکرا کر گھورتا رہتا ہے۔ اور آج مسٹر بھٹناگر کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر ......
یہ سوچتے ہی اُس نے جھٹکے سے بیڈ کے قریب کے لیمپ کو روشن کر دیا۔ یہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا اور ششی بازو میں بڑے اطمینان سے سو رہی تھی اُس کے ماتھے اور اوپری ہونٹ کے اوپر پسینہ چمک رہا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بار بار کھل بند ہو رہی تھیں۔ــــ

P.T. Regd. No. 155
PHONE NO. OFF. 662 RES. 53
THE Aahang Urdu Monthly
Editor: KALAM HAIDRI
BAIRAGI, GAYA.

مدیر

کلام حیدری

محتویات

مزامیر

نظمیں

گوشۂ سجاد ظہیر

مضامین

افسانے

غزلیں

تبصرے

صراحیہ

بہار اُردو اکادمی کے خبرنامے (مئی) نے لکھا ہے کہ:

"اُردو کے فروغ کے لئے حکومت نے سہولتیں فراہم کیں اور اُردو والوں کے مطالبات پورا کرنے کے لئے ضروری حکم نامے جاری کئے —————"

اس خوش خبری کو ہم تک پہنچانے کی کوشش کرنے پر بہار اُردو اکادمی کو مبارک باد ملنی چاہیئے۔ مگر ہماری دقت یہ ہے کہ ہم "اُردو کے فروغ کے لئے حکومت نے سہولتیں فراہم کیں۔" والی بات سے ہرگز متفق نہیں ہو سکتے۔ بہار میں دو ہزار اُردو ٹیچروں کی بحالی کا جو اعلان عام چیف منسٹر نے مہینوں پہلے ایک کیبنٹ منسٹر کے یہاں ہونے والے استقبالیہ میں کیا تھا وہ آج تک جزوی طور پر بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ بہت سے ایسے پرائمری، پرنسپل اور دیگر اسکولوں کے اُن ٹیچروں کو جو کسی دوسرے مضمون کے ٹیچر تھے اُردو ٹیچر کا لقب دے دیا گیا اور اعداد و شمار تیار کر دئے گئے کہ اتنے اردو ٹیچر بحال ہو گئے۔ ڈیڑھ سو اردو والوں کی تعداد رکھنے والی آبادی میں ایک اردو ٹیچر دینے کا وعدہ اور اس کے اعلانات اُن وزیروں کی زبانی عام جلسوں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں جو اقلیت کے نمائندے سمجھے اور بنائے جاتے ہیں۔ لیکن عمل کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اُسے مسلم اقلیت دیکھ رہی ہے۔ کانگریس اور کانگریس حکومت کے ترقی پسند صاحبان اقتدار کے خلوص میں کوئی شک نہیں ہے، یہ اور اندرا گاندھی کی قیادت تک اقلیت کا اعتماد کانگریس کو حاصل ہے لیکن بہار میں اندرا گاندھی اور برواکی پالیسیوں پر عمل کرنے والے کانگریسی لیڈروں اور منسٹروں کی جس حد تک کمی ہے وہ مسلم اقلیت پر ظاہر ہے۔ اس لئے "حکومت نے سہولتیں فراہم کیں۔" سے ہمیں ہرگز اتفاق نہیں ہے۔ بہار اُردو اکادمی "وظیفہ خوار" کی حیثیت سے دعائیں دے سکتی ہے اور اُسے دینا بھی چاہیئے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہار کی وزارت تعلیم اُردو کے معاملے میں نہ فراخ دل ہے اور نہ کدورت سے پاک۔ بہار اُردو اکادمی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دعا سے آگے بڑھ کر حکومت بہار کو اُردو دوستی کی سرٹیفکیٹ عطا کرے۔ اکادمی پر اُردو والوں کا حق بھی ہے اور اردو والے اُس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ حقائق کی تلاش کرے اور عوام کے سامنے اُن حقائق کو رکھے۔

ہم بہار اُردو اکادمی کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ —————

"اُردو والوں کے مطالبات پورا کرنے کے لئے ضروری حُکم نامے جاری کئے۔"

چند حکم نامے ضرور جاری ہوئے ہیں۔ مرکزی حکومت اور بیس نکاتی پروگرام کے تحت اُردو والوں کے مطالبات پورا کرنے کے لئے سرکاری حکم نامے جاری کئے گئے ہیں۔ اندرا گاندھی اور بروا اور ترقی پسند طاقتوں کے دباؤ میں کس مجبوری اور بے کسی کے عالم میں یہ حکم نامے جاری ہوئے ہیں۔ یہ بھی اردو عوام کو معلوم ہے۔ اُردو عوام کو مرکزی کانگریس اور مرکزی سرکار کی پالیسیوں پر اعتماد ہے اُن کے خلوص اور اُن کے دلیرانہ اقدامات کی اُن کے دلوں میں قدر ہے۔

مگر —— ان حکم ناموں کا آنند مارگ کے ہمدرد، جن سنگھ، آر۔ ایس۔ ایس اور جماعت اسلامی کے
ن ے کس طرح قتل کیا ہے وہ بھی ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی "افسر شاہی" نے ملک کے ترقی پسند داخ
رزم، سوشلزم اور جمہوریت کے اصولوں اور آدرشوں کا کیا حشر بنا رکھا ہے یہ فائلوں اور آفس کے بیورو کریٹک
ی کی کارگزاریوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔
حکم نامے ہمارے دکھوں کا مداوا نہیں ہیں، اُن حکم ناموں پر عمل ہمارا علاج ہے۔ ہر جگہ —— کانگریس کے جلسے ہوں،
ن کی کمیٹیوں کے جلسے ہوں، دوسری ترقی پسند انجمنوں کے جلسے ہوں —— اُن سب میں مرکزی حکومت اور مرکز کے
پسند آدرشوں پر اعتماد کا اظہار ہوتا ہے اور صحیح ہوتا ہے لیکن ہر بار "حکم ناموں" پر عمل نہ کئے جانے کی شکایت بھی ہوتی ہے ——
افسروں کو ریٹائر بھی کرایا جا رہا ہے مگر اُس میں عمر کی قید ہے۔ کتنے ہے پرکاشی، آنند مارگ اور فسطائی انجمنوں سے
ریا بلا واسطہ تعلق رکھنے والے افسر، کلرک، اسٹینو، انجینئر، ڈاکٹر —— سرکاری ملازمتوں سے نکالے گئے ہیں؟
" آج زیادہ جاری کئے گئے ہیں، یہ بات سچ ہے مگر ان پر عمل پہلے بھی کم کیا گیا اور آج بھی کم کیا جا رہا ہے ——!
تو کیا ان باتوں سے بد دل ہو جانا چاہیے؟ تو کیا ایسے متعصب، رجعت پسند اور فرقہ پرستی کے شکار سیاست دانوں
روں کے آگے ہمیں سپر ڈال دینا چاہیے؟ نہیں ہمیں پوری مستعدی، حوصلے اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ کانگریس اور
ن حکومتوں کے اعلان شدہ آدرشوں کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔ کانگریس کے اندر اور باہر تمام ترقی پسند، سکولر اور
ٹ طاقتوں کو قوت پہنچانی چاہیے۔ یقین رکھیے اُردو کے حقوق ترقی پسند اور سوشلسٹ سماج ہی میں حاصل کئے
ے ہیں، یاد رکھیے اُردو کے حقوق حاصل کرنے کی لڑائی ملک کے دوسرے تمام ترقی پسند مقاصد کے حصول کا ایک جزو ہے
ں کا جانی، مالی اور تہذیبی تحفظ اُن کا حق تو ہے ہی خود ہمارے جنت نشان وطن کی ہمہ گیر ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔
اب تک کئی ریاستوں میں اُردو اکیڈمیاں قائم ہو چکی ہیں اور بعض دوسری ریاستوں میں قائم ہوں گی۔ اردو والوں کو
اور ہوشیار رہنا ہے کہ ان اکیڈمیوں کو خود غرضی، حصولِ دولت اور ناجائز اقتدار و ہوس کا اڈا نہ بننے دیں۔
ں شامل افراد سے اُن کے ضمیر کی سوگند دے کر مطالبہ کیجئے کہ احباب پروری، حلقہ بندی اور ذاتی منفعت کو اُردو اکیڈمیو
دور رکھیں۔ اکیڈمیوں کو سرکار سے جو گرانٹ ملتی ہے اُس کا صحیح مصرف کیا جائے۔ اُردو کی کتابیں چھاپنے اور علمی تحقیق
ں نکالنے سے زیادہ اُردو کی ترویج و اشاعت کریں۔ ترویج و اشاعت کرنے والے اداروں کی مالی معاونت

——————

—— کلام حیدری ——

گوشۂ سجّاد ظہیر

۷۰ ویں سالگرہ کے موقعہ پر

بنّے بھائی !

آپ کے نہ رہنے سے اُردو کتنی غریب ہو گئی ؟

آپ نے اُردو کو چالیس برسوں میں کتنا امیر بنا دیا تھا ؟

آپ کو صاحبِ نظر اور صاحبِ ضمیر کیا بھلا سکتا ہے ؟

بنّے بھائی !

آہنگ کا یہ شمارہ ۷۰ ویں سالگرہ پر نذرِ عفیدت و احترام کے طور پر قبول کیجئے ـــــــ آپ نے خلوص کی کب قدر نہیں کی اسی لئے جرأت ہو سکی کہ اتنا حقیر نذرانہ لے کر حاضر ہوا ـــــــ !

ـــــــ کلام حیدری

جمیل مظہری

قافلہ کدھر جائے؟

دریچے یادوں کے وا ہو رہے ہیں آج جمیل
بجھا بجھا سا ہے تخیل کا مزاج جمیل

رفیقِ فکر و نظر ساتھ میرا چھوڑ گئے
جو وعدہ ہائے رفاقت تھے اُن کو توڑ گئے

میں زندگی کے بیاباں میں آج اکیلا ہوں
اگرچہ ساتھ لئے حسرتوں کا میلا ہوں

ہرا تھا دل میں ابھی زخمِ ماتمِ پرویز
کہ دل پہ اور لگی غم کی اک سنانِ تیز

اگرچہ سخت تھی مخدوم کی جدائی بھی
مگر جہاں سے اُٹھے آج بنّے بھائی بھی

جرس خموش ہوا میرِ کارواں نہ رہا
کھڑا ہے راہ میں محمل کہ ساربان نہ رہا

میانِ راہ اگر راہبر کو نیند آئے
تو پھر سوال یہ ہے قافلہ کدھر جائے؟

فروغِ صورتِ نقشِ برآب آج بھی ہے
نمودِ عزم مثالِ حباب آج بھی ہے

ہوا تلاطمِ ذرّات اگر بپا بھی تو کیا
یہ دشتِ خواب بگولا کوئی اُٹھا بھی تو کیا

فنا کی زد میں ہے تقدیرِ رہبری اب بھی
ہوائے تیز سے بجھتی ہے روشنی اب بھی

یہی ہے حال کم و بیش ہر زمانے کا
چراغ گل ہوا آج اک سیاہ خانے کا

اِس اک چراغ کے بجھنے سے سو چراغ بجھے
کہ ذوقِ سوز بجھا، دل بجھے، دماغ بجھے

جو ہم قدم تھے جمیل اب وہ ہم سفر بھی نہیں
کہ [illegible] نہ رہا جب تو رہ گزر بھی نہیں

سید احتشام حسین مرحوم

فکر و عمل کا مخلص رہنما

آج مجھے بیس سال پہلے کی کچھ باتیں یاد آ رہی ہیں
سجاد ظہیر کو میں نے پہلے "بنے بھائی" ہی کی حیثیت سے جانا۔
یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی
تھی کہ میرے دور کے لیکن بنے بھائی کے بعض قریبی رشتہ داروں
کے یہاں نہ صرف ان کا بلکہ ان کے دوسرے بھائیوں اور
عزیزوں کا ذکر آیا۔ دیہات کی کسی قدر بجھی بجھی اور سست
رفتار فضا میں لکھنؤ میں رہنے والے پڑھے لکھے عزیزوں کا
ذکر ہوا کے خوشگوار جھونکوں کی فرحت پیدا کرتا تھا۔ تھوڑے
تھوڑے وقفوں کے بعد یہ ذکر صحیح غلط معلومات کے ساتھ
برابر آتا رہتا۔ کبھی معلوم ہوتا کہ بھائیوں میں سے کوئی
ولایت سے پڑھ کر واپس آیا ہے۔ کوئی تعلیم حاصل کرنے
کے لئے گیا ہے، کسی کو بڑی ملازمت مل گئی ہے۔ کوئی بیرسٹری میں
نام پیدا کر رہا ہے، کسی کی شادی ہوئی ہے۔ پھر ایک بڑا وقفہ
گزرا، اوروں کے ساتھ بنے بھائی کا ذکر کم ہوتا، تعلیم کی وجہ
سے میرا ربط بھی دیہات سے کم رہ گیا تھا اس لئے شاید میں
ان کے تذکروں سے بے خبر بھی رہنے لگا تھا۔ لیکن پھر جو
ان کا ذکر سنا تو ایک دوسرے ہی انداز میں۔ وہی عزیز جو
"بنے میاں" کا ذکر محبت اور فخر سے کرتے تھے ناگواری اور
نفرت سے کرنے لگے، نئی تعلیم پر جا و بے جا اعتراضوں کے
ساتھ اپنے بچوں اور قرابت داروں کو لامذہبیت اور
آزاد خیالی سے محفوظ رہنے اور شریف خاندانوں کی عزت
اور غیرت برقرار رہنے کی دعائیں مانگنے لگے۔ معلوم ہوا کہ
افسانوں کا کوئی مجموعہ "انگارے" شائع ہوا ہے جس کے
روح رواں سجاد ظہیر ہیں اور جس میں مذہب اور اخلاق
کی بیخ کنی کی گئی ہے۔

اس وقت میں الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم
تھا اور اپنے بہت ہی قدامت پسند ماحول کے باوجود تحریک
آزادی سے متاثر اور زندگی کے سمجھنے کا متمنی۔ میرے لئے اس
خبر میں گھبراہٹ، خوف اور ایک طرح کے چھپے ہوئے
جذبات کی آمیزش تھی۔ اس وقت تو یہ کتاب پڑھنے کو ملی نہیں
لیکن یہ خیال آزادی کی جدوجہد کے پس منظر میں ذہن میں جم
گیا کہ یقیناً یہ کوئی ایسی کتاب ہوگی جس سے برطانوی سامراج
کے مفاد کو بھی نقصان پہنچتا ہوگا۔ پوشیدہ خوشی اس بات کی
تھی کہ کتاب کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہے جسے میں نہ جاننے
کے باوجود اپنا عزیز کہہ سکتا ہوں۔ پڑھنے کی فکر یوں تھی کہ
دیکھوں افسانوں میں ایسی باتیں کس طرح لکھی جاتی ہیں جن کے
ممنوع قرار دینے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ غرض کہ شوق مطالعہ
اور جذبۂ آزادی کی امنگ نے "انگارے" اور سجاد ظہیر کے لئے
ذہن میں ایک جگہ پیدا کر دی۔

یونیورسٹی میں دو سال گزارنے اور ذہنوں کی وسیع تر دنیا میں

ے نکے بعد ایسی کتابیں پڑھنے اور ایسے لوگوں سے ملنے
ا اور تیز ہوگئی جن سے خاص طرح کے لوگ متنفر یا خوف
- چنانچہ بہت سا وقت سیاسی جلسوں، جلوسوں،
ں اور کتب خانوں میں صرف ہونے لگا۔ اور جب
دی شباب پر تھی، معلوم ہوا کہ جو لوگ پنڈت نہرو کے
، ہیں وہ سب کے سب اسی الہ آباد میں موجود ہیں، ان
اشرف، ڈاکٹر احمد، ڈاکٹر لوہیا اور سجاد ظہیر کے
یت سے لئے گئے۔ اپنی کم آمیزی کی وجہ سے میں فوراً
ا، لیکن ۱۹۳۵ء جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل
کٹر اعجاز حسین اور پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کے
ان سب سے ملنے کی راہیں کھل گئیں۔

زندگی کا طلسمی دور

پہلے پہل میں نے بنے بھائی کو ان کے والد سر وزیر حسن مرحوم
ہائی کورٹ جاتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت وہ ایک
ں میں ملبوس تھے اور ہائی کورٹ کے ایک وکیل معلوم ہوتے
ن چند ہی دنوں کے بعد ایک سیاسی جلسے میں وہ کھدر
ڈلیسی نظر آئے۔ اور پھر میں نے کبھی انھیں وکیل
یں نہیں دیکھا۔ ادبی جلسوں میں ملاقاتیں ہوتے
ریوان کی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں
فرانسیسی، فارسی اور اردو کی بڑی اہم کتابیں نظر
باتیں کرکے اندازہ ہوا کہ ان کا مطالعہ بے حد
ذوق ادب بے حد لطیف ہے۔ انھیں ہندوستان
لمی ادب، تہذیب اور تاریخ سے گہری دلچسپی ہے
ادب کا سر اونچا کرنے کی زبردست لگن انھیں بے چین

ا[illegible]ں کے دو ادبی جلسوں کی یاد آج بھی تازہ ہے
یں پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے عوامی تیوہاروں
اور لوک گیتوں پر ایک بڑی دل چسپ تقریر کی تھی اور اپنی
کتاب کویتا کومودی کے لئے نظمیں فراہم کرنے میں جن دشواریوں
کا سامنا ہوا تھا ان کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا تھا۔
دوسرا جلسہ وہ جس میں سجاد ظہیر نے اپنا ڈرامہ "بیمار" پڑھا
تھا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور تھا اور مجھے کچھ ایسا
محسوس ہوتا تھا کہ ہم زندگی کے کسی طلسمی دور میں داخل
ہو رہے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جو سیاسی جد و جہد اور خواب
آزادی سے ہم آہنگ ہے۔ اور اس نئی دنیا میں بنے بھائی کی
ذات ایک روشنی کے مینار کی سی نظر آتی تھی۔ ۱۹۳۶ء کا
ایک دل چسپ واقعہ یاد آیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو فیض پور کانگریس کے صدر منتخب
ہوئے تھے۔ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے انھیں اس کا وقت
نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنا خطبۂ صدارت لکھیں۔ صرف چند دن
رہ گئے تھے جب انھوں نے خطبے کی تکمیل کی۔ کانگریس
سیشن میں پانچ دن رہ گئے تھے۔ قریب قریب سطر دار
کے سترہ فلسکیپ سائز پر ٹائپ کیا ہوا خطبۂ صدارت انگریزی
میں چھپنے کے لئے دے دیا گیا۔ اور یہ طے ہوا کہ دو دن کے
اندر اس کا اردو اور ہندی ترجمہ بھی ہوا اور چھپ کر مل بھی جائے
تاکہ کوئی شخص اسے وقت پر فیض پور پہنچا دے۔ اردو کے ترجمے
کے لئے ڈاکٹر اشرف مرحوم اور ہندی کے لئے ہمارے موجودہ وزیر
اعظم لال بہادر شاستری کا انتخاب ہوا۔ جو اس وقت غالباً
لکھنؤ سٹی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر اشرف کی
طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے قرعۂ فال سجاد ظہیر کے نام پڑا
صرف رات بھر کا وقت تھا، صبح کو ترجمہ چھپنے کے لئے دینا تھا۔
بنے بھائی کو کسی طرح خیال ہوا کہ مجھے بھی مدد کے لئے ساتھ
لے لیں۔ چنانچہ وہ یونیورسٹی آئے۔ مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی
تو یہ پیغام چھوڑ کر چلے گئے کہ میں جلد سے جلد ان کے یہاں پہنچ
جاؤں۔ چنانچہ میں شام کو جب ان کے یہاں پہنچا تو صورت حال کا

رہے کہ جو آخری بات پھر بھی ترجمہ ختم کر لیا جائے۔ بنّے
بن اور ابو محمد (صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی
جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے) صفحات تقسیم
ہ۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب صبح کا دھندلکا
اس وقت ہم نے ترجمے کی آخری سطریں پوری کر لیں
کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ شاستری جی
دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے اور چونکہ وہ اردو سے
طرح واقف تھے اس لئے ہمارے ترجمے کے اوراق
دو رکھ کر ہندی میں لکھتے جاتے تھے۔ تیجے بھی
پنڈتوں کے یہ بنّے بھائی نے بتایا کہ پنڈت نہرو
کا ترجمہ بہت پسند آیا۔

ان دنوں بنّے بھائی نے انجمن ترقی پسند مصنفین
سلسلے میں بار بار الہ آباد سے باہر کے سفر کئے۔ لکھنؤ
فرنس کی جس میں مرحوم پریم چند نے صدارت کی تھی،
ن کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکا۔ کچھ ہی دن بعد
ب شمالی ہند کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس الہ آباد
جس میں پنڈت نہرو، آچاریہ نریندر دیو، جوش
، نرالا جی، رجے پرکاش نرائن اور بہت سے اہم
نے شرکت کی۔ یہ سب کچھ وہ اتنی لگن اور ایسے
نہماک سے کرتے تھے کہ ہم حیرت زدہ رہ جاتے
بلیغا کم آمیز ہوں اس لئے میں ایسے مواقع اکثر
ا، جب ان کے توسط سے ہندی، اردو، انگریزی
سری زبانوں کے ادیبوں سے ملنے میں آسانیاں پیدا
۔ یہاں تک کہ بنّے بھائی آہستہ آہستہ اس جدید
یل میں ایک مرکزی جگہ کے مالک ہو گئے اور وہ
لکھنے والے جنھیں تھوڑا بہت بھی ادب اور زندگی سے
ر تھا ان کے قریب آتے گئے۔ ان تمام باتوں کی
راد ان کی تصنیف "روشنائی" میں بڑے دلکش

انداز میں بیان کی گئی ہے، انھیں دہرانا مقصود بھی نہیں ہے،
صرف یہ کہنا ہے کہ ان کی ادبی صلاحیتیں، ان کا سنجیدگی سے
سوچ سوچ کر مسائل پر اظہار خیال کرنے کا انداز، ان کا دلکش
اسلوب نگارش، ان کا ادب اور سیاست کے رشتے پر زور
دینے کے باوجود ادبی نقطۂ نظر، یہ ساری باتیں ایسی تھیں جن
سے ان کے وسیع مطالعہ اور بیدار ذہن کا پتہ چلتا تھا جس
سے ہم سب کا متاثر ہونا فطری تھا۔

۱۹۳۸ء میں میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ بنّے بھائی کبھی کبھی
وہاں آتے تھے اور وہاں کی ادبی محفلوں میں جان ڈال دیتے
تھے۔ ان دنوں وہاں بھی تھے۔ ڈاکٹر علیم، پروفیسر احمد علی،
ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر، مجاز، سردار جعفری، سبط
حسن، حیات اللہ، سلمان احمد علی ان سے لکھنؤ کی ادبی گہما گہمی
اپنے عروج پر تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد بنّے بھائی کی شادی ہوئی اور
زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی
[illegible] سنا کہ بنّے بھائی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے
[illegible] دیئے گئے۔ جس کی یادگار ان کے خطوط "نقوش زنداں"
اور وہ چند مضامین ہیں جو انھوں نے "نیا ادب" کے لئے
جیل میں رہ کے لکھے۔

اس کے بعد سے کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ کہیں جم کر ایک جگہ
رہتے اور وہ جہاں بھی رہے میں ان جگہوں سے دور رہا، کبھی
بھولی بھٹکی ملاقاتیں، کبھی بھولے بھٹکے خط، یہی رشتہ رہ گیا،
لیکن اس زمانے کے علاوہ جب وہ پاکستان میں تھے کوئی وقت
ایسا نہیں گزرا کہ ان سے دوری محسوس ہوئی ہو۔ یہ ربط
کچھ تو رضیہ آپا کی وجہ سے قائم تھا اور کچھ ان کی علمی اور ادبی
سرگرمیوں کی وجہ سے جن سے میں ان کی عدم موجودگی کے باوجود
ان کی روح جھلکتی نظر آتی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کے
ادبی ارتقاء میں اپنی عملی اور تنظیمی صلاحیتوں سے جو روح
پھونکی ہے، اسے ادب اور خاص کر اردو ادب کا کوئی مورخ

(بقیہ صــــ)

اُپندر ناتھ اشک

ایک سُلگتی ہوئی یاد

جہاں تک مجھے یاد ہے سجّاد ظہیر کا نام سب سے
نے ۱۹۳۴ء میں سُنا تھا۔ اُن دنوں لاہور میں ترقی
نیوں کے ایک مجموعے "انگارے" کا بہت چرچا تھا۔
بنے بھائی کی پانچ کہانیاں تھیں۔

اُس مجموعے کی کہانیوں کا ہم لوگوں پر بہت اثر ہوا تھا
یا یہ کہوں کہ اُس سے اردو (اور ہندی) ادب میں حقیقت
کا آغاز ہوا تو غلط نہ ہوگا۔ یہ بھی یاد ہے کہ انھیں دنوں
ی کی کوششوں سے کل ہند ترقی پسند ادیبوں کی انجمن
پڑی تھی اور اس کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی جس
ت منشی پریم چند نے کی تھی اور تنظیم کے سکریٹری خود
بر چنے گئے تھے۔ لاہور میں بھی ترقی پسند ادیبوں کا ایک
گیا تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب میں مکالمہ نگار کی حیثیت سے
بمبئی سے وابستہ ہوا تو میں نے بال کیشور روڈ پر ان کے
لہ پر ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں حصہ لیا
اور اُن سے پوری طرح پر متعارف ہوا۔ میرے ذہن
۱۹ء سے پہلے کی کسی ملاقات کی تصویر نہیں ہے کمیونسٹ
دفتر (کھیت واڑی بمبئی) میں پارٹی کے اردو ہفتہ وار
بیٹھے ہوئے بنّے بھائی یا اپنے گھر میں ترقی پسند مصنفین
نشستوں میں شامل بنّے بھائی کی ہی تصویر محفوظ ہے۔

بمبئی کے ان دو برسوں میں اُن کے ساتھ جو وقت گزرا اُس کی
یاد آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔

میں ملاڈ میں رہتا تھا اور وہ چوپاٹی سے ذرا اوپر
بال کیشور روڈ پر رہتے تھے لیکن جب بھی اُن کے یہاں
کوئی میٹنگ ہوتی تو میں اُس میں ضرور شرکت کرتا۔ نشستیں
زیادہ طویل نہیں ہوتی تھیں۔ پندرہ بیس لوگ ہوتے تھے۔ علی
سردار جعفری، کیفی اعظمی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر،
مہندر ناتھ، ڈاکٹر صفدر آہ، غالباً وشوامتر عادل، بلراج
ساہنی اور چند دوسرے اصحاب۔ ادبی تخلیقات پڑھی جاتیں
گرم گرم بحثیں بھی ہوتیں لیکن بنے بھائی میٹنگ کو اس انداز
سے چلاتے کہ بحث حد سے آگے نہ بڑھتی، تلخی نہ آتی اور
عجیب بھائی چارہ کا احساس بنا رہتا۔ مجھے یاد ہے، میں نے
اپنی کہانی "کیپٹن رشید" اور اپنے ڈرامے "قید حیات"
"پرواز" اور "پکّا گانا" انہی نشستوں میں پڑھے تھے۔

بنّے بھائی نہ صرف بہت اچھی کہانیاں لکھا کرتے تھے
بلکہ انھوں نے اُردو میں سب سے پہلا ایک ایکٹ کا ڈرامہ
لکھا تھا۔ "بیمار کا علاج" میں نے اُسے پڑھا تھا۔ مجھے وہ
بہت پسند آیا۔ اُسے پڑھ کر مجھے بھی ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھنے
کی تحریک ملی تھی اور میں نے مسلسل ایک ایکٹ کے ڈرامے
لکھے تھے۔

۱۹۴۷ء ... کی بات ہے ان دنوں بمبئی میں

ت خطرناک قسم کے فسادات بھی ہو گئے تھے۔ ایک بار بنّے
ھوں نے مجھ سے کہا "اشک، اتنا بڑا حادثہ ہو رہا ہے
م کچھ نہیں لکھتے۔ تم ایک ڈرامہ لکھو۔ اُسے "اپٹا" اسٹیج
گا۔ بنّے بھائی کے اصرار میں کچھ ایسی دل کشی تھی کہ میں نے
ی بازار، لال بازار اور دوسرے علاقوں میں جا کر حالات کا
، لیا اور ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھا۔ میں نے اُسے خواجہ
باس کے گھر سمندر ترنگ (دادر بیچ) کی ایک نشست میں
۔ ڈرامہ سب کو بے حد پسند آیا۔ میں نے اُس کا کوئی
ا نہیں رکھا تھا۔ عباس نے ہی "طوفان سے پہلے" اُس
ان رکھا۔ بنّے بھائی نے اُس کا دیباچہ لکھا۔

مجھے اپنے گھر ایک دوپہر کے کھانے کی بھی یاد آ رہی ہے
بنّے بھائی، رضیہ بھابی، سردار جعفری اور اُن کے
دوستوں کو بلا رکھا تھا۔ جب ڈھائی بج گئے اور صرف
صاحب آئے، نہ سردار، نہ کیفی، نہ بنّے بھائی، نہ رضیہ
، تو میں اور کوشلیا بہت مایوس ہوئے۔ ہم انتظار سے
ساہو کر کھانا شروع کرنے والے ہی تھے تو میں نے کھڑکی
بنّے بھائی اور رضیہ بھابی کو تیز قدموں سے آتے دیکھا۔
ے بھوک کے جان نکلی جا رہی تھی۔ جب وہ آئے تو پسینہ
تے ہوئے انھوں نے بتایا کہ جوش صاحب آئے ہوئے
ور وہ اُن سے ملنے کے لیے گئے تھے اِس لیے باتوں
یر ہو گئی۔ کھانا کھانے کے بعد انھوں نے کہا کہ جوش
ب نے اُن کے کہنے پر حالاتِ حاضرہ پر دو نظمیں لکھی ہیں
ن گفتگو انھوں نے ایک بات کہی جس سے آج بھی میں متفق
اور میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے سیاسی اور ادبی رہنماؤں
ف بنّے بھائی ہی ایسا سوچتے تھے اور کر سکتے تھے۔ اُن کا
تھا کہ کوئی ادیب جو بے شک ترقی پسند ادیبوں کی
کا رکن نہ ہو اگر وہ کوئی ایسی چیز لکھتا ہے جو ہمارے
ے کی غمازی کرتی ہے اور ترقی پسند تجزیہ پر پوری اُترتی
ہے تو اُسے منظور کر لینا چاہیے اور اُس کی تعریف و توصیف
کرنی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنّے بھائی کی شخصیت میں
ایسی طاقت تھی کہ اپنے مخالفین سے بھی اپنے مطلب کی
چیزیں لکھوا سکتے تھے اور اُن کی تعریف بھی کر سکتے تھے۔

رضا مظہری

یادِ سجاد ظہیر

سجاد ظہیر نکتہ پرور نہ رہا
ہے سوگ میں شاعری سخن ور نہ رہا
بھٹکے نہ کہیں قافلۂ دانش و فن
جو راہ شناس تھا وہ رہبر نہ رہا

میں اُن سے بہت زیادہ نزدیک نہ تھا
باضابطہ ہم نوائے تحریک نہ تھا
پھر بھی وہ میرے ذہن کے گوشوں میں ہے
ان گوشوں میں گوشہ کوئی تاریک نہ تھا

فیض احمد فیض

رزم اور بزم کا ساتھی

بنّے کی شخصیت بڑی پہلو دار اور تہ دار تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنی جامع بھی تھی کہ بہت جلد ان کی حیثیت ایک معروف بے مثال اور صاحبِ امتیاز منظر کی ہوگئی۔

وہ ہمارے دور کے سیاسی، ادبی اور دانش ورانہ حلقوں کی ایک محبوب ترین اور مقبول ترین شخصیت تھے۔

صحافت کے علاوہ ادب میں بھی انھوں نے تحریروں کا اچھا خاصا ذخیرہ، کہانیاں، ڈرامے، نظمیں، تنقیدی مضامین یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی تحریریں قابلِ قدر ہیں لیکن انھوں نے عہدِ حاضر کی دانش ورانہ اور ادبی زندگی میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں ان میں ان کی نگارشات سے زیادہ ان کا اثر اور ان کی وجدان آفریں صلاحیت کو اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ اثر اتنا گہرا ہے اور اس قدر رچا بسا ہوا ہے کہ اسے الگ کرکے دیکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

انھوں نے کبھی اپنی دانش ورانہ یا نظریاتی عظمت کا رعب نہیں جمایا، دوسروں پر انھوں نے اپنی رائے نہیں مسلط کی سچ یہ ہے کہ میں جن لوگوں کو جانتا ہوں ان میں کٹر پن سے اتنا دور کسی کو نہیں پایا جتنا بنّے تھے۔

وہ بڑوں اور چھوٹوں سب سے برابر والے کی حیثیت سے بات کرتے تھے۔ [illegible] کے ساتھ سرپرستی کا برتاؤ [illegible] بڑوں کی دل آزاری [illegible] کرتے تھے۔ وہ [illegible] اور دوستی کے ذریعے حکمرانی کرتے تھے، مسکراہٹ سے دوسروں کو قائل کرتے تھے، دوستانہ مصافحے کے ذریعے متاثر کرتے تھے

لیکن اس ساری انکساری اور شرافتِ طبع کے باوجود وہ ارادے کے بڑے پکّے، بڑے پُرعزم اور اصولوں کے لئے بڑے استوار مجاہد تھے۔

دوستی میں، اپنے سیاسی یقین میں، اپنے ادبی اصول میں، اپنے طرزِ زندگی میں وہ بڑے ثابت قدم اور وفادار تھے

آج سب سے زیادہ اُن کی دائمی مسکراہٹ یاد آتی ہے جو اچھے وقتوں میں، بُرے وقتوں میں، خوشی کے لمحوں میں اور مشکلوں، مصیبتوں کے دنوں میں، ہر حال میں ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی تھی۔ اور پھر ان کی خوش گفتاری اور فیاضانہ شفقت و محبت یاد آتی ہے۔ جب وہ کسی محفل میں آجاتے تھے تو لگتا تھا وہاں ایک شمع روشن ہوگئی ہے

تخلیقات کے اختتام یا پشت پر اپنا پتہ صاف اور خوش خط تحریر کریں (ادارہ)

انور عظیم

بنّے بھائی کی آواز

یا پھر یوں کہیے۔ آئیے۔ گھر ہی سے شروع کریں
جہاں بنّے بھائی کی زندگی کی جڑیں پیوست تھیں۔ کیا بتانے
کی ضرورت ہے کہ لکھنؤ کے سرو زیر جس کے چشم و چراغ میں سب سے
روشن چراغ بنّے بھائی تھے، لیکن ذرا دیکھئے فرزندانِ ارجمند
کہاں سے کہاں پہنچے اور بنّے بھائی کہاں رہ گئے! ایک دولت
مند اور با اثر خاندان میں جس کے پاس "سب کچھ" ہو مسند
و قالین سے سجائی ہوئی گدے دار زندگی بنّے بھائی کی دسترس
میں تھی۔ آپ جانتے ہیں بہت سی اونچی اور لچکیلی کرسیاں
بھی تھیں۔ اور دنیا نے دیکھا کہ بہت سے ٹھگنے قد کے لوگ، جو
بنّے بھائی کی دسترس میں تھی۔ آپ جانتے ہیں بہت سی اونچی
اور لچکیلی کرسیاں بھی تھیں۔ اور دنیا نے دیکھا کہ بہت سے ٹھگنے
قد کے لوگ، جو بنّے بھائی کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے، پہلی فرصت
میں پھلانگ کر ان کرسیوں پر بیٹھ گئے، بنّے بھائی کی شخصیت
دل کش تھی۔ قد بہت اونچا تھا اور آنکھیں روشن ایسا تو
ہو نہیں سکتا کہ یہ چمک دار اور آرام دہ کرسیاں ان کو
نظر آئی ہوں۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ باقی سب تو ان کرسیوں
پر جلوہ افروز ہوئے مگر بنّے بھائی نہیں بیٹھے۔ بنیادی فرق
یہیں سے شروع ہوتا ہے اور یہیں سے ان کی انفرادیت کے نقوش
ابھرنا شروع ہوتے ہیں۔

انھوں نے ایک انقلابی پرچم اٹھایا اور ایسا کرکے
خلعت و کمخواب سے انکار کردیا۔ ظاہر ہے، ان کی بوبو (اپنی
ماں کو وہ اسی نام سے پکارتے تھے) کو جو پرانے زمانے
کی ایک سیدھی سادی اور بھولی بھالی خاتون تھیں۔ اس بات
پر کافی حیرت ہوتی تھی کہ عجیب تماشا ہے "جیل تو جائے بنّے،
دکھ تو اٹھائے بنّے، ملامتیں تو سہے بنّے"، مگر زندگی کی
ساری نعمتیں ڈھیروں جاکے گریں اور بیٹوں کے دامن میں۔ یہ
بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کے بنّے نے اس وقت کی
زندگی کے آگے دامن نہیں پھیلایا تھا جو آستین چڑھا کر اپنے
وقت کے پیکار میں شامل ہوتے ہیں ان کے دامن تار تار ہوتے
ہیں اور گریباں چاک، ان بے چاری کو کیا معلوم کہ زندگی
کی سچائیاں کتنی تلخ اور تاریک ہیں۔ ان کا بیٹا کوئی سرکاری
عہدیدار نہیں بنا، اس نے کبھی کینہ پروری اور حرام خوری کی
کمین گاہ میں پناہ نہیں لی۔ اس نے کبھی فرماں روائے وقت
کی خوشنودی کے لئے قصیدہ خوانی نہیں کی۔ زندگی کی نعمتوں کے
لئے چھین جھپٹ اس کا شیوہ نہیں رہا۔

جب وہ زندہ تھے تو میں نے بہت سی باتوں کے بارے
میں نہیں سوچا۔ لیکن اب ان باتوں کا خیال آتا ہے، ذہن فلمی
پردے کی طرح روشن ہوجاتا ہے، بنّے بھائی نت نئے روپ
میں اس پردے پر ابھرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔ وہ پارٹی
کے اخبار کے دفتر میں، آصف علی روڈ پر اپنے کمرے میں

بیٹھے ہیں، ان کے موٹے ہونٹوں میں سگریٹ جل رہی ہے، ان
کے بنیان کو پسینہ شرابور کئے دے رہا ہے۔ لگتا ہے دوپہر کا سورج
چھت پر گر پڑا ہے۔ مگر وہ گرمی، شور، گھٹن، پسینے اور بھوک
ہر چیز سے بے نیاز ہیں، میز پر گرد آلود اخباروں اور کتابوں
کا ڈھیر ہے اور ان کا قلم چل رہا ہے (یہی وہ دفتر ہے جس کو
جن سنگھ کے جلوس نے جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینے کی کوشش
کی تھی اور بنے بھائی محض اتفاق سے بچ گئے تھے) ہاں تو وہ
وہاں بیٹھے ہیں اور پارٹی کے ہفتہ وار کے لئے اداریہ لکھ رہے
ہیں۔ اس وقت وہ ہیں اور ان کا قلم اور صرف ایک خیال کہ
سماجی ناانصافی، غم اور الم کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔

جب کام ختم ہو جاتا ہے تو ہم ایک اندھیرے گھٹے ہوئے
دھوئیں سے بھرے ہوئے تہ خانے میں جاتے ہیں جس کا نام ہے
ریسٹوران۔ ہم چائے کے پیاسے ہیں۔ اسی لئے ہم اسے پیاس
نہیں بلکہ چیاس کہتے ہیں۔ چائے، جو ایک قسم کا کاڑھا ہے
دن بھر کی تھکن کے بعد بہت اچھی لگتی ہے۔ ہم مزے میں آجاتے
ہیں، بنے بھائی جنھیں تھکن بھی نہیں تھکاتی، شاعری کی باتیں
کرتے ہیں، حسن و رعنائی کی باتیں، ستاروں بھرے آسمان اور
چاندنی راتوں کی باتیں، دلوں میں طوفان اٹھانے والی ادا
اور عشق و محبت کی باتیں، درد و سوز و ساز اور الجیریا کے
قتل و خون کی باتیں اور جنوبی افریقہ میں لوگوں کی غارت گری
اور انسانیت سوزی کی باتیں۔ لگتا ہے ان کی تہذیبی بصیرت
نے آفاق کا احاطہ کر لیا ہے، ایک ادبی اور تہذیبی شخصیت
کے ساتھ گذاری ہوئی شام انسان کو کیا کچھ دے جاتی ہے۔

یہ شام اور بہت سی شامیں!

اب بھی، برسوں بعد، میں لکھنؤ پارٹی کمیون کی
چھت پر، جاڑے کی دھوپ میں بنے بھائی کو دیکھ رہا ہوں۔
کالی اچکن میں ان کی شخصیت دمک رہی ہے، چہرہ جوان ہے
درخشاں، وہ صبر اور تحمل سے لکھنؤ میں قوم پرست مسلمانوں کی
کانفرنس کا تجزیہ کر رہے ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد نے
بلائی ہے، یہ زمانہ ہے ۱۹۴۶، ۴۷ کا۔ دھوپ سے نہائی
ہوئی چھت پر ڈاکٹر اشرف اور بہت سے دوسرے رہنما بھی
موجود ہیں۔ سب دیدہ ور، سب تیشہ بدست!

پھر اسی روز سہ پہر کو بنے بھائی گنگا پرشاد میموریل ہال
میں کھڑے ہوئے ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے انجمن ترقی پسند
مصنفین کی تحریک پر جو حملے کئے ہیں، بنے بھائی کو ان کا جواب
دینا ہے، حیات اللہ انصاری کے حملے ترقی پسند ادبی تحریک
پر کم اور کمیونسٹ نظریۂ حیات اور طریقۂ کار پر زیادہ تھے۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے بنے بھائی کو ادبی مجادلے
میں اپنا رول دھیمے مگر فیصلہ کن انداز میں کرتے دیکھا۔ سوال
یہ نہیں ہے کہ ترقی پسند ادیب شاہکار نہیں لکھ رہے ہیں، یا
جو لوگ شاہکار لکھ رہے ہیں ان کو نظر انداز کر رہے ہیں جو
شاہکار لکھ رہے ہیں ان کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ سوال
یہ ہے کہ ادیب، جو ایک باشعور شہری بھی ہے اپنے سماجی شعور
اور تاریخی آدرشوں کے فنی اور جمالیاتی اظہار سے انسان کو ایک
نئی زندگی کی جھلک دکھاتا ہے یا نہیں جس میں سماجی ظلم و ستم
نہ ہو، جس میں انسان انسان کی طرح جینے کے حق سے محروم نہ ہو
ظاہر ہے اس نئی دنیا کے تصور میں فرق ہوگا اور اس تصور کو
زندہ حقیقت بنانے کے طریقوں میں بھی۔ لیکن یہ فرق نہیں
ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے سے کیسے روک سکتا ہے۔ اس
کے بعد یہ تحریک کتنے پیچ و خم سے گذری ہے سب جانتے ہیں
اور آج تحریک کس موڑ پر ہے، یہ بھی!

اس کے بعد بنے بھائی غائب ہو گئے، سب جانتے
ہیں کہ جب وہ پاکستان کی غیر قانونی پارٹی کے سکریٹری بنے
تو ان پر کیا بیتی۔ ان کے ساتھیوں کو کس طرح پاکستان کے
حکمرانوں نے توڑنے اور ختم کرنے کی کوشش کی۔ کس طرح راولپنڈی
سازش کے جھوٹے جال میں بنے بھائی اور فیض کو پھانسا گیا

اور وہ کس طرح پھانسی کے ماحول میں زندگی گزارتے رہے اور اس عالم میں بھی میر کی شاعری کے نازک پہلوؤں پر روشنی ڈالتے رہے۔ اور شمس راج رہبر جیسے "رہبروں" کو جن کو کلاسیکی ادب کو انقلاب دشمن ورثہ ثابت کرنے کی دھن تھی۔ راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے وہ نوجوان ادیبوں کو پڑھتے، ان کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتے رہے ان ہی ادیبوں میں، میں بھی تھا۔ جو انھوں نے پاکستان کی قید سے رہا ہونے کے بعد ونڈسر پلیس میں پہلی ہی ملاقات میں بتایا۔ ان کو ان افسانوں کے عنوان تک یاد تھے۔ جو انھوں نے جیل میں پڑھے تھے۔ یہ ہماری گہری رفیقانہ وابستگی کا آغاز تھا۔ حالانکہ ہماری عمر میں کوئی بیس سال کا فرق تھا۔ ہم بحیثیت ادیب ایک ہی آدرش رکھنے کے باوجود، ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اپنے فنی رویوں میں بھی اور اپنے زمانے کی حقیقتوں کے تجزیوں اور زندگی کے تجربوں میں بھی۔ بعض مرتبہ ہم بعض باتوں میں سخت اختلاف کرتے، ہم الجھتے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بنے بھائی نے میرے دلائل کی طرف بے صبری یا ناروا داری کا رویہ اختیار کیا ہو۔ ایک بار صرف ایک بار ایسا ہوا کہ ان کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، اور میں بہت محظوظ ہوا۔

بنے بھائی کو ایک فکر تھی۔ جوان زندگی کا مشن تھا۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کو ماضی کی انتہا پسندیوں کے بحران اور انتشار سے نکالنا چاہتے تھے، بدترین حالات میں بھی انھوں نے ٹیگور اور اقبال دشمنی کے خلاف آواز اٹھائی۔ بدترین سے بدترین حالات میں بھی انھوں نے پرفریب دانش ورانہ ماضی پرستوں کے خلاف آواز اٹھائی، جن کا انجام فاشزم کا عروج ہو سکتا تھا، اور ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس نقطے کو نمایاں کیا جہاں بائیں بازو کی انتہا پسندی اور دائیں بازو کا تعصب دونوں مل جاتے ہیں۔

تلخ سے تلخ اور سخت سے سخت نظریاتی جدوجہد میں بھی ان کی گفتگو منطقی رہتی۔ ظاہر ہے وہ اپنی گفتگو کی نظریاتی بنیاد کو نظر انداز نہ کرتے۔ لیکن ان کی گفتگو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ گفتگو ہوتی تھی، وعظ اور تقریر نہیں۔ ہاں ایک بار ایسا ضرور ہوا کہ سرور نے ساہتیہ اکادمی کے سیمینار میں لینن کے بارے میں اپنے بلیغ تصورات کو تھوپنے کی کوشش کی تو بنے بھائی کی آواز میں ارتعاش پیدا ہوا۔ مرولہ تازہ تازہ اور جرات لوٹے تھے۔ بنے بھائی نے اپنے نظریاتی حریف سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہ خوبی ان کی شخصیت کی بقا پر نرم نیام میں تلوار کی طرح محفوظ رہی، زنگ نا آشنا۔

انھوں نے نظریاتی جنگ میں اپنی سپہ گری کے جوہر دکھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، کبھی شکست نہیں مانی، کبھی ہتھیار نہیں ڈالے اور جب موت ان پر بازی لے گئی اور جب ان کے جسدِ خاکی کو جامعہ ملیہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا تو ان کے آبدیدہ دوستوں نے اپنی نظروں سے اوجھل وفادار دوست اور قافلہ سالار کے بارے میں سوچا۔ کسی نے کہا " کوئی جئے تو اس طرح جئے اور مرے تو اس طرح مرے"۔

بنے بھائی زندگی کے گھنے اور تاریک جنگل سے گزرتے ہوئے نقش پا چھوڑ گئے، خوف نے کبھی ان کے قدموں میں لغزش نہیں پیدا کی۔

وہ آخر تک کہتے رہے:

"زندگی کے پیالے میں غم کی شراب ہو یا نشاط کی، مزا جب ہے، جب اس کی بوند بوند گلے سے اتار لو!"

یہ بنے بھائی کی آواز تھی۔ اور اب جب وہ خاموش ہیں ان کی آواز اسی طرح گونج رہی ہے۔

———

سیّد احمد ہاشمی

ایک بڑا دانشور

واقعات تو ذہن کے گوشوں میں چھپے رہتے ہیں اور کریدنے پر یاد آجاتے ہیں [illegible] کے معاملہ میں ہمیشہ کچا رہا ہوں۔ اس لئے متعین طور پر تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ سجاد ظہیر مرحوم کو کب سے جانتا ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ ادب اور زندگی کے باہمی تعلق اور ان کے درمیان رشتوں کے بارے میں جب کبھی کوئی سوال زیر بحث آیا تو سجاد ظہیر مرحوم کی شخصیت نقیب اور داعی بن کر بار بار سامنے آئی۔ سیاسی حیثیت سے کم اور ادبی حیثیت سے [illegible] سجاد ظہیر مرحوم کو پڑھنے کا موقع ملا۔ البتہ پا[illegible] سی نشیب و فراز میں جب ان کا نام نام نہاد راولپنڈی سازش کیس کے سلسلہ میں سامنے آیا اور فیض احمد فیض کے ساتھ مرحوم بھی پاکستانی استبداد کے آہنی شکنجہ میں کسے گئے تو وہ پہلا موقع تھا جب میں نے انھیں سیاسی حیثیت سے بھی جاننے کی کوشش کی۔

غالبًا ۱۹۵۰ء کے بعد کی بات ہے۔

یہاں ہندوستان میں کلکتہ کے پارک سرکس میں پیس کونسل کا اجلاس ہورہا تھا۔ اس کے آخری روز ایک کل ہند مشاعرہ کا بھی پروگرام رکھا گیا تھا۔ ہندوستان کے ترقی پسند شعراء وادیب اس میں شامل تھے۔ کرشن چندر، سردار جعفری، نیاز حیدر، اسرار الحق مجاز وغیرہ سب اس وقت موجود تھے۔ مرحوم سجاد ظہیر کی اہلیہ رضیہ اس مشاعرہ کے لئے فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کی تازہ غزلیں اور نظمیں ساتھ لاکر شریک مشاعرہ ہوئی تھیں۔ مشاعرہ میں شریک کسی شاعر نے ان دونوں کا کلام سنایا تھا۔ سامعین میں سے ہر ایک تاثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک شعر اب بھی حافظہ میں محفوظ ہے

جانے کیا رسم ہے اب اہل وفا کی اے دل
رسم دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

بہرحال اختتام پر ایک زوردار تجویز منظور ہوئی جس میں ان دونوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ قرارداد میں حکومت پاکستان کے جبر و زیادتی و مظالم کی مذمت بھی کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا موقع تھا جب کہ سجاد ظہیر مرحوم کا نام بڑی اہمیت کے ساتھ میرے سامنے آیا۔

غالبًا ۵۸ — ۱۹۵۰ کی بات ہے۔ جب کہ کلکتہ سے ہفت روزہ "ارمغاں" میری ادارت میں شایع ہورہا تھا۔ مرحوم سجاد ظہیر ان دنوں کلکتہ آئے تھے اور "ارمغاں" کے دفتر میں بھی تشریف لائے تھے۔ وہ بہت دیر تک ہمارے ساتھ رہے۔ اب تک میں نے دور سے سجاد ظہیر کے متعلق پڑھا اور سنا تھا۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جبکہ مرحوم سے باتیں کرنے اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا۔

یہ اور بات ہے کہ ان کے اور میرے نظریات میں بہت سے بنیادی اختلافات تھے مگر یہ صحیح ہے کہ ان اختلافات کے باوجود ان کی متانت، سنجیدگی، شرافت اور

ہر حالت میں دوسروں کے خیالات کا احترام کرنے کی ان کی عادت نے میرے دل میں ان کی عزت بڑھا دی۔

شاید مزاج کا یہی رنگ تھا جس کی وجہ سے مرحوم اپنی زندگی کے آخری ایام تک ہر ادبی و سیاسی مجلس کی جان بنے رہے۔ اور ہر ایک سے ان کے روابط مخلصانہ اور دوستانہ رہے۔

مرحوم کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے خلوص، بے ریائی، ملنساری، تہذیب، شرافت و شائستگی کے بارے میں کوئی شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نہایت باحوصلہ انسان اور نہایت باضمیر سیاست داں تھے، اپنے سیاسی نظریات سے ان کی وابستگی نہایت پختہ اور معاشی و سماجی مسائل پر ان کی رائے ان کی بصیرت کی آئینہ دار تھی۔ اپنی گوناگوں اور متنوع صلاحیتوں کے باعث وہ ہر شخص کو متاثر کر دیتے تھے اور اس کے دل میں اپنے لئے جگہ بنا لیتے تھے۔ ان کے کٹر مخالف بھی ان کے شریفانہ اوصاف کے معترف تھے، وہ زندگی کی صحت مند قدروں کے نمائندہ اور مظہر تھے۔ برصغیر کی آزادی اور ترقی پسندی کی تحریک کے ایک نہایت بیدار مغز اور باشعور رہنما تھے۔ بلکہ ترقی پسند تحریک بانیوں میں تھے۔ وہ ایک بڑے دانشور تھے۔ دنیائے ادب و شعر میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی ادب و معاشرہ میں صحت مندانہ قدروں کو اجاگر کرنے میں بسر کی۔ انتہائی مشکل و صبر آزما حالات میں بھی انھوں نے سوشلزم، سیکولرزم، جمہوریت اور انسان دوستی کا پرچم بلند رکھا۔ ایک ایسے انسان کی یاد کو تازہ کرنا اور تازہ رکھنا انسانی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے اور ملک میں ترقی پسندانہ رجحان کو جارحانہ فرقہ پرستی اور فسطائیت کے مقابلہ میں تقویت پہنچانے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

بقیہ: فکر و عمل کا مخلص رہنما

نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ پندرہ سال پہلے میں نے ان پر ایک مضمون لکھتے ہوئے حسب ذیل جملے لکھے تھے۔ آج بھی ان یادوں کو انہیں جملوں پر ختم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کی صداقت آج بھی ماند نہیں ہوئی ہے۔

میں نے لکھا تھا:

"ہندوستان اور پاکستان کی ترقی پسند ادب کی تحریک کو جس فرد واحد کی تنظیمی اور ادبی صلاحیتوں نے سب سے زیادہ آگے بڑھایا وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی تحریکوں اور اداروں کو بھی افراد کی رہنمائی اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے (حالانکہ افراد کی طاقت جماعت ہی سے حاصل ہوتی ہے) اس لئے ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے، اس پر مضبوط عمارت کھڑی کرنے، عمارت کو آراستہ کرنے، اس کے بسنے والوں میں اس کی محبت اور حفاظت کا جذبہ پیدا کرنے اور اس کے حدود میں اضافہ کرنے کا کام زبردست تعمیری صلاحیت چاہتا ہے۔ جب اس میں سجاد ظہیر کے دوسرے سیاسی اور علمی کارناموں کو جوڑ لیا جائے تو ان کی شخصیت کا وہ خاکہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے جس سے فکر و عمل کے ایک مخلص رہنما کے خط و خال بنتے ہیں۔"

سوہن سنگھ جوش

روشنی اس کی سنبھال کر رکھو

سید سجاد ظہیر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۴ء کے دوران امرتسر میں ہوئی۔ ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی اس وقت خلافِ قانون تھی اور وہ مجھے "انڈر گراؤنڈ" طور پر رام باغ امرتسر میں رات کے وقت ایک درخت کے نیچے ملے۔ میں نے انھیں پارٹی کی پنجاب یونٹ اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تاکہ وہ پارٹی سنٹر کو ہمارے کام کی رپورٹ دے سکیں۔

اس وقت ہمارے انچارج کامریڈ محمود الظفر دائس پرنسپل ایم ایم کالج امرتسر میں تھے اور کامریڈ سجاد ظہیر، سید محمود الظفر اور ان کی شریک زندگی رشیدہ جہاں کے دوست تھے اور ان کے پاس ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ میں محمود الظفر سے بھی راتوں ہی میں ملا کرتا تھا۔ ان سے پارٹی کے کام کے متعلق مشورہ لیا کرتا تھا۔ اور پارٹی کی سرگرمیوں کی رپورٹ دیا کرتا تھا۔

سید سجاد ظہیر ایک دولت مند اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کا خاندان سرکار پرست تھا اور برطانوی راج میں ان کے بھائی اور دوسرے رشتہ دار بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ آزادی کے بعد بھی ان کے ایک بھائی وزیر بنے تھے۔ سجاد ظہیر بھی آئی۔ سی۔ ایس بننے کے لئے لندن گئے ــــ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے دوسرے رشتہ داروں کی طرح آئی سی ایس بن کر برطانوی راج کے حصہ دار کی حیثیت سے ہم پر راج کرنے کی خواہش لے کر گئے ہوں لیکن وہ جب وہاں پہنچے اور مختلف ملکوں کی آزادی کی تحریکوں کا مطالعہ کیا تو وہ ان تحریکوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ ایسی کتابیں ہندوستان میں نایاب تھیں اور خاص کر مارکس ازم اور لینن ازم تو ہم ہندوستانیوں کے لئے شجرِ ممنوعہ تھے اس لئے ان کا ہندوستان میں دستیاب ہونا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن خود انگلینڈ میں مارکسزم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہاں یہ سب کتابیں ملتی تھیں۔ ان بڑے گھرانے کے لوگوں کو جو آئی سی ایس، آئی پی ایس بننے کے لئے گئے تھے برطانیہ عظمیٰ کی کیمونسٹ پارٹی نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ ان نوجوانوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ انگلینڈ میں کیمونسٹ پارٹی ہے جو کہ ہندوستان میں مکمل آزادی کے لئے لڑ رہی ہے اور برطانوی سامراج کے راج کو ختم کرکے ہندوستانیوں کا اپنا راج قائم کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ ان نوجوانوں نے رجنی پام دت سے ملنا شروع کیا۔ اسی طرح مارکسزم آہستہ آہستہ ان کے ذہنوں میں جڑیں پکڑتا گیا اور انھیں یہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان کی غلامی دور نہیں ہوتی۔ ہندوستان نہ تو معاشی، سیاسی اور تہذیبی میدانوں میں ترقی کر سکتا ہے اور نہ اسے خودداری حاصل ہو سکتی ہے۔

اب یہ طالب علم، بالکل بدلے ہوئے نوجوان تھے۔

انھوں نے خصوصی طور پر ایک نظریہ کو، دورِ حاضر کی ایک صداقت کو قبول کیا تھا۔ اور اختیاری طور پر اپنے صفحۂ دل سے ان خوابوں کو مٹا دیا تھا جنھیں لے کر وہ انگلینڈ گئے تھے پھر جب وہ ہندوستان لوٹے تو آزادی کی جد وجہد میں کود پڑے۔ وہ گورے آقاؤں کی نوآبادیاتی مشینری کے کل پرزے بننے کی بجائے اس کے حق میں موت کے فرشتے بن کر آئے اب وہ کرسیوں کے نہیں بلکہ جیل کی کالی کوٹھریوں کے آرزومند تھے۔ برطانوی کمیونسٹ پارٹی نے صرف سجاد ظہیر ہی کے نہیں بلکہ بڑے گھرانوں کے اور بھی بہت سے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کی شمع جلائی۔ تھی ان میں سے کئی لوگ ہمارے ساتھ ہماری پارٹی میں کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد اور ان کی رفیقہ حیات ہاجرہ بیگم، رومیش چندرا جو اس وقت عالمی امن کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں۔ رینو چکرورتی اور ان کے شوہر نکھل چکرورتی، اندرجیت گپتا، بھوپیش گپتا وغیرہ وغیرہ۔

سجاد ظہیر کو آزادی کی لگن نے ایسا سرشار کر دیا کہ وہ انگلینڈ سے واپس آتے ہی آزادی کی لہر میں کود پڑے اور ہمارے ساتھ جیلوں کی ہوا کھانے لگے۔ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے انھوں نے ہندوستانی ادب میں انتہائی اہم رول ادا کیا ہے ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پہ متحد اور منظم کرنا ان کے قلموں کو ایک طرف سامراج اور نوآبادیات کے خلاف، رجعت پرستی، فرقہ پرستی اور ظلمت پسندی کے خلاف دوسری طرف سوشلزم اور ترقی پسندی کے حق میں امن آزادی، جمہوریت اور سیکولرازم کے حق میں ایک تیز تلوار بنا دینا، ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جو ان کو زندۂ جاوید بنا تا ہے۔ انھوں نے ادیبوں کا ایک ایسا جھرمٹ تیار کیا جو آج ہمارے آسمان ادب کی کہکشاں بنا ہوا ہے سجاد ظہیر اور ان کے اپنے ساتھی ادیبوں کی لگن اور انتھک کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ لکھنؤ میں ہندوستانی ادیبوں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں ایک منشور منظوم کیا گیا جس میں رجعت پرستی، فرقہ پرستی اور ظلمت پسندی کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کیا گیا۔ ہندوستان میں اس وقت حالات خراب تھے۔ فرقہ پرستی کا چلن تھا۔ ہندو مسلم فسادات زندگی کا معمول بن گئے تھے۔ عوام ان پڑھ تھے اور آسانی سے مذہبی جنون کا شکار ہو جاتے تھے۔

سجاد ظہیر نے اس منشور کی بنیاد پر تمام زبانوں کے ادیبوں کو اکٹھا کیا اور نئے ادب کی داغ بیل ڈالی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ادب برائے ادب کے گمراہ کن رجحان کے خلاف لڑائی کی بجائے اور ادب برائے زندگی کا بول بالا کیا جائے۔ ہندوستان میں یکجہتی کو پروان چڑھایا جائے ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنے کام کے جوہر دکھائیں یہی ان کا نعرہ تھا۔

سجاد ظہیر نے اس تحریک کو بڑے تعہدوں سے جاری رکھا اور آخری سانسوں تک اس کے روح رواں بنے رہے وہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں کے ایک قافلہ سالار تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے وہ اور ہم سب کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں شامل تھے۔ اس پارٹی کو پنڈت جواہر لال نہرو کا آشیرواد حاصل تھا اور یہ کانگریس کے اندر رہ کر اس کی پالیسیوں پر اثرانداز ہونا چاہتی تھی۔ وہ ایک طرف اپنے ہر ممبر سے تقاضا کرتی تھی کہ وہ کانگریس کا ممبر بنے اور کانگریس کے ڈسپلن میں کام کرے اور دوسری طرف یہ دعویٰ کرتی تھی کہ وہ ایک آزاد پارٹی ہے۔

کانگریس کے ڈسپلن میں کام کرنا اور آزاد پارٹی ہونا دو متضاد باتیں تھیں۔ کمیونسٹ پارٹی چاہتی تھی کہ کانگریس

ـسٹ پارٹی کو چند دانش وروں تک ہی محدود نہ رکھا
بلکہ اسے عوامی پارٹی بنایا جائے اور اس میں مزدوروں
ـانوں کو جتھا بند کر کے شامل کیا جائے ۔ مینو مسانی،
ـاش ترائن، اشوک مہتہ وغیرہ اس وقت پارٹی کے لیڈر
اور مارکس وادی ہونے کا دعویٰ کیا کرتے تھے ۔ کیوں کہ
ـکے انقلاب کے زیر مارکس ازم اور لینن ازم کافی
ہور اور مقبول ہو چکے تھے ۔ یہ لوگ اسی لئے مارکس وادی
ـکے دعوے کرتے تھے لیکن بعد کے حالات نے ثابت
ـا کہ یہ بگلا بھگت محض دکھاوے کے لئے مارکس ازم کا
ـپہنے ہوئے تھے اندر سے تو وہ مارکس ازم کے کٹر دشمن

—

ہمارا گروپ سید سجاد ظہیر کی لیڈر شپ میں کانگریس
ـشلسٹ پارٹی میں کام کر رہا تھا ۔ ۱۹۳۸ میں لاہور کانفرنس
ـقع پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں دو نظرئے سامنے
ـ۔ ایک نظریہ سجاد ظہیر نے پیش کیا ۔ دوسرے نظریہ کے
ـے بنارس ہندو یونیورسٹی کے اچاریہ نریندر دیو، کملا دیوی
ـت پٹ وردھن اور اشوک مہتہ وغیرہ تھے ۔ کیمونسٹ
ـٹی کے دو ممبر جو کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں تھے، سجاد ظہیر
ـحمایت کر رہے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور کانفرنس میں
ـن دونوں نظریوں کی وجہ سے اختلاف اس قدر ابھر گئے کہ
ـنگریس سوشلسٹ پارٹی دو گروپ میں بٹ گئی ۔ اور پھر یہ
ـدونوں گروپ کبھی اکٹھا نہ ہو سکے ۔ میں نے کیمونسٹ پارٹی
ـا مرکزی ایگزیکیٹو کمیٹی میں بھی اکثر تقریریں کرتے سنا ہے ۔
ـہ بڑے دھیرے سے اور آہستہ آہستہ اپنی بات سمجھانے میں
ـاہر تھے جوش میں کبھی نہیں آتے تھے ۔ یہی وطیرہ ان کا عام
ـساتھیوں سے تھا ۔ جب ان کے ساتھی کوئی سیاسی نکتہ سمجھ
نہیں سکتے تھے تو وہ بہت سنجیدگی سے اور دھیرج سے ان کو
سمجھا کر قائل کرتے تھے ۔ طیش میں کبھی نہیں آتے تھے ان کی یہ صفت
ان کے دوستوں میں اضافہ کرنے میں بڑی مددگار ثابت
ہوتی تھی ۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے جو فساد دونوں طرف
ہوئے ان کے خلاف کیمونسٹ پارٹی نے بڑی جدوجہد کی ۔ پاکستان
کے کیمونسٹ پارٹی کے یونٹ بہت کمزور تھے لیکن ہندوستان
میں کیمونسٹ پارٹی نسبتاً مضبوط تھی ۔ جب فسادات بہت
بھڑک اٹھے تو اس وقت پارٹی نے سجاد ظہیر، سوہن سنگھ
جوش اور فضل الٰہی قربان کو پاکستان میں حالات کا جائزہ
لینے کے لئے بھیجا ۔ ہم تینوں وہاں راولپنڈی تک گئے اور ہم نے
لوگوں سے باتیں کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ اس کے
باوجود کہ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کا قتل اور غارت
گری ہوئی ۔ عام لوگ قتل و غارت گری کو بہت برا سمجھتے تھے
چنانچہ مزدوروں اور عام لوگوں نے اپنی جانوں کا جوکھم مول
لے کر ہندوؤں اور سکھوں کے بچوں اور عورتوں کو کیمپوں میں
بھجوایا ۔ تاکہ وہ صحیح وسلامت ہندوستان جا سکیں ۔ اصل میں
عام لوگ برادر کشی پر آمادہ نہیں تھے ۔ مگر برطانوی سامراج
نے انھیں یہ کہہ کر قتل و غارت پر اکسایا تھا کہ قانون کی گرفت
میں بالکل نہیں آؤ گے ۔ وہ لوگ جنھوں نے تمہاری زمینوں پر
قبضہ کیا ہے، جن کے قرض دار میں تم دبے ہو، ان کو قتل کر دو
تمہاری زمینیں تمہاری ہو جائیں گی اور تمہارے قرضے ختم
ہو جائیں گے ۔

ہمارے سامنے ایسے واقعات آئے جہاں پر پولس
نے خود ان کو ہتھیار بند کر کے ان کی رہنمائی کی ۔ ہمارے
ساتھیوں نے وہاں پر ہندوؤں اور سکھوں کو کیمپوں میں
پہنچانے کے کام میں بہت مدد پہنچائی ۔ اور اس کا اعتراف
گجرانوالا گرونانک کالج کے پرنسپل دادا ہرکشن سنگھ نے
امرت سر دربار صاحب میں ایک بھرے اجلاس میں کیا ۔ اسی
دوران وہاں ہمارے ایک کامریڈ تتر لوک سنگھ ٹھکر شہید
کر دئے گئے ۔ ہندوستان میں کیمونسٹ پارٹی نے بہت کام کیا ۔

ادھر پاکستان گئے ساتھیوں نے اپنے سر ہتھیلی پہ رکھ کر مسلمانوں کے گروہوں کو کیمپوں میں پہنچایا۔ اس دوران پارٹی کے تین نوجوان سکھ فرقہ پرستوں کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے جن کے نام تھے سردار گہل سنگھ (جھیل وڈی (صدر پنجاب کسان سبھا) صوبے سنگھ اور میگھر سنگھ دھرم کوٹ والے۔

بہر حال یہ کہانی بہت لمبی اور دردناک ہے۔ سجاد ظہیر اپنی تمام عمر کمیونسٹ پارٹی کے وفادار رہے اور خاص کر ادب میں انھوں نے جو کارنامہ انجام دیا۔ وہ ترقی پسند ادب کی تاریخ میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ ان کی شہادت بھی ادب کی خدمت کرتے ہوئے ہندوستان کے باہر ہوئی میں کمیونسٹ پارٹی کے اس سپوت کو دل سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ ان کے کام، لگن اور قربانیوں نے عام لوگوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ ایسے سپوتوں کی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کو بہت ضرورت ہے۔

رفیقو! روشنی اس کی سنبھال کر رکھو ———

آپ نہیں جانتے؟

مرکز سے ایسی ہدایات پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کو ملی ہیں کہ روزانہ ایک گھنٹے کا اُردو پروگرام شروع کیا جائے۔

آپ کیا کریں؟

مرکزی وزیر اطلاعات ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی اور پٹنہ ریڈیو اسٹیشن ڈائرکٹر کو خطوط لکھیں کہ جلد از جلد پٹنہ ریڈیو سے ایک گھنٹہ روزانہ کا اُردو پروگرام شروع کیا جائے۔

——— کلام حیدری

دو ہزار اُردو ٹیچر

بہار میں دو ہزار اُردو ٹیچرو کی بحالیوں کا جو یقین ہمیں دلایا گیا تھا اُس کا کیا بنا؟ کیوں ابھی تک ڈیڑھ سو کی مسلم آبادی کے علاقے میں بھی اُردو ٹیچر نہیں بحال ہوا ———؟

پوچھئے ——— بہار کے وزیر تعلیم سے پوچھئے آپ کو پوچھنے کا حق ہے!

——— کلام حیدری

وزیر آغا

ہندوستانی سنگیت

ہندوستانی رقص کی طرح ہندوستانی سنگیت بھی جسم اور روح، دراوڑ اور آریا کے ملاپ کی پیداوار ہے۔ روایت کے مطابق سنگیت کو برہما نے تخلیق کیا۔ لیکن شو نے اسے عام کیا۔ بھرت رشی نے یہ علم اپسراؤں تک پہونچایا اور نارد رشی نے آسمان کی اس ودیا سے خاک کے باسیوں کو روشناس کیا۔ بعض لوگ مہادیو کو اس کا خالق سمجھتے ہیں اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ موسیقی کو موسیقار نامی پرندے سے ماخوذ کیا گیا ہے[1]

ہندوستانی موسیقی کے سلسلے میں پرندے کی روایت زیادہ قرین قیاس ہے۔ کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ واقعتاً ایسا کوئی پرندہ بھی تھا جس کی چونچ میں پانچ سوراخ تھے اور ان سوراخوں سے جو سُر نکلتے تھے ان سے مختلف راگ اور راگنیاں مرتب ہو گئیں تھیں بلکہ صرف اس قدر کہ ہندوستانی موسیقی کا آغاز جنگل کی فضا سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور جنگل کے سنگیت میں پرندوں کے چہچہانے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ قدیم زمانے سے ہندوستان اس کلچر کا علمبردار رہا ہے جس کے بنیادی عناصر جنگل، بارش اور اس کے نتیجے میں پیدائش اور فراوانی ہے۔ جنگل اور زمین سے ہندوستانی کلچر نے جو اثرات قبول کئے، ہندو مذہب، بت تراشی، مصوری اور رقص وغیرہ کے سلسلے میں ان کا ذکر طویل تر ہوگا۔ ہندوستانی سنگیت کے سلسلے میں بھی دیکھئے کہ جنگل کی آوازوں نے اس کی بنیادوں کو ترتیب دیا ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستانی سنگیت کے سات سُر سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی، (جنہیں سپتک کا نام ملا ہے) سات مختلف جانوروں کی آوازوں سے ماخوذ ہیں جیسے کھرج (سا) مور کی آواز سے، رکھب (رے) پپیہے کی آواز سے، گندھار (گا) بکری کی آواز سے، مدھم (ما) کلنگ آواز سے، پنچم (پا) کوئل کی آواز سے، دھیوت (دھا) گھوڑے کی آواز سے اور نکھاد (نی) ہاتھی کی آواز سے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی سنگیت کی ساتوں بنیادی آوازیں جنگل کی آوازوں ہی سے متعلق ہیں۔

جنگل نے ہندوستانی سنگیت کو سات بنیادی سُر ہی عطا نہیں کئے بلکہ اسے آوازوں کی وہ رنگا رنگی، بو قلمونی، متنوع اور تعداد بھی بخشی جو جنگل کا امتیازی وصف ہے۔ جنگل درختوں، پتوں، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں ہی کی آماجگاہ نہیں بلکہ

---

[1] علم موسیقی از شمس کنول (آجکل موسیقی نمبر سنہ ۱۹۵۶ء)

لاتعداد مختلف آوازوں کا مسکن بھی ہے ان آوازوں میں سے
ہر آواز اپنی انفرادیت کے باوصف جنگل کے نغمے کا ایک جزو ہے بعینہ
جیسے جنگل کا ہر درخت اپنی الگ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی جنگل
کے "کل" کا ایک حصہ ہے تاہم جنگل کی ان آوازوں کی تعداد اور
تنوع خاص طور پر اہم ہے کہ اسی چیز نے ہندوستانی سنگیت میں
راگوں اور راگنیوں کی تقسیم اور تعداد کو متاثر کیا ہے۔ مثلاً
ہندوستانی موسیقی میں بہتر ٹھاٹھوں کا ذکر ملتا ہے جن سے
۳۴۸۴ راگ حاصل ہوئے ہیں۔ ہندوستانی موسیقی میں سروں
کے علاوہ بائیس سرتیاں بھی مقرر ہیں۔ اور جب ان سرتیوں کی
تعداد کو مختلف سروں کے درمیانی عرصہ میں بڑھایا یا کم کیا جائے
تو راگوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ممکن ہے۔ یہی حال تال کا
ہے۔ سنگیت رتناکر میں تال میں ایک سو بیس اقسام کا ذکر
ملتا ہے۔[1] اسی طرح موسیقی کے آلات کے سلسلے میں بھی ہندوستانی
موسیقی بہت زرخیز ہے کہ یہاں ازمنہ قدیم ہی سے ڈھول،
تار اور ہوا کے نغماتی آلات کی لاتعداد اقسام رائج رہی ہیں۔
زرخیزی کے اس پہلو سے جنسی جذبے کا ایک گہرا تعلق
ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب نہ صرف جنگل کی زرخیزی
سے متاثر تھی بلکہ اس پر جسم کے تقاضے بھی مسلط تھے۔ گویا
یہ تہذیب روح کے بجائے جسم کی گرویدہ تھی جنگل سے قریب
ہونے کے باعث اس میں بصارت بالکل محدود لیکن لامسہ، شامہ
اور سامعہ زیادہ برانگیختہ تھیں۔ بالخصوص جنگل میں سامعہ کا
زیادہ متحرک ہونا گویا انسان کی بقا کے لئے بھی بے حد ضروری تھا
(تاکہ وہ جنگلی جانور کی چاپ سے بروقت آگاہ ہو سکتا) بہر
حال یہ جسم کا معاشرہ تھا (اور جسم کا اہم ترین مقصد نسل کی بقا کے علاوہ
اور کچھ نہیں) اور یہی وہ مقام تھا جہاں جنسی جذبے کو فطرت
نے ایک خاص اہمیت بخش دی تھی۔ جنسی جذبے کے عمل میں آواز
کا کیا منصب ہے، اسے زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں تاہم یہ بات
طے ہے کہ ہندوستانی موسیقی کو جسم کے اس بہت بڑے تقاضے (یعنی
جنسی تسکین) نے یقیناً متاثر کیا اور اسے ایک خاص مزاج اور ایک
خاص جہت عطا کی۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ ہندوستانی موسیقی میں ہر
راگ کے پلو سے کئی ایک راگنیاں بندھی ہوئی ہیں جیسے بھیروں کے
ساتھ بھیرویں، گوجری ٹوڈی۔ رام کلی اور برائی۔ اور مالکونس
کے ساتھ باگیشری، کوب، پربج، سوہنی۔ اور کھباوتی۔ اس
کے بعد ان راگ راگنیوں کے پتر یا بیٹے بھی ہیں اور یوں ہر راگ نے
اس خاندان یا دو نغموں کے ذخیرے کی صورت اختیار کر لی ہے۔
جو قدیم ہندوستانی تہذیب میں بہت توانا تھا۔ موسیقی میں نر اور
مادہ کی یہ تخصیص بالخصوص بعض نغماتی آلات میں بھی موجود ہے۔ مثلاً طبلے
کے دو ٹکڑے ہیں ایک مادہ جو تنگ ہے اور "پڑی" کہلاتا ہے
اور دوسرا نر جو چوڑا ہے اور "دھاما" کہلاتا ہے۔ مزاجاً بھی اس
میں وہی فرق ہے جو نر اور مادہ میں ہونا چاہیئے "پڑی" میں ٹھہراؤ
ہے اور ایک خاص ڈگر پر ایک مخصوص انداز میں رواں دواں رہنے
کا انداز بہت نمایاں ہے جب کہ "دھاما" بہت گرار ہے تموجات کو
پیش کرتا اور مرد کی فطری بے قراری اور تحرک کا غماز ہے لیکن بات
یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر کسی راگ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے
تو اس کے دو واضح حصے نظر آئیں گے۔ پہلا الاپ۔ استھائی اور انترہ
کا حصہ جو بلمپت یعنی دھیمی لے میں گایا جاتا ہے۔ اور دوسرا دُرت
جو تیز لے میں ادا ہوتا ہے۔ راگ میں الاپ کا حصہ جنسی فعل کے اس حصے
سے مماثل ہے جس میں پیار اور چھیڑ چھاڑ کو اہمیت ملتی ہے۔ دُرت
خالص جنسی فعل کا مماثل ہے اور ایک انتہائی نقطے پر پہنچ کر دوبارہ
اس مقام پر آ جاتا ہے۔ جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اور
اور یوں جنسی فعل کے آغاز عروج اور زوال کی ساری داستان کو
پیش کر دیتا ہے۔

ہندوستانی موسیقی کا ایک بنیادی وصف، جو غالباً سب تہذیب
الارواح سے ماخوذ ہے اس میں جادو کا وہ عنصر ہے جس کا مختلف

۱؎ POPLEY - THE MUSIC OF INDIA P. 74

راگوں کے اثرات کی صورت میں عام طور سے ذکر ہوا ہے۔ مثلاً دیپک راگ کے بارے میں یہ خیال کہ اس کے گانے سے شعلے نمودار ہو جاتے ہیں اور میگھ ملہار کے بارے میں یہ نظریہ کہ اس سے برکھا ہونے لگتی ہے صاف طور پر اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا تعلق کسی نہ کسی منزل پر تہذیب، لاروا سے ضرور متعلق تھی اور موسیقی کو جادو کی رسوم کے سلسلے میں یقیناً بڑی اہمیت حاصل تھی۔ مندروں میں منتر پڑھنے کی رسم کو اسی عمل کی ایک بگڑی ہوئی صورت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہر ہندوستانی راگ ایک تصویر سی پیش کرتا ہے جو اس راگ کے مزاج کو واضح کرتی ہے۔ مثلاً راجہ۔ ایس۔ ایم ٹیگور نے سری راگ کو ایک ایسے غیر فانی شخص کے روپ میں دیکھا ہے جو اپنی محبوبہ کی معیت میں ایک نہایت خوب صورت چمن سے گزرتا ہے۔ اور گزرنے کے دوران خوشبو میں بسے ہوئے پھولوں کو اکٹھا کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح اس نے میگھ کو یوں دیکھا ہے کہ چاروں طرف گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ اور بجلی کے کوندے لپک رہے ہیں اور شاہی ہاتھی پر اپنی دلہن کو ساتھ لئے وہ نوجوان شہزادہ بیٹھا ہے جو اس راگ کا مظہر ہے[1]۔ راگوں کی ان مختلف تصاویر کے پس منظر میں ہندوستان کی دھرتی کی تصویر بھی ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مجموعی اعتبار سے ہندوستانی موسیقی کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ اس جزو اور "کل" کا ایک دلکش امتزاج موجود ہے۔ ایک ایسا امتزاج جس میں جزو لمحاتی طور پر ایک بچے کی طرح "کل" سے اپنا ہاتھ چھڑا کر ایک زقند سی بھرتا ہے اور پھر (جیسے بھٹک جانے کے خیال سے خوفزدہ ہو گیا ہو) دوڑ کر دوبارہ کل (ماں) کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ مثلاً غور کیجئے کہ ہندوستانی سنگیت میں کھرج ہی سب سے اہم اور اچل سر ہے۔ (اچل سے مراد قائم یا جامد سر کے ہیں) باقی سروں کا بذات خود کوئی مقام نہیں بلکہ کھرج کے سہارے اور اس کے تناسب سے مقرر ہوتے ہیں بلکہ سنگیت میں کھرج کو قائم کرنے کے بعد جب آپ آگے بڑھتے ہیں تو ہر بار ایک چکر سا لگا کر واپس آتے اور کھرج کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ اس سے دو باتیں آئینہ ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کھرج کی حیثیت ماں کی سی ہے جس کی انگلی سے چمٹا ہوا بچہ بار بار آزاد ہو کر واپس اس کی انگلی سے آچمٹتا ہے۔ دوسری یہ کہ آزادی کے اس وقفے میں بچہ ایک سیدھی لکیر کو تعقیبا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک قوس سی بنا کر واپس "کل" سے آملتا ہے۔ یہ قوس جو ہندوستانی موسیقی کی اصطلاح میں مینڈھ یا میں گمک کے نام سے موسوم ہے، بڑی اہمیت کی حامل ہے اور ہندوستانی سنگیت کے مزاج کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہی قوس ہندوستانی کلچر کے دوسرے مظاہر میں بھی بہت نمایاں ہے (جیسے بت تراشی اور مصوری وغیرہ میں) اور اس کا نہایت گہرا تعلق اس لچکدار شاخ سے ہے جو جنگل کے لئے ایک علامت کا درجہ رکھتی ہے۔ ہندوستانی سنگیت کے اس مزاج کو ایک تشبیہہ سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اس سنگیت کا بنیادی سر ایک شاہراہ کی طرح ہے۔ اب اگر ہر قدم پر اس شاہراہ سے ایک پگڈنڈی نکلے۔ جو ایک خوبصورت سی قوس بنا کر دوبارہ اس شاہراہ میں ضم ہو جائے تو ہندوستانی سنگیت کی ایک واضح صورت نظروں کے سامنے ابھر آئے گی۔ (میلوڈی) اسی لئے ہندوستانی سنگیت کا امتیازی وصف ہے کہ اس سنگیت میں جزو ایک علاحدہ کل میں تبدیل نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اپنی ہستی اپنے وجود کا اعلان کر کے دوبارہ کل کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی موسیقی میں تمام سر یک وقت اپنی اپنی انفرادیت سے دست کش ہوئے بغیر آگے کو بڑھتے ہیں۔ چنانچہ مغربی موسیقی چند ایسی شاہراہوں کے مجموعے کا نام ہے جو ایک دوسری کے متوازی اور ایک دوسری میں ضم ہوئے بغیر کسی خاص سمت میں

---

[1] POPLEY — THE MUSIC OF INDIA P. 68

[1] واضح رہے کہ اس کتاب میں ہندوستان سے مراد وہ برصغیر ہے جو ۱۹۴۷ء میں بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا تھا

رواں دواں ہوں۔ اور ان کی آوازوں سے "ہارمنی" پیدا ہوتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں مغربی موسیقی کا امتیازی وصف سُر کی انفرادیت ہے۔ یہاں ہر سُر کل کا جزو نہیں بلکہ خود ایک کل ہے اور جب بہت سے کل مل کر ایک نغمے کو تخلیق کرتے ہیں تو اس میں جزو کے اوج کے بجائے بڑھتے ہوئے قدموں کی مخصوص تال کا احساس ہوتا ہے۔

ہندوستانی موسیقی اس لحاظ سے بھی مغربی موسیقی سے مختلف ہے کہ یہ ایک ایسے معاشرے کی پیداوار ہے جس میں سماجی اقدار کو انفرادی اقدار پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اور فرد سماج کے مقابلے میں بہت کم حیثیت کا حامل رہا ہے۔ تاہم چونکہ جنگل اور دھرتی کے اثرات کے تحت اس معاشرے میں نئے روابط کی تشکیل کا اصول پوری طرح کارفرما ہے اس لئے موسیقی پر اس کا اثر یوں مرتسم ہوا ہے کہ سُر دُن سُننے میں نئے "الاپ" ابھرتے چلے آتے ہیں۔ اور فرد کی انفرادیت کے منظر عام پر نہ آنے کے باعث اس میں "خالص خلیج" کا وہ انداز ابھر نہ سکا جو مغربی موسیقی سے خاص ہے۔ ہندوستانی اور یورپی موسیقی کے فرق کے بارے میں رابندر ناتھ ٹیگور کا خیال کہ یہ دن اور رات کے فرق کی ایک صورت ہے، بہت وزنی اور خیال افروز ہے، دن کی دنیا میں اجزا مفاہمت اور تضاد کے عمل میں مبتلا ہونے کے باوجود ایک وسیع تر مفاہمت کو وجود میں لاتے ہیں جب کہ رات کی دنیا پُراسرار اور گہری ہے۔ ہندوستانی سنگیت اسی رات سے مشابہ ہے، دن، اتحاد، اتفاق اور مفاہمت کو تحریک دیتا ہے۔ جب کہ رات جزو کے بھٹکنے اور پھر خوف زدہ ہو کر کل کا سہارا لینے کے منظر کو پیش کرتی ہے ——— اسی لئے مغربی موسیقی کی اساس مفاہمت پر استوار ہے، جب کہ ہندوستانی سنگیت مزاجاً میلوڈی کی ایک صورت ہے۔

تاریخ تہذیب کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ جب زمین کے ساتھ چمٹی ہوئی دراوڑی تہذیب آریا کی متحرک تہذیب سے ہمکنار ہوئی تو اس نے قربِ محبوب کی لذت سے برقرار رکھنے کے لئے خود کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی خود کو ایک بلند تر سطح پر لانے کی یہ کوشش جسم کی نفی کے روپ میں نہیں تھی (جیسا کہ آریا کے سلسلے میں ہوا) بلکہ اس کا مقصد جسم کو عروج کے مدارج تک اوپر اٹھا لینا تھا۔ چنانچہ آریاؤں کی آمد کے بعد ہندوستانی موسیقی کی اس صنف کو بڑا فروغ حاصل ہوا جسے "دھرپد" کا نام ملا ہے اور جو پاکیزگی اور رفعت کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ دھرپد میں نہ صرف دیوتاؤں اور دیوتاؤں کی حمد و ثنا اور ان کی شجاعت، قوت اور بہادری کے کارناموں کا ذکر ملتا ہے۔ بلکہ اس میں بامعنی الفاظ کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ بنیادی طور پر ہندوستانی موسیقی لفظ اور معنی میں ایک باہمی ربط پیدا کرنے کے حق میں نہیں بلکہ لفظ، ایک بے معنی لفظ کو سُر کی ترسیل کے لئے استعمال کرتی ہے۔ لیکن دھرپد میں یہ بات نہیں دھرپد تو گویا دراوڑی جسم میں آریائی روح کے داخل ہونے کی ایک صورت ہے۔

مذہبی پہلو کے تسلط اور روایت کے ساتھ بہت زیادہ وابستگی کے باعث دھرپد میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے ٹھہراؤ کا یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ مسلمان نہ صرف عقائد کی دنیا میں ایک متحرک اور کثیر دہ نقطۂ نظر کے داعی تھے۔ بلکہ جسمانی طور پر بھی متحرک اور بے قرار قبائل پر مشتمل تھے۔ ان کے ہاں بت شکنی کی روایت نہ صرف مذہبی طور پر[1] زمین کی نفی کرنے کی ایک کاوش تھی۔ بلکہ یہ اس بات پر دال بھی تھی کہ یہ لوگ آوارہ خرامی میں مبتلا ہونے کے باعث زمین کے جادو سے بہت دور تھے۔

بہرحال ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ایک تحرک، ایک ایسا ذہنی اور جذباتی اُبال پیدا ہوا کہ ہندوستانی معاشرے کا صدیوں پرانا نظام ٹوٹ کر ایک نئی سطح پر استوار ہو گیا۔ مذہب میں اس کی صورت نانک، کبیر، اکبر اور دوسرے مفکرین کی وہ کوششیں تھیں جن کا مقصد ہندومت اور اسلام میں مفاہمت کی ایک فضا قائم کرنا تھا۔ مصوری اور فن تعمیر میں اس نئی مفاہمت کا ذکر کیا جا چکا ہے موسیقی میں مسلمانوں کے فطری تحرک نے سنگیت کو ٹھہراؤ اور روایت کی

---

[1] ہندوستانی موسیقی اور مسلمان۔ از شاہد احمد دہلوی (ہندوستانی موسیقی مرتبہ مفتی فخر الاسلام ص ۱۴۳)

فضا سے باہر نکل کر ایک نئی سطح تلاش کرنے پر لگا دیا۔ یہ نئی سطح ہندوستانی سنگیت میں "خیال" کا آغاز اور اس کا ارتقا تھا۔

"خیال" کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اسے تیرہویں صدی عیسوی میں امیر خسرو نے ایجاد کیا تاہم اس ترقی اور ترویج کے سلسلے میں سلطان حسین شرقی کا نام عام طور سے لیا جاتا ہے۔ سلطان حسین شرقی جونپور کے پندرہویں صدی کے شاہانِ شرقیہ میں سے تھے۔ خیال کا ایک بنیادی وصف اس کا تحرک ہے۔ دھرپد میں صرف ایک تان ہوتی ہے۔ جسے گمک کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن خیال میں لاتعداد تانیں ابھرتی ہوئی ملتی ہیں اور اگرچہ دھرپد میں "میں گھسیٹ" اور تیز کومل اور تیور سروں کے موجود ہیں تاہم اس میں زمزمہ اور مرکی موجود نہیں جو خیال کا طرۂ امتیاز ہے۔ زمزمہ، مرکی اور تان کی فراوانی نے خیال کو وہ تحرک عطا کیا ہے۔ جو واضح طور پر مسلمانوں کے ذہنی اور جسمانی تحرک سے متعلق ہے۔ خیال کے ساتھ پکھاوج کے بجائے طبلے کا وجود بھی اس تحرک ہی کی نشان دہی کرتا ہے پکھاوج میں ٹھہراؤ ہے لیکن طبلے کے دو حصے ہیں جن میں سے ایک تو اس ٹھہراؤ کا علم بردار ہے اور دوسرا متحرک اور بے قرار ہے۔ یوں طبلے کے یہ دونوں حصے مل کر منجمد اور متحرک معاشروں کے ملاپ ہی کو پیش کرتے ہیں۔

دھرپد اور خیال کا اہم ترین فرق اس بات میں ہے کہ دھرپد ایک کہانی پیش کرتا ہے جب کہ خیال اس کہانی کی مختلف کڑیوں کو بعینہٖ پیش کرنے کے بجائے انہیں لطیف علامتوں میں ڈھال دیتا ہے۔ دھرپد میں بامعنی الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دوسری طرف خیال میں لفظ کو جذبے کی ترسیل کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہاں سر ہی جذبے کی ترسیل کا واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ خیال ایک علامتی رنگ اختیار کر کے سامعین کی سعیِ تخلیق کو متحرک کرتا ہے اور یہ بات ہندوستانی موسیقی کے ابتدائی مزاج سے ہم آہنگ تھی۔ غور کریں تو ہندوستانی موسیقی کی تاریخ میں تین اہم مدارج دکھائی دیں گے "الاپ جو (بقول شاہد احمد دہلوی) ایک ایسا گونگا نغمہ ہے[1]۔ جسے

فی شکل دیدی گئی ہے۔" دھرپد "میں بامعنی لفظ کا اضافہ ہوا اور جو تھی جذبات کے اظہار کا موجب بنا اور "خیال" جس میں تحرک اور تموج کا اضافہ ہوا لیکن جس نے الاپ کی گونگی کیفیت کو علامتوں کے روپ میں خود سے ہم آہنگ کر لیا، بنیادی طور پر ہندوستانی موسیقی لفظوں کے ذریعے جذبے کی ترسیل کے بجائے، سُر کے ذریعے جذبے کے اظہار کی گرویدہ تھی لیکن آریا کے ردعمل کے تحت اس نے ایک نمایاں مقصد کو اپنایا۔ بعد ازاں جب مسلمانوں کی آمد سے انجماد کی کیفیت ٹوٹی تو ہندوستانی موسیقی نے ایک بار پھر اپنے اصل مزاج کو دریافت کر لیا۔ اور بے معنی لفظ کے ذریعے اظہار کی طرف مائل ہو گئی۔ اس کے علاوہ خیال کی ادائی کے سلسلے میں عورت کا منصب بھی زیادہ نمایاں ہوا۔ جس طرح ہندوستانی گیت عورت کے اظہارِ محبت کی ایک صورت تھی۔ بعینہٖ خیال سُر کے ذریعے اس محبت کے اظہار کا وسیلہ قرار پایا۔ ثقافتی اعتبار سے دیکھیں تو یہ ہندو تہذیب (جس کی علامتیں جنگل جسم لعشق عورت تھیں) کے روحانی طور پر اوپر اٹھنے اور ایک متحرک تہذیب (جو مسلمانوں کی تہذیب تھی) سے خود کو ہم کنار کرنے کی کوشش پر دال ہے۔ چنانچہ اگر اسے آواز کے روحانی ارتقا کا نام دیں تو بات شاید آئینہ ہو جائے۔

---

[1] ہندوستانی موسیقی اور مسلمان۔
از شاہد احمد دہلوی ص ۱۴۰۔

باقر مہدی

میرا پیمانہ

وقت کو میں نے نظموں سے
ناپ کے
جیون کاٹا ہے
آج پرانی نظموں میں بیتے دنوں کی
چند لکیریں
پچھلے پہر کی بے خوابی
غصیلے الفاظ کی ٹھنڈی پھیکی تصویریں
راکھ راکھ ساری تحریریں
مہمل حال کی تفسیریں
یہ سارا سرمایہ
ردّی کاغذ کا اک دفتر
وقت کا سایہ
اپنا پرتو چھوڑ گیا ہے!

کینسر

پتیاں سوکھی شاخیں جلا کر
جسم کے کونے کونے میں دیکھا
جڑ کا نام و نشاں تک نہ تھا

کیسے پہلی ہی برف باری نے
بے نشاں جڑ سے یادوں کی کونپل
کھلائی؟
کیا محبت بھی اک کینسر کی طرح
جل کے — بے موسمی تیز بارش میں
ریشے ریشے میں یوں پھیل جاتی ہے؟ ———

ایک کالی غزل

(عزیز قیسی کی نذر)

بکھر چکے ہیں سائے سائے کرن کرن بیماری ہے
دھواں دھواں ہیں چہرے چہرے نظر نظر آزاری ہے

اب کیا کہیے اب کیا سنیے ٹھہر ٹھہر جاتی ہے دل کی دھڑکن
راکھ رگوں میں جلتی ہے اور آنکھوں میں چنگاری ہے

بچوں کو آئینہ دیتا، بھوکوں کو اک سپنا دیتا
یہ گھر گھر بازار سجاتا، روحوں کا بیوپاری ہے

دولت کے لنگر خانے میں شہرت، عزت بٹتی ہے
ہر فن کار بھکاری ہے اور ہر شاعر درباری ہے

نیل گگن ہے ٹکڑے ٹکڑے بکھر بکھر تارے ہیں
مشرق میں سورج ڈوبا ہے محشر کی تیاری ہے

آوازوں کی سسکی سسکی سرگوشی چپ چپ سناٹا
خاموشی کو آرٹ بنانا آج بڑی فن کاری ہے

کتنے باغی خلعت پا کر دیکھو ڈھول بجاتے ہیں
باقر تیرا سرکش رہنا اک فطری بیزاری ہے

قمر رئیس

ایک نظم

رات پھر حاملہ ہوگئی
دیکھئے
چال میں اس کی اک بانکپن آ گیا
بھر گئے کوسطے
باہیں جواں ہوگئیں
اک انوکھی سی گمبھیر سی مسکان
مونالزا کی طرح
عارض و لب پہ افسوں جگانے لگی
خامشی بھی مدھر راگ گانے لگی
ہر گھڑی یاس و امید کی آہٹیں
نازِ تخلیق کی بے ردا خواہشیں
لب پہ آنے لگیں
دل لبھانے لگیں
خواب راحت کی کھوئی ہوئی آہٹیں
پاس آنے لگیں
رات پھر حاملہ ہوگئی
دیکھئے
سانولے جسم کی جاگتی کوکھ میں
کسمساتی ہوئی چاندنی موہتی
کوئی مورت ہے
یا پھر صدا کی طرح
کوئی عفریت ہے؟
کوئی آسیب ہے؟
کس کو معلوم ہے؟
رات پھر حاملہ ہوگئی
دیکھئے؟؟

شہزاد منظر

انفرادیت کی تلاش میں

"فرد کی آزادی" اور "انفرادیت کی نشوونما" آج کے ادب کا محبوب موضوع ہے۔ جدیدیت کے رجحان سے قبل اُردو ادب میں کبھی بھی فرد کی آزادی اور انفرادیت کی نمو پر اس قدر زور نہیں دیا گیا جس قدر آج دیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُردو شعر و ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات غالب تھے جس کے نزدیک انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کی اہمیت رہی ہے اور جو انفرادیت کے مقابلہ میں اجتماعیت پر زور دیتی رہی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانۂ عروج میں انفرادیت پسندی ایک بیمار رجحان تصور کیا جاتا تھا اور انفرادیت پرست ہونا انتہائی مذموم بات تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ بدل گیا اور کل تک ادب میں جس موضوع کو مذموم اور قابلِ نفرت تصور کیا جاتا تھا وہ ادب کا سب سے محبوب اور مقبول موضوع بن گیا۔

جدید ادب میں "انسان کی گم شدہ انفرادیت" یا "ذات کی تلاش" ایک اہم موضوع ہے۔ اس بارے میں کمار پاشی کا کہنا ہے کہ:

> "نئے انسان نے وہ سب کچھ کھو دیا ہے جو اس نے روزِ اول حاصل کیا تھا۔ پہلے وہ اپنی قوتوں پر زندہ تھا اور پنجرے سے اس کا رشتہ بہت گہرا تھا لیکن آج وہ مشینوں کے رحم و کرم پر ہے۔ پنجرے سے اس کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ خدا کے ساتھ اس کے جو تصورات وابستہ تھے وہ تصورات اب ختم ہو چکا ہیں۔ جبر، ذہنی رشتے کو ازلی اور ابدی رشتہ سمجھتا تھا۔ سائنس اور ٹیکنولوجی کے اس دور میں اس کا بھی زوال ہو چکا ہے۔ وہ اب جان چکا ہے کہ اس پوری کائنات میں اس کی حیثیت ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں ہے اور اس کی زمین جسے وہ اب تک قائم و دائم سمجھتا تھا کسی وقت بھی ایٹم کی ہولناکیوں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر سکتی ہے۔"
>
> (نئی شاعری کے مسائل ———
> سالنامہ ادب لطیف ۱۹۶۷ء)

صنعتی یکسانیت کے اس دور میں فرد اپنی شخصیت کے احساس سے محروم ہو چکا ہے اور اس کے وجود کی معنویت اس کے لئے سب سے بڑا سوال ہے۔ زندگی کی معنویت اور "ذات کی تلاش" آج کے دور کے انسان کے سوالات ہیں جس کا جواب آج کے دور کے ادیبوں اور مفکروں کو دینا ہے۔ میں اس مقالہ میں موخرالذکر سوال سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ آج کے صنعتی دور نے فرد کی فردیت (انفرادیت) کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے اور فرد کو معاشرے کا تابع و پابند بنا کر

اس سے سب کچھ چھین لیا ہے اس لئے آج کے انسان کی جدوجہد دراصل فرد کی آزادی اور انفرادیت کی بازیابی کی جدوجہد ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنولوجی کی ترقی کی وجہ سے دنیا سمٹ کر ایک اکائی کی صورت اختیار کر رہی ہے اور آٹومیشن کے عہد نے انسان کو صنعتی معاشرے میں ایک معمولی، غیر اہم اور انتہائی حقیر پرزہ بنا دیا ہے جس کی معاشرے سے الگ اپنی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ آج کا صنعتی انسان اپنی انفرادیت گنوا چکا ہے اور وہ بھری پری دنیا میں قطعی تنہا اور اکیلا ہے۔ ہجوم اور جم غفیر میں بھی وہ تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہے۔ آج ہر شخص معاشرے کا تنہا انسان ہے۔ یہ صنعتی دور کی لعنت ہے کہ ایک ہی عمارت میں رہنے والا شخص اپنے دوسرے پڑوسی سے ناواقف ہے اور اس لئے وہ اس کے دکھ سکھ اور خوشی و غم میں اس کا ساتھی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے اجتماعیت پرست معاشرے میں انسان اپنی انفرادیت کی تلاش میں ہے۔ وہ ذات کے غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس لئے وہ فرد کی آزادی۔ انفرادیت کی تکمیل اور نشوونما اور حریت فکر کا رونا رو رہا ہے لیکن آج کے صنعتی انسان کو انفرادیت کہاں حاصل ہوگی؟ فرد کی آزادی اور انفرادیت کی تکمیل اور نشوونما کس نظام میں ہوگی؟ کیا سرمایہ دارانہ نظام میں؟ اشتراکی نظام میں یا کسی تیسرے اور نئے نظام میں؟

مغرب میں انفرادیت پرستی اور انفرادی آزادی کا بڑا چرچا ہے اور مغرب کے آزاد خیال اور روشن ضمیر دانش ور آزادئ خیال، حریت فکر اور انفرادیت کی نشوونما کی مالا جپتے ہوئے نہیں تھکتے۔ لیکن کیا وہ یہ دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ میں کسی اشتراکی ادیب، صحافی یا دانش ور کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ "نیویارک ٹائمز" "واشنگٹن پوسٹ" یا کسی دوسرے اخبار و جریدہ میں کمیونزم کی حمایت میں مضمون لکھے؟ جو معاشرہ طبقاتی استحصال اور سماجی و اقتصادی عدم مساوات کی بنیاد پر قائم ہو۔ جس معاشرے میں انسان کی زندگی کا زیادہ تر وقت دو وقت کی روٹی کے حصول میں گزرتا ہو۔ جہاں زندگی قطعی غیر یقینی اور غم و الم سے پر ہو اور جہاں ملک کی تمام دولت اور وسائل پر گنتی کے چند افراد کا قبضہ ہو وہاں ہر فرد کی انفرادیت کی کس طرح نشوونما ہو سکتی ہے؟ وہاں ہر فرد کس طرح آزادئ فکر حاصل کر سکتا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام کا کارنامہ یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں جب ساری دنیا میں جاگیردارانہ نظام قائم تھا تو وہ انفرادی آزادی کا پرچم لے کر آیا اور اس نے اسے جاگیردارانہ نظام کی قبر پر گاڑ دیا۔ اس نے نئے نظام حیات کے تحت فرد کو بہت حد تک انفرادی آزادی دی لیکن اس کا المیہ یہ ہے کہ یہ نظام چونکہ اقتصادی استحصال اور معاشی عدم مساوات کی بنیاد پر قائم ہے اس لئے صنعتی انقلاب کے بعد سائنس اور ٹیکنولوجی کی ترقی کی وجہ سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس نے فرد کو مشین اور ذرائع پیداوار کا تابع بنا دیا اور معاشرے میں اکثریت کی انفرادی آزادی کچل کر رہ گئی اور اس طرح عوام کی اکثریت کی انفرادی نشوونما نہ ہو سکی چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس سرمایہ دارانہ نظام نے انفرادی آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا اس نے خود اپنے ارتقا کے ذریعہ اسی کی نفی کر دی۔

جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق ہے وہاں فرد کی مکمل آزادی اور تکمیل ذات ممکن نہیں کیونکہ اس نظام کی بنیادی خصوصیت طبقاتی اور اقتصادی استحصال ہے اس لئے جب تک معاشرے کے تمام افراد کو سماجی اور معاشی مساوات حاصل نہیں ہوگی فرد کی انفرادیت کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ اب رہا اشتراکی نظام کا سوال، تو اس میں شبہ نہیں کہ اشتراکیت فرد کی انفرادی نشوونما کی مخالف نہیں ہے لیکن وہ انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اور فرد کے مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دیتی ہے۔ اشتراکی نظام میں

بنیادی نقص یہ ہے کہ یہ نظام کٹر اجتماعیت پرستی اور جبریت پر قائم ہے۔ جہاں اجتماعیت پرستی کے نام پر فرد کی انفرادیت کو انتہائی بے دردی سے قربان کر دیا جاتا ہے۔ اشتراکی ملکوں میں فرد کو آزادیٔ مطلق کبھی حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ مجرد آزادی کا تصور، فلسفی کا خواب تو ہو سکتا ہے لیکن دنیا کے کسی بھی دور اور کسی بھی معاشرہ میں ممکن العمل نہیں یہی وجہ ہے کہ مارکسسٹوں نے آزادیٔ مطلق کا جھنجھٹ ہی نہیں پالا۔ سوشلسٹ معاشرہ میں انفرادیت کو مکمل تحفظ حاصل نہیں ہے وہاں فرد ہمیشہ معاشرہ کے تابع رہے گا اسے کبھی بھی معاشرہ سے زیادہ اہم تصور نہیں کیا جائے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح وہاں بھی اس کی حیثیت معاشرے میں ایک انتہائی معمولی اور قطعی غیر اہم جزو کی ہے۔

میرا خیال ہے (بقول کرشن چندر) اشتراکیت کو مزید نرم رو، لچک دار، لبرل اور انسان دوست بننے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نظام کی ساری خوبیاں محض اس کی جبریت پسندی اور حد سے زیادہ اجتماعیت پرستی کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اشتراکیت کی حقیقی اسپرٹ اور فرد کی تکمیل ذات میں براہ راست کوئی تضاد نہیں ہے۔ اشتراکیت کا بنیادی مقصد ایک ایسے معاشرے کی تعمیر ہے جہاں سائنس اور ٹیکنولوجی کی ترقی کے نتیجہ میں اتنی زیادہ پیداوار ہو کہ انسان اقتصادی غلامی سے نجات حاصل کر لے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی انفرادیت یا اس کی ذات کی تکمیل صرف اس قسم کے ایک مثالی نظام میں ممکن ہے۔

کوشن موہن

وفادار

یہ ہوا کتنی ہی بار

. . . .

دل بے تاب میں لے کر نئے احساس کی پیاس
جب کسی دوسری عورت کے پاس
شوق سے جاتا تھا میں
کتنا گھبراتا تھا میں
چاند اُبھرتا ہی نہ تھا یا دل سے
'کام' ناکام ہی رہ جاتا تھا
نفس امارہ کا

سر پہ الزام ہی رہ جاتا تھا
تجربے تشنہ رہے
ہار کر آخر کار
یا ترا پہلی 'ڈگر' پر ہولی

. . . .

دُور لہراتا ہے اُس بیتے سمے کا آنچل
ایک موہوم سا منظر مرے دل کے اندر
چٹکیاں لیتا ہے، مسکاتا ہے
ایک مچلا ہوا 'میں'
اپنے ہی گھر میں گرفتار رہا
کتنا ناتجربہ کار اور وفادار رہا

خمار قریشی

مرا نام مجرم ضمیروں میں لکھ دے

میں وہ ہوں کہ جس نے
ترے ساحلوں پر برہنہ کھڑی کشتیوں میں شرارے بھرے تھے
میں طارق نہیں تھا
میں الماس تھا
میں نے آپ اپنی وقعت کو پہچان کر
خود کو پتھر سے کم تر ہی جانا
مجھے پھر ایازی صفت مل گئی تھی
ترا حکم اوّل
ترا حکم آخر!

کہیں سنگ ریزوں میں اعلان کا زمزمہ بن گیا میں
کہیں دل گرفتہ، دل آزار لمحوں کو برگشتگی دی
کہیں سبزہ زاروں میں (آب و ہوا) شعلہ گر بن گیا میں
مگر اب
زمستاں کی شب میں
وہ برگد کا سایہ بھری چاندنی میں جھکنے لگا ہے
وہ پروین چہرہ دمکنے لگا ہے
وہ نقشِ قدم دھیمے دھیمے سُروں میں بلانے لگے ہیں
میں اب بھی الف کی سیہ تختیاں اپنی گردن میں ڈالے
تری شاہراہوں پہ ننگِ تماشا کی تصویر ہوں!!

ڈاکٹر حامد چھپروی

نئے اُردو افسانے کے خدوخال

عصرِ جدید قدروں کے زوال، ذہنی انتشار، شکست خوردگی، اندرونی ویرانی، تنہائی کے احساس اور ایک غیر محفوظیت کا دور ہے۔ تخریب کے بڑھتے ہوئے وسیلوں نے انسانی زندگی کی بے یقینی کے احساس کو شدید تر کر دیا ہے۔ صنعتی پھیلاؤ سے انسانی رشتے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ تمام قدریں ٹوٹ چکی ہیں۔ مروجہ حقیقتوں سے اعتماد اٹھ چکا ہے اور تمام ادارے بے حقیقت ثابت ہو چکے ہیں۔ جوزف ہیلر کے مشہور ناول "کیچ ۲۲" کا ایک کردار کہتا ہے:-

"مجھ سے میرے ملک کی حفاظت کے لئے جدوجہد کی بات مت کرو۔ میں اب تک ہمیشہ اپنے ملک کی حفاظت کے لئے لڑتا رہا ہوں۔ اب میں اپنی حفاظت کے لئے لڑنا چاہتا ہوں۔ ملک اب خطرے میں نہیں لیکن خطرے میں ہوں۔ آج صرف میں اپنے بارے میں سوچوں گا۔"

یہاں تمام مروجہ قدروں اور اداروں سے انکار اور صرف اپنی ذات کے تحفظ کی فکر کا اظہار ہے۔ اردو کا نیا افسانہ بھی اسی ذہنی رویے کی پیداوار ہے ـــــ اسی لئے نئے افسانہ نگاروں کا سفر تشکیک سے شروع ہوتا ہے۔ اور تمام مروجہ اقدار کے انکار سے تربیت پاتا ہوا اپنی ذات کے نہاں خانوں میں گم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیا افسانہ ہیئت و موضوع کے اعتبار سے پرانے افسانہ سے بہت مختلف ہے۔

تخلیقی اور ذہنی آزادی نئے افسانوں کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ نئے افسانہ نے ماضی کے کئی بت توڑے ہیں یہاں ہمیں ایک نیا ذہن اور نیا شعور ملتا ہے۔ اور واضح طور پر نئی منزلوں کا احساس ہوتا ہے۔ جس قسم کی نظریاتی وابستگی پہلے کے افسانوں میں ملتی ہے۔ نیا افسانہ اس ذہنی غلامی سے آزاد ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں نظریاتی سانچوں اور رٹے بنائے فارمولوں کے بجائے ایک کرب انگیز فکر کی آنچ ملتی ہے۔ اب حقیقت کا تجزیہ سیاسی عینک لگا کر نہیں کیا جاتا بلکہ یہ شخصی اور ذاتی ہوتا ہے۔ اس لئے یہ افسانے سوچے سمجھے نتائج کا سہارا لے کر آگے بڑھنے کے بجائے آزادانہ فضا میں نمو پاتے ہیں۔ اب عام انسان مزدور، کسان اور زمیندار کا لبادہ اوڑھ کر سامنے نہیں بلکہ اپنے فطری وجود کو لے کر ابھرتا ہے۔ رام لعل، جوگندر پال، اقبال متین، غیاث احمد گدی، قیصر تمکین، اقبال مجید اور رتن سنگھ وغیرہ کے افسانوں میں جدید ذہن کی یہ ناوابستگی اور تخلیقی آزادی ملتی ہے۔ جوگندر پال کے ایک افسانہ "رہائی" میں ایک کردار دوسرے کرداروں سے کہتا ہے:

"میرے دوستو! سالہا سال ہم سے وہی

فقرے بولائے جا رہے ہیں، ایک ہی طرح کے
واقعات کے جبر میں ہم سب کو محبوس کیا گیا ہے
میرا سوال ہے اس نئے واقعات، نئے خیالات،
زندگی کے نئے اسباب کی راہیں ہم پر کیوں بند
کی گئی ہے؟ ــــــ ہم نے اپنی اپنی جان
کی بازی کھیل کر اپنی رہائی کا یہ اقدام کیا ہے
آؤ، اس کھڑکی کی راہ سے نکل جائیں، آؤ
جلدی کرو، باہر نئی زندگی ہمارا انتظار کر
رہی ہے۔"

اردو کا نیا افسانہ دراصل پرانے سانچے اور فارمولوں سے رہائی پانے کی ایک زبردست اور کامیاب کوشش ہے نئے واقعات، نئے خیالات اور زندگی کے نئے اسباب کی راہوں تک رسائی حاصل کر کے نئے افسانہ نگاروں نے افسانہ کے فن کو بے پناہ وسعت دی ہے۔ اس انفرادی نقطہ نظر سے زندگی کے وسیع تر حقائق کی ترجمانی اب پہلے سے کہیں بہتر طور پر ہونے لگی ہے۔

نیا افسانہ کائنات کے جلووں کے بجائے ذات کے نہاں خانوں کو پیش کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور افادی ادب کے نظریہ نے سماجی جبریت سے افسانہ کو محدود بنا رکھا تھا۔ لیکن نئے افسانہ نگاروں کا ذہنی سفر فرد سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے ذات کے مسائل، زندگی کی معنویت کی تلاش اور وجود کی غرض وغایت پر غور و فکر نئے افسانے کے بنیادی عناصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں سماجی اور اجتماعی مسائل کے بجائے فرد کی الجھنوں کا اظہار ملتا ہے۔ نئے افسانوں میں یہ موضوعات وجودیت کی تحریک، مغربی افسانہ کے اثر، تخریب کے بڑھتے ہوئے وسیلوں سے اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے انسانی مستقبل اور پھر آزادی کے بعد ملک میں پیدا ہونے والی شکست خوردگی کا نتیجہ ہے۔

دراصل نئے افسانہ نے نفسیات اور دوسرے علوم کے نئے زاویوں کے اثرات کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ انہیں ادبی اظہار کا روپ دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی کے فن، فن کار کے نقطہ نظر اور وسیلے اظہار کے وسائل سے تعلق میں اتنی زیادہ تبدیلی آگئی کہ کہانی کی حقیقت و ماہیت ہی بالکل بدل گئی۔ نئے افسانہ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا مابعد الطبیعاتی انداز ہے۔ زندگی کی غیر مرئی حقیقتوں اور اجنبی جہتوں تک پہنچنے کی خواہش نے نئے افسانے کی پوری فضا کو مابعد الطبیعاتی سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔ نیا افسانہ نگار اپنے تجربے کو مدلل اور منطقی بنا کر پیش کرنے کے بجائے وجدانی اور مابعد الطبیعاتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیا افسانہ کسی مخصوص ماحول، زمانے یا کسی خاص نوعیت کی واردات کا عکاس ہونے کے بجائے زندگی کی غیر منظم صورت کا ترجمان ہے۔

نئے افسانے میں یہ بنیادی تبدیلی دراصل نتیجہ تھی ان فکری کوششوں کا جنہوں نے انسانی تجربوں، شعور کی ماہیت اور زمان و مکان کے مروجہ تصورات کو بالکل باطل قرار دیدیا۔ ولیم جیمس نے وقت کے نفسیاتی تصور اور تجربوں کے بہاؤ پر روشنی ڈالی۔ اس نے ذہنی زندگی کی ہمہ وقتی کو واضح کیا اور بتایا کہ انسان کی ذہنی زندگی مختلف سطحوں کی حامل ہوتی ہے۔

فرد ایک ہی وقت میں کئی تجربات کا ادراک کر سکتا ہے برگساں نے شعور کو ایک اٹوٹ نفسی بہاؤ بتایا اور کہا کہ شعور اور داخلی زندگی میں یادوں کا تسلسل قائم رہتا ہے ان جدید نفسیاتی حقیقتوں کی روشنی میں نئے افسانہ نگاروں نے تجربوں کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور زمان و مکان کے متعلق ایک نفسیاتی رویہ اپنایا۔ پہلے افسانہ عام طور پر ایک مخصوص فضا میں شروع ہو کر مختلف سچویشن سے گزرتا تھا

اور طے شدہ منطقی نتیجے پر پہونچکر ختم ہو جاتا تھا۔ نیا افسانہ ان متعین قدروں اور منطقی نتیجوں سے آزادی کا اعلان کرتا ہے۔ اسی لئے نئے افسانوں میں پلاٹ نام کی کوئی چیز خط مستقیم کی صورت میں نظر نہیں آتی۔ اب نہ تو زمانی تسلسل ہوتا ہے اور نہ ہی نقطۂ آغاز و اختتام۔ ان افسانوں میں قصہ ایک سیدھ میں آگے بڑھنے کے بجائے گھڑی کے پنڈولم کی طرح آگے اور پیچھے گردش کرتا ہے شعور کے بہاؤ کی تکنیک دراصل افسانہ کے فن کے اسی داخلی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اب کرداروں کے خیالات کی عکاسی کے بجائے کرداروں کے ذہنی عمل کو پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے کرداروں کے بجائے ٹائپ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ لیکن نئے افسانہ میں کردار ٹائپ اور کسی لیبل کے بغیر سامنے آتے ہیں۔ چونکہ روایتی کردار نگاری خارجی رنگ کی تھی اس لئے قدیم افسانہ کی دنیا میں خارجی آدمی چھایا ہوا ہے۔ اب کردار کے ذہن و شعور کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے نئے افسانے کی دنیا پر داخلی آدمی کی حکمرانی ہے۔ پہلے اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ فرد واحد کیا کرتا ہے۔ اس لئے روایتی کردار نگاری آدمی کو اس کے عمل کے ذریعہ ابھارتی تھی۔ نیا افسانہ اس پر غور کرتا ہے کہ آدمی کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ نئے افسانے کے کرداروں نے عمل کی تمام زنجیریں توڑ دی ہیں۔ پہلے کردار زمان و مکان میں اسیر ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے نکل کر ماضی حال اور مستقبل پر بیک وقت حاوی ہو گیا ہے۔

نئے افسانہ میں سب سے نمایاں علامتی اور تجریدی رجحان ہے۔ نئے افسانہ نگاروں نے عام بیانیہ انداز اختیار کرنے کے بجائے علامتوں کا سہارا لیا اس لئے افسانہ کا پورا فن علامتی اور تجریدی سانچوں میں ڈھل گیا۔ دراصل یہیں نئے افسانے کی روح پوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس کے حقیقی خد و خال کی پہچان ہوتی ہے علامتی افسانوں میں نہ تو ٹھوس ہونے کی کیفیت ملتی ہے اور نہ ہی زمان و مکان کا واقعیاتی احساس یہ کچھ غیر مرئی سا ہوتا ہے۔ اس میں زمان و مکان ذہنی تجریدی کی سطح پر واقع ہوتے ہیں۔ اس میں ٹھوس کرداروں کا کام تمثیلوں اور علامتوں سے لیا جاتا ہے۔ اسی لئے ایسے افسانوں میں اکثر و بیشتر درخت حرکت کرتے نظر آتے ہیں اور سڑکیں بوتی دکھائی دیتی ہیں۔

دراصل ان افسانوں میں علامتوں کے پیچھے ایک جہان معنی آباد ہوتا ہے۔ علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کرتا ہے۔ ایسے افسانوں میں علامتیں ایک نظام کی حیثیت سے کارفرما ہوتی ہیں۔ اور افسانہ کی معنوی کلید انہیں علامتوں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ سریندر پرکاش۔ بلراج مینرا، بلراج کومل، انور سجاد، احمد ہمیش، اور احمد یوسف کے یہاں کامیاب علامتی افسانے ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تجزیاتی مطالعہ سے نئے اردو افسانہ کے خد و خال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سریندر پرکاش کے افسانوں "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" رونے کی آواز، نئے قدموں کی چاپ، رہائی کے بعد، پیاسا سمندر اور جیبی زان وغیرہ میں جدید معاشرہ کے مسائل، شخصیت کے زوال، مشینی تہذیب کے پھیلاؤ اور جدید انسان کی ذہنی افسردگی پر گہری سوچ ملتی ہے۔ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" میں علامتوں کا ایک پورا نظام ہے۔ افسانہ عہد آفرینش کے انسان کی اپنا

اور رفاقت کے احساس سے شروع ہوتا ہے اور صنعتی دور کے اثر سے پیدا ہونے والی ذہنی علاحدگی اور رفاقت کے فقدان کے المیہ پر ختم ہوجاتا ہے یہاں ڈرائنگ روم ہمارا جدید معاشرہ ہے ۔ اور آتش دان کی بجھی ہوئی آگ قدروں کے زوال کی علامت ۔ سمندر، میدان اور پگڈنڈیوں سے ڈرائنگ روم تک کا سفر قدیم سے جدیدیت کا سفر ہے۔ منیرا کے افسانہ "ماچس" میں ایک انسان سگریٹ جلانے کے لئے ماچس کی تلاش میں ہر جگہ بھٹکتا پھرتا ہے ۔ ماچس کی یہ تلاش دراصل زندگی کی معنویت کی تلاش ہے ۔ بلراج منیرا کے یہاں جدید انسان کے فکری سفر اور داخلی کرب کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ اور صنعتی معاشرہ میں ٹوٹتے ہوئے انسانی رشتوں پر غور کیا ہے ۔ دراصل علامتی اور تجریدی افسانہ کا سفر خارج سے باطن کی طرف ہے ۔ اسی لئے اردو کا نیا افسانہ انسان کے داخلی درد و کرب کی آواز بن گیا ہے ۔

نئے افسانہ نگاروں کے نقطۂ نظر بنیادی تبدیلی نے نئے افسانے کی زبان کو بھی پچھلے افسانوں سے بہت مختلف کر دیا ہے ۔ نئے افسانہ کی زبان کی اساس خلاقانہ اور اور استعاراتی عمل پر ہے ۔ اس لئے اب افسانہ کی زبان لغوی، منطقی اور بیانیہ نہیں رہی بلکہ خلاقانہ، استعاراتی اور علامتی سانچہ میں ڈھل گئی ۔ نئے افسانہ کی زبان کا یہی تخلیقی پہلو نئے افسانہ کو شاعری سے قریب لاتا ہے

نیا افسانہ دراصل اردو افسانوں میں بتدریجی تبدیلیوں کی ایک منزل ہے اسی لئے پچھلے افسانہ سے کہیں زیادہ امکانات کا حامل ہے ۔ پھر بھی تخلیقی اور ذہنی آزادی، علامتی اور تجریدی طریق کار، زمان و مکان کی نفسیاتی نوعیت، کردار اور پلاٹ کے بجائے ایک روحانی صورتحال پیدا کرنا، ٹھوس پیکر کے بجائے ایک طرح کی بے بدنی اور زبان کا خلاقانہ اور علامتی استعمال، یہ وہ چند بنیادی نقوش ہیں جن کے ذریعہ نئے اردو افسانہ کے خدوخال کی پہچان ہوتی ہے ۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس وقت افسانہ تغیر کی زد پر ہے ۔ کئی طرح کے رجحانات سرگرم ہیں ۔ ایسے میں محض چند عناصر ہی پر اصرار کرنا اس امکانات کو محدود کر دینا ہوگا ۔

احمد یوسف

اک منظر سامنے کا

ایک شخص ستون سے بندھا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ ماتھے پہ ایک مضبوط کپڑے کی پٹی ستون سے اُس کے رشتے کو مزید قوت پہنچا رہی ہے۔ گردن میں ایک قدرے ڈھیلی سی رسی بندھی ہے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر اُسے سختی سے بند کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ یہ شخص اگر ہاتھ اُٹھانا چاہے تو ہاتھ جنبش نہیں کر سکتے۔ پاؤں چلانا چاہے تو یوں محسوس ہو کہ پاؤں منوں مٹی میں دھنس چکے ہیں۔ گردن ہلانا چاہے تو پتہ چلے کہ گردن پہ آرے چل رہے ہیں۔ سر گھمانا چاہے تو یہ لگے کہ سر پہ میخیں جڑ دی گئی ہیں اور بولنا چاہے تو کچھ ایسا گمان ہو کہ گویا لبوں کے دروازے پہ ہزاروں قفل لگا دیئے گئے ہیں۔

اب یہاں ایک ستون ہے اینٹ، چونے اور گارے کا اور ایک ستون ہے گوشت و پوست کا، جس کی [illegible] اب بھی آزاد ہیں جیسے وہ دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، سوچ سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے۔ [illegible] ہے کہ کچھ اور جسموں کے ملنے کے بعد ہی انسانی عمل وجود میں آتا ہے۔

فی الوقت تو عالم یہ ہے کہ وہ اس طرح رسیوں میں جکڑا ہے کہ بے قوت ہے، بے زبان ہے اور اس کے چاروں اور خلقت کا اژدہام ہے اور وہ جس کے ہاتھ میں کوڑا ہے اُس پہ قیامتیں برسا رہا ہے۔

شڑاپ۔ شڑاپ۔ شڑاپ۔

ایک سانپ جو برس رہا ہے، ایک سانپ جس نے خلقت کو ڈس لیا ہے۔

تم کیا جانو اس کم بخت کو۔ ایک دن میری بیوی کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ یہ وہاں پہنچ گیا۔ بیوی کہتی ہے اس کے چہرے پر خشونت تھی، درندگی تھی اور ایسا طنز تھا جو سیدھا دل پہ وار کرتا ہے۔

وہاں پہنچ کر جانتے ہو اس نے میری بیوی سے کیا کہا سنو گے؟

ایک طویل خاموشی [illegible] بن گئی

[illegible] کہا۔ جس کے ہاتھ میں کفگیر ہو اُسے دستگیری [illegible] ہے۔

شڑاپ۔ شڑاپ۔ شڑاپ۔

وہ سب دھڑکتے دلوں سے سوچ رہے تھے کہ اس سراسیمگی کے عالم میں اگر اس کی آنکھیں برہنہ پا باہر نکل آئیں تو کیا ہوگا۔

اور سنو بھائیو ــــ یہ ذلیل اوقات مجھ سے کہا کرتا کہ 'دس' ہمیشہ 'ایک' سے بڑا ہوتا ہے میں اسے سمجھاتا کہ ایک اور ایک اور ایک اور ایک ــ تا آنکہ یہ دس ہوتے ہیں اس لئے بنیادی اہمیت "ایک" کی ہے اور بڑا وہ ہے

جو بنیادی اہمیت رکھتا ہو۔ یہ بات کبھی بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ایک اور ایک اور ایک کو ہمیشہ 'ایک' کے خلاف اکساتا رہا۔

سڑاپ۔ سڑاپ۔ سڑاپ۔
خلقت ... گئی کہ کہیں اس کے چیتھڑے نہ بکھر جائیں
کہ وہ ستون ... پر کھڑا ہے مگر اس ستون کے
... ن ہے اور یہاں سے وہاں تک۔
تازہ مچھلیاں ...

سڑاپ۔ سڑاپ۔ سڑاپ
لوگ سختی سے آنکھیں بھیچ لیتے ہیں اور پوری طاقت سے اپنی آواز کو اپنے حلقوم میں اسیر کر لیتے ہیں کہ ان کی ایک 'آہ' یا ایک 'واہ' پھنکارتے ہوئے کالے ناگ کو متوجہ کرنے لئے کافی تھی۔

اور سنو، مجھ سے کہتا تم 'ساز' اور 'باز' کے فرق کو سمجھو۔ دیکھو یہ جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے، جب ساز اٹھاتا ہے تو آسمان تک وجد میں آجاتا ہے۔ ایک تم ہو کہ محض چیخ۔ محض جھپٹ۔

میں اس پوچھتا ہوں کہ آخر پڑوس کا وہ لئیم اس کا کون ہے۔ بھائیو تم ہی بتاؤ کون ہے اس کا۔

سڑاپ۔ سڑاپ۔ سڑاپ۔
کانپتے ہوئے لوگ سوچ رہے ہیں کہ کہیں مقید اور آزاد جسموں کی راہ سے ہوتی ہوئی اس کی روح نہ باہر نکل آئے۔ اور تب ہم میں سے ایک ایک سے یہ پوچھے کہ ہم نفسو تمہاری روحیں کدھر گئیں؟۔ پھر ہم اسے کیا جواب دیں گے؟

سڑاپ۔ سڑاپ۔ سڑاپ۔
اور جانتے ہو اس ناہنجار کے ظلم کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔
سنو یہ کہتی ... کہانی ہے۔ اس نے ببرے بچوں کو بہکایا کہ اگر تمہارا باپ کہے کہ روشنی گل کر دو تو تم کبھی اس کی بات نہ ماننا کہ آخر پروانوں کو بھی تو جینے کا حق حاصل ہے۔

اسے تو انسانی آبادی کا سکھ چین سرے سے پسند نہیں تھا پروانے اگر سارے میں گشت لگاتے رہیں تو تمہیں بتاؤ کہ کیا کوئی آرام سے سو سکتا ہے۔

سڑاپ۔ سڑاپ۔ سڑاپ۔
لوگ سوچنے لگے کہ یہ تو پتہ نہیں کس مٹی کا بنا ہوا ہے اسے تو شاید کچھ نہ ہو مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں وہ پھنکارتا ہوا، برستا ہوا، ڈستا ہوا سانپ دم نہ توڑ دے۔ پھر اس شخص کے ہاتھ میں کیا رہ جائے گا۔

ان کی آنکھیں کچھ کھلی تھیں، کچھ بند تھیں۔ ان کے ہوش کچھ باقی تھے، کچھ اڑ چکے تھے۔ کچھ پتھر بن چکے تھے، کچھ پتھر بننے کے عمل میں تھے کہ ایک عجیب سے منظر نے انھیں تازہ دم سا کر دیا۔

ایک نوجوان مجمع سے نکل کر دس قدم پیچھے گیا۔ وہ معمولی قمیص، پاجامے میں ملبوس تھا اور اس کے پاؤں میں ربڑ سول کے جوتے تھے۔

نامرد یہ بھی سوچ کہ صرف اس ماں کے خصم کے ہاتھ کا پھنکارتا ہوا سانپ ہی کیوں بولتا ہے، وہ کیوں نہیں بولتا جو رسیوں میں جکڑا کھڑا ہے اور جس کے منھ میں کپڑا ٹھسا ہے۔
رنگیلے اسے پکڑنا۔
میتے اس تخم حرام کی خبر لو۔
یہ سور کا بچہ یہاں کیسے آ گیا۔
خلقت کی آنکھوں کے شہر روشن ہو گئے اور نوجوان بھاگتا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے رنگیلے، میتے اور جانے کون کون۔

غزلیں

لطف الرحمٰن

دھوپ کی بارش میں خوابوں کے شجر جل جائیں گے
رت بدلتے ہی یہ منظر راکھ میں ڈھل جائیں گے

آئے کی اونچے پہاڑوں سے وہ برفیلی ہوا
شعلۂ آواز کے سب پیرہن گل جائیں گے

شاخ کی گردن میں ہوں، یا خاک کی آغوش میں
اپنی خوشبو ہم فضا کے جسم پر مل جائیں گے

یہ پرانے ہی سہی، کھوٹے نہیں، مت پھینکئے
کل یہ سکے بھی کسی بازار میں چل جائیں گے

آئینہ تھے ہم کسی کی راہ کے پتھر نہ تھے
کیا خبر تھی، بے سبب دنیا کو ہم کھل جائیں گے

تنہا تھا میں بھی زرد ہواؤں کی مار پر
لکھا ہوا تھا نام بھی خنجر کی دھار پر

سنسان راستوں کی نگہبان بن گئیں
آنکھوں، کو کس نے ڈال دیا انتظار پر

کچھ دیر اور سینۂ صحرا کا نقش ہوں
ہوتا ہے پھر سوار بھی رخش غبار پر

بکھرا ہوں اس طرح میں سمٹنے کے نام پر
سمٹے ہوئے ہیں لوگ میرے انتشار پر

اس دشت سے گزر کے سفر پانیوں کا تھا
تحریر ہوگا یہ مرے لوح مزار پر

شامل رہا میں بھیس بدل کر اسی کے ساتھ
نکلا تھا اک گروہ جو میرے شکار پر

کچھ زخم کھا کے شام تک خیمے میں لوٹ آئے
جاگی سحر تو نکلے نئے کارزار پر

غزلیں

مصوّر سبزواری

جو انتظار کی شامیں نچوڑتا ہوگا !
نہ اک چراغ بھی گھر میں وہ چھوڑتا ہوگا

یہ اور بات ملی دشت زاد پیاس اسے
وہ اپنا رشتہ سمندر سے جوڑتا ہوگا

عجب [illegible]س میں نکلا ہے چمنیوں سے دھواں
غریب شہر کوئی شہر چھوڑتا ہوگا

رہے نشاں کسی بے نام اسم کا کب تک
ہماری قبر کو سیلاب توڑتا ہوگا

وہ شہسوار یہ لگتا ہے اب بھی جنگل سے
ہمارے گھر کی طرف باگ موڑتا ہوگا

نہیں تھا چشم صدف میں مصوّر ایک گہر
وہ خالی سیپ کی آنکھوں کو پھوڑتا ہوگا

احتشام اختر

خواب آنکھوں میں نہاں ہے اب بھی
بجھ گئی آگ دھواں ہے اب بھی

وہ مرے پاس نہیں ہے لیکن !
اس کے ہونے کا گماں ہے اب بھی

کیا دلاور کوئی آیا ہی نہیں
راہ میں سنگِ گراں ہے اب بھی

کوئی پیاسا ہی نہیں ہے ورنہ
چشمۂ شوق رواں ہے اب بھی

گھر کو کاندھے پہ لئے پھرتا ہوں
مجھ میں یہ تاب و تواں ہے اب بھی

مَیں تعلّق سے پرے ہوں لیکن
مجھ سے وابستہ جہاں ہے اب بھی

محمد منشا یاد

کوئی ہے!

(کون ہو تم اور کیا دیکھتی ہو ـــــ شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں تمہیں نہیں جانتا)

"تو خواتین و حضرات ـــــ میں جناب صدر کی اجازت سے سب سے پہلے اپنی غزل پیش کرتا ہوں۔"

"ارشاد۔"

"دشمن اناج کا۔"

"اناج؟ ـــــ وہ کیا ہوتا ہے۔"

"بے شرم ـــــ اپاہج باپ پر ترس نہیں آتا تو بوڑھی ماں بہن کا ہی کچھ خیال کر۔"

"خیال سے کیا ہوتا ہے۔"

"تمہارا سر ـــــ نوجوان ہے مگر تو کچھ کرنا بھی چاہیے۔"

"میں کرنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں تمہارے لئے، آپا کے لئے، بابا کے لئے اپنے بچوں، پوتوں، پڑپوتوں اور ان کے پڑپوتوں کے لئے۔"

"پتہ نہیں کیا بکتا ہے۔"

"میرے بچو ـــــ میرے پوتو ـــــ میرے پڑپوتو ـــــ میری آنے والی نسلو! یقین جانو میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں، اپنے لئے نہیں تمہارے لئے تم سب کے لئے۔"

(تمہاری آنکھیں بڑی دل کش ہیں ایسی آنکھیں تصویروں میں ملتی ہیں ایک بار میں تصویروں کی نمائش دیکھنے گیا۔ دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ فیس بھی نہیں تھی۔ ایک تصویر مجھے بے حد پسند آئی۔ میں دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر وہ مجھ سے کہنے لگی جاؤ مجھے میلا نہ کرو۔ میں ......)

"اور اب میں جناب الف سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ جناب الف۔"

"آپ کا دفتر کہاں ہے؟"

"میرا دفتر بے حد طویل و عریض ہے۔ کھول بیٹھوں تو۔"

"ایئر کنڈیشنڈ بھی ہوگا۔"

"نہیں ساؤنڈ پروف ہے۔"

"ساؤنڈ پروف؟"

"ہاں ـــــ کوئی چیخ باہر سنائی نہیں دیتی۔"

(تم اس قدر دور کیوں بیٹھی ہو جب تم مسکراتی ہو، لہو کی بوندیں ٹپ ٹپ میرے دل پر گرتی ہیں اور میرا دل صابن کی گاچی کی طرح کھُرنے لگتا ہے، اگر تم ہنس پڑو تو میں خون میں لت پت ہو جاؤں)

"بے غیرت ہے۔"

"اس کا خون سفید ہو گیا ہے۔"

"کون کہتا ہے، ـــــ یہ دیکھو، کیا یہ سفید ہے؟"

"یہ تو نے کیا کیا؟"

"جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"خدمت ہے ——— میری ——— میں منیجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آپ تشریف رکھیں میں ان کو اطلاع دیتا ہوں۔"

"جی شکریہ۔"

"شاید آپ ان کے عزیز ہیں؟"

"جی نہیں مجھے ملازمت کی تلاش ہے۔"

"ملازمت ہے ——— تم ——— یہاں کوئی جگہ نہیں تم جا سکتے ہو۔"

"جی ہاں ——— میں ہر جگہ آ جا سکتا ہوں۔"

(تمہارے بال ——— تم اپنے بال سمیٹ کیوں نہیں لیتی ہو۔ تم اتنے کروڑوں اربوں بال کیسے اٹھائے پھرتی ہو مجھے لمبے، گھنے اور بہت سارے بال بڑے اچھے لگتے ہیں۔ ایک بار میں نے ایک لڑکی کی تصویر بنائی اس کے بال بے حد لمبے تھے۔ مگر آپا کو تصویر پسند نہ آئی اس میں بال ہی بال ہیں لڑکی نہیں ہے۔ بے چاری آپا کو کیا پتہ لڑکی کا منہ تو دوسری طرف تھا)

"خواتین و حضرات ——— حضرت جیم تشریف لاتے ہیں۔"

"کیا کام کر سکتے ہو؟"

"دنیا کا ہر کام کر سکتا ہوں۔ بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔ نہیں ڈھو سکتا ہوں۔ لکڑی چیر سکتا ہوں۔ فرش صاف کر سکتا ہوں، کھانا پکا سکتا ہوں۔"

"نہیں کھانا پکانا آتا ہے۔"

"ہاں مجھے کھانا پکانا اور کھانا بہت اچھا لگتا ہے۔"

(تمہارا نام کیا ہے۔ کیا نام ہو سکتا ہے۔ سعیدہ، [illegible]دہ، عبیدہ، جمیلہ، حامدہ، فرحت ——— کوئی سا بھی ہو مجھے تو سارے نام اچھے لگتے ہیں)

"جی ڈگری بھی ——— مگر [illegible]"

"کیا مطلب؟ ——— نمبر کم تھے۔"

"نہیں سر ——— نمبر تو بہت تھے۔ پچھلے ایشوں میں ہمارے گھر میں پانی چڑھ آیا تھا۔ ٹرنک میں ساری چیزیں رکھی خراب ہو گئی تھیں۔"

"ہمیں زیادہ پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ملازمت ملنے پر تم چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ ویسے بھی ہم تمہاری ڈگری کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتے۔"

"جی بے حرمتی کی کوئی بات نہیں میں برا نہیں مناتا، ویسے بھی وہ بھیگ کر خراب ہو گئی ہے۔"

(نہ کرو ——— مجھے خوار نہ کرو ——— مجھے اس طرح دلچسپی سے نہ دیکھو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا میری راتوں کی نیند حرام ہو جائے گی)

"ماں مجھے بھوک لگی ہے۔"

"وہ آتی ہو گی ہم سب اس کے منتظر ہیں۔"

"میں اس کی کمائی اور لائی ہوئی روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

"تو پھر ڈوب مر۔"

"ہاں مجھے ڈوب مرنا چاہئے لیکن یہ جرم ہے وہ میرا چالان کر دیں گے مجھے ان سے بے حد ڈر لگتا ہے۔"

(کہاں رہتی ہو ——— کس شہر سے آئی ہو ——— کیا وہاں سورج نکلتا ہے۔ لو چلتی ہے۔ کیا تم پر سورج کی شعاعیں کبھی نہیں پڑیں۔ اگر ایسا نہیں تو تمہارے آس پاس بیٹھی ہوئی گوری چٹی لڑکیاں اس قدر میلی کیوں لگ رہی ہیں)

"اب میں جناب [illegible] سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں۔"

"[illegible]"

"ارشاد۔"

"[illegible] گلاب، شفق، [illegible]"

آنکھ

"تیری قسم ماں ——— ——— وہاں ہڑتال ہو گئی۔"

"اچھا ٹھیک ہے ——— کھانا کھالے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے ———"

"کیوں بھوک نہیں ہے ———"

"اب مجھے کبھی بھوک نہیں لگے گی۔ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر پھینک دیا ہے۔"

(بس کرو۔ ختم کرو ——— خدا کے لئے باز آجاؤ ——— تم تو مجھے مار ڈالنا چاہتی ہو۔ تم نہیں جانتی ہو میں کس قدر بکھرا ہوا ہوں تم مجھے کیوں ریزہ ریزہ کرنا چاہتی ہو۔ مجھ پر ترس کھاؤ ——— ——— میرے بچوں، میرے پوتوں ...)

"کاکا ——— کوئی کام ملا۔"

"بابا ——— میں کاکا نہیں ہوں۔ میں پیدا ہوتے ہی ادھیڑ ہو گیا تھا۔"

(شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں تمہیں نہیں جانتا۔ مگر شاید تم مجھے جانتی ہو کمال ہے۔ تم خوابوں پر یقین کرتی ہو۔ مجھے تو بھول ہی جاتے ہیں)

"اب آپ کے سامنے ملک کے نامور شاعر حضرت نون تشریف لاتے ہیں۔"

(اچھا تو تم مجھے ہپناٹائز کر رہی ہو ——— مگر یہ ——— یہ ظلم ہے۔ یہ زیادتی ہے۔ مجھے آزاد کر دو۔ میں گردن گھمانا چاہتا ہوں میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں میں اسٹیج پر جانا چاہتا ہوں لیکن اسٹیج کہاں ہے؟

اور لوگ کہاں ہیں؟ ——— میرے بازو کہاں ہیں؟ میرے پاؤں؟ میری ٹانگیں؟ میرا دھڑ؟ ——— میرے کندھوں پر میری گردن نہیں ہے۔ شاید میں نے خود اتار کر کہیں رکھ دی ہے۔ کہاں رکھ دی ہے؟)

"دن بھر کاغذ کالے کرتا رہتا ہے؟"

"تصویریں بناتا اور شعر کہتا ہے ماں۔"

"یہ موئے شعر کیا ہوتے ہیں؟"

"جیسے وہ پکے مکان والوں کے ریڈیو پر گائے جاتے ہیں۔"

"اسے شرم نہیں آتی ——— پکے مکان والوں کی ریس کرتا ہے۔"

(مجھے میری گردن لا دو۔ میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا دھڑ میری گردن کے لئے تڑپ رہا ہے۔ رحم کرو ——— خدا کے لئے ———)

"نکل جا ——— ——— نکل جا گھر سے"

"بے شرم ——— بے غیرت"

میری غیرت کدھر گئی ——— ——— اور میری گردن؟ ——— اور لوگ؟ ——— ——— تم ——— تم ڈائن ہو ——— تم نے ہنستے بولتے انسانوں کو مجسموں میں بدل دیا۔ تم مجھے پتھر کرنا چاہتی ہو ——— لیکن میں پتھر ہونا نہیں چاہتا ——— میرے بچو ——— میرے پوتو ——— میرے پڑپوتو ——— گواہ رہنا کہ میں نے چاہا تھا پتھر نہ ہونے پاؤں)

"لوگو تم کہاں ہو؟"

"تم سب کدھر چلے گئے ——— کوئی ہے؟"

"کوئی ہے ——— کوئی ہے۔"

"ہائے، وہ ہنستے مسکراتے لوگ ——— !"

"اب حضرت حمزہ کی باری ہے۔ خواتین و حضرات ——— حضرت حمزہ"

"حمزہ؟"

(کیا سب لوگ زندہ ہو گئے معاف کرنا ——— ہم نے تمہیں ڈائن کہا ——— تم تو کسی ملک کی شہزادی ہو ——— پری ہو ———)

"آپ کون ہیں"

"میں شاعر ہوں۔ میں حمزہ ہوں۔"

"پاگل ہے۔"

"اوئے اوئے"
"آپ تشریف لے جائیے۔"
"میں شعر سناؤں گا۔ آپ نے مجھے پکارا ہے۔"
"میں نے جناب حمزہ کو پکارا ہے آپ تشریف لے جائیں۔"
"پڑھنے دو۔ پڑھنے دو۔"
"بیٹھ جائیے۔"
"مکھی مچھر کھٹمل، پیٹ نزلہ کھانسی بلغم خون بخار۔"
"خوب کہا ہے۔"
"کہیں سے اُڑایا ہے۔"
"پاگل ہے۔"

"اوئے اوئے۔"
(نہ جاؤ — ہری جی — ٹھہر جاؤ — شعر تو سنو — بات تو سنو — مجھے اپنے بال تو دیتی جاؤ — مجھے اپنے ساتھ لے چلو — ٹھہرو — میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں)

—— !

"حضور — اس نے زبردستی اسٹیج پر چڑھ کر الٹے سیدھے دو ایک شعر سنائے پھر دیکھتے ہی دیکھتے بھاگ کر کھڑکی سے کود گیا —— یہی ہمارا مشترکہ بیان ہے۔"

غزلیں

شاھد کلیم

میں کتنی بار ملا یہ حساب کیا کرتا
کہ آئینہ سے بھلا اجتناب کیا کرتا

اک اپنے آپ کو عرقاب کر دیا میں نے
خدا کی طرح نزولِ عتاب کیا کرتا

بعید روز و شب سے سفر کی نہ تھی کوئی صورت
کہ دیکھتا تھا ہر اک رات خواب کیا کرتا

بھٹکتا پھرتا ہمیشہ تلاش میں اپنی
میں اپنے آپ کو مثل سراب کیا کرتا

نہ جانے کتنے ہی اوراق تھے بچے اس کے
میں رکھ کے کمرے میں اپنی کتاب کیا کرتا

اس جھوٹی آس پہ ہی کچھ اور دن جیوں گا
دشتِ سکوت میں بھی بانگِ جرس سنوں گا

تنہا ہوں میں شب کی کوئی مجھے پکارے
آواز پر میں اس کی گھر سے نکل پڑوں گا

جلتی ہوئی ہوا جب پیچھا مرا کرے گی
میں اپنے سونے گھر کے گوشے میں چھپ رہوں گا

اک سلسلہ سے سارے ہی پیڑ تشنہ لب ہیں
میں خود نہ جانتا ہوں کس پر برس پڑوں گا

وہ مجھ سے بھاگتا ہے میں اس سے بھاگتا ہوں
اپنی کہانی پوری کیسے میں کر سکوں گا

لیلیٰ بالبکی
ترجمہ: نفی امام

آؤ چاند کو چلیں

آنکھیں بند کر لینے کے بعد بھی اپنے اردگرد ہر چیز کو دیکھ سکتی ہوں۔ لانبا صوفہ، جو کمرے کی ایک لمبی دیوار کے سہارے اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا ہے بقیہ دیواروں پر شیلف چھوٹی سی میز قالین پر رنگین کشن سفید لیمپ جو بڑے سے مٹی کے تیل کے لیمپ سے ملتا جلتا ہے اور دیوار میں ایک سوراخ سے لٹکا ہوا کھونٹیوں سے آراستہ فرش پر لٹکا ہوا تھا، یہاں تک کہ کھڑکیاں بھی، جو ہم نے بغیر پردوں کے چھوڑ رکھی تھیں۔ دوسرے کمرے میں ایک چوڑا صوفہ ہے آئینے سے ملحق میز دیوار میں بڑی سی الماری اور دو مخملی کرسیاں، شادی کے دن سے اب تک ہم نے اپنے چھوٹے سے گھر میں کسی چیز کو بدلا نہیں۔

اپنے شوہر کو بڑبڑاتے سن کر کہ صبح ہو گئی ہے اور شہر بھر میں مرغ بھی جاگ رہے ہیں، میں نے آہستہ سے پپوٹوں کو کھولا، پھر میں نے کھڑکی کے سامنے اسے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ جہاں صبح کا اجالا اس کے ننگے تن پر اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔ مجھے اس کے ننگے بدن سے پیار تھا۔

میں نے پھر سے آنکھیں موند لیں، و اپنی دنیا میں لوٹ آئی، میں نے اسے آواز دیا کہ لوٹ آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ جائے کہ میں اسے چومنا چاہتی ہوں، وہ خاموش رہا۔ مجھ سے یوں الگ ہو کر دور جا کھڑے ہونے کے اس انداز سے ہی سمجھ گئی کہ وہ کوئی اہم بات کہنے کے لئے خود کو تیار کر رہا ہے۔ اس وقت وہ جذباتی اور بڑا ہی بداخلاق دکھائی دیتا تھا۔ فیصلہ کرنے اور پھر انہیں نافذ کرنے پر بیتاب، اور رایک میں تھی اس کے بالکل برعکس، اس سے جھگڑنے، بحث و مباحثہ کرنے کے لئے میرے لئے ضروری ہے کہ اس کے ہاتھ تھامے رہوں یا اس کے کپڑوں کے لمس کو محسوس کروں۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں تکیہ دور پھینک دیا جسے میں اب تک بھینچے ہوئے تھی اور اس کی قمیص کو جھپٹ کر اپنے سینے پر پھیلا دیا۔ پھر میں نے چھت کو دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ کیا اسے سمندر نظر آرہا ہے۔؟

ہاں، نظر آرہا ہے، اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا کہ سمندر کا رنگ کیسا ہے؟

ایک سمت گہرا نیلا اور دوسری جانب راکھ سے مشابہ سفید اس نے کہا۔

میں نے پوچھا کہ کیا سرداب بھی وہیں ہیں

ہاں، اب بھی وہیں ہیں؟۔ ان گھروں کے بیچ میں جو ایک دوسرے میں گھسے ہوئے نظر آتے ہیں، اس نے جواب میں کہا، اور عمارتوں کی چھتوں پر پانی اچھل پڑا ہے۔

میں نے کہا —— مجھے کھجور کے اس ایک تنہا درخت سے انتہا پیار ہے جو ہمارے یہاں سے دیکھو تو سمندر کے وسط میں نظر آتا ہے اور سرو میرے دماغ میں سفید قبروں کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔

دیر تک وہ چپ رہا اور میں چھت کو گھورتی رہی۔ پھر اس

...نے کہا ـــــ مرغ بانگ دے رہے ہیں۔ اور میں نے فوراً اُسے بتایا کہ پرندوں میں مرغ مجھے پسند نہیں ہیں کیوں کہ وہ فضا میں اُڑنے سے قاصر ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا کہ سامنے والی عمارت کی ایک کھڑکی سے کیسے روشنی نظر آ رہی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے باوجود شہر کی بتیاں بجھی جا رہی ہیں ـــــ صرف ہم ہی دو جنہوں نے ساری رات ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے ہوئے گزار دی ہے۔ اس نے کہا... یہ شاید تم نے بہت پی لی ہے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے جھٹ اس کی بات کاٹ دی کہ مجھے "بہت پی لی ہے" جملے سے نفرت ہے۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ میں ناراض ہونے والی ہوں۔ لہٰذا اس نے فوراً موضوع بدل دیا اور بولا ـــــ شہر مختلف رنگوں اور سائزوں کے چمکتے بیش قیمت پتھروں کا ڈھیر لگ رہا ہے

میں نے کہا ـــــ اس وقت میرے خیال میں شہر بچوں کے ان رنگین ڈبوں کی طرح نظر آ رہا ہے۔ جنہیں پھونک مارو تو ڈھیر ہو جائیں۔ اور کیا تمہارا اکھڑ اپنے دو ٹکڑوں سمیت بادل سے ڈھکا ہوا فضا میں بہہ رہا ہے۔ وہ بولا کہ اس کی زبان خشک ہے۔ اور وہ ایک نارنگی چاہتا ہے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا جملہ ختم کر دیا کہ اگرچہ اس شہر کے علاوہ میں کسی دوسرے شہر میں نہیں رہی ہوں پھر بھی مجھے اس سے نفرت ہے، کہ اگر میں نے یہ خواب نہ دیکھا ہوتا کہ ایک دن میں ایسے آدمی سے ملوں گی، جو مجھے اس شہر سے بہت دور لے جائے گا۔ تو بہت پہلے ہی اُداسی سے مر گئی ہوتی۔ یوں لگا جیسے اس نے میرا آخری جملہ سنا ہی نہ ہو۔

اس نے دہرایا ـــــ میرے حلق میں کانٹے اٹک رہے ہیں اور مجھے نارنگی چاہیئے میں نے اس کی خواہش کو نظر انداز کر دیا اور کہے چلی گئی کہ اس کی قربت میں مجھے ذرا پرواہ نہیں کہ میں کہاں ہوں، انتظار کی تاب نہ لا کر وہ مجھ پر پھٹ پڑا

تم مسلسل بچے پیدا کرنے سے انکار کئے جا رہی ہو۔ آخر کیوں؟

میں اُداس ہو گئی۔ احساس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کو پوری... طاقت سے بھینچ دیا ہو، آنسو میری آنکھوں میں بھر آئے۔

شادی کئے ہوئے ہمیں کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟ اس نے پوچھا میں نے ایک لفظ نہ کہا، صرف اپنی نظروں سے اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اس نے روکھے پن سے بات جاری رکھی ـــــ شادی کئے ہمیں ایک سال اور کچھ مہینے ہو چکے ہیں اور تم ہو کہ مسلسل انکار کئے جا رہی ہو۔ حالانکہ شادی سے پہلے تمہیں بچوں کا جنون تھا۔ تم ان کے لئے مری جا رہی تھیں۔

وہ ڈگمگایا اور صوفے پر ہاتھ مارتے ہوئے برس پڑا لے کر سی، کیا تجھے اس کی التجا، یاد نہیں؟ اور لے ہمپ، کیا تو نے اس کا رونا نہیں سنا تھا؟ اور لے تکیہ، کتنی ہی بار کیا اس نے تمہیں بچہ سمجھ کر اپنے سینے سے چمٹائے لمبی راتیں نہیں گزاری تھیں؟

میں نے نرمی سے کہا کہ کیا مردہ چیزیں خیالوں، آوازوں اور حس سے روشناس ہوتی ہیں؟

اور تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ مردہ ہیں؟ اس نے غصے سے پوچھا، میں نے جواب دیا کہ چیزیں مردہ نہیں ہوتیں لیکن وہ لوگ ہی ہیں جو انہیں ان کی دھڑکن عطا کرتے ہیں، اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ فی الحال وہ چیزوں کے متعلق بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں بھی ہمیشہ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے سے گریز کرتی رہی ہوں۔ لیکن آج وہ مجھے فرار نہیں ہونے دے گا۔ خالی خالی ذہن کے ساتھ میں نے کہا ـــــ میرے اردگرد چیزیں، یہ کوچ، یہ قالین، یہ دیوار، یہ لیمپ، یہ گلدان، یہ شلیف۔ اور یہ چھت..... .... وہ آئینہ ہے، جس میں مجھے باہر کی دنیا کا عکس نظر آتا ہے۔ میں انہیں ہرگز نہ چھوڑا کروں گی۔

وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخا ـــــ... وہی گھومے ہوئے چیزوں کا جھگڑا! میں ابھی اور اسی وقت جاننا چاہتا ہوں کہ

تم بچوں کی پیدائش سے کیوں انکار کرتی ہو؟ ——————
—— اور خود کو ناقابل برداشت پاکر میں بھی چیخ اٹھی ——
کبھی تم نے بھی بچوں سے انکار کیا تھا! تھوڑی دیر کے لئے وہ خاموش
رہا پھر بولا —— میں نے انکار شادی سے قبل کیا تھا۔
—— طنز سے میں نے کہا —— اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ
اس سے ناراض تھا —— وہ ٹھہر کے سنجے، وہ اتنی اجازت
مہربانی کے لئے گذارش کیا کرتا تھا تاکہ وہ مجھ سے اور میں اس سے
مل سکوں، تاکہ وہ مجھے اپنی بانہوں میں بھر سکے اور میں اسے اپنی
بانہوں میں۔ تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے پیار میں غرق
کرسکیں، یہ وہ تھے جو ہمارے لئے ہماری ملاقاتوں کی جگہ، ان تک
ہمارے قدموں کی گنتی اور وقت تعین کیا کرتے تھے۔ اور تنہائی
میں چوری چوری ہمارے پیار کا مذاق اڑاتے، دن میں تین بار
پیٹ بھرتے، من پسند قہوے پیتے اور سگریٹ پھونکتے، قہقہے لگاتے
ہماری محبت کی کہانی کو بہت چٹخارے لیکر چباتے ہوئے۔
—— مجھے دوسروں کی پرواہ نہیں، اس نے گھٹی گھٹی آواز میں
بڑبڑاتے ہوئے کہا، میں ایک اور عورت سے بندھا ہوا تھا۔
آہ! میں آخر کس طرح یہ تکلیف برداشت کرسکتی ہوں؟
یہ سارا جنون جو مجھے اس سے ہے وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی بزدلی کا
اعتراف کیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے دائیں ہاتھ کی طرف
دیکھو اور پوچھا کہ کیا میرا خون اس سے اب بھی فرش پر ٹپک رہا ہے؟
—— تم پاگل تھیں جب تم نے اپنے خیال کو پورا کرنا چاہا۔
میں نے یہ دروازہ کھولا، اسی کمرے میں داخل ہوا اور تمہیں کوچ پر پھیلے
ہوئے پایا۔ تمہارے ہاتھ کی نسیں کٹی ہوئی پڑی تھیں اور تمہاری
انگلیاں خون کے سمندر میں تیر رہی تھیں، تم جنونی تھیں، میں نے
تمہیں یقیناً کھو دیا۔ میں اداس اداس مسکرا دی۔ اس حال
میں میں اس کی قمیص کھینچ کر اپنے سینے پر پھیلا رہی تھی اور میرا
چہرہ اس میں ڈوب کر اس کی مانوس مردانہ بو سونگھ رہا تھا، میں
نے کہا کہ میں نے خود کو اس کی محبت میں گم کر دیا۔ ساری دنیا

سے بے خبر میں نظر نہ آنے والی آندھی تھی۔ میں نے التجا کی کہ وہ
کچھ اور میرے نزدیک آجائے اور مجھے اپنے ہاتھ تھام لینے دے
میں انہیں تھامنے کی خواہشمند ہوں مگر وہ دور کھڑا رہا
بالکل غیر متحرک، میں اس سے حاملہ ہونے سے منکر ہوں، اس
لئے وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مصر ہے کہ مجھے اب اس سے پیار نہیں رہا
کیا ...... ؟ میں تڑپی، میں نے چیخ کر کہا۔ وہ یہ الزام
مجھے ہرگز نہیں دے سکتا۔ گذشتہ رات ہی کو لے لو، میں اس کے
پہلو میں پڑی تھی اور اس نے خود کو گہری نیند کے سپرد کر دیا تھا
جب کہ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں نے صاف صاف کہدیا کہ
اس کا جلدی سو جانا اور میرے اس کے پہلو میں پڑے تنہا تنہا
رہنا۔ میرے لئے کتنا جاں گسل تھا۔ اس نے فوراً کہا کہ اسے راتوں
میں کوئی ایسی رات یاد نہیں جو میں نے جاگ کر گذاری ہو، اس طرح
اسے یقین ہے کہ اس کے سوتے ہی میں بھی سو جاتی ہوں، نفرت
میرے دل میں اتر آیا اور میں نے کہا کہ یہ پہلی بار تھا جو اس نے
یوں اپنے پہلو میں جگا ہوا اور تنہا چھوڑ دیا تھا پھر میں نے اس
حادثے کی تفصیل بتا دیا۔ کس طرح وہ سو رہا تھا، کس طرح اس
کی سانس تیزی سے چل رہی تھی جب کہ میں اس کے پہلو میں لیٹی چپ
چاپ سگریٹ پھونک رہی تھی کہ یکایک کمرے کی خاموشی میں
کے پار میں نے چادر سے ایک پاؤں کو پھیلتے ہوئے دیکھا تھا، میں نے
اسے ہلانا چاہا۔ مگر وہ بے حس رہا۔ یکایک پوری طاقت سے
چلانے کی خواہش میرے دل میں ابھری، میں نے اسے ہلا تا
مگر وہ بے حس ہی رہی، پھر میں نے اپنے چہرے کو اس کے بالوں
دفن کر دیا تھا۔ میں چپ چاپ روتی رہی، میں نے سوچا ا
میں نے محسوس بھی کیا تھا کہ میں اس کے اور اپنے پاؤں
امتیاز کرنے سے قاصر تھی۔ دبی دبی سی آواز میں اس نے کہا
—— اس زمانہ میں لوگ پیار کی وجہ کر نہیں مرتے۔ م
سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے فوراً ہی جواب دیا ——
یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس زمانہ میں لوگ بچے نہیں جنتے۔

وہ بولا ــــــ تمہارے خیال میں کیا سچ مچ بیس سال بعد بھی یہ کمرہ ایسا ہی ہوگا ، ان بیس سالوں میں کیا بدلا ہے ؟

ــــــ خوشی سے کم کر کے خیال سے بول اٹھی ــــــ بالکل اس ننھے بچے کی طرح تھی ۔ جو اپنی پیٹھ کے بل پڑا ٹمٹماتے ستاروں کو ٹکر ٹکر دیکھے جاتا ہے اور انہیں چھونے کی خواہش سے بے تاب ہو کر ان کی طرف اپنے ننھے ننھے ہاتھ بڑھاتا ہے ۔

اس نے پوچھا ــــــ جیسے تم مجھے برابر دھوکا دے رہی تھیں ؟

کیا ؟ یکایک مجھے احساس ہوا کہ اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا ہے ۔ جیسے وہ لڑائی جیتنے کے لئے مجھ پر حملہ آور ہوا ہے ، میں نے تابوں بھی کر دہ عورت صرف عورت جو اپنے مرد سے غیر مطمئن ہو بہت بے تابی اور اشتیاق سے بچے کی خواہش کرتی ہے تاکہ وہ بھی دنیا میں سمٹ جائے ۔

اس نے فوراً بات کاٹ ڈالی ــــــ اور کیا تم مطمئن تھیں ؟

میں نے بتایا کہ ہم دونوں گھبرائے ہوئے تھے کہ ہم نے زندگی کے انجان راستوں کو سمجھ نہیں سکے تھے یا ہم خوف سے کانپ رہے تھے ، ہم ہمیشہ اجنبی چہروں سے گھبراتے رہے ہیں اور ان کی آواز سنتے رہے ہیں اس لئے ، اپنے لئے ، میں نے موت سے مقابلہ کیا ہے کہ زندہ رہ سکوں ، وہ غلطی پر ہے ۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ــــــ وہ بڑبڑایا

میں نے کہا کہ ساری مصیبت کی جڑ اس کی یہی ناسمجھی ہے ــــــ اور اگر کبھی میں نے اُسے بتا بھی دیا کہ کیوں مجھ میں حاملہ ہونے کی سکت نہیں ، تو وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے گا ۔

غلطی ! وہ چیخا ، غلطی ! میں اس کی قمیص سے کچھ اور چمٹ گئی ۔ تاکہ اس سے طاقت حاصل کر سکوں اور پھر آہستہ آہستہ بہت ہی نرم لہجے میں ، اُسے بتایا کہ اس بچے کی قسمت کے بارے میں کتنی خوف زدہ ہوں ، جیسے ہم اس دنیا میں لا پھینکیں گے ،

آخر میں کس طرح تصور کر سکتی ہوں کہ میرا بچہ ، ایک وجود ، جس نے میرے خون سے غذا حاصل کی اپنی کوکھ کے اندھیرے میں جسے میں نے چھپائے رکھا ہو ۔ جسے میں نے اپنی سانس ، اپنے دل کی دھڑکنوں اور اپنے روزانہ کی غذا میں اپنا حصہ دار بنایا ہو ، ایک وجود جسے میں نے زندگی اور یہ زمین دی ہو ، آخر کس طرح میں تصور کر سکتی ہوں کہ مستقبل میں ایک دن وہ مجھے اپنے پیچھے چھوڑ کر راکٹ میں بیٹھ کر چاند میں جا بسے گا ۔ اور کسے پتہ ہے ، وہ وہاں خوش بھی رہ سکے گا کہ نہیں ؟

وہ دیر تک خاموش رہا ، تھوڑی دیر بعد صبح کا اُجالا اس کے چہرے سے چھن چھن کر کمرے کے کونے میں پھیلنے لگا ، اس کا چہرہ کسی تاثر سے خالی تھا اور دور کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی فضا میں یونہی خالی پن سے ایک تیر کی شکل کی چیز اور ایک ننھے سے چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا ، فکر و تردد کا تاثر اس کے چہرے پر عیاں تھا ۔ میں تو دھی چُپ تھی ، میں نے اپنی آنکھیں موند لیں ۔

ــــــ اُسے اپنے بے حد نزدیک ، آسمان میں راکیٹ پھینکنے والی اونچی مینار کی طرح کھڑے پاکر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں نے بڑبڑاتے ہوئے اس سے کہا کہ مجھے اس کے ننگے بدن سے بے حد پیار ہے کیوں کہ جب وہ اس تن کو کپڑوں میں چھپا دیتا ہے ، خاص کر جب وہ اپنی ٹائی کو گرہ لگاتا ہے ، تو مجھے بے حد اجنبی لگتا ہے ، اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور مجھ پر جھک آیا ، بڑی تیزی سے میں اس کی باہوں میں سمٹ گئی اور دیوانگی سے بڑبڑانے لگی

ــــــ مجھے تم سے محبت ہے ، مجھے تم سے محبت ہے ......

اور اس کی پھسپھساہٹ میرے بالوں سے چھن کر اُبھری ــــــ تم بہت موتی ہو ! پھر اس نے اپنی ہتھیلی میرے ہونٹوں پر پھیلا دی اور دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنے گھیرے میں کچھ اور کھینچتے ہوئے حکم دیا ــــــ آؤ چاند کو چلیں ــــــ تم اور میں "

●●

غزلیں

فاروق شفق

کب کوئی جھونکا خفا رہتا ہے
آدمی خود ہی بجھا رہتا ہے

گرتی ہے یاد کی شبنم جس شب
سارا دن پھول کھلا رہتا ہے

شبنمی پھول کبھی چن نہ سکا
باغ کہرے سے ڈھکا رہتا ہے

اس کو چپکے سے بلاؤں کیسے
پھول کانٹوں میں گھرا رہتا ہے

ہم ہی آپس میں نہیں ملتے ہیں
پیڑ سے پیڑ ملا رہتا ہے

راہ گل پوش نظر آتی ہے
جب تک احساس خفا رہتا ہے

دل پہ دستک نہیں ہوتی کوئی
گھر کا دروازہ کھلا رہتا ہے

رات بھر سانس نہیں لی جاتی
کوئی سینے پہ کھڑا رہتا ہے

پڑھ سکیں آنکھیں اگر رنگوں کو
زرد میں سبز چھپا رہتا ہے

روز بارش کہیں ہوتی ہے شفق
روز کیوں جسم دھلا رہتا ہے

جمنا پرشاد راہی

کچھ تو سچائی کے شہکار نظر میں آتے
کاش ہم لوگ نہ خوابوں کے اثر میں آتے

جب کہ ہر روز نئی دیوار نمک داں ٹھہرا
کیسے مجروح اجالے مرے گھر میں آتے

سوئے پنگھٹ پہ جمی برف پگھل سکتی تھی
تشنہ سورج تو کبھی میرے نگر میں آتے

اجنبیت کے دریچوں میں کھلی تھیں آنکھیں
کس کے سائے مرے خوابوں کے کھنڈر میں آتے

شامل حال رہی مصلحتِ شیشہ گری
ورنہ پتھر بھی زدِ فتنۂ دشر میں آتے

ہم بگولوں کی طرح بادیہ پیما تھے مگر
اذن ہوتا تو تری راہ گزر میں آتے

ہم نے اس خوف سے خاکوں کو مکمل نہ کیا
شام کے رنگ بھی تصویرِ سحر میں آتے

غزلیں

مبارک شمیم

شکوہ سدا رہے گا اسی بات کا مجھے
اک عکس کہیں سے تراشا گیا مجھے

تصویر ہستئ خاص بشر نے پڑھا مجھے
لیکن مآل کار نہ حل کر سکا مجھے

لے جا رہا تھا خود ہی جسے اپنے دوش پر
اک رہگزر میں ایسا جنازہ ملا مجھے

جلتے رہے گے ٹھہرتے سورج کی دھوپ میں
لوگو! زمین شور میں کیوں بو دیا مجھے

یہ ڈر بھی ہے نہ سر کوئی بیسرا اتار لے
یہ بھی خوشی ہے لوگ پکاریں خدا مجھے

تھا بے خودی کی راہ میں سایہ قدم قدم
اس آگہی کی دھوپ نے جھلسا دیا مجھے

ماحول ہے کثیف کہ میں خود ہوں کم نظر
دھندلی دکھائی دیتی ہے یار وفا مجھے

یا مجھ کو اپنی راہ گزر میں بکھیر دے
محراب دل میں ورنہ ادب سے بٹھا مجھے

یادوں سے پھر چھڑا دے فرصت کا مشغلہ
اے گیسوئے دراز ابھی بھول جا مجھے

ملنا تھا مجھ کو روز ازل درد کائنات
دے کر غم نصیب ہی بہلا دیا مجھے

سنسان راہ اور بلا کی مہیب رات
اے ہم سفر نہ چھوڑ کے ایسے میں جا مجھے

تیری نظروں سے بھی بسلامت گزر گیا
احساس درد جاوداں نذر اب بنا مجھے

پھر شہر شہر پھرتا ہے میری تلاش میں
پہلے شمیم تو نے کہیں کھو دیا مجھے

اب ایسی انجمن خواب میں چلا جائے
کوئی وہاں سے اٹھائے نہ خود اٹھا جائے

غم نصیب سے ہم کو کبھی ملے گی نجات
جو ہم کہیں، وہی قسمت میں لکھ دیا جائے

نہ روشنی رہی جن میں نہ شعلگی باقی
کہو صبا سے کہ ایسے دیئے جلا جائے

ہزار رنگ میں جی کو ہزار دھڑکے ہیں
عذاب ہوش و خرد اب نہیں سہا جائے

کہیں تو تیشۂ فرہاد کا حوالہ دو
جو لب پہ تذکرۂ جوئے شیر آ جائے

مری طلب سے بہت کم ہے تلخئ حالات
شمیم زہر بھی اس میں ملا دیا جائے

تبصرے

نام کتاب : **میرے لہو کی آگ**
مصنف : نشتر خانقاہی
صفحات : ۱۳۶
قیمت : بارہ روپے
ملنے کا پتہ : مسعود الحسن صدیقی، ۱۵۔ نور نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاعری کی تمام خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ اکثر اچھے اشعار پہلی نظر میں متاثر نہیں کرتے جبکہ پہلی نظر میں اچھے دکھائی دینے والے اشعار دھیرے دھیرے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ غزلوں کے ساتھ یہ بات خاص طور پر صحیح ہے۔ لہٰذا غزلوں کی بنیاد پر کسی شاعر کی حیثیت کو طے کرنا بڑا کٹھن ہوتا ہے، کیونکہ اس عمل میں بیشتر غیر مستحق اشخاص کو وہ شہرت مل جاتی ہے جو کسی مستحق کا مقدر نہیں بنتا۔ غالب کو بھی اپنی شایان شان شہرت کے لئے ایک سو برس انتظار کرنا پڑا۔

نشتر خانقاہی کے مجموعہ کلام "میرے لہو کی آگ" کے مطالعہ کے بعد آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزلوں کے شاعر ہیں۔ اول تو اس مجموعہ میں غزلیں زیادہ ہیں اور نظمیں کم۔ دوم ان کے مزاج میں شہرت سے "ایک درویشانہ بے نیازی" ہے جس کی فن غزل متقاضی ہے کیونکہ گیسوئے فن دھیرے دھیرے سنورتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے الفاظ میں نشتر خانقاہی کی شاعری "داخلی کلام" ہے۔ لیکن یہ وہ داخلی کلام ہے جو اس دور کے تمام لوگوں کے مسئلے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جس کے متعلق اس مجموعہ کے پبلیشر مسعود الحسن صدیقی لکھتے ہیں۔

"میں ایمانداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شاعری جو میں چھاپ رہا ہوں میرے اور مجھ جیسے ان گنت لوگوں کے لئے بہت اہم ہے۔ اس عہد کی ساری پیچیدگی، بے مائیگی، الجھن، شکست و ریخت، عدم تیقن اور بے وسیلگی لئے ہوئے ہے۔"

اس سلسلہ میں نشتر خانقاہی کے اپنے خیالات متضاد ہیں۔ ایک شعر ہے ؎

اس عہد میں ثانی مرا مشکل سے ملے گا — میں اپنے ہی زخموں کا لہو پی کے پلا ہوں

لیکن دوسرا شعر ہے ؎

جان بھی اپنی نہیں، دل بھی نہیں تنہا اپنا — کون کہتا ہے کہ دکھ درد ہے، اپنا اپنا

غالباً تضاد ہر سچے فن کار کے مزاج کا خاصہ ہے۔ دراصل تضاد بذات خود اپنی کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ارتقائے خیال کا محرک ہوتا ہے، یہی احساس نشتر خانقاہی کے مجموعہ کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

نرسل کا المیہ جو اس زمانے میں جدید فن کاروں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے، دراصل concept کی ناکامی ہے۔ جب کسی شاعر کا مشاہدہ ناکام رہتا ہے تو کوئی واضح concept کی امید [illegible] concept کی راہ میں قواعد سے لاپرواہی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ نشتر خانقاہی [illegible] انہیں ایسے

[illegible] داس بنا جا چکا ہے۔

پرانے سکوں کا وارث ہوں پھرتا ہوں میں، در بدر اپنی جھولی میں ڈالے ہوئے
سارے سکّے جو ٹکسال باہر ہوئے، سارے الفاظ وہ جن کے معنی نہیں

کاٹ میں بجلی سے تیکھی، بال سے باریک تر
زندگی گزری ہے اس تلوار پر چلتے ہوئے

اب یہ عالم ہے کہ میری زندگی کے رات دن
صبح ملتے ہیں مجھے اخبار میں لپٹے ہوئے

پہلے شعر میں "ٹکسال" کے بعد "...." کی کمی رہ جاتی ہے۔ دوسرے شعر میں "کاٹ میں بجلی سے تیکھی" کی جگہ "بجلی سے تیز" اور تیسرے شعر میں "صبح" کی جگہ "روز" سے شعر کا حسن بڑھ جاتا ہے۔

تاہم نشتر خانقاہی کے یہاں اچھے اشعار کی کمی نہیں۔

صحرا کی وسعتوں میں نہ جب عافیت ملی | میں شہر شہر دل کا سکوں ڈھونڈتا پھرا

کاش اک پل اپنی مرضی سے بھی جی کر دیکھتے | جانے کس کس کے اشاروں پر جئے جاتے تھے لوگ

دستک کہیں ہوا دیتی ہیں کھڑکیاں میری | گھٹا کہیں ہو ٹپکتا ہے سائبان میرا

رات ایک بچہ میں، شام ایک ہوٹل میں، بس یہی وسیلے تھے
میز کے کنارے پر، چائے کی پیالی میں، اس کے ہونٹ رکھے تھے

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ نشتر خانقاہی غزلوں کے شاعر ہیں۔ اس حقیقت کی تصدیق اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ بظاہر انہوں نے آزاد اور غیر پابند نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر نظم کے زیادہ تر مصرعے مروجہ وزن یا بحر کے مطابق رہتا ہیں۔ ان کی نظم "طلب ایک حادثہ کی" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں سترہ چھوٹے بڑے مصرعے ہیں، جن میں تیرہ مصرعے مروجہ وزن کے عین مطابق ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی نے نشتر خانقاہی (یا ان کی نظم "پت جھڑ میں تنہا پیڑ") کے بارے میں لکھا ہے:-

"نشتر خانقاہی نے جو کچھ کھویا ہے اور جو کچھ بھلایا اس کی علامت ان کی نظم "پت جھڑ میں تنہا پیڑ" ہے۔ لیکن یہ تنہائی حافظ کی طرح ہمدم کی تلاش نہیں کرتی (دل ز تنہائی بہ جاں آمد خدا را ہمدمے) بلکہ اپنی جگہ مکمل ہے۔"

شمس الرحمن فاروقی نے نظم "پت جھڑ میں تنہا پیڑ" کو "تنہائی" کی نظم کے روپ میں لکھا ہے۔ حالانکہ اس طرح نظم

NEGATIVE میں پیش کی گئی ہے۔ "وہ نہ" کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ قرآن شریف ہو یا گیتا، بائبل ہو یا گورو گرنتھ صاحب سبھوں میں خدا کی صفات کا ذکر NEGATIVE میں ہوا ہے۔ (وہ کسی کا بیٹا ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے ...... وغیرہ)۔ ایسا کہیں نہیں ہے کہ خدا "یہ" ہے "وہ" ہے، بلکہ ہر جگہ یہی ہے کہ خدا "یہ" نہیں ہے "وہ" نہیں ہے۔
طوالت کا خوف دامن گیر ہے، تاہم قارئین کی دلچسپی کے لئے نظم "بت جھڑ میں تنہا پیڑ" نقل کی جاتی ہے:

دائیں بائیں نفی کی علامت ہے اور بیچ میں
خالی خالی اکیلا عدد ایک کا
(——۱——)
اس طرح سر جھکائے کھڑا ہے کہ جیسے یہاں
کوئی آیا ہے اب تک نہ آئندہ آنے کی امید ہے
میں کفِ برگِ احساسِ تنہائی پر
کل کے موسم کی معصوم میت لئے
چیختا ہوں، کوئی اس کا وارث اگر ہو تو آواز دے
اور آئے،
کہ شہرِ خموشانِ تاریخ میں
دفن کردیں اسے
کوئی آواز کانوں میں آتی نہیں
صرف خالی اکیلا عدد ایک کا
دونوں جانب نفی کی علامت لئے
میری آواز کے دائروں سے پرے
سوچ میں غرق ہے

اوپر میں نے ترسیل کے المیہ کا ذکر کیا تھا، لیکن اس نظم میں "تفہیم کا المیہ" درپیش ہے۔
"میرے لہو کی آگ" نشتر خانقاہی کا ایک مجموعہ ہے جو صوری و معنوی ہر اعتبار سے دلکش ہے۔

—————— عشرت ظہیر ——————

نام کتاب : **کارواں خیالوں کے**
مصنف : نو بہار صابر
صفحات : ۱۹۰
قیمت : چھ روپے
ناشر : انجمن ترقی اردو، ماڈل ٹاؤن ۵۵۳/۳ راگھو ماجرا۔ پٹیالہ

وہاب صابر نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور ان کے اس مجموعہ میں بھی اصناف شاعری کے نمونے ان کے جوان کہنہ مشق شاعر ہونے کی دلالت کرتے ہیں۔

واجندر سنگھ ورما نے نوبہار صابر کی زندگی، تہ دار شخصیت اور شاعری پر اچھا تعارف قلم بند کیا ہے۔
اس مجموعہ میں ۴۴ نظمیں، ۳۳ غزلیں ۷۶ رباعیاں اور متفرق طنز و ظرافت کی کلیاں اور کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔
عمدہ کتابت، اچھی طباعت، دلکش سرورق سے مزین یہ مجموعہ کلام چھ روپے میں مہنگا نہیں ہے۔

——————— عشرت ظہیر ———

نام کتاب	:	**لالچی**
مصنف	:	بدر اورنگ آبادی
صفحات	:	۸۴
قیمت	:	پانچ روپے
ملنے کا پتہ	:	کلچرل اکیڈمی، دینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ۔ گیا

'لالچی' بدر اورنگ آبادی کے ان افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان لکھے گئے۔ ان افسانوں کو پیش کرتے ہوئے بدر اورنگ آبادی نے کوئی بڑا دعویٰ نہیں کیا۔ انہوں نے ایسا نہیں کہا ان پچیس تیس سال پرانے افسانوں میں آج کی دنیا کے دل کی دھڑکن ہے اور نہ ہی انہوں نے ان افسانوں میں روایت کی جڑیں تلاش کی ہیں۔ بلکہ انھوں نے ان افسانوں کو پیش کیا ہے اور اس کے پیش کش کو ایک ایسا حادثہ بتلایا ہے، جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ گیا تھا۔

پیش لفظ میں وہاب اشرفی تحریر فرماتے ہیں:

"......... تب سے اردو افسانے نے کتنی ہی کروٹ لی ہے۔ بیانیہ انداز کو جھٹکا لگا ہے — علامت پر مبنی افسانوں کی بھیڑ چال ہے۔ ترسیل کا پاس نہیں۔ شعور کی رو پر زور ہے۔ مربوط ماجرا سازی اب کوئی ایسا فنی مرحلہ نہیں ......"

"لالچی" کے افسانے یقیناً آج کے افسانوں سے ہئیت و مواد اور اسلوب و پیش کش کے اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان میں نہ علامتوں کا التزام ہے، نہ ترسیل کو المیہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، شعور کی رو پر بھی شعوری زور نہیں ڈالا گیا ہے اور نہ ہی غیر مربوط ماجرا سازی کا اہتمام ملتا ہے ——— لیکن ان تمام خصوصیات کی زیریں لہریں جو آج کے افسانے کا خاص انداز ہیں "لالچی" کے بیشتر افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

افسانہ "کھیل کھیل میں" مواد کے اعتبار سے ایک نفسیاتی افسانہ ہے جو SEXUAL LOVE کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن اس کے اسلوب میں شعور کی رو کی زیریں لہریں ہیں جو اس افسانے کو آج کے افسانے کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

بدر اورنگ آبادی کے افسانوں کا ماحول آج سے پچیس تیس سال قبل کا ضرور ہے لیکن ان کے افسانوں کی زبان آج کے جدید افسانوں سے بہت قریب ہے۔

"یہ دوہرا پن کیوں ہے ...... مجھے تو ایسا لگا جیسے تحلیل ہوتی جا رہی تھی جیسے میرا وجود ہی سمٹ کر ان کی آنکھ بن کر رہ گیا ہو ...... میں خود نہیں سمجھ پاتا پرمیلا کہ میرا وجود مجھ سے الگ کیوں ہو جاتا ہے؟ ....
پرمیلا تم بھی مجھے ... نہیں چھوڑو گی، اس صلیب کو ڈھونے کے لئے ______ پرمیلا — میری تنہائی مجھے کھا ... ہے ... ______"

(لالچی)

بدر اورنگ آبادی نے اپنی باتوں کو کہنے کے لئے خوب صورت استعاروں کی مدد بھی لی ہے۔ مثلاً افسانہ "چیتا" کے یہ الفاظ:

"جنگلوں میں ایک ... چیتا ... جس کی خوراک انسانی گوشت ہے۔ اس کی چنگھاڑ سے ڈر کر دوسرے جانور بھاگ جاتے ہیں لیکن انسانی ایک عادت سے چیتا متنفر ہو گئی ______
...... وہ چیتا انسانوں کی چوسی ہوئی ہڈیاں پھینک دیتا ہے ....."

چیتا کی نفسیاتی شکست خوردگی ... علامت ہیں جو افسانے کو سطحیت اور عمومیت سے بچاتی ہیں۔

بدر اورنگ آبادی کی ... نفسیات پر بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں نفسیاتی گتھیاں، پیچیدگیاں ایک خاص تاثر کے ساتھ اُبھرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ... کے بچپن کی ذہنی خلش اور نشوونما کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ (افسانہ "سیڑھی")

بدر اورنگ آبادی نے زیادہ تر نفسیاتی افسانے لکھے ہیں لیکن ہندوستانی تہذیب اور کلچر، یہاں کے ماحول اور یہاں کے رہنے بسنے والوں کی زندگی کا بھی گہرا مشاہدہ ہے۔ انھیں یہاں کے افراد کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا گہرا صدمہ ہے۔ ان کے کئی افسانوں میں "بھکاریوں" کا ذکر بڑے ... سے ... ہوا ہے۔ (آرٹسٹ کون۔ اُلجھن۔ کارواں)

"لالچی" پچیس تیس سال قبل کے افسانوں کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی افسانوی ادب کے ذوق رکھنے والے آج کے قارئین کے لئے ایک دلکش تحفہ ہے۔

عشرت ظہیر ______

______

نام کتاب: **میرا شہر میرے لوگ**

مصنف: طیب انصاری صفحات: ۱۱۸ قیمت: پانچ روپے

ناشر: ولا اکیڈمی، عزیز باغ، سلطان پورہ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۴

"میرا شہر میرے لوگ" طیب انصاری کے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۲ء کے درمیان لکھے گئے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ خاکے حیدرآباد کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور مصنف کے دوستوں پر مشتمل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
وقار خلیل، آمنہ ابوالحسن، محمود خاور پر اچھے خاکے قلم بند کئے گئے ہیں۔ قیصر سرمست نے پُر معنی سرورق بنایا ہے جو اپنی طرف کھینچتا ہے ______

عشرت ظہیر ---

کتاب	صنف	مصنف	قیمت
چند نام گلیاں	افسانے	[illegible]	[illegible]
صفر	〃		-/۱۰
بابا لوگ	〃	غیاث احمد گدی	[illegible]
زاویۂ نگاہ	تنقید	خلیل الرحمٰن اعظمی	-/۱۰
اپنی تلاش میں	خود نوشت سوانح عمری	کلیم الدین احمد	عام ایڈیشن -/۳۰ ڈیلکس ۱۲۵
نجوں کا سفر	شاعری	ڈاکٹر خورشید پرشاد	-/۱۰
نوائے راز	〃	مجور شمسی	-/۵
درخشاں	〃	حفیظ بنارسی	-/۵
احتشام حسین نمبر	خصوصی شمارہ	ماہنامہ آہنگ	۱۵
معیار و مسائل	تنقید	ڈاکٹر شاہ شکیل احمد	۳/۵۰
انتخاب کلام جمیل	انتخاب مع تنقید	ڈاکٹر محمد مشتاق	-/۳
مطالعۂ اردو	انتخاب نظم و نثر	کلام حیدری، محمد علی خاں	۳/۵۰
دیدۂ حیراں	افسانے	منظر حنفی	-/۳
تیکھی غزلیں	غزلیں	〃	-/۴
گونگا ہے بھگوان	ناول	کوثر چاند پوری	۲/۵۰
پتھر کا گلاب	〃	〃	-/۷
آواز کی صلیب	افسانے	〃	-/۳
کاروان ہمارا	رپورتاژ	〃	۳/۲۰
روشنی کے دریچے	شعری مجموعہ	سید احتشام حسین	-/۱۰
کوکھ جلی	افسانے	راجندر سنگھ بیدی	۵/۵۰
شہر ممنوع	〃	واجدہ تبسم	-/۱۲
آیا بسنت سکھی	〃	〃	-/۱۸
چھوئی موئی	〃	عصمت چغتائی	۵/۵۰
مطالعۂ ممنون	تنقید	منشاء الرحمٰن منشا	-/۳

اکیڈمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

R.N.I. Regd. No 4253/64
P.T. Regd. No. 155
PHONE NO. | OFF. 662 | RES. 53

THE Aahang Urdu Monthly
Editor: KALAM HAIDRI
BAIRAGI, GAYA.